اسلام اور تقدیر انسانی

الله
هي العليا

گائی ایٹن (حسن عبدالحکیم)

مترجم: فضل قدیر

Marfat.com

اسلام اور تقدیرِ انسانی

Marfat.com

Marfat.com

اسلام اور تقدیرِ انسانی

گائی ایٹن (حسن عبدالحکیم)

مترجمہ

فضلِ قدیر

ادارہ ثقافت اسلامیہ

2- کلب روڈ لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

طبع دوم: نومبر 1998ء

تعداد: 1100

ناشر: ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ' لاہور

مطبع: مکتبہ جدید پریس' لاہور

قیمت: ~~200-00~~ 300/-

New Price [illegible] mic Culture
Institute [illegible]
2-Club Road, Lahore.

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام آباد کے تعاون سے شائع کی گئی۔

Marfat.com

فہرست

تعارف		۷
باب اوّل	اسلام اور یورپ	۱۹
باب دوم	تسلسل اور تقابل	۶۳
باب سوم	حق اور رحمت	۱۰۷
باب چہارم	دنیائے قرآن	۱۴۷
باب پنجم	رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام	۲۰۱
باب ششم	مدینۃ النبیؐ	۲۴۱
باب ہفتم	خلفائے راشدین	۲۸۳
باب ہشتم	کارِ جہاں	۳۱۵
باب نہم	قانون کی حکومت	۳۵۱
باب دہم	انسانی بوالعجبیاں	۳۸۷
باب یازدہم	آرٹ، ماحول اور تصوف	۴۳۵
باب دوازدہم	دیگر جہتیں	۴۷۷

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

مذہب کا معاملہ قطعی طور پر جُداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے تمام مباحث و موضوعات میں معروضی مطالعے کے لیے مختلف درجات کی لچک پیدا ہو سکتی ہے بعض صورتوں میں تو شخصی آراء و خیالات کی آمیزش تصویر کے واضح اور متوازن نقوش کو اُبھارنے کے بجائے اُلٹا اُسے مبہم اور پیچیدہ کر دیتی ہے لیکن مذہب کی اپنی ایک منفرد نوعیت ہے۔ اس میں معروضیت محض اوپری سطح کو کھرول یا کُرید سکتی ہے، اس کی اصلی روح تک نہیں پہنچ پاتی۔ دین کی تفہیم کی کنجیاں مشاہدہ کرنے والے کے اپنے وجود اور ذاتی تجربے میں پنہاں ہوتی ہیں۔ یاد رکھیے ان کنجیوں کو پائے بغیر کوئی بھی دروازہ نہیں کھل سکتا۔ یہ بات خصوصیت سے اسلام پر صادق آتی ہے؛ کیونکہ یہ ایک ایسا مذہب ہے جو ایمان اور کفر کے امتیاز کو دیگر تمام امتیازات کے مقابلے میں بہت زیادہ اور بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اس کی توضیح طبیعیاتی یا محسوس سطح پر بینا اور نابینا کے فرق سے کی جا سکتی ہے۔ ایمان اور قوتِ فہم ایک دوسرے کے ممد و معاون ہیں۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک بصارت سے محروم شخص سے کوئی شخص ارضی منظر بیان کرنے کو نہیں کہا کرتا،

Marfat.com

خواہ اس نابینا نے اس مخصوص منطقے کے جغرافیائی حالات سائنسی انداز سے مطالعہ کیے ہوں اور چٹانوں اور نباتات کا تجزیہ بھی کیوں نہ کر رکھا ہو۔ اسلام میں انسانی زندگی کے ہر پہلو، ہر خیال اور ہر عمل کو ایمان کے بنیادی ارکان کی روشنی میں آنکا اور پرکھا جاتا ہے۔ اگر اس بنیادی کیلی کو کوئی گھسیٹ پھینکے تو مذہبی ڈھانچے کے جملہ اجزائے تشکیلی ایک دوسرے سے دُور دُور جا پڑتے ہیں۔

کسی ایمان سے عاری شخص کے لیے، ارکانِ ایمان بے معنی ہیں اور اس زاویۂ نظر سے اُسے ایک مسلمان کی زندگی میں کوئی چیز بھی قابلِ فہم محسوس نہ ہو گی۔ ایک مخلص عیسائی کے لیے 'دین' اور 'دُنیا' خیال کی مختلف جہتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگر ان دو کو گڈمڈ کر دیا جائے تو وہ بلبلا اُٹھتا ہے۔ اسلام اس تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ ایک مسلمان کے لیے اس کی عبادت، اس کے جسمانی اعضاء و جوارح کا استعمال، پاکی اور تقدیس کے حصول کی جستجو، منڈی میں اشیاء کا تبادلہ، روزمرّہ کے کام اور کھیل کود وغیرہ ایک ناقابلِ تقسیم کُل کے اجزا ہیں اور عملِ تخلیق کی طرح ان میں کوئی فصل یا دراڑ نہیں۔ مسلمان کی مربوط و مستحکم دنیا کا واحد دَر ایک ہی کنجی سے کھلتا ہے ــــ اور وہ کنجی ہے توحید کا اثبات ــــ اور اس اثبات کے بعد جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس کی صدائے بازگشت وجود کے محیط کو چھوتی ہے اور جہانِ وجود کی سرحدیں لاشئے یعنی عدمِ وجود سے مس کرتی ہیں۔

اسلام ایسا مذہب ہے جو ہر شئے کا احاطہ کرتا ہے۔ اسے یا تو ایک کُل کی حیثیت میں تسلیم کرنا ہوتا ہے یا پھر رَد ــــ یہ ایک ایسی حقیقت پر ایمان کا نام ہے جو اپنے دائرے سے ہٹی ہوئی کسی دوسری حقیقت کو آزاد و خود مختار وجود رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر بالفرضِ محال ایسا ہوتا بھی تو وہ دوسری حقیقت خواہ کس قدر بھی دور اور محجوب ہوتی، اس حقیقتِ اصلی کو رَدّ کر دیتی جو اپنی ذات میں واحد اور لاشریک ہے۔

اس زاویۂ نظر کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ کوئی بھی شخص ایک مخصوص نقطۂ خیال کو اپنائے بغیر اسلام کے متعلق کچھ کہنے کا مجاز نہیں ہو سکتا اور یہ خیال اسے پوری طرح واضح اور

Marfat.com

عیاں کرنا چاہیے۔

اس کتاب کا مصنّف یورپی ہے جو کچھ عرصہ قبل ذہنی قبول و توثیق کے نتیجے میں مشرف بہ اسلام ہُوا۔ اس سلسلے میں اس کا ایقان یہ تھا کہ تمام الٰہی مذاہب، ایک بلند تر سطح پر ایک اساسی وحدت کے حامل ہیں۔ ایک مذہب کو تبدیل کر کے دوسرے مذہب میں داخل ہونے کے معنی عموماً یہ لیے جاتے ہیں کہ ایک مذہب کے مقابلے میں دوسرے کو رد کر دیا جائے مگر میرے لیے تو یہ ایک تسلیم و قبول کا عمل تھا جس کے پیچھے رد کرنے کی کوئی "پخ" نہیں لگی ہوئی تھی ــــ ہاں اگر کسی شے کو رد کرنا تھا تو وہ تشکیک اور لادینیت کے خیالاتِ فاسدہ تھے۔

جو شخص دینِ اسلام میں پیدائش کے بجائے انتخاب کے وسیلے سے داخل ہوتا ہے وہ عموماً مذہب کی زمینِ اصلی، یعنی قرآنِ مجید اور سُنتِ رسول رؤف الرحیم میں اپنی جڑیں گہرائی تک پیوست کرتا ہے مگر یہاں صورتِ حال یہ تھی کہ مسلمانوں کی عادات و روایات اس مصنف کی اپنی نہیں تھیں۔ اس میں مسلمانوں جیسے استحکام کی کمی تھی اور ان کی کمزوریوں سے، اور خاص طور پر ان نفسیاتی الجھنوں سے جو حالیہ تاریخی عوامل کی بنا پر پیدا ہو گئی تھیں، وہ قطعی مبرّا تھا۔ اُس نے نقالی میں خود کو عرب بنا کر پیش کرنا بھی پسند نہیں کیا کیونکہ اس کے پیشِ نظر یہ حقیقت تھی کہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے جس کے بنیادی ڈھانچے کا استحکام اور سرد و گرم کی سہار کی قوت کا راز یہ ہے کہ اس میں ہر آنے والی صدی میں نئے نئے ملکوں سے تازہ اور فعّال خون داخل ہوتا رہا ہے۔ ایرانیوں، ترکوں، منگولوں، بربریوں، افریقیوں، ملائیوں اور ہندوستانیوں نے اسے قُوّت فراہم کرنے کے ساتھ وہ رسم و رواج توڑ پھوڑ دیتے جن پر عرب نازاں اور مفتخر تھے۔ ان لوگوں نے دینِ اسلام میں ایک نئی روح دوڑائی اور اس کی تہذیب و تمدن میں ایک نئی آب و تاب پیدا کر دی۔

اسلام نے زندگی گزارنے کا ایک بنیادی لائحۂ عمل پیش کر دیا تھا جو مسلمانوں کو دوسرے مذہبی گروہوں سے ممتاز و منفرد بناتا تھا۔ جب جیشِ اسلامی میں بیرونجات سے لوگوں کی آمد ہُوئی تو کچھ ہی عرصے میں ان لوگوں نے اس میں ایسے رنگ بھر دیے جو دیدنی تھے۔ ایک دارالاسلام سے دوسرے دارالاسلام میں پھیلے ہُوئے بہ رنگِ طاؤس

Marfat.com

کی دُم کی طرح نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔

وہ یورپی اور امریکی جو ذہنی تقلیب کے نتیجے میں اسلام قبول کرتے ہیں، دُنیا کی قدیم ترین سرحد پر بھونچک انداز میں تنہا کھڑے ہیں۔ یہ وہ سرحد ہے جسے عیسائیت کے غلبے اور اس کے بعد کے تیرہ سو سالہ وقفے نے مشرق کی اسلامی تہذیب و تمدن سے کاٹے رکھا۔ یہ کئی نوعیتوں سے ایک عجیب و غریب صورت حال تھی۔ تہذیبی اعتبار یہ خطِ فاصل دو ایسے حصّوں کو منقسم کرتا تھا جہاں کے لوگ باہمی رویّوں کے تحت ایک دوسرے سے ناقابلِ فہم حد تک الگ تھلگ تھے۔ ان دو منطقوں میں یکساں انداز میں خود کو ماحول سے ہم آہنگ کرنا ایسا ہی تھا جیسے دو انتہائی بُعد والے سیاروں کے درمیان رسل و رسائل قائم کرنے کی سعی۔ اہلِ مغرب جس طرح مسلمانوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں کچھ اُسی طرح مسلمان مغرب کے باسیوں کو سمجھنے میں بیٹھے ہیں۔ جو لوگ دو کشتیوں کے سوار کی طرح ایک پاؤں ایک منطقے اور دوسرا دوسرے منطقے میں جما کر کھڑے ہیں، وہ ان دو مختلف اللسان لوگوں کے درمیان ترجمان کا کردار ادا کرنے کی سعیٔ خام میں مصروف نظر آتے ہیں جبکہ حق یہ ہے کہ یہ کام صرف اُسی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہے جب انہیں دونوں زبانوں پر یکساں مہارت حاصل ہو۔

مغربی مسلمان اپنی سمت تو بدل لیتا ہے مگر اپنا تشخص بدلنے کو تیّار نہیں ہوتا۔ وہ اس تہذیب و روایات کے رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس تہذیب و روایات ہی نے اس کے سماجی وجود کی صورت گری کی ہے۔ مغرب کا مسلمان وہی سوالات کرتا ہے جو اُس کا کلچر اُسے سمجھاتا ہے۔ دُنیا کی بگڑتی حالت اس کے اعصاب پر سوار ہے اور دل و دماغ میں حزن و یاس کی موجیں متلاطم ہیں جنہوں نے اس میں ایک خاص انداز کا ابہام پیدا کر دیا ہے۔ ایسی پُر پیچ کیفیات اور روایات سے اس کا خمیر اُٹھا ہے۔ ایک روایتی اور پابندِ دین مسلمان کے لیے اُس کی اس عجیب و غریب صورت حال کو سمجھنا انتہائی مشکل ہے۔ مغربی مسلمان آج بھی یورپ کے ماضی کی پرچھائیوں کی لپیٹ میں ہے۔ اس کے آباؤ اجداد کا تکلم ہنوز اس کے لیے گنگ نہیں ہُوا؛ تاہم اس

Marfat.com

نے خود کو ان سے بہت زیادہ فاصلے پر کر لیا ہے۔

سامی النسل لوگوں کے مزاجوں میں ایک فطری قانونیت ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایک خاص انداز کی لکیر کی فقیری پائی جاتی ہے۔ وہ الفاظ اور عبارت پر پوری قوت سے توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک یورپی قانون کی عبارت سے کہیں زیادہ اس کی رُوح کو اہمیت دیتا ہے۔ جب وہ داخلِ اسلام ہوتا ہے تو ناگزیر طور پر اس جذبے اور خو کو اپنے ساتھ لپیٹ لاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو مزاج کے اس میلان سے وہ اپنے منتخب کردہ مذہب کی مفید خدمت اس دور میں کر سکتا ہے جس میں ہر چیز انقلابی انداز سے تغیّر پذیر ہے۔

آج جبکہ وقت کے ہاتھوں جامد اور کٹّر انداز کی مذہبیت کی دیواروں کو لونی لگ رہی ہے، سب سے زیادہ ضرورت اس امر کے تعیین کی ہے کہ دینِ حنیف کے لازمی اجزا کیا ہیں اور پھر انہیں پوری مضبوطی سے تھام لیا جائے۔ جب ہم یہ بات کہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہرگز نہیں لیے جانے چاہییں کہ دینِ مبین کی عمارت کا کوئی حصّہ غیر اہم ہے بلکہ مقصود تو اس بات پر زور دینا ہے کہ جب کوئی قصر زیرِ محاصرہ ہو اور دشمن اس کے بیرونی حصار کو درہم برہم کر دے تو ہمیں اس کے اندرونی مورچوں کو قوت بہم پہنچانے کے لیے سامان کرنا چاہیے۔

یہ کتاب ان لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جن کے دماغوں کی ساخت و پرداخت مغربی تمدن کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اس میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ موجودہ دور کی دنیا جیسی کچھ بھی ہے اسی تہذیب کی پروان چڑھائی ہوئی ہے۔ میں اپنے جدید تعلیم یافتہ ہم مذہبوں کے لیے اتنا ہی کچھ لکھتا ہوں جتنا غیر مسلموں کے لیے۔ اوّل الذکر گروہ میں ایسے بے شمار افراد پیدا ہو گئے ہیں جو اس دین کو جس میں کہ وہ پیدا ہوئے ہیں، بیرونی لوگوں کی آنکھوں سے دیکھ کر دوبارہ تجزیاتی نظر ڈالنے کی سعادت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ انہیں اپنے دین کے متعلق روایتی دلائل و براہین قبول نہیں۔ وہ اس وقت تک مناسب و موزوں تھے جب اسلام اپنے خول میں بند تھا۔ اپنے اصل

Marfat.com

کی طرف لوٹنے کے لیے انہیں اب زیادہ گہرا غوطہ لگا کر طویل مسافت طے کرنا ہوتی ہے۔ ایسے ہی متجسس لوگ اپنی معلومات کی روشنی میں اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکیں گے۔ وہ غیر مسلم جو اسلام کی فہم کا شوق تو رکھتے ہیں مگر مذہبوں کے تقابلی مطالعے کا میلان نہیں رکھتے۔ انہیں یقیناً یہ پوچھنے کا حق ہے کہ جو کچھ اس کتاب کے مصنف نے لکھا ہے کیا وہ صحیح اور قدیم عقائد کے مطابق مستند سمجھا جا سکتا ہے؟

ان کے اس سوال کا کوئی سادہ اور دو ٹوک جواب نہیں دیا جا سکتا کیونکہ مسلمانوں کی Orthodoxy (راسخ الاعتقادی) کی کوئی ہمہ گیر و ہمہ قبول قسم کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ "Orthodoxy" ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے لیے عربی زبان میں کوئی مترادف لفظ نہیں۔ ویسے بھی اسلام میں پاپائیت کا کوئی نظام موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے شیعہ ایران میں اس کی کوئی شکل ہو؛ تاہم مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اصولہائے دین کے لیے قرآن سے بڑی کوئی سند نہیں۔ اب ہم کیا ایمان رکھتے ہیں؟ یا کچھ دوسرے لوگوں کا ایقان کیا ہے؟ یہ معاملہ اُس وقت تک انفرادی بصیرت کے ذیل میں آئے گا جب تک ہم شریعت اور اجماعِ امّت سے بہت دور نہیں جا پڑتے اور آج اجماعِ امّت کی ضرورت ایک کھلا سوال بن کر ہمارے سامنے معلّق ہے۔

اگر ہم عیسائیت کی اصطلاح "آرتھوڈوکسی" (راسخ الاعتقادی) کو عاریتاً لیں تو اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ "سُنّی آرتھوڈوکسی" یا سُنّیوں کا اپنے عقائد کو خالص اور برحق سمجھنے کا تصوّر دسویں صدی عیسوی میں اُبھرا اور اس نے بعد کے دو سو سال میں اپنے خدوخال نمایاں کیے۔ یہ ایک طرح کا اجماعِ امّت تھا اور اس کی حیثیت اُن متضاد اور متحارب نظریات کے مابین جن سے امّت کا اتحاد پارہ پارہ ہونے کا خطرہ تھا، ایک راہِ معتدلہ کی سی تھی۔ اس میں اختلافِ رائے کے واسطے خاصی گنجائش تھی۔ یہ راستہ دین کی خالصیت اور ملّتِ مسلمہ کے فرد ہونے کی تنگ نظر شرائط کے ردِّعمل کے طور پر ابھرا۔ سُنّیت کی تصریح کے مطابق ہر وہ شخص مسلمان کہلانے کا اہل ہے جو کلمۂ طیّبہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر ایمان رکھتا ہو۔ چونکہ انسانِ ضعیف دلوں کا حال

Marfat.com

جاننے کا وصف نہیں رکھتا، اس لیے اخلاصِ قلب کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے۔

اب عملی طور پر شاید ہی چند لوگ ہوں جو "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے اس سادہ اور زبانی اقرار کے عواقب و عوامل پر نظر رکھے بغیر کسی کو مسلمان قرار دینے کے حق میں ہوں ـــــ مسلمان صرف ایک خدا پر یقین رکھتا ہے جو تمام تر قوت کا حامل اور لاشریک ہے۔ وہ اُن تمام نبیوں پر بھی ایمان رکھتا ہے جنہیں انسانوں کو راہِ ہدایت دکھانے کے لیے اللہ جل وعُلا ابتدائی وقت سے مبعوث کرتا رہا ہے اور وہ اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے بعد نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور اس کے بعد اب احکاماتِ الٰہی کی آمد بھی منقطع ہو چکی ہے۔ اسے اس پر بھی یقینِ واثق ہے کہ قرآنِ مبین کلامِ الٰہی ہے اور اس بات پر بھی کہ اس میں ایک حرف کا بھی ردّ و بدل ہُوا ہے، نہ ہو گا۔ وہ ایمان کے قصرِ مقدس کے پانچ بنیادی ستونوں، جنہیں ارکانِ ایمان کہا جاتا ہے کی شہادت بھی دیتا ہے۔ وہ نمازِ پنجگانہ، زکوٰۃ، رمضان کے روزوں، اور مالی وسائل اگر اجازت دیں تو مکّہ مکرمہ جا کر حج ادا کرنے پر بھی ایمان رکھتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان پہلے رُکن کو چھوڑ کر ایمان کے ایک یا دو ستونوں کی طرف توجہ نہیں دیتا تو پھر بھی اسے ایمان والوں میں شمار کیا جا سکتا ہے؛ تاہم اگر وہ ان کی ضرورت سے منکر ہو جائے تو اسے ملّتِ اسلامیہ سے خارج سمجھا جائے گا۔ قرآنِ مبین نے مسلمانوں کے ایمانی اعمال کی گواہی ان الفاظ میں دی ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ
كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ
اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا
وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

رسول اس کتاب پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئی،

Marfat.com

ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی۔ سب خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم اُس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور وہ (خدا سے) عرض کرتے ہیں کہ ہم نے (تیرا حکم) سنا اور قبول کیا۔ اے پروردگار! ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (بقرۃ (۲) : ۲۸۵)

ان آیاتِ مبارکہ سے "مومن" ہونے کی ایک شرط یہ بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ جمعیتِ مسلمین کے لیے قرآن کو اللہ کی نازل کردہ کتاب کی حیثیت سے تسلیم کرنا لازم ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآنِ مبین کے کسی حصے یا کسی ارشاد کا انکار "ایمان" کو وسوسے اور تذبذب میں بدل سکتا ہے۔ قرآنِ کریم کی وہ آیات جو قوانین سے متعلق ہیں بالکل واضح ہیں؛ تاہم اس کے کچھ حصے ایسے بھی ہیں جن کی مختلف انداز میں تعبیرات کی جا سکتی ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہر آیت میں معنی تہہ در تہہ ہیں۔ اس صورتِ حال کے تحت قدرتی طور پر بعض آیات کی تشریح تغیرات سے دوچار ہوئی ہے۔ عام طور پر ان تغیرات کو اس شرط کے ساتھ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ انہیں لفظی ترجمے سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ میں فہمِ سلیم، مذہبی جوشش، ہٹ دھرمی، تعصب اور کٹرپت سے نبرد آزما رہی ہے اور Orthodoxy کی ایک جامع تعریف کی متقاضی نظر آتی ہے۔ اور اب اس کا تعین اجماعِ امت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ فی زمانہ بہت سے مسلمانوں نے مختلف وجوہ کی بنا پر، جن میں آج کی اصطلاح میں "تشخص کا بحران" بھی شامل ہے، تنگ نظری اور لفظ پرستی میں پناہ لے لی ہے۔ ہر مخصوص گروہ اپنی لفظی تاویلات پر مصر نظر آتا ہے جس کے نتیجے میں اُمّہ تلخ مناقشات کا شکار ہے اور فکر و خیال کے مختلف گروہوں میں بٹ کر رہ گئی۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آج اگر کوئی مسلمان اسلام پر کچھ بولنے یا لکھنے کی جسارت کرتا ہے تو اس پر کفر و بدعت کی تیغ چلا دی جاتی ہے۔ اس غریب کو ازمنۂ قدیم کے عیسائیوں کی طرح (جب ان کے نزدیک

Marfat.com

مذہب ابھی زندگی اور موت ، نجات اور عذاب کا معاملہ تھا) اسی قسم کے کفر و شرک کے فتوؤں سے ہراساں ہو کر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوتے ہیں۔ مسلمان مصنف ان الزام تراشیوں کو فراخ حوصلگی سے برداشت کرتا ہے اور ان میں کسی قوت کے بجائے کمزوریوں کے آثار ٹٹول لیتا ہے۔

اب جہاں تک "بدعت" یعنی فکرِ اسلامی میں کسی نئی راہ کے نکالنے کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ کام بہت مشکل ہے ؛ البتہ یہ آسان ہے کہ ان چیزوں کو جنہیں فراموش یا نظر انداز کیا جا چکا ہے ، دوبارہ متعارف کرانے کی سعی کی جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس خیال کو ہم مذہب میں ایک نیا نظریہ سمجھتے ہیں ، کچھ عرصے بعد یہ پتا چلتا ہے کہ اسے تو فلاں فلاں مسلم فلسفی ایک ہزار سال پہلے قائم کر چکا ہے۔

مغربی مسلمان کی صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی Orthodoxy پر اس کے ضرورت سے زیادہ تنگ نظر ہم مذہب ساتھی نکتہ چینی کرتے ہیں تو دوسری طرف اسے اُن غیر مسلموں کا ہدفِ تنقید بننا پڑتا ہے جن کے رابطے اسلامی دنیا سے ہیں۔ وہ شور مچا دیتے ہیں کہ وہ حقائق کے خلاف اسلام کا تصور خیال انگیز انداز میں پیش کر رہا ہے۔ یہ حقائق عمل و چلن سے متعلق ہوتے ہیں ، اُصولوں سے متعلق نہیں ہوتے اور اس پر یہ ذمے داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ تاریخ کے کسی خاص دَور کے مسلمانوں کے روش و اعمال کی مدافعت کرے۔

جہاں تک عام انسانوں کا تعلق ہے تو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ صالح مرد و زن کی تعداد دنیا میں بہت زیادہ نہیں۔ پھر یہ بات بھی محلِ نظر ہونی چاہیے کہ بدی ہمیشہ مذہب کے لبادے میں مستور ہو کر نیکی کا منہ چڑانے آموجود ہوتی ہے۔ فی زمانہ سیاسی نظریے ، بدطینتی اور حماقت جاذبِ نظر لباسوں میں ملبوس بڑے اعتماد سے سڑکوں، گلیوں پر خراماں نظر آتے ہیں۔

یہ بیوقوفانہ سی بات ہوگی کہ اُمتِ مسلمہ میں گروہی مفادات اور فرقہ بندیوں پر پردے ڈال کر ان کی مدافعت میں بحث و تمحیص کی جائے اور مسلم ملکوں کے

Marfat.com

درمیان خونریز جنگوں، مسلم رہنماؤں کی منافقت امیروں کی بدعنوانیوں اور پُرجوش لوگوں کی جنوں خیزیوں سے صَرفِ نظر کیا جائے ان لوگوں نے یہ تک تو بھلا دیا ہے کہ رحم و عطوفت کا بنیادی قانون کیا ہے اور عقل و ذہن کے استعمال کو کیوں واجب کیا گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم ایک پُرفتن دَور میں سانسیں لے رہے ہیں۔ فتنے کے معنی عام طور پر شہروں میں افراتفری اور انتشار، کے لیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے خمیر پھُوٹنے کی اصطلاح بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ خمیر کا خاصہ یہ ہے تلچھٹ نیچے سے اُٹھ کر اوپر کی سطح پر آن براجتا ہے۔ اس حقیقت کے ساتھ یہ بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ اُمّتِ مُسلمہ میں قومیت کے اعتبار سے ریاستوں کی تقسیم کے باوجود مسلمان ابھی تک کسی آدمی کا تشخص قومیت یا نسل کی نوعیت سے کرنے کے بجائے اس مذہب کے حوالے سے کرتے ہیں جس میں وہ پیدا ہُوا۔ یہ اس لیے کہ ان کے لیے یہ باور کرنا محال ہوتا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو سرے سے کسی خدا کے وجود کو مانتے ہی نہیں۔ بنا بریں عادتاً وہ ہر یورپی اور امریکی کو عیسائی سمجھتے ہیں اور اکثر عیسائیوں کی برائی ظاہر کرنے کے لیے ہٹلر کی مثال دیتے ہیں —— عین اسی اندازِ نظر کے تحت جو بھی شخص اسلامی دنیا میں پیدا ہوتا ہے، اُسے مسلمان قرار دیا جاتا ہے۔ مغربی دنیا کے لوگ اسی حوالے سے ہر چھوٹے موٹے، گھناؤنے، ظالم اور سفّاک شخص کو جو اسلام سے اتنا ہی دُور ہوتا ہے جیسے ہٹلر عیسائیت سے تھا مسلمان سمجھ لیتے ہیں اور مذہب کا معیار اسی قسم کے لوگوں کے اعمالِ فاسد سے قائم کرنے لگتے ہیں۔

بہر حال سطح کے نیچے ایسے ہزاروں مرد و زن موجود ہیں جو مثالی مسلمان کہے جا سکتے ہیں۔ وہ اسلام کو آج بھی اسی طرح سینے سے لگائے ہُوئے ہیں جیسے قرونِ اولیٰ کے لوگ لگائے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں ایسے اہلِ صفا بھی ہیں جن کی محبتِ الٰہی بڑے بڑے گنہگاروں کے اعمال کو موم کی طرح پگھلا کر مصفّیٰ کر دیتی

Marfat.com

ہے۔ اسلام ہمیشہ مسلمان لیڈروں اور قائدین کے قلوب و اعمال میں نہیں ملتا اور نہ ہی لازمی طور پر سرکاری قسم کے مبلغین کے سینوں میں جاگزین ہوتا ہے بلکہ اسلام انہیں ملتا ہے جو اس کی جستجو کرتے ہیں۔ اسلام اپنا اظہار مختلف صورتوں میں کرتا ہے۔ کسی سنجیدہ اسلامی مطالعے کی رُوح وحدت فی الکثرت میں پرتو فگن ہوتی ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک عرب تھے۔ قرآن کریم عربی زبان کا ایک صحیفہ ہے۔ یہ ایک ایسی پاک زبان ہے جس کے اپنے ڈھانچے میں حقیقتِ مجردہ جلوہ پیرا ہے۔ اس نوعیت سے دیکھیے تو ہر مسلمان کسی نہ کسی اعتبار سے "مستعرب" ہوتا ہے اگرچہ اس عمل نے اسلامی تہذیب کے مختلف اور متنوع رنگوں میں ایک انفرادیت و یک رنگی پیدا کر دی ہے، تاہم اس سے ایک تونگر اور زرخیز کلچر کی وہ نیرنگیاں ختم نہیں ہو گئیں جو مختلف نسلی اور تاریخی تنوعات نے پیدا کی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ مذہب کے قوانین اور اصول سادہ ہیں لیکن انہیں بروئے کار لانے کی جہتوں اور نوعیتوں کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

آنے والے ابواب میں انشاء اللہ یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ مسلمان ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اس امر کا مطالعہ کیا جائے گا کہ وحی الٰہی، جو کہ ایمان کی روح ہے، کی روشنی میں عقاید، تاریخ اور معاشرتی زندگی کی کیا معنویت بنتی ہے۔ اسلامی تہذیب بہر حال انسانوں ہی نے تشکیل دی ہے۔ اس کے حسن و قبح، جیسے کچھ بھی ہوں، کا لب لباب یہ ہے کہ یہ اُسی سرچشمے سے نکلی ہے اور اپنی بھرپور کیفیات میں یہ الٰہی رفعتوں کی حامل ہے جس کا احاطہ کرنا از بس مشکل ہے —— اپنے ہر بیان اور توضیح کے سلسلے میں، مَیں بخوشی ایک ہی فارمولا (کُلیہ) پیش کروں گا جو اسلامی حوالے سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہ ہے "واللہ اعلم" یعنی یہ کہ اللہ بہتر جانتا ہے اور یقیناً اسی کی ذات سب سے بہتر جانتی ہے۔ اس لیے تمام لکھنے والوں کو اپنی حدود، اپنا ذہنی پس منظر اور اللہ کے آگے اپنی لاعلمی کو اسی انداز میں پیشِ نظر رکھنا چاہیے جیسے زندوں کو موت۔

واللہ اعلم

Marfat.com

Marfat.com

باب اوّل

اسلام اور یورپ

ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں شہنشاہیت عروج پر تھی جس کی بنا پر وہاں کے لوگ دُوسری تہذیبوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شہنشاہیت کے زوال کے بعد، حالیہ زمانے میں اسلام سے دلچسپی کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ اس رجحان میں تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ریاستوں کی مساعی کو بھی دخل ہے جنہوں نے ڈھائی سَو ۲۵۰ برس کے عرصے میں پہلی بار عالم اسلام سے عملی شناسائی بہم پہنچانے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب دُنیائے اسلام کے متعلق یورپ میں معلومات اور مواد کی کمی نہیں۔ کُتب خانوں کی الماریاں اسلامی کتابوں سے اَٹی پڑی ہیں۔

رہا یہ امر کہ معلومات کے اِس طُومار نے اسلام کو سمجھنے اور اُس کے ساتھ سازگاری کی کوئی کلید فراہم کی ہے یا نہیں کہ جس کے بغیر افہام و تفہیم بےمعنی ہے، بالکل الگ سوال ہے۔ ہم میں سے جو لوگ اسلام اور یورپ کے درمیان افہام و تفہیم کی کھائی پاٹنے کے لیے پُل تعمیر کرنے کی ضرورت

Marfat.com

محسوس کرتے ہیں، وہ تو اس مواد اور مساعی سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اگر حقیقت کو قبول کرنے کا اشارہ کمزور اور مسخ شدہ ہو تو وہ حقیقت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر یہ اشارے اپنی حقیقت میں کتنے ہی مبہم اور کمزور کیوں نہ ہوں، ضروری ہے کہ ابلاغ کے لیے درست الفاظ اور مؤثر ترین ذرائع بار بار بروئے کار لائے جائیں۔

اسلام اور مابعد کی مسیحی ثقافت کی طرح اسلام اور عیسائیت کے مابین ابلاغ کے راستے میں بعض گوناگوں مشکلات حائل رہی ہیں۔ اہلِ مغرب نے اسلام کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے (اور جسے ہم آج مستشرقین کی تصانیف سے موسوم کریں گے) اُس کے پسِ پشت بالعموم ازمنۂ وسطیٰ کی تند و تلخ مناظرہ بازی کارفرما نظر آتی ہے۔ عیسائیت کا سلطنتِ روم پر قابض ہونے سے لیکر ساتویں صدی عیسوی تک یہ سوچنا ایک حد تک درست تھا کہ اس کے پیغام کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوگی اور کوئی طاقت اُسے پھیلنے سے روک نہیں سکے گی، مگر ساتویں صدی ہی میں اسلام نے عیسائیت کے آگے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔ تب تقویٰ ہی عیسائیوں کو ان شدید صدمات برداشت کرنے کی طاقت عطا کر سکتا اور اس خیال سے بچا سکتا تھا کہ نیا مذہب (اسلام) نازل کر کے خدا خود (نعوذ باللہ) کسی سنگین غلطی کا مرتکب ہوا ہے۔ مسیحی دور کا مصر، فلسطین اور مشرقِ قریب کے دوسرے علاقے ایک عفریت کی زد میں آ گئے تھے جو بغیر کسی اطلاع کے صحرائے عرب سے نمودار ہوا تھا اور جس نے دُنیا کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں، اور ظلمت کے سائے براہِ راست مسیحی دُنیا کے قلب یعنی ارضِ مقدس پر محیط ہو چکے تھے۔

اُدھر تصویر کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ اسلام کے ہتھیار مؤثر اور مضبوط تھے جبکہ عیسائیت کے کمزور اور زنگ خوردہ، اس لیے اُس نے الفاظ ہی کے تیر و تبر تراش کر اسلام سے مقابلے کی ٹھانی۔ پہلے اس نے دینِ اسلام کو بدعت گردانا، پھر اسے باطل اور شیطانی قرار دے کر زبان کے اسلحہ خانے کا پورا ذخیرۂ تیغ و تفنگ اس کے

Marfat.com

خلاف پروپیگنڈے بازی میں اسی طرح جھونک دیا کہ نازی جرمنی کے سابق رئیس انتشارات آنجہانی ڈاکٹر گوبلز کی آنکھیں بھی شاید ندامت سے جھک جائیں۔ عیسائی مصنّفین و مبلّغین کی طرف سے اسلام کے خلاف انتہائی مکروہ انداز کی ہرزہ سرائی کی گئی جس کی صدائے بازگشت بعض مواقع پر آج بھی سنائی دے جاتی ہے۔ اس ذہنیت کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ پوپائے روم انوسینٹ سوم نے، حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشخص عیسائیت کے دشمن کی حیثیت سے کیا اور اپنے پیروؤں کے سامنے آپ کی یہی شبیہہ پیش کی۔ اس کے تقریباً سات سو سال بعد مہم جو ڈفٹی، (Doughty) نے پیغمبر اسلام علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو (نعوذ باللہ) ایک جعلساز عرب قرار دیا۔ ۱۹۳۶ء میں طبع ہونے والی اے۔ ایل فشر کی کتاب "اے ہسٹری آف یورپ" (تاریخ یورپ) میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں یہ گستاخانہ کلمات استعمال کیے گئے کہ "وہ ایک مکار، پُرہوس اور عقل سے عاری شخص تھے" (نعوذ باللہ)۔ اسی کتاب میں قرآنِ مُبین کے ارشادات کو ہذیان سے موسوم کیا گیا تھا (نعوذ باللہ)۔ یاد رہے یہ کتاب ۱۹۳۶ء کے بعد کتنے ہی سالوں تک مدارس اور تعلیمی اداروں میں ایک انتہائی معیاری کتاب تصوّر کی جاتی رہی۔

بہرکیف، عصرِ حاضر کا مسلمان اُن کتابوں سے جن میں مغربی مصنّفین نے واضح اور کھلے انداز میں اسلام کے خلاف تعصبات کا اظہار کیا ہے کہیں زیادہ ایسی کُتب سے مضطرب اور بے چین ہو اُٹھتا ہے جن میں بظاہر اسلام کے ساتھ ہمدردانہ رویّہ اختیار کیا جاتا ہے، کیونکہ عام طور پر ایسی ہی کتابوں میں پسِ پردہ وُہ عناصر ہوتے ہیں جو اُس کے ایمان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً بعض مصنّفین نے ڈھکے چھُپے لفظوں میں یہ قیاس آرائی کی ہے کہ (نعوذ باللہ) قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف تھی۔ اب اگر فرض کر لیا جائے کہ قرآن مجید کا کوئی شخص مصنّف تھا، پھر اِس انسان کی خواہ کتنی بھی تعریف کی جائے، اس کے یہی معنی نکلیں گے کہ اسلام کی مکمل نفی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ اس قبیل کے بیشتر مغربی مصنّفین، پیغمبرِ اسلامؐ

Marfat.com

کی عظمت ایک ہوشیار سکول ماسٹر کی طرح بیان کرتے ہیں۔ وُہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں کئی دلکش اور قابلِ ستائش پہلو ظاہر کرتے ہیں، خصوصاً دشمنوں کے ساتھ آپ کا کریمانہ برتاؤ جس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے انہیں انتہائی مخلص، باعظمت اور شجیع قرار دیتے ہیں! تاہم اُن کی تحریروں کا لب ولہجہ کچھ اس انداز کی ترحم آمیزی لیے ہوتا ہے، جیسا آج کل یورپین لوگ تیسری دُنیا کے پس ماندہ یا ترقی پذیر لوگوں کا ذکر کرتے ہُوئے اختیار کرتے ہیں۔

مُستشرقین کی ایسی کتابوں میں ایک خاص قسم کا ابہام پایا جاتا ہے جنہیں پڑھنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابھی وُہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ دراصل اسلام خُدا کا نازل کردہ مذہب ہے بھی یا نہیں۔ اور یہ روش بیشتر مغربی مصنّفین کے ہاں پائی جاتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ برطانوی ماہرِ اسلامیات، ڈبلیو منٹگمری واٹ (W. Mont-gomery Watt) بھی اس امر میں تذبذب کا شکار ہیں۔ چنانچہ وُہ اپنی کتاب "محمدؐ۔ پیغمبر اور سیاست داں" Mohammad - Prophet and Statesman میں کہتے ہیں:

"اُن کے (حضورِ اکرمؐ کے) تشہیر کردہ تمام خیالات اور نظریات دُرست اور معقول نہیں تھے مگر اللہ کے جود و کرم سے وُہ انسانوں کو پہلے کے مقابلے میں ایک بہتر مذہب مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

مصنّف چونکہ خود عیسائی ہے اور عیسائیت کا ظہور اسلام سے پہلے ہو چکا تھا، اس لیے بعض لوگ یہ قیاس کرتے ہیں کہ مصنّف کا قلم کچھ بہک گیا ہے، پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ کا جود و کرم حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو جزوی طور پر بہتر بنانے پر کیوں مائل ہوا۔ دُوسرا سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ آخر وُہ کون سی کسوٹی ہے جس پر جانچنے کے بعد یہ حقیقت معلوم کی گئی کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ خیالات تو سچائی پر مبنی تھے جبکہ آپؐ کے بعض نظریات (نعوذ باللہ) نادُرست تھے۔ اب ذرا اُن کے اس بیان کو عیسائیت پر منطبق کر کے دیکھئے اور مشاہدہ کیجیے کہ ایک عیسائیت کے پیرو پر اس بات کا کیا ردِّ عمل ہو گا، اگر اُس سے یہ کہا جائے کہ حضرت

۱۲۳۳۸۹۲

Marfat.com

عیسیٰ کے تمام خیالات اور نظریات تو دُرست نہ تھے، تاہم چونکہ عیسائی مذہب یونانی اور رُومی مذاہب سے قدیم ہے، اِس لیے وُہ اِن سے بہتر ہے۔

جہاں تک عیسائی مصنّفین کا تعلّق ہے تو اُن کی بعض بندشیں اور حدود، مناسب اور قابلِ قبول تصوّر کی جاسکتی ہیں، مثلاً اُن سے یہ توقّع، نہیں کی جاسکتی کہ وُہ اپنے مذہب کے اصولوں سے صداقت نہ برتیں، لیکن یہ حقیقت کہ وُہ خود ایک علیحدہ مذہب کے پیرو ہیں، اِس بات کی ضرور متقاضی ہے کہ اِن میں اس حد تک فہم تو ہو جس سے کچھ دروازے کھُل سکیں، کیوں کہ بعض اوقات یہی وصف مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ اس گروہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ کسی دُوسرے مذہب کے متعلق احترام کے دائرے میں بات چیت کرنا اُس مذہب کے ماننے والوں ہی کے لیے شائستگی نہیں قرار پاتا، بلکہ یہ خدا کے ساتھ بھی شائستگی اور تہذیب برتنے کے مترادف ہے۔

اس بات کی صراحت مشہور کیتھولک ماہرِ اسلامیات ایمیل ڈرمنگھم (Emile Drimlnghem) نے بڑی خوبی سے اپنی کتاب "حیاتِ محمدؐ" Life of Mohammad[1] میں کی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان حائل رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے وُہ کہتے ہیں:

"سچّی اضافیت کا تصوّر، حقیقتِ مطلق کو فنا نہیں کرتا" اسی نکتے کی مزید صراحت کرتے ہوئے وُہ لکھتے ہیں کہ "وحیٔ الہٰی، انسان کی زبان پر جاری ہوتی ہے اور اس میں وقت اور مقام کا لحاظ ہوتا ہے۔ ہمیں جو تضاد نظر آتا ہے وُہ وقت کے منشور میں نورِ ازل کے انعطاف کے سوا اور کچھ نہیں۔"

ڈرمنگھم بھی اپنی محبتِ اسلام کے باوصف جس کی خاطر اُنہوں نے الجزائر میں اپنی زندگی ختم کر دی تھی، بعض مقامات پر اپنی عیسائیت سے تجاوز نہیں کرسکے۔

1. London: Routledge, 1930.

Marfat.com

بیشتر مسلمان ایک متعلقہ مگر حریف مذہب سے فطری شکوک کے باعث اسلام کے بارے میں عیسائی کی تحریر پر اعتماد نہیں کرتے اور ان کے مقابلے میں لا ادریوں کی تصانیف کو ترجیح دیتے ہیں؛ حالانکہ اُن کی یہ روش درست نہیں۔ ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کے ساتھ ہمکلام ہو سکتا ہے؛ چاہے یہ ہمکلامی اختلافی مسئلے کے پس منظر میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس ایک لادین گونگا ہوتا ہے اور پھر جہاں تک معروضیت کا تعلق ہے تو اس نام کی کوئی چیز اُن کے ہاں پائی نہیں جاتی۔

دُوسرے گروہ کے نقطۂ نظر سے جب کوئی بھی آزاد خیال لا ادری اہلِ مغرب کا (جو کہ پیداوار ہے ایک مخصوص تہذیب اور دورِ تاریخ کا) بغور مشاہدہ کرتا ہے تو اُس پر بلاخطا یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس نظریے کا حامل شخص ایک بے دین عیسائی ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہو سکتا ہے ایمان کے لحاظ سے وُہ اپنے دین کے بہت قریب ہو مگر جب وُہ عیسائیت کے خلاف کچھ بولتا ہے تو یہ اختلاف گویا اُن اصولوں کے نام پر ہوتا ہے جو اس نے لاشعوری طور پر عیسائی مذہب سے اخذ کر رکھے ہیں بعینہٖ اُن ایشیائی اور افریقی لوگوں کی طرح جو اپنے استعماری آقاؤں سے اخذ کیے ہوئے اُصولوں کے سہارے استعمار کے خلاف صف آراء ہیں اور آئے دن اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ پس کسی عیسائی مصنّف کے کھلے اور برملا تعصبات، کسی لا ادری کے درپردہ تعصبات سے کہیں بہتر ہیں۔ اصولی طور پر اسلام سے متعلق غیر مسلموں کی تصانیف کی محدود تعداد سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ان سے کسی مسلم کو دین حاصل کرنے کی جستجو ویسے بھی نہیں کرنا چاہیے بالکل اسی طرح جس طرح عیسائیت کے تفہیم کے لیے کوئی عیسائی کسی غیر مسیحی مصنّف کی تحریر کا سہارا نہیں لیتا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کیا مسلم مصنّفین اس ضرورت کو جو بلاشبہ شدّت سے موجود ہے، پورا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے؟

بہت سے مسلمان علما کم از کم اپنی نجی گفتگو میں اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ مغرب کی تہذیبی سرحد کے اُس پار مذہبِ اسلام کی افہام و تفہیم کی بڑی حد تک کمی رہی ہے۔

Marfat.com

وہاں ایسا مواد دستیاب نہیں جو آج کے تقاضے پورے کر سکے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کا مسلم مصنّف ایسے آلات کو استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے جو اس کے ہاتھوں میں اچھی طرح سماتے ہی نہیں۔ اِس کے ساتھ ہی ایک بڑی دقّت یہ بھی ہے کہ روایتی انداز کے مسلم علما جنہوں نے خود کو جدید تہذیب اور مغربی افکار سے بچا رکھا ہے، مغربی ذہن خاطر خواہ طور پر سمجھ نہیں پاتے۔ وُہ اِن کے لیے اسی طرح اجنبی ہے جیسے کہ ازمنہ وسطیٰ میں عیسائیوں کے لیے مسلمانوں کا طرزِ فکر! نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ کے باسیوں نے روایتی تہذیبوں کے پُشتے اور رکاوٹیں عبور کر لیں اور کرۂ ارض میں خوب جہاں گردی کی جس کے باعث وُہ ایسے پُر تکلف بن گئے کہ مقابلتاً دُوسری تہذیبیں اُنھیں بے حقیقت نظر آنے لگیں۔ ایک زمانے میں صورتِ حال اِس کے برعکس تھی۔ تب یونانیوں کے معصوم اور بے داغ شباب کے مقابلے میں افلاطون اہلِ مشرق کو "بزرگ" سمجھتا تھا۔ اب اہلِ یورپ "بزرگ" تسلیم کیے جاتے ہیں کہ انہوں نے بہت زیادہ سیرِ ارض کی ہے، بہت کچھ دیکھا ہے جس کی تکلیف دہ یادیں اُن کے ذہنوں پر بارِ گراں بنی ہوئی ہیں۔

روایتی مسلمان لکھتا تو بڑے تیقّن اور استناد کے ساتھ ہے مگر اس بے چارے کو مغربی اذہان میں اُبھرنے والے سوالوں کا کوئی ادراک نہیں ہوتا۔ یہ سوالات اسے غیر ضروری اور گستاخانہ معلوم ہوتے ہیں اور دل میں وُہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کا کام بیکار اور لایعنی ہے۔ قرآن کی صداقت جو اُس کے لیے اس قدر پُر اثر اور بدیہی ہوتی ہے، اگر اپنے طور پر ایک غیر مسلم کو قائل نہ کر سکے، تو اُس (روایتی مسلمان) کی درماندہ مساعی بھی کارگر نہیں ہوتیں۔

اب رہ گئے وُہ مسلم مصنفین جنہیں جدید مغربی تعلیم سے بہرہ یابی نصیب ہے اور جن کی تصنیف کردہ کتابیں مغرب میں گردش کرتی رہی ہیں، اپنی حیثیت میں بے حد کم فہم ہیں مگر خود کو مذہبی اجارہ داروں کی صف میں پیش پیش رکھتے ہیں۔ اس قبیل کے مصنفوں کی تصانیف جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں کافی

Marfat.com

گھومتی پھرتی رہیں، اب درد سر بن کر رہ گئی ہیں۔ ان حضرات کی زبردست کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ ثابت کریں کہ اسلام عصر حاضر کی جدید یورپی تہذیب سے ہم آہنگی کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ حضرات بڑے بڑے کتب خانے محض اس لیے کھنگالتے رہے ہیں کہ مغربی فلسفیوں (جیسے ایچ۔ جی ویلز وغیرہ) کی تحریروں سے اسلام کی مطابقت میں کچھ کلماتِ خیر بٹور سکیں۔ اپنی اس کدوکاوش میں انجام کار وُہ کچھ ایسے صحافیوں کی تحریریں اپنی زنبیل علم میں ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جنہوں نے پیغمبرِ اسلام یا مسلمانوں کے متعلق چلتے چلاتے انداز میں کچھ آراء کا اظہار کیا ہے۔

اُنہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ جس تہذیب پر والہانہ نثار ہو رہے ہیں وُہ اسلامی اصولوں اور عقائد کے حوالے سے شدید تنقید کا ہدف بنائی جا سکتی ہے۔

حالیہ چند برسوں میں صُورتِ حال خاصی بدل گئی ہے۔ اگرچہ مذہب کے یہ ٹھیکیدار ہنوز ہمارے ساتھ ہیں جو جدیدیت پسندی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ ہمعصر مسلم مصنّفین پر اب یہ الزام عائد نہیں ہو سکتا کہ وہ اسلام پر فخر محسوس نہیں کرتے۔ اب تو صورتِ حال یہ آ بنی ہے کہ بعض اوقات یہ افتخار نہایت پُرجوش انداز اختیار کر لیتا ہے اور اب کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ مغرب کے گھُن خوردہ معاشرے پر تنقید سے روگردانی کرتے ہیں، تاہم اُن کی تنقید دُرست اور معیاری نہیں ہوتی۔ وہ اسباب و علل کے بجائے مغربی تہذیب کے امراض کی ظاہری علامتوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ابھی تک وُہ مغربی تہذیب کی دریوزہ گری سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے اور اسلام میں "النفصہ" ایک نئے دور یا نشاۃ ثانیہ کی تمنائیں دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ اس نشاۃ ثانیہ کو وہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے مماثل سمجھتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی نشاۃ الثانیہ مذہبی نقطۂ نظر سے الحاد اور بے دینی کا احیاء تھا جسے عیسائیت نے قبل ازیں اکھاڑ پھینکا۔ اور یہی الحاد بیخ و بنیاد تھا یورپی تہذیب کی تباہی اور گراوٹ کا جسے آج مسلمان یورپی فکر، فلسفے اور زندگی میں شناخت کرنے لگے ہیں۔ عیسائیت کے خلاف معاندانہ جذبے نے انہیں اس حقیقت سے اندھا کر دیا ہے کہ جن طاقتوں اور نظریات نے ایک مذہب کو تباہ کیا تھا وُہ دوسرے کو بھی تباہ کر سکتی ہیں۔ اگر بعض مسلمان اس

Marfat.com

پہلوؤں پر نظر بھی ڈالتے ہیں تو انھیں یقین ہوتا ہے کہ اسلام کی فطری توانائی اور اجنبی عناصر کو اسلامیانے کی صلاحیت اسے تخریبی عوامل سے محفوظ رکھے گی۔ بہرحال یہ بات بھی ایک خطرناک جوئے سے کسی طرح کم نہیں۔

جو لوگ مسلمانوں سے قریبی رابطہ رکھتے ہیں ان کے کان طوطے کی سی اس رٹ سے اکتا گئے ہیں: "ہم مغربی معاشرے کی اچھی باتیں اپنائیں گے اور بُری رد کر دیں گے" یہ بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ کوئی مسلمان اسے ممکن تصوّر کرے۔ اسلام اپنی ذات میں ایک نامیاتی کُل ہے جس میں ایک جزو دوسرے سے منسلک اور مربوط ہے اور کسی ایک جزو کو کُل سے علیحدہ رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ کم از کم مسلمانوں کو تو حقیقتاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہر تہذیب اس وحدت کا کوئی نہ کوئی رنگ ضرور رکھتی ہے۔ اُنہیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ مغرب کی جدید تہذیب جو بہروپ کی طرح ہر لمحہ لگاتار نمونے بدل رہی ہے، اسباب و علل کے پس منظر میں بہرحال ایک مربوط حیثیت کی حامل ہے۔ اگر اس میں سے ایک ریشہ بھی کھینچ کر نکال لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ یہ اپنی ساخت میں ایک سے اندیکھے دھاگوں سے جُڑی ہوئی ہے۔ اگر اس میں سے نامکمل "بہتری" بھی لے لی جائے تو وہ اپنے ساتھ اس کے بنیادی ڈھانچے کا کوئی نہ کوئی جزو ضرور ساتھ لائے گی۔ جس طرح دھوپ کے ساتھ پرچھائیاں بھی ہوتی ہیں، اسی طرح ہر بہتری میں ایک خرابی کی صورت بھی مضمر ہوتی ہے جو اس کے ساتھ علّت یا معلول کی حیثیت سے منسلک ہوتی ہے۔ سیّد حُسین نصر جو روایتی اسلام اور مغرب میں بروئے عمل تخریبی قوّتوں کو سمجھنے اور پرکھنے میں دوسرے مُسلم مصنفین کے درمیان ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، اس مسئلے پر یُوں رقم طراز ہیں:

"بہت سے مسلمان مصنفین ایسے الفاظ اور اظہارِ بیان اختیار کرتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے تہذیبی اعتبار سے اُنہیں زبردست دھچکا لگا ہے اور وہ مغرب کے سامنے زبردست احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ ان کی تحریریں مغربی تہذیب اور نام نہاد معیار کی غلامی کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے مغربی نظریات اسلام

Marfat.com

کے لبادے میں چھپا کر پیش کرتے ہیں جب کہ انھیں اسلام سے ایک جذباتی لگاؤ کے سوا اور کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسے اسلام کے ترجمان بننے کی کوشش کرتے ہیں جو کسی طرح بھی اسلام کے ذہنی اور روحانی اصل سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔[1]

یہ خیال سب سے پہلے معاندانہ ذہن رکھنے والے کچھ مستشرقین ہی نے سجھایا تھا کہ جب سے اسلامی تہذیب نے سائنسداں (جس معنی میں آج یہ اصطلاح مروّج ہے) پیدا کرنا بند کر دیے ہیں، یہ بہت فرسودہ، جمودی اور زوال پذیر ہو گئی ہے اور جمود کا یہ دور، عیسوی تقویم کے مطابق تیرھویں صدی عیسوی کا تھا۔ اِس نظریے پر جدید اور قدیم دونوں مکتبہ ہائے خیال کا اتفاق ہے۔ اس کے بعد سے ہی "نشاۃِ ثانیہ" کے لیے ایک تڑپ موجزن ہو گئی۔ اب یہ ایک المیہ ہے کہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ زوال پذیری (اگر اس لفظ کا اطلاق درست ہے تو) اصل اصولوں سے انحراف کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ زوال پذیری علامت ہے، تھکاوٹ، اور سہل انگاری کی جب کہ اُصولوں سے انحراف ایک تکلیف دہ عمل اور ایسی حرکت ہے جس کا ہدف کبھی صحیح نہیں ہوتا۔ اور کسی جنونی یا عفریت کی نسبت ایک سوتا ہُوا دیو بہر حال بہتر ہے۔

جہاں تک اُس دَور کے مسلمانوں کے اپنے ہزار سالہ تاریخی و ثقافتی ارتقاء سے بے اعتنائی برتنے کے رجحان کا تعلق ہے، اُس کی جڑیں اٹھارویں صدی میں ملتی ہیں جب مغرب، اسلام پر اثر انداز نہیں ہُوا تھا۔ اس وقت تک بارہ جیّد مصلحین، حرمین شریفین میں دین کی تدریس و تبلیغ کرتے رہے تھے۔ ان لوگوں کا موقف یہ تھا کہ دین کو ایسے تمام عناصر سے پاک کر دینا چاہیئے جن کا جواز براہ راست قرآن و سنّت سے فراہم نہ ہو سکتا ہو۔ اُنھوں نے اندھی تقلید کی بھی مذمّت کی۔ یہ عمل تقریباً ایسا ہی تھا جیسے ساڑھے تین سو سال قبل عیسوی دُنیا میں پروٹسٹنٹوں نے اصل الہامی صحیفوں کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی تھی۔

مسلمان علما کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وُہ بیرو مباحث کو بڑی اہمیّت

1- Islam and the plight of Modern Man, P.122

Marfat.com

دیتے۔ یہ لوگ عالمِ اسلام اور گردوپیش کی دُنیا میں دُور دُور تک سفر کرتے رہتے۔ اِن بارہ فاضلین میں صرف پانچ عرب تھے، باقی حضرات ہندوستانی، مراکشی اور کُرد نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق دُنیا کے ہر گوشے سے عُلما زیارات اور حجِّ بیت اللہ کے لیے مکّے اور مدینے جاتے رہتے۔ یہاں وہ ایک یا دو سال قیام کرکے علمائے عصر سے علمی استفادہ کرتے اور پھر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ اس طرح علمائے عصر کے خیالات ایک مرکز سے دُوسرے میں سُرعت سے منتقل ہوتے رہے۔

اٹھارہویں صدی کے اہم ترین مُصلح شیخ محمّد بن عبدالوہاب نجدیؒ تھے۔ (پیدائش ۱۷۰۳ء، وفات ۱۷۹۲ء) شیخ موصوف نے حرمین شریفین میں علمِ دین حاصل کیا۔ انہوں نے جزیرۃ العرب میں اپنے گاؤں لوٹنے سے قبل بڑی طویل سیاحت کی۔ اپنے وطن نجد میں انہوں نے ایک قبائلی سردار السعود سے بڑے گہرے روابط استوار کرلیے جو تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہوئے۔ اس سردار ہی کے خلاف آج سعودی عرب کے حکمران ہیں۔

محمّد بن عبدالوہاب نے اپنے طویل سفر کے دوران میں اسلامی دُنیا کی زبوں حالی دیکھی۔ جب اسلامی اصولوں اور مسلمانوں کے اعمال میں انہیں زمین و آسمان کا بُعد نظر آیا تو انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوائے چند مسلمانوں کے باقی تمام مسلمانوں کو اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ انہوں نے بڑے جوش و خروش سے مسلمانوں کو ایک ناقابلِ مفاہمت نظریہ، تنزیہہ خالص کی تبلیغ کی اور اس بات پر زور دیا کہ وحیٔ الٰہی یعنی قرآنِ حکیم کی اطاعت بلاحیل و حجّت ہونی چاہیئے۔ اُن کے مسلک میں سرّیت و تصوّف کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ قرآنِ کریم کی مجازی و تمثیلی تعبیر کے قائل نہ تھے۔ یہ خالص توحید کا پرچار تھا اور اس کے علاوہ باقی تمام رسوم قابلِ مذمّت اور غیر اسلامی تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ اس سادگی کے رویّے میں انحطاط پیدا ہوا اور پھر یہ ایک عامیانہ رویّہ بن گیا جس میں ہر چیز کو بدعت گردان کر ممنوع قرار دے دیا گیا۔

Marfat.com

اس روش کو تیز تر کرنے میں مغرب کے غلبے اور بالادستی کا بھی ہاتھ تھا۔ اس مسلک کے پیروؤں کا کہنا تھا کہ اسلام ایک انتہائی سیدھا سادا مذہب ہے۔ اسے سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ اس کے لیے کسی تشریح اور تفسیر کی ضرورت نہیں۔ اللہ مالک الملک ہے۔ انسان اس کا غلام ہے۔ آقا و مولا حکم دیتا ہے۔ غلام کا کام اسے بجالانا ہے۔ عدم بجا آوری کی صورت میں اُس کے لیے سزا ہے۔ یہ سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہتا اور عیسائی کبھی غلبہ حاصل نہ کر پاتے، اگر اس سیدھے اور سچے دین میں صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی قیاس آرائی، صوفیانہ عدم اعتدال اور فلسفیانہ موشگافی جیسی نت نئی پیچیدگیاں پیدا نہ کر دی جاتیں۔ اِن باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی میراث ان کے ہاتھوں سے نکل گئی اور مغرب کی زوال آمادہ تہذیب نے اپنا شکنجہ اُس اُمت پر کس دیا جسے "خیر الامم" کہا گیا تھا۔ اس اندوہناک صورتِ حال سے نکلنے کا ایک ہی راستہ قرار دیا گیا اور وُہ تھا قرآن و سنّت کی طرف واپسی۔ اُس وقت یہ نعرہ سُننے میں آیا کہ کتابیں پھینک دو۔ اُن کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس صحیفۂ الٰہی ہے اور یہ انسان کے لیے کافی ہے۔

یہ یقیناً صحیح ہے کہ اسلام کے بنیادی اُصول سادہ، واضح اور آسان ہیں، اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے آخری ہدایت یا پیغام کی حیثیت سے یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اِنسان اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے بغیر کسی وسیلے کے بے حجاب ہے۔ وہ خُدا کے سامنے پیش ہونے کو ٹال بھی نہیں سکتا۔ اِس کی ذاتی و نجی زندگی کیلئے نہایت واضح قوانین موجود ہیں اور کسی نافہمی کی کوئی گنجائش نہیں، اور جب سب کچھ بتا اور سُنا دیا گیا ہے تو پھر انسانی خطا و نسیاں کے لیے اللہ کی رحمت موجود ہے، وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ کرم اس کا مزاج ہے۔ بلاشبہ یہ ساری باتیں دُرست قرار پاتیں اگر انسانی طبائع اتنی پیچیدہ اور شگافیدہ نہ ہوتی اور انسانی ذہن کسی راہ کو اختیار کرنے میں اتنا تجسّس اور اس کی چھوڑ سے خود کو آگاہ اور مطمئن کرنے کا شائق نہ ہوتا۔ مسلم طرزِ فکر اور مذہبی قیاس آرائی میں فروغ کا عمل جو صدیوں میں طے ہوا ہے یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ یہ سب جس کی نشاندہی سطور بالا میں کی گئی ہے، کافی نہیں۔

Marfat.com

اہلِ یورپ جو سرزمین عرب میں رہے اور جنہوں نے وہاں کام کیا، اکثر اسلام کو ایک بوائے اسکاوٹ، مذہب قرار دیتے ہیں اور سچ بات تو یہ ہے کہ اسلام کے ترجمان اُسے یہی شکل دے کر پیش کرتے ہیں۔ وُہ ایک ایسی شبیہہ بناتے ہیں جس کا بغداد کی پُرشکوہ خلافت سے کوئی تعلق دکھائی دیتا ہے نہ اندلس کی اسلامی سلطنت سے۔ نہ ہی ساسانیوں کے ایران اور وسط ایشیا کے تیموریوں اور عثمانی ترکوں سے اور نہ ہی اُن بے شمار صوفیا فلسفیوں اور فن کاروں سے جن کی شان شوکت میں اسلامی تہذیب کی عظمت جھلکتی ہے۔ بوائے اسکاوٹ قسم کے تصوّرات و عقائد رُوح کو مضطرب کر دینے والے سوالات کا جواب بننے کے لیے کسی طور پر بھی کافی نہیں۔ ایسے عقائد رکھنے والے لوگ نہ اہلِ مغرب کو مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو۔ اب رہ گیا یہ کہ تعلیم یافتہ مسلمان بڑی تعداد میں مذہب سے برگشتہ کیوں نہ ہُوئے تو اُس کی دو وجوہ ہیں پہلی وجہ تو یہ کہ انہوں نے مذہب کی توضیح ایک سیاسی تصوّر کی حیثیت سے جاری رکھی اور دُوسری یہ کہ اُن کے سامنے دُوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایک یورپی یا امریکی جو عیسائیت سے بے اعتنائی برتنے کے بعد بھی خود کو ایک عظیم تہذیب کا وارث سمجھتا ہے اور ایسی کوئی وجہ نہیں کہ مذہب سے گہرا لگاؤ نہ رکھنے کے باوجود وُہ اپنا تشخص زائل کر دے۔ اس کے برعکس اسلام کا پیروٹے کار اپنے دین سے غفلت اور بے اعتنائی برتنے کے بعد ہر طرح کھوکھلا رہ جاتا ہے؛ حتّٰی کہ وُہ اپنی شناخت بھی بھول جاتا ہے۔ اسلامی ثقافت کم و بیش مذہب ہی کا ایک حصّہ ہے اور اس میں غیر مذہبی ثقافت کی سرے سے گنجائش نہیں۔ مزید برآں، اُمّتِ مسلمہ بنیادی طور پر آج بھی ایک مذہبی ملّت ہے جس میں ترکِ مذہب خود ملّت سے رشتہ منقطع کر لینے کے مترادف ہے

بہر حال یہ اُس زمانے کے مسلمانوں ہی کا تقاضا نہیں کہ مذہب کے بارے میں عمیق معلومات انہیں فراہم کی جائیں اور اس پر مابعد الطبیعیاتی پہلو سے غور کیا جائے۔ بہت سے عیسائی بھی ایسی ہی خواہشات رکھتے ہیں جس سے عیسائیت کچھ اور تہی کیسہ ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ نے بعض مرد و زن میں کچھ ایسی ذہانت ودیعت کی ہے کہ وُہ اپنے داخلی تجربہ

Marfat.com

کی تسکین کے لیے حقیقت مجرّدہ کے متعلق بڑے دُور رس سوالات پوچھتے ہیں۔ اِن کا یہ اشتیاقِ تفہیم ایک عطیۂ الٰہی ہے جو اگرچہ دیگر تمام عطیات کی طرح خالی از خطر نہیں، تاہم اِس تجسّس دَروں کے اپنے کچھ استحقاق ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ فوری نوعیت سے اُبھرنے والے قلبی و رُوحانی سوالات کے جوابات دیے جائیں۔ ایک طرح سے دیکھیے تو یہ سوالات اللہ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں تاکہ وُہ اپنے بندوں کی تفہیم کی خاطر ان کے جوابات دے اور ہماری معلومات میں اضافہ کرے۔ پھر ہمیں اِس بات کی یقین دہانی بھی کرائی گئی ہے کہ خُدا کسی جائز ضرورت کو اس وقت تک پیدا نہیں کرتا جب تک کہ وُہ اس کی تسکین کا سامان پہلے ہی پیدا نہ کر دے۔ پر تجسّس اذہان ہمیشہ اور ہر جگہ معدودے چند ہوتے ہیں، لیکن خاص طور پر یہی سوال کرنے والے ٹھوس اور مستحکم آرا کی تشکیل کرتے ہیں۔ آج اہلِ دانش جن اُمور میں متشکک ہیں کل عام آدمی بھی اُنہیں اشتباہ کی نظر سے دیکھیں گے۔

وُہ خیالات و نظریات جو بادیُ النّظر میں بے حد مبہم اور عام مرد و زن کے امورِ زندگی سے جُدا اور الگ تھلگ نظر آتے ہیں، دراصل سماج کے تانے بانے کے ذریعے معرضِ وجود میں آتے ہیں؛ اگرچہ اِس عمل میں اکثر وُہ مسخ بھی ہو جاتے ہیں۔ اب اگر جدید تہذیب کی فطرت و مزاج اور اس کے منابعِ اصلی پر نظر کیجیے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو نظریات فی زمانہ موجزن ہیں، وُہ اپنے اندر دین و ایمان کی تمازت گری کے جملہ سامان رکھتے ہیں، اِس لیے ایمان و ایقان کا تحفّظ دانش و ذہانت کے ہتھیاروں سے ہونا چاہیئے؛ یعنی اُن دلائل و براہین سے جو بیسویں صدی کے حالات و مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ایمان کی حمایت و اعانت کے لیے روائتی انداز کے دلائل اب ہرگز مؤثر نہیں، اس کے ساتھ ہی اب خدا پر ایمان اور موجودہ زندگی سے ماورئ وجود کے حالات کا ادراک بھی فطری اور قدرتی محسوس نہیں ہوتا۔ چونکہ قرآن میں اربابِ فکر اور غور و خوض کرنے والوں کو بار بار مخاطب کیا گیا ہے بلکہ صریح انداز میں کہا گیا ہے کہ انسانوں کو اپنی دماغی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنا چاہیئے، اس لیے مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وُہ اپنے

Marfat.com

دین کی ذہنی اور عقلی بنیادوں کو مزید گہرائی اور گیرائی فراہم کرنے کی سعی کریں اور عصر حاضر کے سوالوں کے جواب کے لیے فکر سے مبرّا اطاعت اور جذباتی خروش کا سہارا نہ لیں۔

سادہ یا پیش افتادہ رویّہ نہ صرف اُن تحریروں میں نظر آتا ہے جو اسلام کو بحیثیت ایک طرزِ زندگی پیش کرتی ہیں بلکہ قرآن کی جدید تشریحات میں بھی اسے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اس بات کا جائزہ لینے کے لیے ذرا ان مقبول عام جدید تفاسیرِ قرآن کا جو جذباتی رنگ میں یا عام انداز کی ہیں، ازمنہ وسطیٰ کی عظیم تفاسیر سے موازنہ کیجیے جو یا تو اُس دور کے معقولیوں نے یونانیوں سے اخذ کردہ فلسفے کی بنیاد پر لکھی ہیں یا پھر اُن صوفیوں نے جو معنی کی گہرائیوں میں متن کی سطح سے کوسوں نیچے اترتے چلے گئے ہیں تو اس سلسلے میں بعض ایسی تفاسیر بھی ملیں گی جس میں صرف و نحو کے ماہرین نے الفاظ و جملوں کے مفاہیم میں بڑی پیچیدہ موشگافیاں کی ہیں۔

بہتر تو یہ تھا کہ اس انداز کی تشریح کا ایک اقتباس براہِ راست پیش کر دیا جاتا مگر یہ اچھی بات نہیں کہ ان مخلص اور متقی لوگوں کی سعی کا مذاق اڑایا جائے جنھوں نے قرآن سے محض اپنی محبّت اور شیفتگی ظاہر کرنے کے لیے اس انداز کو اپنا شعار بنایا، البتّہ اس روش کی نشاندہی ظرافت کے پیرائے میں کی جا سکتی ہے تاکہ مفسّر کی ذات عیاں نہ ہو۔ ویسے حقیقت میں یہ پیرایہ اصل متن سے تھوڑا ہی مختلف ہو گا۔ اب ذرا سورۃ الشمس کی ابتدائی آیات ملاحظہ فرمائیے: وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝ "سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی، اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے، اور دن کی جب اسے چمکا دے، اور رات کی جب اُسے چھپا لے۔"

دورِ وسطیٰ کے مفسّرین نے ان سیدھی اور واضح آیات میں انتہائی گہرے رموز و علائم تلاش کیے ہیں اور قیاس کے سہارے ان علائم کی عجیب و غریب تشریحات کی ہیں۔ ان آیات کی جدید تفسیر کچھ اس انداز کی ہے:

"قسم پہلے سورج کے نکلنے کی کھائی گئی ہے اور یہ کتنی خوبصورت ہے طلوع ہونے کے وقت سورج انتہائی صاف اور شفّاف ہوتا ہے اور نہایت

Marfat.com

مُصفّا اور پاک روشنی سے چمکتا ہے۔ یہ ہماری طبعی زندگی کا سرچشمہ ہے اور خُدا ہمیں زندگی بخشنے میں کتنا مہربان ہے! پھر چاند ہے جو اپنی خوبصورت روشنی کے ساتھ انسانوں سے سرگوشیاں کرتا ہے اور ان کے دلوں میں شاعرانہ خیالات جگاتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ چاندنی میں بیٹھنا کتنا سرور آگیں ہوتا ہے! پھر دن کی قسم آتی ہے جس میں سورج بھرپور انداز میں چمکتا ہے اور دُنیا روشن ہو جاتی ہے۔ مگر سُورج بھی تمام وقت نہیں چمکتا۔ رات آتی ہے تو دن کے برعکس حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شے ہماری نگاہوں سے چُھپ جاتی ہے اور ہم اندھیرے میں گھر جاتے ہیں۔ کس بے مثال خوبصورتی سے قرآنِ کریم ان حالتوں کو بیان کرتا ہے اور کتنی خیال آگیں ہیں یہ آیات!" اور پھر اس انداز کی تفسیر الفاظ کے موتی پروتی آگے بڑھتی ہے اور صفحے کے صفحے بھر دیتی ہے۔ ایسی تفسیر میں نیّت کا خلوص تو ہوتا ہے مگر معنی میں گہرائی کم ہی ہوتی ہے۔"

محض اخلاص اور نیک نیّتی ہی مؤثر ابلاغ کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اُس زمانے کے بیشتر مُسلم مصنفین کے اپنے خیالات کا ایک اجنبی زبان میں اظہار کی ناکامی دراصل اسلام کے بارے میں اُن غیر معمولی حالات کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نوآبادیاتی دور کے بعد منظرِ عام پر آئے اور ایک ایسی دُنیا میں ظاہر ہوئے جو مغربی افکار سے متاثر تھی اور جہاں "دارالحرب" میں جنم لینے والے نظریات حاوی تھے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بیدار ہوئے تو انہوں نے خود کو ایک ایسے سیّارے میں پایا جس پر اُن کے دُشمنوں کا قبضہ تھا اور پھر وُہ مجبور ہوئے کہ اپنی بیداری کو قائم اور برقرار رکھنے کے لیے ہر شعبے میں اُن دُشمنوں کی نقالی کریں۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ اُس وقت صورتِ حال کس قدر غیر معمولی تھی، ضروری ہے کہ تاریخ کے پسِ منظر میں مغربی اور اسلامی تہذیبوں کے تصادم کا بھرپور مطالعہ کیا جائے۔

پیغمبرِ اسلام علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی وفات (جو عیسوی تقویم کے مطابق ۶۳۲ میں ہُوئی) کے بعد تقریباً ایک صدی کے اندر اندر مسلمانوں کی سلطنت چین کی

Marfat.com

سرحدوں سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک، فرانس کی سرحدوں سے لے کر ہندوستان کی بیرونی حُدود تک اور بحر کیسپین سے لے کر صحرا تک پھیل گئی تھی۔ یہ حیرت انگیز توسیع اِن لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آئی جنہیں جزیرہ نمائے عرب سے باہر کی عظیم دُنیا میں جاہل خانہ بدوش کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ انہی بادیہ نشینوں نے تقریباً پینتالیس لاکھ مربع میل کا علاقہ تسخیر کیا اور مشرقِ قریب، شمالی افریقہ اور اسپین میں عیسائیت کے مراکز کو سرنگوں کر لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ بازنطین کی رُومی سلطنت کو اپنے تحفظ اور بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے مملکتِ ایران کو اسلام کے ایک مضبوط قلعے میں متبدل کر دیا۔ انسانی تاریخ میں اس طرح کی فتح و نصرت کی دُوسری مثال موجود نہیں۔

سکندرِ اعظم نے اپنی عظیم فتوحات سے قدیم دُنیا کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں مگر اپنے پیچھے اس کے سوائے چند داستانوں اور کتبوں کے کچھ نہ چھوڑا تھا جب کہ عربوں کا امتیاز یہ تھا کہ وُہ جہاں سے گزرے وہاں اُنہوں نے ایک تہذیب، ایک تمدّن بلکہ ایک پورا نظامِ زندگی تشکیل دے ڈالا جو آج بھی وقت کے تھپیڑے کھا کر زندہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے حتمی طور پر یورپ کی تاریخ کا ڈول ڈالا اور مشرق کے زرخیز میدانوں تک بہت عرصے اُن کی رسائی نہ ہونے دی؛ چنانچہ ردِ عمل کے طور پر صدیوں بعد اہلِ مغرب نے یورپی طاقت کی نشوونما کے لیے مغربی اور جنوبی علاقوں میں مہم جوئی کا آغاز کیا۔

۷۲۰ء تک مسلمانوں نے یورپ میں کوہ پیرنیز عظیم بلندیاں عبور کر لی تھیں اور مغربی یورپ اِن کے قدموں تلے پڑا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُنہیں فرانسیسیوں نے اِن مقامات پر شکست دے دی تھی جنہیں آج ہم طوُر (Tours) اور پواتیا (Poitiers) کے شہروں کی حیثیت سے جانتے ہیں؛ تاہم یہ بات مشکوک ہے کہ یہ جنگیں فیصلہ کُن تھیں۔ بہرحال امرِ واقعہ یہ ہے کہ اُن کی فوجوں کا مشرقی بازو اِس شکست سے قبل سوئٹزرلینڈ کے علاقے میں دَر آیا تھا۔ یہاں یہ باور کر لینے میں کوئی قباحت نہیں کہ سوئس علاقے سے آگے سیاہ جنگلات مسلمانوں کے لیے جاذبِ توجہ نہ بن سکے ہوں۔ یہ بھی امکان ہے کہ اس علاقے میں منطقہ معتدلہ جیسی ٹھنڈک اُنہیں موت کی یخ بستگی محسوس

Marfat.com

ہوئی ہو۔ پھر بلاشبہ توسیع کی یہ سیلِ تند عارضی طور پر آپ ہی آپ رُک گئی، گویا اپنی فطری حد تک پہنچ چکی تھی۔ اگر مسلمان حوصلہ کر کے چند میل اور آگے گھستے چلے جاتے تو آج ایک جُدا ہی داستان دُنیا کے سامنے ہوتی۔ اس وقت فرانس کے تخت پر ایک سُلطان جلوہ افروز ہوتا اور ایک امیر دریائے ٹیمز کے کنارے ایک قصر میں بیٹھا شہریاری کر رہا ہوتا، اور یوں شمالی امریکہ کی یورپی نژاد آبادی ہر طرح اسلام کے پرچم تلے سانس لے رہی ہوتی۔

جس سُرعت اور تیزی سے ساتویں اور آٹھویں صدی کی دُنیا میں اہلِ اسلام نے خروج کیا وہ اپنی جگہ ایک انتہائی حیرت انگیز بات تھی مگر اس سے کہیں زیادہ حیران کُن یہ امر تھا کہ اس تمام حرب وضرب کے باوجود نہیں کہیں خون کے دریا بہتے نظر آئے نہ کھیت وکھلیان لاشوں سے اَٹے دکھائی دیئے۔ اگر عرب سپاہ اگلے شہنشاہوں کے لشکروں سے مختلف نہ ہوتی تو یقیناً یہ مظاہر دیکھنے میں آتے۔ مگر یہ تو ایسے لوگ تھے جن میں خوفِ خُدا حد کو پہنچا ہُوا تھا۔ اس انداز کی سلامت روی کا ہمارے اپنے زمانے میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایسے لشکری تھے جو ہر وقت خشیتِ الٰہی سے سہمے رہتے۔ وُہ پیڑوں، درختوں، وادی وکوہسار حتیٰ کہ اجنبی دیسوں میں اُس مالک الملک کو اپنا نگراں پاتے اور سمجھتے کہ اس سے وُہ کہیں چھُپ نہیں سکتے۔ اُن کے فاتحانہ قدم وسیع وعریض دُنیا کو روندتے پھرتے تھے مگر اُن میں غرور اور تند خوئی نام کو نہ تھی۔ وُہ اپنے رب کے حکم کے مطابق سلامت روی اور نرمی سے زمین پر خراماں تھے۔ دُنیا میں کبھی کسی نے اس نوع کی فتوحات کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔

فرانس کی سرزمین پر ناکام یلغار کے صدیوں بعد تک مغربی یورپ کے سر سے اسلامی تسلط کا خطرہ ٹلا نہیں۔ اسلام پوری دُنیا پر ایک غالب تہذیب کی حیثیت سے اُبھرا تھا جب کہ عیسائیت یُورو ایشیائی علاقے کے حصار میں محبوس تھی اور اس نے خود کو کبھی محفوظ نہیں سمجھا۔ اسے تحفّظ جب ہی میسّر آیا جب مسلمان خود ہی اپنے سب سے بڑے دُشمن بن کر ایک دُوسرے سے دست وگریباں ہو گئے۔ حملہ آور ارضِ فلسطین پر اُمنڈ کر آئے مگر کچھ ہی عرصے میں مار بھگائے گئے۔ پھر

Marfat.com

تیرھویں ۱۳ صدی میں منگول غول بیابانی کی طرح دنیائے عرب کو تاخت و تاراج میں مصروف ہوئے لیکن کچھ ہی عرصے میں وہ مشرّف بہ اسلام ہو کر اس دین کے پاسبان بن گئے جسے وہ روندتے آئے تھے، عین اسی طرح جیسے ترک اسلام کے محافظ بن گئے تھے۔

۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی تسخیر ہوئی اور پھر بہت جلد ترکوں نے حصارِ یورپ کو زبردست چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ بلغراد ۱۵۲۱ء میں مفتوح ہوا اور دوسرے ہی سال جزیرہ رہوڈز ترکوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ ۱۵۳۰ء میں ترک سلطان سلیمان عالیشان نے ہنگری پر خروج کیا اور موہاچ (Mohacs) کے مقام پر ہنگری کی فوج کو زبردست شکست دی۔ ۱۵۳۰ء میں فرانس کے بادشاہ فرانسس اوّل نے ہیپسبرگ (Hapsburg) خاندان کے بادشاہوں کے خلاف سلیمان عالی شان سے امداد طلب کی اور اٹلی پر خروج کے ترک منصوبے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے چند ہی سال بعد پروٹسٹنٹ عقائد رکھنے والے یورپ کے بادشاہوں نے پاپائے اعظم اور شہنشاہ رُوم کے خلاف مسلمانوں سے ساز باز کی اور سُلطان سلیمان نے جرمنی میں داخل ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ترکوں کی جانب سے یورپ کے لیے یہ دھمکی کسی طرح کارگر نہ ہو سکی، کیونکہ اس وقت تک یورپ نے اسلامی دُنیا کو اپنی طاقت کے حصار میں لے لیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ جہاز سازی اور آتشیں اسلحہ میں اس کی شاندار ترقی تھی لیکن اس کے اس چیلنج میں بھی نو طویل صدیوں کا وہ ہراس و خوف شامل تھا جو اسلام سے لاحق رہا۔ یہ ڈر اور یہ خطرہ یورپ کے شعور پر ایک چھاپ بن کر ثبت ہو گیا تھا۔

۱۶۸۳ء میں عثمانی ترکوں نے آخری بار وی آنا کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت تک اُن کی قوّت میں اضمحلال واقع ہو چکا تھا جس کا عکس معاہدۂ کارلووچ (Carlowitz) میں، جس پر ۱۶۹۹ء میں دستخط ہوئے، دیکھا جا سکتا تھا اور چند برسوں سے عالمِ اسلام (اگر اب کہنا درست ہو) ہمیشہ اپنی مدافعت اور تحفّظ پر کمر بستہ رہا اور اب اس کا دفاعی حصار بھی ٹوٹ رہا تھا۔ برطانیہ ہندوستان پر اپنے پنجے گاڑ چکا تھا جب کہ ولندیزی، انڈونیشیا پر قابض ہو چکے تھے۔ اُدھر روس نے ازوف (Azov) تسخیر کر کے ریاست ہائے بلقان

Marfat.com

میں مسلمانوں کا کٹّر دشمن بن گیا جو آج بھی ویسا ہی ہے۔

معاہدۂ کارلووِچ سے لے کر جنوبی فرانس میں مسلمانوں کی پیش قدمی تک اسلام اور یورپ کے درمیان ایک ہزار سال کا فاصلہ حائل ہے جب کہ کارلووِچ کے صلح نامے کے بعد سے اَب تک تین سو برسوں سے بھی کم مُدّت گزری ہے اور یہ مُدّت اتنی خاصی ہے کہ اس دوران میں اہلِ یورپ کے دلوں میں اسلام کے خلاف تعصّب کی آگ سرد پڑ جانی چاہیے تھی۔ افسوس! یہ آتشِ خرمن سوز سرد نہ پڑ سکی۔ تیونسی مصنّف حکم جائٹ (Hichem D' Jait) کہتے ہیں:

"حقیقت تو یہ ہے کہ دورِ وسطیٰ کے تعصّباتِ مغرب کے اجتماعی لاشعور میں بتدریج اس طرح راسخ ہو گئے ہیں کہ آج دہشت سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ آخر یہ کبھی نکال پھینکے بھی جا سکتے ہیں یا نہیں؟"[1]

شہنشاہی سطوت کے ایّام یقیناً ان تعصبات کو کسی حد تک فراموش کر دینے والے ایّام کہے جا سکتے ہیں؛ تاہم بیسویں صدی کے آواخر میں ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'روما کا زوال اور خاتمہ' (Decline and Fall of Roman Empire) کے اکہتّر ابواب میں سے نو باب اسی موضوع کے لیے وقف کرنا ضروری خیال کیا۔ اس کے بعد آنے والی صدی میں یقیناً یورپی مؤرّخین اس عصبیّت کو نظر انداز کر سکتے تھے، لیکن اُس دَور میں بھی جب شہنشائیت کی آب و تاب ماند نہیں پڑی تھی، ہمیں اسلام کے خلاف پُر تعصّب ذہنیّت درگ و شر پیدا کرتی نظر آتی ہے۔ اِس کی مثال کے لیے جان بوکن (John Buchan) کی کتاب "گرین مینٹل" (Green Mantle) ہے جو ۱۹۱۶ء میں طبع ہوئی تھی اور بیس سال تک اسکول کے تقریباً ہر انگریز طالب علم کے زیرِ مطالعہ رہی۔ اس کتاب میں تہذیب و تمدّنِ عالم کے لیے احیائے اسلام کے غلبے کو قیصر کی افواج سے بھی کہیں زیادہ سنگین خطرہ بتایا گیا تھا۔

---

[1] یورپ اور اسلام

Marfat.com

جیسا کہ گزشتہ صدیوں میں اکثر یہ ہوتا آیا تھا کہ یورپ کے بچوں کو سونے سے پہلے سبز عمامے باندھنے والے جنّوں کی ہولناک کہانیاں سُنائی جاتی تھیں جن میں وُہ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے، انسانیت اور تہذیب و تمدّن کو خاکستر کرنے کے لیے یلغار کرتے نظر آتے تھے۔ عوام کے ذہن کو بدلنا تو نہایت ہی مشکل کام ہے مگر اِن کے تعصبات کو تقویت پہنچانا نسبتاً آسان ہے۔ اگر بوکن کو اسلام کے خلاف مقدمہ پیش کرنا ہوتا تو وُہ "گرین مینٹل" جیسی کتاب کبھی نہ لکھتا لیکن اُسے اِس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

مسلمانوں کے متعلق یہ ڈراؤنی کہانیاں ہمیشہ یکطرفہ نوعیت کی ہوتی تھیں۔ اپنی تاریخ کے بڑے حصّے میں مسلمانوں کو اہلِ یورپ کے خلاف کسی قسم کا تعصّب رکھنے کی کوئی وجہ دکھائی نہ دی۔ صلیبی جنگوں کے مختصر دَور کے علاوہ، مسلمانوں نے ہر زمانے میں اس طرح کی بات نظر انداز کی۔ ازمنۂ وسطیٰ میں مسلمان علماء، مبلّغین اور تاجر ہسپانیہ سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام میں آزادانہ سیر و سیاحت کرتے رہے۔ اُن کا پاسپورٹ اُن کا کلمۂ ایمان "لا اِلٰہ اِلّا اللہ" ہُوا کرتا تھا۔ اُن کی مہم جوئی اور سیاحت کو اس مذہبی نقطۂ نظر نے زیادہ تقویّت پہنچائی کہ مسافروں کی ہر طرح مدد اور مہمان نوازی کی جائے۔ یہ ایک دینی فریضہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے علماء مراکش میں بھی خود کو وطن جیسی محبّت آمیز آغوش میں محسوس کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے زمانے کے صُوفیا سفر کرتے ہوئے انتہائی دُور دراز علاقوں تک جا پہنچتے تھے۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ اُن کے قبضے میں وُہ کون سا طلسمی قالین تھا جس پر بیٹھ کر وُہ اتنی طویل مسافتیں طے کر لیا کرتے تھے؛ خاص طور پر ایک ایسے زمانے میں جب نقل و حمل کی آج جیسی سہولتیں میسّر نہ تھیں۔

بے شمار سیّاحوں خصوصاً تاجروں نے دارالاسلام سے بھی دُور دراز علاقوں کا سفر کیا اور ایک زمانہ وُہ بھی تھا جب قاہرہ کا ایک سیّاح چین پہنچ کر کینٹن میں اپنی ہُنڈیاں اور تمسکات کے عوض نقد رقم حاصل کر سکتا تھا مگر ان لوگوں نے خود کو متمدّن دُنیا ہی تک محدود رکھا۔ وُہ غیر مہذّب اور یورپ سے دُور رہے جہاں ہر وقت اُن کے سروں پر موت کا خطرہ منڈلاتا رہتا۔ اِس زمانے میں اُن کی معلومات سُنی سنائی باتوں پر مشتمل ہُوا کرتی تھیں۔

Marfat.com

یہ معلومات اُنھیں اُن عیسائی طلباء سے حاصل ہوتی تھیں جو مسلم ہسپانیہ کی بڑی درسگاہوں میں حصولِ علم کے لیے آیا کرتے۔ ابتدائی زمانے کے ایک مصنّف نے اس رائے کے حق میں دلائل پیش کیے ہیں کہ ایک سفید فام آدمی افریقہ کے ایک سیاہ فام سے ذہانت میں کسی طرح کم نہیں ہے کیونکہ اس زمانے کا عام خیال اس کے برعکس تھا۔ بہرحال پیرنیز سے آگے کا خطّہ جہالت اور بربریّت کی آماجگاہ متصوّر ہوتا تھا۔ یورپ سے وہ افراد جو صلیبی جنگوں میں فلسطین گئے، اُنہوں نے جنگ میں عورتوں اور بچّوں کی تخصیص کیے بغیر اپنی وحشت و بربریت کے وہ نمونے چھوڑے تھے جن سے یورپ کے متعلق مسلمانوں کے خیالات بہتر ہونے کے بجائے اور بھی مشکوک ہو گئے؛ تاہم مسلمانوں کی نظروں سے عیسائی تارک الدّنیا افراد اور راہب پوشیدہ رہے جو گرجاؤں اور خانقاہوں میں روحانی زندگی کے علمبردار تھے؛ بالکل اسی طرح جیسے عیسائی، مسلمانوں کی روحانیّت کے اسرار و رموز سے کوئی واقفیّت نہیں رکھتے تھے۔

صلیبی جنگوں سے بہت پہلے ہسپانیہ میں طُلیطلہ (Toledo) کے ایک شہری سعید بن احمد نے اقوامِ عالم کی اقسام پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں اُس نے دُنیا میں بسنے والی قوموں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک وہ گروہ جو سائنسی علوم سے آشنا ہے اور دُوسرا وہ جو اس سے نابلد ہے۔ اوّل الذکر گروہ میں اُس نے عربوں، ایرانیوں، بازنطینیوں، یہودیوں اور یونانیوں کو شامل کیا تھا جب کہ باقی نسلِ انسانی کو اس نے شمالی اور جنوبی خطّے کا وحشی قرار دیا تھا۔ دُوسرے لفظوں میں ایک گروہ سفید فام تھا اور دُوسرا سیاہ فام۔ فرانسیسیوں کا مذہب بھی کسی دلچسپی کا حامل ہوگا، یہ بات کسی کے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔ ابنِ خلدون نے جو دُنیا کے ہر زمانے میں ایک عظیم مؤرّخ مانا جاتا ہے، چودھویں صدی کے آخری دَور کے بارے میں لکھتے ہوئے مغربی یورپ کو قطعاً نظرانداز کر دیا تھا؛ البتّہ اُس نے اتنا حوالہ ضرور دیا تھا کہ اُس تک کچھ اطّلاعات ایسی پہنچی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فلسفہ و سائنس میں دُنیا کے اِس علاقے میں کچھ ترقیات ہوئی ہیں۔ وہ کہتا ہے: "دُنیا کے اُس حصّے میں کیا کچھ ہو رہا ہے اس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔"

Marfat.com

یہ وقت وہ تھا جب یورپ کا عہدِ وسطیٰ اپنے عروج پر پہنچا اور ایک صدی سے بھی کم عرصے پہلے یورپ اپنی حدود پھلانگ کر امریکہ دریافت کر چکا تھا۔ اس زمانے تک خاصی کتابیں یونانی، ایرانی اور شامی زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہو گئی تھیں، تاہم سولھویں صدی سے قبل محض ایک لاطینی کتاب کا ترجمہ نظر میں آیا ہے۔

بلاشبہ اس لاتعلقی کا ایک اور سبب بھی ہو سکتا تھا۔ عیسائیوں کے لیے اسلام ایک ناقابلِ برداشت رکھنے کی حیثیت رکھتا تھا جب کہ مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کو اہلِ کتاب تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں تھا۔ دُوسری طرف صورتِ حال یہ تھی کہ اگر ایک عیسائی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو سچا تصوّر کرتا تو اُس کے ہم مذہب اُسے مرتد گردانتے۔ اس کے برعکس اسلام میں حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی تعظیم و تکریم اور انہیں ایک مستند پیغمبر ماننا لازمی قرار دیا گیا ہے اور اُن کے لائے ہوئے پیغام کو بھی حق ماننا لازم ہے، البتہ ان کے پیغام کو اللہ کا آخری پیغام تصوّر نہیں کیا جاتا۔ قرآن نے اس بات کو کھلے طور پہ بیان کر دیا ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں اور اُن کی لائی ہوئی کتابوں میں سے کسی کو نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے سرے سے کسی نبی اور صحیفۂ الٰہی کو تسلیم نہ کیا جائے جس میں خود قرآن بھی شامل ہے۔ فقۂ اکبر میں جو امام ابُوحنیفہؒ سے منسوب ہے، یہ مسئلہ یوں بیان کیا گیا ہے: "اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے معلوم نہیں، اللہ کے پیغمبروں میں عیسیٰؑ اور موسیٰؑ پیغمبر تھے یا نہیں تو وہ کافر قرار دیا جائے گا۔"[1] خاص طور پر ہسپانیہ میں جو اس وقت دارالاسلام کا ایک حصّہ تھا، مسلمانوں نے یہودیوں اور

---

[1] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ کوئی شخص یہ شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اس کے عبد اور رسول ہیں اور یہ بھی شہادت دے کہ عیسیٰؑ اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کا وُہ کلمہ ہیں جو اس نے حضرۃ مریم علیہ میں پھونکا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی روح ہیں اور یہ بھی گواہی دے کہ جنّت اور جہنم فی الواقع موجود ہیں، تو اللہ جل شانہٗ اس کے تمام اعمال سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اُسے جنّت میں داخل کرے گا۔

Marfat.com

عیسائیوں کو قبول کیا۔ غیر مسلموں کے لیے مسلمانوں کا یہ رویہ جدید اصطلاح کے مطابق رواداری نہیں تھا، بلکہ اُن کے مذہب کی جانب سے اُن پر یہ پابندی عائد ہوتی تھی؛ جب کہ عیسائیوں نے اسپین پر دوبارہ قبضہ کیا تو وہاں مقیم مسلمانوں اور یہودیوں پر یہ پابندی عائد کر دی کہ وہ یا تو عیسائیت قبول کریں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

اس دور میں جب مسلم دُنیا کو تحفظ حاصل تھا اور جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ تحفظ سدا قائم رہے گا، اس خطے میں بعض غیر معمولی واقعات بھی رُونما ہو رہے تھے، جنہیں ابنِ خلدون سرسری طور "وہ خطے" کہہ کر گزر گیا تھا۔ یہ بھی ایک بوالعجبی تھی کہ جن لوگوں نے عربوں کو وحشی اور بربری کہا تھا، اُنہیں یونانی علوم عربوں ہی کی وساطت سے ملے اور انہوں نے عربی سے انہیں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا؛ اور اس طرح حکمت و دانش کا ایک نیا خمیر اُٹھنا شروع ہو گیا۔ جس طرح اسلامی تہذیب نے اپنی ہیئت میں نئے علوم کو ضم کر لیا تھا، اسی طرح عیسائیت بھی انتخابی بنیاد پر یہی روش اختیار کر سکتی تھی کیونکہ بحیثیت ایک جُزِ دلائیفک یہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھی اور ان تمام سوالات کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتی تھی جو ایک عیسائی پوچھ سکتا تھا، مگر ایسا نہ ہو سکا بلکہ نئے علوم سے یہ اپنی اہمیت بھی کھونے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ جدید علوم نے اہلِ یورپ کی نگاہوں کو اس طرح خیرہ کر دیا کہ وُہ اپنی مذہبی انفرادیت فراموش کر بیٹھے اور تمام حدود پھلانگ کر ترقی کی راہ پر ہر سمت بگٹٹ بھاگنے لگے؛ اور ترقی بھی ایسی جس سے پہلے کبھی نوعِ انسانی کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔

جس طرح سڑنے یا خمیر ہونے کے عمل میں دھماکہ خیز گیسیں خارج ہوتی ہیں یا پہاڑی سے نشیب کی طرف بہنے میں پانی کا ریلا بہت قوت پیدا کرتا ہے، اسی طرح دُنیائے عیسائیت نے نئی دانش و بینش سے پیوستہ ہو کر مادی ترقی کی ارزانی کر دی۔ روم کا کلیسا ترقیات کی اس بے پناہ سیلِ رواں کو جو مکمل طور پر خود ساختہ منطق اور اُصول پر کاربند تھا، روک نہ سکا۔ صنعتی انقلاب کی آمد اور پیداوار میں سائنسی آلات و ذرائع نے ایسی بے پناہ قوت کی اجرائی کی جو مؤثر طریقے پر جنگی مہمات میں بروئے کار لانے سے فتوحات اور تسخیر کے عمل کو مہمیز دیتی تھی۔

Marfat.com

مسلمان جو اپنے خول میں اسیر اور ضرورت سے زیادہ پُر اعتماد تھے ہمیشہ اس بات سے بے نیاز رہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور یہ اندازہ قائم کریں کہ دُنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دارالاسلام کے گرد و پیش کا علاقہ اغیار کے قبضے میں چلا گیا؛ البتہ وسطی و قلبی حصہ بہر نوع برقرار رہا۔ مسلمان قرآن کا دیا ہُوا یہ سبق بھُول گئے کہ دُنیا میں اقتدار دھوپ چھاؤں کی مانند ہے۔ اسے کبھی دوام حاصل نہیں، وُہ بیرونی خول جو عالمِ اسلام کے اندرون کا محافظ تھا، انڈے کے چھلکے سے زیادہ وقعت کا حامل نہ ہو سکا۔ اس خول کو نپولین نے جولائی ۱۷۹۸ء میں اسکندریہ فتح کرنے کے بعد توڑ دیا۔ اس کے عزائم بہت بلند تھے۔ وہ مکّے پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا چکا تھا۔ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ وُہ مشرّف بہ اسلام ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مصری اس کی پیش قدمی نہ روک سکے؛ البتہ نیلسن نامی ایک انگریز نے نپولین کا یہ خواب کہ وُہ ایک نئی اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد خود اِس کا امیر بن جائے گا، تباہ کر دیا۔ پھر اس کے بعد تو عالمِ اسلام نے اجتماعی مدافعت کی خُو ہی چھوڑ دی؛ البتہ انفرادی طور پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے دلیری اور جنگجوئی کے اکّا دکّا واقعات دُنیا کے سامنے آتے رہے؛ جیسے الجزائر میں امام عبدالقادر کا فرانسیسی استعمار سے مقابلہ؛ قفقاز میں امام شامل ؒ کی معرکہ آرائیاں؛ انڈونیشیا میں ڈیپونا گارو کی جنگ آزمائی یا مہدی سوڈانی کے انگریزوں سے زبردست معرکے؛ بہر حال پہلی جنگِ عظیم کے بعد تقریباً سارے کا سارا عالمِ اسلام بیرونی تسلّط کے حصار میں آ گیا۔

عالمِ اسلام کی تسخیر جو کبھی ناممکن تصوّر کی جاتی تھی، اب نہ صرف ممکن بن گئی بلکہ فی الواقع ایک حقیقت کا رُوپ دھار چکی تھی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی خاص دروں بینی کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کی اِس ذلّت آمیز تباہی میں اُن کی اپنی بے خبری اور بے عملی کا دخل زیادہ تھا۔ اب شکست کی خجالت کے ساتھ ساتھ ضمیر کی ملامت بھی اُنہیں کچوکے لگا رہی تھی۔ اہلِ مغرب کی حربی قوّت، تکنیکی مہارت اور انتظامی صلاحیت میں تمام تر برتری کے باوجود یہ حادثۂ فاجعہ اتنی جلدی وقوع پذیر نہ ہوتا اگر عالمِ اسلام اپنے

Marfat.com

دین پر کاربند رہتا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مخلص ہوتا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ مذہبی اعتبار سے کون سے عقائد تسلیم کیے گئے اور کن پر عمل درآمد ہُوا۔ دینِ اسلام کے ماننے والے بہر حال وہی تھے۔ اُصول کے معاملے میں اسلام اُس وقت تک الگ اور متحارب گروہوں میں منقسم نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ مسلمان خود فریبی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

ایک ایسی اسلامی مملکت جو بحرِ اوقیانوس کے ساحل پر مراکش سے لے کر انڈونیشیا کے بیرونی جزائر اور بحرِ آرال سے سوڈان تک پھیلی ہوئی تھی اگر ایک جسدِ واحد کی طرح متحد ہوتی تو مخالف قوتوں کے لیے کبھی لقمۂ تر ثابت نہ ہوتی۔ جس طرح ملّت کے اندرونی مناقشات اور حریفانہ کشمکش نے ارضِ فلسطین میں عارضی طور پر صلیبی جنگ آزماؤں کو کامیاب ہونے کا موقع فراہم کیا تھا، اسی طرح آج بھی یہ بداعمالیاں انہیں مکمل طور پر زیرِ نگیں بنانے کے راستے ہموار کر چکی ہیں اور اب ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اُن کے تمام بلند عزائم محرومی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔

جو نتائج بھی سامنے آئے تھے اُنہیں جسمانی غلبہ یا تسلط قرار نہیں دیا جا سکتا تھا وُہ لوگ جنہوں نے اس سے پہلے مُسلم دُنیا پر اپنا اثر و نفوذ قائم کیا تھا، وُہ یا تو فوجی اعتبار سے مضبوط مگر تہذیبی اعتبار سے کمزور تھے (جیسا کہ منگولوں کے غلبے کی صورت میں تھا) یا پھر اس کے بالکل برعکس، یعنی تہذیبی لحاظ سے قومی اور فوجی اعتبار سے کمزور۔ اب مسلمانوں کا مقابلہ ایسی مغربی قوتوں سے تھا جو فوجی مضبوطی کے ساتھ ساتھ تہذیبی اعتبار سے بالادست تھیں۔ اگر استعمار پسندی کا تجربہ اہلِ اسلام کے لیے وحشیانہ مظالم میں سے کسی ایک نوعیت کا ہوتا تو شکستگی کا زخم گہرا نہ ہوتا بلکہ اس کا ایک موہوم سا نشان باقی رہ جاتا۔ مرے ہوئے لوگ جلد ہی دفنا دیے جاتے ہیں اور قتلِ عام کے واقعات بھی فراموش کر دیے جاتے ہیں مگر یہ غلبہ نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے تمام غیر یورپیوں کے لیے اتنا کم وقعت نہ تھا کہ آسانی سے بھلا دیا جا سکتا۔ یہ غلبہ تو مغربی آقاؤں کی سوچی سمجھی سکیم کی بدولت معرضِ عمل میں آیا تھا۔ یہ آقا بزعمِ خود "مقامی باشندوں کی جنہیں وُہ حقارت سے "مُقامی" (Natives) کہا کرتے، اصلاح کرنا اور انہیں ہدایت دینا اخلاقی فریضہ تصور کرتے

Marfat.com

تھے۔ مقامی لوگوں کے اخلاق اقدار سے نفرت ہمیشہ بڑے نرم لب و لہجے میں ظاہر کی۔ آگے چل کر مقامی لوگوں کی روایات سے یہی نرم آمیز نفرت، ظلم و ستم سے کہیں زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہوئی۔ اِن آقاؤں نے اُنہیں صرف جسمانی طور پر ہی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ رُوحانی سطح پر بھی اُنہیں کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔

اگرچہ یہ فاتحین خود کو عیسائی کہتے تھے مگر مجموعی اعتبار سے اپنی رعایا کی نظر میں یہ دیندار لوگ نہیں تھے۔ یقینی طور پر اُن کے پاس کوئی مذہبی نظریہ تھا نہ مذہب کی حُرمت کا کوئی شعور۔ وُہ لوگ اُصولی اُمور سے لاتعلق نظر آتے۔ وُہ فروعی معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے، اسی لیے اِن معاملات سے نمٹنے میں وُہ بتدریج ماہر ہوتے چلے گئے۔ مسولینی کی طرح جو بعد کے دَور میں گزرا، اُنہیں یہ معلوم آتا تھا کہ ٹرینوں کی آمد و رفت کو کس طرح وقت کا پابند بنا دیں، لیکن اپنی اُس رعایا کو جس کے نزدیک مذہب کی حُرمت ہر شے پر فوقیت رکھتی تھی، سمجھنے یا اپنا موقف اُن پر عیاں کرنے کے رموز سے وُہ قطعی نابلد تھے۔

یورپی اقوام، الجزائر اور انڈونیشیا کے سوا تمام نو آبادیات سے خود دستبردار ہو گئیں۔ وُہ کسی علاقے سے بھی نکالی نہیں گئیں؛ تاہم اپنے بعد انہوں نے در فتنہ کُھلا رہنے دیا۔ اُن کی سلطنتوں کا زوال عدم قوتِ ارادی، بے یقینی، دو طویل عالمی جنگوں سے پیدا ہونے والی تھکن اور اقتصادی عوامل کے دباؤ سے ہُوا لیکن نو آبادیات سے دستبرداری کے وقت اُنہوں نے نئی خود مختار اقوام پر ایک نہایت نامناسب اور غیر موزوں طرزِ حکومت ٹھونسنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہو سکتا ہے اس کا کوئی متبادل اِن کے سامنے نہ ہو کیونکہ حکمرانی کا روایتی انداز اور سماجی زندگی کا کہنہ نظام بڑی حد تک تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بہر حال دنیا میں کہیں بھی یہ نہیں ہُوا کہ ماضی کی روایات و رسوم کا اعادہ کیا گیا ہو۔ حالیہ زمانے میں ہمارے سامنے یوگنڈا کی مثال ہے جہاں آزادی کے موقع پر عمداً روایتی ہیئتِ حاکمہ کی بنیادیں تباہ کرنے کی کوشش کی گئی۔[1]

---

[1] سر اینڈریو کوہن (Sir Andrew Cohen) نے آزادانہ نقطۂ نظر کی آڑ لے کر کاباکا کو تباہ کر دیا جس کے نتائج یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ عمداً کیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ کاباکا، (باقی حاشیہ ۴۶ پر)

Marfat.com

نوآبادیات اور یورپی اقوام کے زیرِ تحفظ علاقوں میں آزادی کی تحاریک اصلی اور روایتی قدروں کے اعادے کے لیے شروع نہیں کی گئی تھیں بلکہ یہ نتیجہ تھیں مغربی نظریات اور اقدار کے انجذاب کا جو وہاں کی سماجی زندگی میں یورپی اثر و نفوذ کے باعث عمل میں آیا تھا۔ نوآبادیات سے مغربی آقاؤں کی دست برداری کے بعد جدیدیت یا مغربیت کا سیلاب رُکنے کے بجائے اور تیز تر ہو گیا۔ پُرانے آقاؤں کے جوش و جذبے کے برعکس نئے حکمرانوں کا ہر "نئی" چیز کے لیے اشتیاق بے حد و نہایت رہا جس میں خود فریبی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایسے تمام معاملات میں جو ستم ظریفی ہے وہ جنگِ ویت نام، میں المناک طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ اُس مُلک کے لوگ اپنے قدیم نظریات اور روایات کی بقا کی خاطر نہیں لڑے بلکہ مبہم مغربی نظریات اور فلسفہ ہائے زندگی کے لیے زحمت کش جنگ ہوئے۔ اُنہوں نے قوم پرستی اور سوشلزم کے خیالات کے سلسلے میں اپنے سابق آقاؤں کی نقالی اختیار کی۔ اس جنگ میں دراصل مغرب آئینے کے سامنے اپنے ہی عکس سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی ۳۰ ہی برس تو ہوئے ہیں کہ یورپ نے بہ استثنائے رُوس، حاکمیت و شہنشاہیت کا بارِ گراں اُتارا ہے۔ اتنی کم مدّت میں یہ باور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کے دل و دماغ میں ایسا اندرونی اعتماد پیدا ہو جائے کہ وہ شہنشاہیت کے کردار کو بلا حیل و حجّت مان لیں۔ ان سُرخ فام صاحب لوگوں کو اپنی راستبازی کا یقین کیسے تھا؟ نوجوان نسل بدیشی آقاؤں کی اُن تصویروں پر ہنستی ہے جس میں وہ پام کے درختوں کے نیچے خاص انداز کی مضحکہ خیز ٹوپیاں پہنے شاہانہ تمکنت سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ آج بھی

(صفحہ ۴۵ کا باقی حاشیہ) ترقی اور جمہوریت کی راہ میں سنگِ گراں بن گئے تھے۔ اور ان دو اصطلاحات (ترقی و جمہوریت) کی خاطر یوگنڈا میں افراتفری اور دہشت گردی کا بازار گرم کروا دیا گیا۔ فی زمانہ ایسے بہت سے مسلمان ہیں جو کوہن کی طرح روایتی طرز کی حکمرانی سے شدید نفرت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی جہل و تاریکی کے نمائندے کہے جا سکتے ہیں۔

Marfat.com

صورتِ حال وہی ہے ـــ لوگوں کو مغربی اقدار کی کسوٹی پر اُسی طرح کسا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس امتحان کو قبول کر لیتے ہیں۔ آج بھی انتظامِ مُلکی میں اُسی پُر رعونت اعتماد کا بڑی دیدہ دلیری سے مظاہرہ کیا جاتا ہے جس کے تحت ایک نسل پہلے کا سفید فام صاحب مقامی باشندوں کے ہجوم کو محض بید دکھا کر قابو میں رکھتا تھا، کیونکہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ساری دُنیا مغرب کے اُن قواعد وضوابط پر چلتی رہے گی جو یورپی تاریخ کی پیداوار ہیں۔

اقوامِ متحدہ میں یورپی طاقتیں ایک چھوٹی سی اقلیّت ہیں، تاہم اگر اقوام متحدہ کے منشور کا مطالعہ کیا جائے تو ایک ہی نظر میں یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک اُصول بھی یورپیئن فلسفے سے ہٹ کر کسی دُوسرے منبع سے اخذ نہیں کیا گیا ـــ اور یہی بات عصرِ حاضر کے بین الاقوامی قانون پر بھی صادق آتی ہے۔ آج بھی سابق نو آبادیاتی آقاؤں کی آراء، اخلاقی اصول اور تعصبات اسی طرح طاقت کے حامل ہیں جیسے یورپی ہتھیار۔ اگر ان سے کوئی گریز کیا گیا ہے تو آنکھیں بند کر کے مارکسیّت یعنی یورپ کے یہودی نظریات یا نیم مذہبی خیالات سے لیے گئے اور ان میں عیسائی بدعات، یہودی مہدویت کے خواب اور مشتبہ سائنس آمیختہ کر دی گئی۔ بین الاقوامی طور پر کلیدی لفظ "تہذیب" ہے۔ آپ خواہ مسلمان ہوں، ہندو، بودھ یا اسکیموسب کے لیے ایک شرط لازمی ہے۔ آپ کو "تہذیبی اقدار" کا خوگر بنا ہوگا ورنہ آپ کو "پسماندہ" کہہ کر ذلیل کیا جائے گا۔

فرتھجاف شوآن (Frithjof Schuon) نے "تہذیب" کی یہ تعریف کی ہے:

"یہ دُنیوی اور کاروباری تناظر میں شہری نفاست پسندی ہے جو مذہب اور فطرتِ معصوم کے خلاف معاندانہ رویّہ رکھتی ہے۔ اپنی اصل میں لفظ 'تہذیب' کا مفہوم شہروں میں سکونت کے سوا اور کچھ نہیں (یاد رہے زمانہ سابق میں شہروں کے متعلق عام تاثر یہی تھا کہ یہ وہ مقامات ہیں جہاں جسمانی گندگی اور رُوحانی فساد ہوتا ہے) بہر حال 'تہذیب' ایک جاندار لفظ ہے۔ مسلم دُنیا یا کسی اور خطّے کا کوئی انتہائی پرجوش انقلابی بھی 'غیر مہذب' کہلانے کے خیال سے لرز اُٹھتا ہے۔"

Marfat.com

سیاسی سطح پر نوآبادیاتی ذہنیت کی مخالفت لوگوں کے لیے ایک طرح کی افیم ثابت ہوئی ہے جو انہیں اس چیز پر غور کرنے سے باز رکھتی ہے کہ زیادہ اہم یہ امر ہے کہ کس طرح اُن کے ذہنوں کو "نوآبادی" بنایا گیا ہے۔

آج اس ذہنیت کے باعث جو ذہنی و جذباتی صدمے، جن سے یورپی دُنیا دوچار ہے، وُہ مسلم اقوام میں خاص حالات کے سبب شدّت اختیار کر گئے ہیں اور آج اسلام کے تمام مظاہر پر، خواہ سیاسی ہوں یا فکری، اثرانداز ہو رہے ہیں۔ مغرب کو اُسی کے ہتھیاروں سے چت کرنے کی کوشش میں ہوتا یہ ہے کہ بالکل ہی اجنبی نظریات و خیالات کو اپنا کر، اور "اسلامی" ہونے کا لیبل لگا کر، راتوں رات مشرف بہ اسلام کر لیا جاتا ہے۔ اس کوشش بے ہودہ نے اسلامی ملّت کو اکثر بدہضمی میں مبتلا کر دیا ہے۔

سیاسی طور پر مغرب کی شدید مخالفت ہی کو، اسلامی اقدار کی ازسرِنو احیاء کا مؤثر ذریعہ تصوّر کر لیا گیا ہے اور اس بات سے صرف نظر کر لیا گیا ہے کہ یہ اقدار کس حد تک مسخ ہو چکی ہیں؛ اور اس بات کا بھی قطعاً لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ توہین۔ یا متوقع توہین کے جواب میں مجنونانہ رویّہ اسلام کی روح اور نظام کے منافی ہے۔ کسی منصف مزاج مبصر کے لیے (بشرطیکہ اس کا ذہن چھان پھٹک کر سکے) حقیقی اسلامی اقدار کو اُس جذباتی ردِّعمل سے الگ کرنا بے حد دشوار ہے جو دُنیائے اسلام پر گزر رہے ہوئے صدموں اور حادثات سے پیدا ہوا ہے۔ آج کے زمانے کے مسلمان نہ تجزیاتی نظر کے حامل ہیں اور نہ خود احتسابی اور اپنی ذات پر تنقید کا مزاج رکھتے ہیں کہ یہ امتیاز کر سکیں۔

آج عالمِ اسلام میں جو کچھ ہو رہا ہے، اور جو بالعموم تیسری دنیا میں بحرانوں کی صورت میں وقوع پذیر ہے، اس کی تشریح اس بات سے ہو جاتی ہے لیکن مسلمانوں کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ اُن کے زخم ہرے رکھتی ہے یعنی عالمِ اسلام کے قلب میں مغربی عسکری و سیاسی طاقت اسرائیل کا لبادہ پہنا کر مضبوطی سے قائم کر دی گئی ہے۔

---

1 Light on the Ancient Worlds, Perennial Books, p.9

Marfat.com

مسئلہ فلسطین جذباتیت اور غم و غصّے کی لہروں میں اس طرح لپٹ گیا ہے کہ انسان اِس کے ذکر ہی سے بچنا چاہتا ہے؛ تاہم اس ضرورت سے کب تک آنکھیں چرائی جاسکتی ہیں۔ فلسطین میں (جہاں جزیرہ نمائے عرب سے باہر اسلام کے قدم پہلے پہل پہنچے تھے) ایک اسرائیلی ریاست کے قیام کے آشوب نے آج کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت کی سیاسی تربیت کی ہے۔ یہی وُہ بنیادی مسئلہ ہے جو گزشتہ چالیس برس سے عالمِ عرب کے جملہ عوارض کی جڑ ہے۔ اسی مسئلے نے شرق اوسط کا سیاسی و سماجی استحکام درہم برہم کر رکھا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ دُنیا میں جوہری تصادم کا فلیتہ ثابت ہوسکتا ہے۔ امریکہ اور یورپی برادری شاید اس موضوع پر خوش فہمیوں میں یوں مبتلا نہ ہوتی اگر انھوں نے مسلمانوں کے پس منظر سے ذرا گہری واقفیت حاصل کر لی ہوتی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلمان عام طور پر "نسل" کے مغربی تصور سے اس طرح کا علاقہ نہیں رکھتے جس طرح یورپین اور اِن کے برادران عم امریکی۔ یہ لوگ تو کسی معاندانہ تعصب کا شکار نہ بھی ہوں تو عام لوگوں کا تشخص ان کے اوّلین نسلی مصادر سے کرنا شروع دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان کسی مرد یا عورت کی "پہچان" اِس کے مذہب سے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی یہودی، یہودیت کا اسی طرح مخلص پیرو ہو سکتا ہے جیسے مسلمان اسلام کا، خواہ اس کا دادا سابق میں یہودی ربّی ہی رہا ہو؛ جیسا کہ اس زمانے کے مشہور نومُسلم مصنّف محمّد اسد کا معاملہ ہے۔ یہ حقیقت باعثِ تعجب نہیں کہ آج یورپین اور امریکی نومسلموں کی بڑی تعداد یہودی الاصل ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن دونوں مذاہب کے پسِ منظر میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دراصل اہلِ مغرب، اسرائیل کو یہودی نسل کا ایک "قومی وطن" سمجھتے ہیں کہ ایک بے گھر، بے در قوم کی جس نے صدیوں تک یورپینوں کے ظلم و ستم سہے، تالیفِ قلب کر دی جائے۔ ان کی نظر قطعاً اِس طرف نہیں جاتی کہ اس نئی ریاست کے افراد کس مذہب سے وابستہ ہیں۔ نازیوں نے انہیں گیس چیمبروں میں بھیجنے سے پہلے اِن کے "تقویٰ" اور دینداری کے متعلق کچھ دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

Marfat.com

مسلمانوں کی نظر میں اسرائیل ایک مسلم خطّے میں یوریپئن اور امریکیوں کی بستی کا نام ہے جسے سابق استعماری طاقتوں کی مدد سے وجود میں لایا گیا ہے اور اس کے قیام و ثبات کے لیے امریکی ہتھیاروں کی مدد لی جارہی ہے اور بظاہر اس ریاست کے عزائم یہ ہیں کہ دارالاسلام کے اندر تک اپنی سرحدوں کی توسیع کی جائے۔ کسی مسلمان کے نزدیک ایک "لادین یہودی" خود اپنی نقیض کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی رائے میں بیشتر یہودی خاص طور پر ان کا حکمران ٹولہ سچے یہودی ہیں وُہ یوریپئنوں جیسے نظر آتے ہیں اور انہی کی طرح گفتگو کرتے اور سوچتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں وہی درشت مزاجی اور ایسی انتظامی قابلیت ہے جو یورپی استعمار کا خاصہ ہیں[۱]۔

صلیبی جنگوں سے مشابہت تکلیف دہ حد تک واضح ہے کہ اہلِ مغرب فلسطین میں پھر آن براجے ہیں اور انہوں نے القدس یعنی یروشلم کے متبرک شہر پر دوبارہ قبضہ جما لیا ہے۔ یہودی نسل کا ابتلا اُن کا قتلِ عام اور ان کی دربدری مسلمانوں کا قصور نہ تھا۔ یورپ کا جرم یورپ ہی کے سر جانا چاہیئے۔ مسلمان یہ نہیں سمجھ سکتے کہ آخر وُہ کیوں دُوسروں کے گناہوں کے ذمّہ دار سمجھے جائیں؟ ۔ شاہ عبدالعزیز ابنِ سعود نے ایک مرتبہ صدر روزویلیٹ سے پُوچھا تھا کہ آپ جرمنی کے بہترین علاقے یہودیوں کو کیوں نہیں دے ڈالتے؟ شاہ موصوف یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اگر آپ امریکی یہودیوں کے لیے بُری طرح

---

[۱] یہ صحیح ہے کہ آج اسرائیل میں مشرقی یہودی جو سفاردیم (Sephardim) کہلاتے ہیں مغربی یہودیوں سے جو اشکنازم (Ashkenazim) کہلاتے ہیں تعداد میں بڑھ گئے ہیں، اب وہ حکومت پر بھی مؤثر اثرات ڈال رہے ہیں، تاہم سیاست میں ظواہر کو حقائق سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس تاثر کو کہ اسرائیل ایک مغربی نوآبادی ہے یورپ اور امریکہ کے عوامی رویّے تقویت پہنچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ خالی از دلچسپی نہیں کہ اسرائیل، واحد غیر یورپی مُلک ہے جو "یورو ویژن" (Eurovision) کے گیتوں کے مقابلے میں حصّہ لیتا ہے۔ اس پروگرام کو لگ بھگ پانچ سو ملین ناظرین دیکھتے ہیں اور کوئی اسے عجوبہ خیال نہیں کرتا۔

Marfat.com

تشویش مند ہیں تو اپنی اڑتالیس ریاستوں میں سے ایک ریاست (شاید ٹیکساس) اُنہیں کیوں نہیں دے ڈالتے ؟ عربوں کا عام خیال یہی ہے کہ سفید آدمی اپنا علاقہ کسی کو دینے کے بجائے دُوسروں کا علاقہ دینے پر زیادہ مائل رہتے ہیں۔

آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس خیال کا حامل ہے۔ اسرائیل کو مغرب کی اعانت ایک کھلی مُنافقت ہے۔ یورپ اور امریکہ نے اپنی یہودی آبادیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسرائیل کے قیام میں مدد دی ہے۔ یہ الزام یورپینوں اور امریکیوں کو خواہ کیسا ہی لغو کیوں محسوس نہ ہو، بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ صیہونیت، سامی النسل افراد کے خلاف ایک ردِ عمل کی صورت میں شروع ہوئی اور اسے سامی النسل لوگوں کی مخالفت کرنے والے افراد کی حمایت کی ضرورت تھی۔

تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl) کو یہ کہنے میں کبھی باک محسوس نہ ہوا کہ سامیوں کے مخالفین ہمارے پکے دوست اور ان کی مخالف ریاستیں ہماری حلیف ہوں گی۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں یہودی الاصل لوگوں کے خلاف تعصبات تحلیل ہونا شروع ہو گئے تھے اور اُنھیں مختلف ملکوں کی سماجی زندگی میں مدغم کرنے کا عمل تیز ہو گیا تھا۔ اس وقت اس بات پر زیادہ زور دیا گیا کہ یہودی جس مُلک میں رہ رہے ہوں، وہاں کے لوگوں کو مختلف نظر آئیں، اور اپنے اختیار کردہ وطن کا رگ وریشہ متصوّر نہ ہوں۔ سامی النسل کے مخالفین ان کی اس روش سے بہت خوش تھے۔ ہرزل کو آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کے ایک صدر نے جو اس کا دوست تھا متنبہ کیا تھا کہ یہودیوں کا "علیحدگی" پر اس درجہ زور آخر ایک دن اُنہیں خون کی ہولی کھلوا دے گا۔ پچاس سال بعد ان کا جو قتلِ عام ہوا اُس سے یورپ اور امریکہ کے ضمیر نے ملامت کی، لیکن یورپ اور امریکہ اگر یہودی مہاجرین کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھتے تو شاید یوں بے اندازہ جانوں کا نقصان نہ ہوتا۔ ضمیر کی اسی ملامت کے باعث امریکیوں اور یورپینوں نے ایک یہودی ریاست بنوا دی۔

فلسطینیوں نے اپنا تشخص عربوں کی حیثیت سے کروانا شروع کر دیا تو اسرائیلی ریاست کا کام اور بھی آسان ہو گیا اور اس بات سے اہلِ مغرب کل کی طرح آج بھی

Marfat.com

فلسطینیوں کے حسب و نسب اور نسلی ماخذ کا آسانی سے پتا لگا لیتے ہیں۔ اسلام میں "عرب" سے مراد وُہ شخص ہے جس کی مادری زبان عربی ہو اور محض اِس بات سے اس کے آباؤ اجداد کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ فلسطینی اُن قدیم کنعانیوں کی اولاد ہیں جن کے خون میں درجنوں فاتحین جیسے فلسطین، عربی، یونانی، رومن، ایرانیوں، عربوں اور ترکوں کا خون شامل ہوتا رہا ہے۔ صرف ایک بات فلسطینیوں کی قدامت پر ضرور گواہ ہے اور وُہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اس علاقے پر زور آور قوّت کے سہارے قبضہ نہیں کیا تھا، وُہ ہمیشہ سے وہاں تھے۔

آخر الامر مسلمانوں کی جنھیں نوآبادیاتی تجربہ پہلے ہی سے تھا، سمجھ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ دُوسرے ملکوں سے لائے ہوئے لوگوں کو مقامی آبادی کی منشا و مرضی کے خلاف تیسری دُنیا کے کسی مُلک میں جبراً آباد کروانا نوآبادی ذہنیت کی کارفرمائی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اس خیال میں اُنھیں صیہونیت کے مؤسّسین کے بیانات اور نظریات نے بھرپور تقویت پہنچائی۔ اوّلین صیہونی آباد کار آخر تو اپنے دَور کی پیداوار تھے اور ان کا دَور نوآبادیاتی استعمار کا نصف النّہار تھا۔ وُہ اپنے ساتھی یورپینوں کے ساتھ ایشیا اور افریقہ میں مقامی باشندوں کو جدید تہذیب سے آشنا کرنے کے لیے سفید فام افراد نوآبادیات قائم کرنے کے حق کو نہ صرف تسلیم کرتے تھے بلکہ اُسے ایک قابلِ تعریف بات سمجھتے تھے۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ آرون آرونزون (Aaron Aaronsohn) نے ۱۹۰۹ء میں تیونس میں فرانسیسی آباد کاروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہودیوں نے فلسطین کی طرف نقلِ مکانی اسی وقت شروع کر دی تھی جب فرانسیسیوں نے ۱۸۸۲ء میں تیونس کے فرانسیسی آباد کار سے موازنہ کیا۔

تعلیم یافتہ مسلمان، جو فلسطینیوں کے ساتھ ذہنی و قلبی ہمدردی رکھتے ہیں، اس ذلّت آمیز سلوک سے سخت نالاں ہوئے کہ اُنھیں مقامی باشندے سمجھ کر محض اس لیے پرے دھکیل دیا جائے کہ کچھ سفید فام مرد و زن کے لیے ارضِ فلسطین میں جگہ بنائی جائے۔ وُہ اس بات سے بھی دل برداشتہ ہوئے کہ اعلیٰ سطح کی عرب قوتیں بھی متحد ہو کر فلسطین میں اِن نووارد

Marfat.com

آبادکاروں کو بے دخل کرنے میں بُری طرح ناکام ہو کر رہ گئیں، اور ستم تو یہ تھا کہ یہ ایک ایسے وقت میں ہو رہا تھا جب مغربی استعمار دُنیا کے تقریباً ہر گوشے سے دستبردار ہو رہا تھا اور نوآبادیوں سے اپنی بساطِ اقتدار لپیٹنے میں مصروف تھا۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کو خود اپنی بے بسی اور بے بضاعتی کا اقرار بصد شرمساری کرنا پڑ رہا تھا۔ ذلت و رسوائی جھنجھلاہٹ اور غصّے کو جنم دیتی ہے اور یہ غصّہ اب تمام حدود دپھلانگ کر دُور دُور تک پُوری مسلم دُنیا کے رگ و ریشے میں پیوست ہو گیا ہے۔ نوجوان طبقہ خاص طور پر اس سے متاثر ہوا ہے۔ اُبلتے ہوئے جذبات کا آسانی سے تجزیہ نہیں کیا جا سکتا تاہم اس بات کا پتا لگانا کچھ مشکل نہیں کہ یہ نوجوان اپنی شدید نفرت اور غصّہ اسرائیلیوں کے لیے نہیں امریکیوں کے لیے محفوظ کر چکے ہیں کہ اسرائیلی تو وہی کر رہے ہیں جو ان حالات میں ہم کرتے؛ تاہم ان کے دل و دماغ اس قوم کو نظر انداز نہیں کر سکتے جس کی اعانت کے بغیر اسرائیل اپنی موجودہ حیثیت میں کبھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔

اس ناانصافی نے تاریخ کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اگر جلد اس کی تلافی نہ کی گئی تو ہم سب کے لیے اس کے نتائج انتہائی تلخ ثابت ہوں گے۔ امریکہ مسلمانوں کی نگاہوں میں خواہ کتنا پست اور "زوال پذیر" کیوں نہ ہو تاہم اگر دیکھا جائے تو وُہ روس کی جارحانہ لادینیت کے مقابلے میں کہیں کم ظالم اور مکروہ ہے کیونکہ مکّے میں پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فاتحانہ داخلے کے بعد سے اس وقت تک پہلی بار مسلمان ایک ایسی طاقت (رُوس) کے بالمقابل آئے ہیں جو مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے اور مسلمانوں کے ایمان کو بے یقینی میں تبدیل کرنے کے درپے ہے۔ اگر مسئلہ فلسطین اور اُس کے زائیدہ صدمے نہ ہوتے تو یقیناً اس زمانے میں اسلام کے لیے روس کا چیلنج سب سے بڑا چیلنج ہوتا۔ آج بھی لگ بھگ ساڑھے چار کروڑ مسلمان وسطی ایشیا اور کوہ قاف میں رہ رہے ہیں۔ گزشتہ ساٹھ برس سے وُہ اپنا دین اور اس کے اصولوں کو متواتر ظلم اور چیرہ دستیوں کے علی الرغم زندہ رکھنے کی کشمکش میں مصروف ہیں۔ اس تمام عرصے میں ان ستم زدہ مسلمانوں کو دُنیا میں پھیلی ہوئی اپنی اُمت سے کسی قسم کی مؤثر امداد و اعانت

Marfat.com

میسر نہیں آسکی جبکہ ملت اسلامیہ اسی وقت اُمّت مسلمہ کہلانے کی مستحق گردانی جاتی ہے جب وُہ دین کی خاطر ظلم وستم سہنے اور تکالیف اُٹھانے والے مسلمان بھائیوں کی امداد و اعانت کو اپنا اوّلین فریضہ سمجھ کر ادا کرے۔ جس غیر مشروط انداز میں امریکہ اسرائیل کی مدد کر رہا ہے، اس نے بہت سے مسلمانوں کو اس بات کا قائل کر دیا ہے کہ رُوس امریکہ سے کم بُرا ہے، یہ نظریہ وہی لوگ قائم کر سکتے ہیں جنہوں نے اس حقیقت سے آنکھیں موند لی ہیں کہ ان کے ہم مذہبوں کو سوویت استعمار کس طرح نشانۂ ظلم وستم بنا رہا ہے۔ یہ حضرات جدید دُنیا کے مزاج سے ناواقف ہیں۔ یہ خیالی دُنیا میں بستے ہیں جس کا سیاسی حقائق وحالات سے کوئی تعلق نہیں۔

اگرچہ یورپی اور امریکی لوگوں نے اب اقتصادی وجوہ کی بناء پر عالم اسلام کو سمجھنے کی ضرورت محسوس کی ہے تاہم اس ضمن میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت ہنوز نہیں ہُوئی ہے۔ اس راہ میں بڑی عظیم مشکلات حائل ہیں۔ بہرحال انسانیت کے اس گروہ کو جو آج بھی اس بات پر ایقان رکھتا ہے کہ دین ومذہب کو اپنا وجود برقرار رکھنے کا حق ہے، اس راہ کی رکاوٹیں دُور ہونے پر اعتماد کرنا ہوگا۔

اسلام کے ساتھ سیاسی اور مذہبی مفاہمت مغرب کے اپنے مستقبل کے لیے انتہائی اہمیت رکھتی ہے اور اُسے اس امر کو اپنی اوّلین ترجیحات میں رکھنا ہوگا۔ حتمی اعداد و شمار تو نہیں دیے جا سکتے، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دُنیا میں تقریباً ایک ارب مسلمان بس رہے ہیں اور یہ تعداد قوّت کی میزان پر ایک قابلِ لحاظ وزن تصوّر کی جانی چاہیے۔ مختلف قومی سرحدوں اور رقابتوں نے اُمّت کو تقسیم کر رکھا ہے تاہم مراکش سے انڈونیشیا تک بنیادی طور پر وحدت اور مشترکہ مفادات کے احساس کہ گردشِ ایام مٹا نہ سکی اور اب بھی یہ مسلمانوں کی گہری توجہ کا مرکز ہے قرآن مبین کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

ترجمہ: ہم نے تمہیں ایک "اُمّت وسط" بنایا ہے (یعنی ایک ایسی ملّت جو درمیانی راہ پر گامزن ہو) تاکہ تم انسانیت پر اس کے شاہد ہو۔ (البقرہ (۲): ۱۴۳)

Marfat.com

اگر خالصتاً جغرافیائی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اہلِ اسلام ایک درمیانی اُمّت ہے جو اس کرۂ ارض کے وسطی خط کے دونوں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی اُمّت ہے جو قدیم اور آفاقی صداقتوں کی امین اور سماجی اور انسانی استحکام کی پاسدار ہے (اس نصب العین کی خلاف ورزی تو ہوئی ہے مگر اسے فراموش کبھی نہیں کیا گیا) جس کی اس پُرفتن اور آشوب گزیدہ دُنیا کو بہت ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسی اُمّت ہے جس نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اُمّید کا دامن نہیں چھوڑا عجب کہ باقی جو دو انتہائی حدوں سے دنیا سر پھوڑ کر اپنے آپ کو فنا کر رہی ہے ـــــ انسانیت کے لیے جو مشرق و مغرب شمال و جنوب کی سمتوں میں بٹ گئی ہے۔ اسلام ایک درمیانی کڑی اور مرکزِ ثقل کی حیثیت رکھتا ہے۔ گروہ بندیوں، شکستوں، غلامیوں اور سیاسی خلفشار نے ترجیحات کی سوجھ بوجھ مسلمانوں میں بالکل تباہ نہیں کر دی ہے۔

ایک پادری نے ٹائمز آف لندن میں اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا ہے کہ مادیّت، تعیّش پرستی اور میکانیّت کی دُنیا میں اسلامی عوام اب بھی خدا کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنانے میں مصروف ہیں، ٹیکنالوجی کو نہیں۔ ۔ ۔ اندریں اثناء ان لوگوں کے لیے مارکسیت اور امریکیت میں سے کسی ایک کا انتخاب بے معنی ہے جو بہت پہلے یہ فیصلہ صادر کر چکے ہیں (اور اس پر قائم ہیں) کہ انسان تنہا روٹی کے سہارے نہیں جی سکتا[1]

اِس وقت دُنیا میں تقریباً ہر جگہ اعتقادات اور تہذیبی اقدار پر مغرب جدید کے اثرات کی پیدا کردہ اُکھاڑ پچھاڑ نظر آ رہی ہے جس کی وجہ سے اعتقادات وغیرہ زندہ نہ رہ سکے۔ اقوام کی اقوام اب گویا روحانی اور نفسیاتی خلا میں زندہ ہیں۔ دُنیائے اسلام بھی اس تصادم سے ہل گئی تھی۔ اگرچہ اس کی بنیادیں قائم رہیں، اس کا پورا ڈھانچہ متزلزل تو ہو گیا تھا مگر اپنی جگہ جما رہا، یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی ناقابلِ مزاحمت قوّت کسی اٹل بھاری جسم سے آ ٹکرائی ہے جس کی وجہ سے ہمیں ایک بالکل ہی مختلف اندازِ فکر، مختلف اندازِ زندگی، مختلف طریقِ کار کا باقی ماندہ نمونہ مل گیا ہے۔ اس کا رشتہ ماضی سے برقرار ہے۔

---

[1] "Examining the root cause of Islam's Present Discontent" عالمِ اسلام کی موجودہ بے اطمینانی و اضطراب کی بنیادی وجوہ کا تجزیہ، مضمون۔ فرانسیس ایس ایڈورڈز ایس جے "ٹائمز" ۲۲ جنوری ۱۹۸۰ء

Marfat.com

سید حسین نصر لکھتے ہیں:

"انڈونیشیا سے مراکش تک، عوام کی بھاری اکثریت کے لیے اسلامی ثقافت کا ذکر صیغۂ ماضی کی بجائے صیغۂ حال کے حوالے سے کرنا چاہیئے۔ جو لوگ اس تہذیب کو ماضی کے حوالے سے یاد کرتے ہیں وُہ تعداد میں کم ہیں مگر بلند بانگ ہیں۔ ان لوگوں نے روایات سے ناتا توڑ رکھا ہے اور خود اپنی محور و مرکز سے محرومی کو غلطی سے پورے اسلامی معاشرے کا ڈگر سے ہٹ جانا سمجھتے ہیں"[1]

مسلمانوں کا خود زمانے کی طرف رویّہ عیسائیوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے لیے تاریخ ایسی چیز نہیں جس کی تجہیز و تکفین ہو چکی ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے صحابہ کرامؓ اور ابتدائی زمانے کی دُوسری متقی و برگزیدہ شخصیتیں زندہ لوگوں کے ساتھ رہ رہی ہیں (اور ایک لحاظ سے وُہ اُمّت میں شامل ہیں) اگرچہ وُہ تمام متبرک شخصیات جنّت میں ہیں اور ہم اس دور کے زندانی ہیں۔ جدید انسان مستقبل کے بے مصرف اور سراب آسا خوابوں میں زندہ ہے جب کہ مسلمانوں کے لیے ماضی محض عشرتِ رفتہ کا نام نہیں بلکہ "اینجا" اور "امروز" ہے۔

ازمنہ وسطیٰ کا کوئی عیسائی کسی مسلمان کو بہ آسانی سمجھ میں آسکتا تھا بشرطیکہ اُس کی نیّت ہوتی۔ جدید انسان تو اپنے آب و جد کو بھی نہیں سمجھتا۔ حالیہ صدیوں نے اُسے ایک ایسی عجیب و غریب مخلوق بنا دیا ہے جو اس سے پہلے دُنیا میں کبھی نہیں دیکھی گئی تھی کہ اِس کی زندگی ایسے عقائد کی تابع ہے جس کا انسانوں کے روایتی اور مذہبی ورثے سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر وُہ مسلمانوں کو سمجھنے لگیں تو شاید اپنے آپ کو بھی سمجھنے لگیں اور اُن غلطیوں کے مرتکب نہ ہوں جو اُنھیں اپنے ہاتھوں تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں۔

کسی عام آدمی کے لیے جو کہ لادین ہے، لاادری ہے یا کسی سطح پر بھی مذہب کی

---

[1] سید حسین نصر بحوالۂ سابقہ صفحہ نمبر ۱۳۵

Marfat.com

حقیقت سے نا آشنا ہے) اور بے اصل ہو چکا ہے، اسلام مباحث کی پوری کائنات کا دروا کر سکتا ہے جو اس کے اجداد کے لیے تو معروف شے تھی مگر اس کے لیے بالکل اجنبی ہو گی۔ عیسائیوں کے لیے اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ان کے مذہب سے قریبی تعلق رکھتا ہے مگر جس نے عیسائیت کے بارے میں بالکل مختلف رویہ اپنایا ہے۔ اسلام سماجی، تہذیبی اور فکری سطح پر تہذیبِ انسانی میں ایک قوتِ حاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی مسلمان اور عیسائی کے مابین اختلافات پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں اہم اور غیر اہم پر نظر رکھنا چاہیئے۔ وہ نقطۂ اتصال جہاں تمام مذاہب باہم ملتے ہیں ایک قسم کا "حجرۂ خاص" ہے جہاں انسان اپنے تمام دنیاوی لبادے اتار کے خدائے عزوجل کے سامنے خلوت میں ہوتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں تمام علائق اور نسبتیں حقیقتِ مطلقہ کا محض سایہ نظر آتی ہیں۔ اسی مرکز سے تمام خطوط پھوٹتے ہیں اور دینیات، اخلاقی ضوابط و قوانین اور سماجی طرزِ عمل کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔

ایک طرف تو مذاہب میں حقیقتِ اصلی کے ادراک کے طریقوں کا اختلاف ہے۔ دوسری طرف وہ اختلافات ہیں جو مختلف معاشروں اور افراد کے اپنی اپنی روایات اور رسم و رواج میں ڈھلنے کی بدولت ہیں، اور مؤخر الذکر صورت میں خاص عنصر ہی اس بات کا ہے کہ لوگ کس چیز کو بے چون و چرا قبول و تسلیم کر لیتے ہیں اور کون سی چیز ظاہر و باہر ہوتی ہے۔ سطحی طور پر تو مذہب کا اور اس تہذیب کا جس کی اس نے تشکیل کی، محض رنگ و بو ہی دیکھا جاتا ہے یا وہ روحانی اور انسانی "فضا" ہوتی ہے جس میں کسی مذہب کے پیروکار اپنی زندگیاں گزارتے ہیں اور تجربات کی تفسیر کرتے ہیں۔

اس بات کا علم کہ کوئی مذہب اپنی ذات میں کیا ہے، اہمیت تو رکھتا ہے؛ تاہم انسان کو یہ بھی اندازہ ہونا چاہیئے کہ اس کے مذہب کے متعلق دوسرے کیا رائے رکھتے ہیں اور عام لوگوں کے تعصبات اور جبلّی مفروضات میں اس کا اظہار کس انداز میں ہوتا ہے۔ مغرب کے جدید باسی کو باور کرا دیا گیا ہے کہ اُسے اپنے لیے خود سوچنے کا حق ہے اور وہ فرض کر لیتا ہے کہ اس حق کو استعمال کر رہا ہے۔ یہاں وہ اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا کہ اس کی ہر فکر کی تشکیل تہذیبی اور تاریخی عوامل نے کی ہے اور

Marfat.com

مزید یہ کہ اس کے خیالات اور آراء ایک تصویری معمّے کے کٹے ہوئے قطعات کی طرح ایک دُوسرے میں اس طرح پیوست ہوتے ہیں جس میں ظن و تخمین کا گزر نہیں جو بات "میرا خیال ہے" سے شروع ہو، ایسے اندازِ فکر کی مظہر ہے جس میں عقائد اور تجربات کی بافت ہوتی ہے یا غلط قیاس اور لغزش کا امکان۔ ان تمام عوامل ہی نے موجودہ ذہنی حالت کی تشکیل کی اور ان کے تحت وُہ اُصول قائم ہوئے جن پر اس مرحلے میں اور اس زمانے میں کوئی ذی عقل آدمی شک و شبہ نہیں کر سکتا۔

عام مسلمان جس فضا میں سانس لیتا ہے وُہ کم از کم جزوی طور پر اس ماحول سے متعین ہوئی جس میں مذہب کا من جانب اللہ اضافہ ہُوا اور جس میں وُہ پروان چڑھی، یعنی عرب کا ریگستان۔ اور پھر جہاں تک ترکوں اور منگولوں کا تعلق ہے ایشیا کے وسیع لق ودق میدان، دُوسرے لفظوں میں یُوں کہیے کہ دُنیا کے کنارے پر انتہائی کھلی، روشن اُفق والی جگہیں اسلام کا گہوارہ بنیں اور ان علاقوں میں اور انسانی دُنیا کے تنگ، گنجان آباد شہروں اور مزروعہ زمینوں میں بُعد المشرقین ہے۔ فریتھجوف شوآن (Frithjof Schuon) لکھتے ہیں:

"کسی نئے مذہب کی ابتدا کے معنی یہ سمجھئے کہ ایک نئی قسم کا روحانی اور اخلاقی نمونہ پیش کیا جائے۔ اسلام کی صورت میں یہ نمونہ ایک طرح سے مراقبے اور مجادلے یا فقر اور متاہلانہ زندگی کے اوصاف کے درمیان توازن کا نام ہے جو عیسائیت کی رُو سے متناقض ہیں۔ عرب، اور ہر وُہ آدمی جو اسلام کے ذریعے مستعرب ہُوا، چار سمتوں کا مالک ہے: صحرا، شمشیر، عورت اور مذہب۔ اس کے نزدیک تلوار موت کی علامت ہے کہ نصیبِ دشمناں بھی ہے اور رزقِ دوستاں بھی جب کہ عورت محبّت کی علامت ہے جو ثمر بھی ہے اور سوغات بھی۔ وُہ اِن تمام لطیف شیریں اور اعلیٰ اوصاف کی مظہر ہے جو موت کی عفونت کو زندگی کی مہک سے بدل دیتی ہے۔ درویشی کے جامے میں اور ذاتِ مطلق کے بالمواجہہ عشق اور موت کے آمیختے ہی سے عرب نجابت کا خمیر اُٹھا ہے"[1]

---

[1] Islam & the Perennial philosophy, p.91

Marfat.com

یہ شرافت اور نجابت آج بھی عرب دنیا کی شخصیات میں پائی جاتی ہے، اگرچہ عوامی شخصیات یا اِن شخصیات میں جو خود کو اسلام کے ترجمان کی حیثیت میں پیش کرتی ہیں، کم ہی دیکھنے میں آتی ہے مگر اُس انبوہِ کثیر کا کیا جائے جس کی ساخت پر داخت اسلامی ماحول میں ہوئی ہے؟ یہ کج مج زبان بالعموم اظہارِ خیال سے قاصر ہیں اور اپنا احوال نہیں کہتے۔ اس لیے ہمیں غیر جانبدار مبصروں کے بیانات ہی پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک غیر جانبدار مبصر اور مشہور امریکی ناولٹ نگار پال باؤلز ہیں جو برسوں مراکش میں رہے ہیں۔ انہیں اس لیے غیر جانبدار کہا جا سکتا ہے کہ ان کی دلچسپی تمام تر اپنے ارد گرد کے لوگوں میں تھی اور مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا ماسوائے مذہب کے اس مشاہدے سے جو لوگوں کی روزمرہ کی زندگی اور طرزِ فکر سے جھلکتا تھا۔ اپنے ایک مضمون "مصطفیٰ اور اس کے دوست" میں انہوں نے مراکش کے ایک ٹھیٹ مسلمان لڑکے کی زندگی افسانوی رنگ میں پیش کی ہے۔ اس لڑکے کے مغربی ہم سر کو تو بس فٹ بال اور ڈسکو وغیرہ سے شغف ہے۔ یوں وُہ "مصطفیٰ" کے ذریعے اسلام کی سماجی زندگی اور ہم عصر مغربی دُنیا کا موازنہ کرتا ہے۔

مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اور اہلِ رائے افراد مصطفیٰ کی اس شبیہہ سے یقیناً باؤلز کو دیگر غیر ملکیوں ہی کی طرح عرب قوم اور اسلامی احیاء کا مخالف سمجھے گا۔ یہ طبقہ مصطفیٰ کی تصویر کشی کے مستند ہونے سے انکار نہیں کر سکتا لیکن وُہ اُسے کسی ایسی رکاوٹ کا نمائندہ سمجھے گا جس کے دُور ہونے ہی سے "خالص دین" تک رسائی ممکن ہے اور جو ماضی کی باقیات میں سے ہے اور جسے بھول جانا ہی اچھا ہے کہ یہ لوگ کہیں گے کہ عیسائیت کے برعکس اسلام اسی دُنیا کا نام ہے۔ یہ سماجی ذمے داریوں اور مثالی سیاسی نظریات کا مذہب ہے۔ اس اندازِ نظر کے تحت مصطفیٰ کو "تمیز" سکھانے اور "صحیح اسلام" کی تعلیم کی ضرورت ہے تاکہ وُہ دُوسرے لائق نوجوانوں کے ساتھ، انقلابی جھنڈے تلے "فلاں، فلاں مُردہ آباد"، "امپیریلزم کے بدنہاد غلام ہائے ہائے" کرتا پھرے۔

یہ تو خیر اپنی رائے ہے غریب مصطفیٰ کو امپیریلزم (مغربی شہنشاہی استعمار) کے

Marfat.com

متعلق کچھ معلوم نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ وُہ اُن ذہنی اُلجھنوں اور اندرونی کرب سے آزاد ہے جس میں اِس کے تعلیم یافتہ بھائی مبتلا ہیں اور اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ جو مذہب میں اِس کا اوڑھنا بچھونا بنا ہُوا ہے اُسے عرب قوم کے فخر و مباہات کے اظہار کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ مصطفیٰ ایک سیدھا سادا، بے ضرر انسان ہے؛ تاہم وُہ "عوام" میں سے ہے (جن کے نام پر نعرے ڈھالے جاتے ہیں) پُوری اسلامی تاریخ میں جب بادشاہ ایک دُوسرے کو قتل کرتے رہے، فلسفی، منطقی اور ائمہ دین لمبے لمبے مباحث میں غلطاں و پیچاں رہے اور مصلحین اپنا کام کرتے رہے، عوام اپنی دُھن میں مگن اپنی راہ چلتے رہے ہیں اور اُن کے قول و فعل کو شاید ہی خاطر میں لائے ہوں۔ ہوسکتا ہے مصطفیٰ اور اس کے ساتھی ان فلسفیوں اور مصلحین کی نسبت زیادہ دیر تک "زندہ" رہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گرد بھی کچھ "مصطفیٰ" قسم کے نوجوان تھے جن کے ساتھ آپؐ محبّت اور شفقت و رحمت کا برتاؤ کرتے تھے۔ جس کا تتبّع آپؐ کے بعد مذہبی قائدین و ائمہ نے نہیں کیا۔

باؤلز کہتا ہے: "ہوسکتا ہے مصطفیٰ بہت تھوڑی تعلیم رکھتا ہو یا چٹّا جاہل ہو۔ ہوسکتا ہے وُہ مذہب پر پُوری طرح عمل پیرا ہو یا جزوی پابندی کرتا ہو یا بالکل تارک ہو، مگر وُہ ہمیشہ خود کو مسلمان ہی کہے گا اور اس کی اوّلین وفاداریاں اور ہمدردیاں اپنے ساتھی مسلمانوں ہی سے وابستہ ہوں گی خواہ وُہ کسی مُلک کے ہُوں۔ اگر مصطفیٰ ہندو یا بُدھ مذہب کا پیرو ہوتا تو ہمارے اور اس کے مابین شاید اتنا نمایاں فرق و اختلاف نہ ہوتا کیونکہ دُنیا میں کوئی اور دین یا مذہب ایسا نہیں جو اپنے پیروکاروں سے اپنے عقائد اور ارکان کی اِس درجے تو تعمیل کا تقاضا کرتا ہو جیسی کہ مُلک و قومیت سے ماورا یہ برادری، جسے اسلام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کرتی ہے۔ ہم مغرب کے رہنے والوں میں کوئی کتنا ہی بڑا خیال پرست اور مفکّر کیوں نہ ہو، وُہ زندگی کی غایت کو اس کے ثمرات ہی سے ناپے گا۔ اس غایت کی تعریف ہمارے ہاں بڑی مؤثر ہے کہ

Marfat.com

ہر فرد کو زندگی کو حسن اور جلا بخشنے کے لیے اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے؛ خواہ وُہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ مصطفٰے زندگی کو اس انداز سے نہیں دیکھتا۔ اس کے لیے یہ لغو اور بے معنی ہے کہ ہم ہر وقت عمل پر زور دیں، اس آرزومندی میں دن گزاریں کہ دُنیا کو جیسا ہم نے پایا تھا اس سے بہتر چھوڑ کر جائیں، اور نئے نئے خیالات اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کی اَن تھک کوشش کرتے رہیں۔ اگر مصطفٰے سے پُوچھیے تو وُہ یہی کہے گا کہ ہم اس دُنیا میں اس لیے نہیں بھیجے گئے ہیں کہ ہر وقت کام ہی کرتے رہیں، ہم یہاں عبادت کیلئے آئے ہیں۔ بس زندگی کا مقصدِ حقیقی یہی ہے۔ اُس کے لیے زندگی گزارنے کا جمہوری طریقہ اور شہری ذمے داریوں کا احساس کچھ معنی نہیں رکھتا۔

سچ تو یہ ہے کہ مصطفٰے ایک زبردست سیاح اور مہم جُو ہے۔ اُسے زندگی سے الف لیلہ کا سُرور اور خمار کی طلب ہے، اور اگر اس میں یہ لذّت مفقود ہو تو وُہ اُسے فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وُہ پرخطر زندگی گزارنے میں یقین رکھتا ہے اور اکثر اوقات اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے نہیں چُوکتا۔ باؤلز کہتا ہے: "اُس کی وجہ یہ ہے کہ وُہ اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ کسی عمل کا کوئی نتیجہ یا مکافات بھی ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اعمال اور نتائج ایک دُوسرے سے علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں کاتبِ تقدیر نے اِن کا مقدر ازل ہی سے مقرّر اور معیّن کر رکھا ہے۔ اس کے نزدیک موت سے ڈرنا انتہائی حماقت ہے اور اپنے اعمال کے مستقبل کے نتائج سے تشویش مند ہونا بھی بے عقلی ہے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ زندگی ہی سے ڈرنا شروع کر دیا جائے۔ بس ہوشمندی اور پیش بندی مضحکہ خیز ہے، کنجوسی اور کنجوسی قابلِ ملامت ہے اور مآل اندیشی اور مستقبل کی فکر کے ڈانڈے معصیّت کو چھوتے ہیں۔ اس کے نزدیک کوئی انسان کس طرح فرض کر سکتا ہے کہ آنے والا برس تو دُور کی بات ہے "کل" کا دن بھی طلوع ہو گا یا نہیں؛ بنا بریں وُہ کیسے جرأت کر سکتا ہے کہ تقدیر کو جھانسا دے کر آنے والے وقت کے لیے خواہ وُہ مستقبل قریب ہو یا بعید تیاریاں شروع کر دے۔

Marfat.com

دانا انسان ہر وقت کمر باندھے اور زادِ راہ لیے ہوئے تیار رہتا ہے۔ وُہ اپنی آرزوؤں کی بساط کو مستقبل تک نہیں پھیلاتا کہ کہیں وُہ اس کی روح کے لیے سلاسل نہ بن جائیں اور وُہ زندگی کو خیرباد کہنے میں ہچکچائے۔ مراکش کا مصطفیٰ آپ کو بتائے گا کہ سچّا مسلمان ایک لمحے کی اطلاع پر موت کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اُسے آزادی کی شدید خواہش ہوتی ہے اور چونکہ حقیقی امداد اور اعانت اسلامی کی جانب سے ملتی ہے اس لیے وُہ دُوسروں کی اعانت کا طلب گار نہیں ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کسی فقیر کو کسی راہ چلتے شخص سے ایک ٹکا بھی بطور خیرات مل جائے تو وُہ لوگوں کو دکھا دکھا کر یہی کہتا ہے کہ دیکھو مولا کریم نے مجھ پہ کیسا کرم فرمایا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بھولے سے بھی نہیں گزرتا کہ ہر شخص اپنی بود و ماند کا راستہ خود تراشتا ہے۔ زندگی کے متعلق اِس کا عام تصوّر یہی ہے کہ اِس دُنیائے ناپائیدار میں قیام چند روزہ ہے۔ یہاں کچھ عرصے ٹھہر کر چل دینا ہے چونکہ حالات اور دُنیا میں عرصۂ قیام پر کسی کو اختیار نہیں، اِس لیے اُس سے اُسے بہت کم دلچسپی ہوتی ہے۔ واقعات کے ردّ و بدل کے باوصف، یہ تصویر اپنے اندر گہرے مضمرات رکھتی ہے۔ شاید کسی دلیل سے کہیں زیادہ وضاحت سے یہ اُس خلیج کو ظاہر کرتی ہے جو اسلامی فضا میں پرورش پائے ہوئے اذہان اور مغرب کے عام اِنسان کو ایک دُوسرے سے جُدا کرتی ہے۔ ہمعصر مسلم معاشرے کی تعلیمی اور سماجی تہیں الگ الگ ہیں۔ اِن کے درمیان حائل خلیج کو عبور کرنے کے لیے کئی پُل بنانے ہوں گے کہ صرف اسی صورت میں افہام و تفہیم کا ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔[1]

(دیئر ہیڈز آر گرین)
(لندن: پیٹر اوون) ص ۸۳-۸۹

Their Heads are Green, Paul Bowles, London, Peter Owen, pp. 83-89

Marfat.com

باب دوم

تسلسل اور تقابل

ایک بہت پرانی روایت کے مطابق، حضرت آدم علیہ السلام کو جو کہ کرۂ ارض پر پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی، اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ایک لمبے سفر کا حکم ملا۔ بہشت بریں سے کرۂ خاکی پر ہبوط کے بعد وُہ اپنی اصلی حالت کی پرچھائیں ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ اُن کے قدوقامت، اور بصارت میں بھی انحطاط واقع ہو چکا تھا لیکن وُہ اب بھی ان نفوس میں سے تھے جن سے مالکِ ارض و سمٰوات فنا اور زمان کے حجابات سے کلام کرتا ہے۔

اِن کے رب نے اِرشاد فرمایا: میرے عرش کے عین نیچے میرا ایک مقدس مقام ہے۔ وہاں جاؤ اور میرے لیے ایک گھر تعمیر کرو اور اس کے گرد اِس طرح طواف کرو جیسے تم نے میرے عرش کے گرد فرشتوں کو گردش کرتے دیکھا ہے"۔ بموجب حکم ربّی آدم علیہ السلام اِس مقدس مقام کی طرف روانہ ہوئے جو ہر دائرے کے محوری نقطے پر ہے۔ وہاں اس سماوی مرکز نے اپنا عکس ایک معبد کی صورت میں ظاہر کیا جس کی چھت ایک بہت بڑے یاقوت کی تھی اور اِس کو سہارا دینے والے

Marfat.com

ستون زمرد کے، جس کے نیچے سفید براق پتھر جس کی روشنی کی مثل دُنیا میں کوئی اور روشنی نہیں تھی۔ یہ پتھر انسانی روح کے اس اوّلین نمونۂ کمال کی طرح تھا جو ابھی امتدادِ زمانہ سے آلودہ نہیں ہوئی تھی۔

ملکوتی قوتوں کی راہنمائی میں وُہ ریگزار حجاز میں داخل ہوئے اور آخر ایک ایسی وادی میں آٹھہرے جس کے گرد پہاڑ ایک دائرہ بنائے ہُوئے تھے۔ چٹانوں اور ریت سے اٹی یہ جگہ اُس سرسبز و مشکبار مقام سے بالکل مختلف تھی جہاں آدم کا ہبوط ہُوا تھا اور بہشت کا تو اس میں شائبہ تک نہ تھا۔

حضرتِ آدم علیہ السّلام نے حُکمِ خُداوندی بجا لاتے ہوئے زمین پر گھر بنایا جس کے پتھر کوہِ سینا، جبلِ زیتون، جبلِ نسیان اور کوہِ جودی سے لائے گئے تھے۔ اِس کام کی تکمیل کے بعد انہوں نے مناسک ادا کیے اور دُنیا سے رخصت ہو گئے جس طرح ہر ذی روح کو، خواہ وُہ ایک دن زندہ رہے یا ایک ہزار سال، بالآخر رخصت ہونا ہے۔ مدّتِ مدید تک اِس مقام پر سکوت طاری رہا اور آندھیاں ریگِ صحرا سے اس گھر کو جو آدمؑ نے تعمیر کیا تھا، ڈھانپتی رہیں۔

پھر زمانہ گزر گیا اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنا عرصہ گزرا۔ دو اجنبی ریگستان میں سفر کرتے ہُوئے وادیٔ مکہ میں داخل ہُوئے۔ ان کے ساتھ ایک خورد سالہ بچّہ بھی تھا۔ مرد طویل القامت تھا، اور تقریباً اسّی برس کی عُمر کو پہنچ چُکا تھا۔ اسی برگزیدہ انسان کا نام ابراہیمؑ تھا اور تقدیرِ الٰہی سے شرفِ پیغمبری کا حامل تھا۔ اس کے ساتھ ہاجرہ تھیں۔ مصر کی ایک حسین و جمیل کنیز جن سے حضرت ابراہیمؑ کا اس کبرسنی میں ایک فرزند، اسمٰعیل تولّد ہُوا — ریت کے اُس ٹیلے کے پاس، جس نے معبدِ مقدّس کو ڈھانپ رکھا تھا۔

ابراہیم علیہ السّلام ہاجرہ اور اپنے خورد سالہ بچّے کو اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنی زوجہ اور بچّے کے لیے کچھ کھجوریں اور پانی کا ایک مشکیزہ رہنے دیا۔

آخر ایک موقع وُہ آیا جب پیاس نے اس پاک بی بی اور بچّے کو نڈھال کر دیا۔

Marfat.com

خورد سالہ اسمٰعیلؑ کو سائے کی جگہ پر لٹا کر پہاڑی راستوں پر ہاجرہ تلاشِ آب میں روانہ ہوئیں۔ کوہِ صفا پر انہیں کوئی چشمہ نظر نہ آیا، نہ مروا کی پہاڑی پہ پانی اور زندگی کے کوئی آثار دکھائی دیئے۔ سات مرتبہ وہ صفا و مروا کے درمیان اللہ تعالیٰ کا کرم طلب کرتی دوڑیں کہ ناگاہ انہیں ایک آواز سُنائی دی۔ اضطراب میں وُہ دوڑ کر اپنے لختِ جگر کے پاس پہنچیں تو دیکھا۔ ان کے فرزند کے پیچھے ایک فرشتہ کھڑا ہے جس نے اپنے پَر سے زمین پر ضرب لگائی تو اس مقام سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ رواں ہو گیا۔ یہی وُہ چشمہ ہے جو عُرفِ عام میں زم زم کہلاتا ہے اسی سے لاکھوں زائرینِ حرم آج بھی اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ اسی مقام پر ہاجرہؑ نے اسمٰعیل علیہ السّلام کی پرورش اور پرداخت کی جو عرب نسل کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ کچھ عرصے بعد شمال سے چند خانہ بدوش قبائل بھی یہاں آکر آباد ہو گئے۔ اسی جگہ پر حضرت ہاجرہؑ نے انتقال فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب لوٹے تو نوخیز اسمٰعیلؑ جوانی کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ پھر ان دونوں باپ بیٹوں نے مل کر اللہ کے گھر 'کعبۂ مکرمہ' کی تعمیر شروع کی۔ یہ تجدید تھی آدمؑ کے کام کی۔ اس کی تقلید کسی نہ کسی طریقے سے ہر آدمی کرتا ہے، کیونکہ وُہ آدم ہی کے گوشت و پوست کا ٹکڑا ہے۔ تعمیرِ کعبہ میں، اسمٰعیلؑ اپنی پیٹھ پر، پتھر باندھ کر لاتے تھے اور ابراہیم علیہ السّلام انہیں بغیر چونے گارے کے ایک دُوسرے پر جما دیتے تھے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے: وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾

"اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ مل کر کعبۃ اللہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے تو یہ دُعا اِن کے لبوں پر تھی۔ اے ہمارے رب! یہ (خدمت) ہم سے قبول فرما بلاشک تو سُننے والا (اور) جاننے والا ہے۔" (بقرہ (۲): ۱۲۷)

اور جب ابراہیم علیہ السّلام حجاز سے رخصت ہوئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے تو انہوں نے وادیٔ مکہ کے لیے برکت کی دُعا کی اور کہا:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ

"اے ہمارے رب! مَیں نے اپنے خاندان کے ایک حصّے کو تیرے

Marfat.com

مقدس گھر کے قریب ایک بنجر وادی میں آباد کر دیا ہے۔" (ابراہیم (۱۴): ۳۷)

اور انہوں نے یہ دعا بھی کی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ

"اے پروردگار! ان (لوگوں) میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان (کے دلوں) کو پاک صاف کیا کرے۔" (بقرہ (۲): ۱۲۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول ہونے میں کئی صدیاں لگیں اور وہ شفاف پتھر لوگوں کے گناہوں سے سیاہ ہو گیا اور زم زم کے چشمے کا پانی کھاری ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر اللہ کا متبرک گھر بھلا دیا گیا۔ دُور دُور پھیلے ہوئے کچھ خانہ بدوش بدوی قبائل ہی اس کی جائے وقوع سے آگاہ تھے جنہیں تاریخ نے کوئی اہمیت نہ دی۔ تاریخ کو انتظار تھا کہ اس گھر کو از سر نو دریافت کیا جائے اور انسانیت کو ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کرانے والا آئے اور پھر وقت آگیا کہ اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے قریش کے قبیلہ بنو ہاشم میں اللہ کا وہ رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوا جو اولادِ آدم میں سے آخری پیغمبر تھا اور جس کا نام نامی محمدؐ تھا۔

یہ تو ایک پیرایۂ اظہار ہے اور شاید سب سے بہتر بھی، لیکن بیان تصوّر کو الفاظ کا قالب دینے سے قاصر ہے؛ مگر تصوّر کو محض خیال آرائی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے ابداع ہی سے تمام چیزیں وجود پذیر ہوئی ہیں۔ یہی ابداع و براعت انسان کے تصوّرات پر حاوی ہوتی ہے اور اس کے تخیل کو ہر طرح مہمیز کرتی ہے بشرطیکہ وہ اس کے لیے ہمہ تن آمادہ ہو؛ تاہم اس داستان کی تعبیر اپنے اپنے ذوق کی بات ہے کیونکہ یہ کہانیاں اَن گنت معنوی پیرائے رکھتی ہیں۔

کعبۂ مشرفہ کی مکہ مکرمہ میں تعمیر اور حضرت محمد مصطفٰے علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی روایتی داستان میں بڑا ہتا جو بات اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک احساسِ تسلسل ہے جو ہر مقدس تاریخ کو باہم مربوط رکھتا ہے۔ اسلام کے ہر اعلان و

Marfat.com

اظہار میں اس تسلسل کی کارفرمائی واضح انداز میں نظر آتی ہے ۔ اس کے برعکس ہو بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ جس دین کی بنیاد توحید اور اتحاد پر تھی اُسے لازماً ایک تسلسل کا دین ہونا تھا جو ماضی سے کوئی فصل یا انقطاع گوارا نہیں کرتا اور وقت اور زمانے کو اجازت نہیں دیتا کہ حقیقتِ ازلی سے وابستہ عناصر کو منتشر کر دے۔

اگر قرآنِ مبین کا پیغام بالکل "نیا" ہوتا تو نقشۂ عالم بگڑ جاتا، تسلسل کا رشتہ ٹوٹ جاتا اور حکمتِ الٰہی پر شبہ گزرتا جو بالطبع غیر متبدّل ہے۔ یہ بات قرآن مجید نہایت واضح انداز میں بیان کرتا ہے: مَا یُقَالُ لَکَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِکَ ۔

(ترجمہ) "(اے محمدؐ) آپ سے جو کچھ کہا جاتا ہے، وہی ہے جو آپ سے پہلے ہو گزرنے والے پیغمبروں سے کہا گیا تھا۔" (حٰمٓ سجدہ (۴۱): ۴۳)

"اگر (نعوذ باللہ) اللہ تبارک و تعالیٰ ماضی میں دیے گئے اپنے ارشادات و احکامات کی تردید کرتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آخر خدا نے سابقہ ادوار کے لوگوں کو ہدایت و راہبری سے کیوں محروم رکھا یا خدا جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے اتنا طویل توقف کیوں کیا۔؟"

قصۂ آدم کے ضمن میں عیسائیت اور اسلام کے نقطۂ نظر میں ایک اہم تضاد اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ عیسائیت کے نزدیک آدم کا "گناہ" اور اس "گناہ" کی وجہ سے کائناتی توازن میں جو برہمی پیدا ہو گئی تھی، عیسیٰؑ کے مصلوب ہوئے بغیر درست نہیں ہو سکتی تھی؛ جب کہ ہبوطِ آدمؑ کے متعلق اسلام کا تصوّر یہ ہے کہ آدمؑ کو معاف کر دیا گیا تھا، تاہم وہ اس لغزش کے عواقب سے محفوظ نہ رہ سکے اور انہیں اس کے بعد بہشت میں قیام کی اجازت نہ ملی۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق عیسیٰ علیہ السّلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہی سے یہ مطلوب نہیں تھا کہ پورے عالم کے گناہوں کا کفّارہ ادا کریں بلکہ ان کا کام یہ تھا کہ آدم علیہ السّلام کو جو پیغام دیا گیا تھا، بدلے ہوئے زمانوں کے مطابق اس کو دُہرائیں کیونکہ انسانوں کا بنیادی گناہ صرف یہی ہے کہ ہم زود فراموش واقع ہوئے ہیں۔ اگر ہم طبعاً عہدِ فراموشی اور (حقیقت پر وہم کو ترجیح دیتے ہوئے)

Marfat.com

اصنام پرستی سے مبرّا ہوتے تو پھر کسی بات کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اسی باعث بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کم و بیش انسانیت کے اوّلین مذہب یعنی حکمت ازلیہ کی بحالی اور احیاء کا نام ہے۔ خود قرآن مجید نے اس کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ

"اُس نے تمہارے لیے وہی دین ٹھہرایا جو نوحؑ کے لیے مقرر کیا تھا اور جو ہم نے اب تجھ پر وحی کیا اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تاکہ تم دین پر (مضبوطی) سے قائم ہو جاؤ اور اس میں تفرقے کا شکار نہ ہو جاؤ۔" (شوریٰ (۴۲): ۱۳)

یہ مذہب، یہ حکمت و دانش پوری انسانیت کا اسی طرح ورثہ ہے جیسے ہوائیں، سمندروں کا مدّ و جزر اور خود پورا کرۂ ارض۔ ہر انسان کو دو کان اور دو آنکھیں بھی دی گئی ہیں۔ اگر اس کا دل "بیمار" نہ ہو تو بحیثیت انسان اس پر خدا کی عطا کردہ حکمت کے دروازے وا رہتے ہیں۔ یہ حکمت موروثی ہی نہیں اس کی فطرت کا جزو بھی ہے، اور ان میں بھی اس کی لَو جھلکتی ہے۔ جو لوگ بظاہر بہت ہی کم فہم، بے عقل اور ناواقف ہیں اگر یہ نہ ہو تو پھر ان کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔

اِسلام چیزوں کی فطرت و ماہیت پر، جیسی کچھ کہ وُہ ہیں نہ کہ جیسی وُہ ہونی چاہئیں غیر متبدل طور پر قائم رہتا ہے۔ اولاً وُہ اس حقیقتِ متعالیہ پر قائم ہے جس کے آگے تمام روشنیاں ماند ہیں ـــــ اور ثانیاً، اِس کا اعتماد دُنیا کے قابلِ محسوس لیکن عارضی و ممکن حقائق اور انسانی تجربے پر ہے۔ شاید نپولین ذہنی طور پر مسلمان تھا کہ ایک موقع پر اُس نے کہا تھا: "اشیاء کی ماہیّت اور فطرت مری مالک اور آقا ہے۔" فی زمانہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وُہ حقائق سے آنکھیں موڑ کر خود کو خوابوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اِن کی یہ عادت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ مبارک کے قطعاً برعکس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحاظ سے حقیقت پسند تھے۔ حقیقت بنیادی طور پر ایک سنجیدہ موضوع ہے جسے نہ تو حیران کیا جا سکتا

Marfat.com

ہے نہ بہکایا جا سکتا ہے۔ ہر مسلمان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ سنجیدگی کی اِسی رُوح کو ملحوظ رکھے اور وقت و تاریخ کے شدائد کا مقابلہ کرے جس میں صبر و ثبات اور گردشِ زمانہ سے بے نیازی جوہر ایقان کا قلب اور اُس کی پُشت پناہ ہیں۔ اس کے گرد و پیش کی ہر شے تغیّر پذیر ہے مگر اسے استقامت و ثبات کا پیکر ہونا چاہیئے، اور اسی بنا پر مسلمان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وقت نے دیگر تمام مذاہب میں تبدیلیاں پیدا کر کے ان کے چہرے مسخ کر دیے ہیں مگر اسلام وعدۂ خداوندی کے مطابق وہی رہا اور وہی رہے گا جو وُہ ہے۔

اسلام کے ایک متّبع کو انسانی نمونۂ کمال یعنی فطرت یا دُوسرے لفظوں میں انسان کے اس وقار و عظمت پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیئے جس پر وُہ دستِ خداوندی سے صورت پذیر ہوتا ہے؛ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔

ترجمہ: "اپنا چہرہ راستی اور استقامت سے دین کی طرف رکھو کہ یہی فطرت اللہ ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔" (رُوم (۳۰): ۳۰)

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد یہ ہی ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو اس بات پر آمادہ کرے کہ زندگی کے ہر مرحلے اور ہر سطح پر وُہ مردِ صحیح مرد اور عورت صحیح عورت کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر سکے۔ اسلام انہیں لامتناہی پیچیدگیوں میں پڑنے سے بھی روکتا ہے، کیونکہ ان طوفانوں میں پڑ کر اس کی عظمت اور وقار کے درہم برہم ہو جانے بلکہ اس کی سالمیت ہی کے پارہ پارہ ہونے کا احتمال ہے۔ سچا مسلمان جو اپنے خالق کے سامنے بیک وقت فخر اور انکسار کے ساتھ پیش ہوتا ہے اور اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ اس کا رویّہ مغالطے اور تعجّب سے پاک ہوتا ہے، فطرتِ سلیمہ کا صحیح عکاس ہوتا ہے۔ اس میں آقائی اور چاکری دونوں صفت حدِ کمال میں ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں عیسائیت نے وحدانیت کے دائرہ عمل میں رہتے ہوئے اپنی "درونیت" اور روحانی آزادی کی خاطر یہودیت کے مقدّس قوانین اور رسوم پاش پاش کر دیے تھے۔ اس کے بعد کے معاملات کی زمام کار مسلمانوں کے

Marfat.com

ہاتھ آگئی۔ مشیتِ الٰہی نے اُنہیں یہ سمجھایا کہ توازن بحال کیا جائے اور خُدا کا آخری پیغام ایک تالیفی مگر مختصر انداز میں پیش کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے جسدِ واحد میں اتنی زیادہ بُوقلمونیاں اور تنوعات سما گئے ہیں کہ یہ گویا براہِ راست اظہار ہے باری تعالیٰ کے صفاتی نام "الواسعؔ" کا جس کے معنے ہیں توسیع والا، احاطہ کرنے والا، بڑی گنجائش فراہم کرنے والا۔ اسلام کو تین عناصر نے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا ہُوا ہے اور وُہ ہیں منزّل من اللہ کا قانون جو سب مذہبی و سماجی اعمال پر محیط ہے۔ دُوسرے حج کی فرضیت جس میں مسلمان دُنیا جہاں کے گوشوں سے آکر ایک مرکز پر مجتمع ہوتے ہیں۔ تیسرے اجماع ہے جس میں مُتقی اور عالم اہلِ اسلام کی آراء کا وزن تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسلام کا قانون بندے کے نجی معاملات اُس کے اور مولیٰ کے درمیان انفرادی رشتوں پر حملہ آور نہیں ہوتا ہے نہ اس سے کوئی سروکار رکھتا ہے کہ کوئی مرد اسلام کی بنیادی رُوحانی تعلیمات کی توضیع و تشریح کس انداز میں کرتا ہے کہ ان کا مفہوم ایسی سچائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو ظاہر و باطن میں واضح اور حقیقی ہو، مگر یہ چھوٹ اس وقت تک ملی رہتی ہے جب تک اس کا طرزِ عمل سوادِ اعظم کے مفاد سے متصادم نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسا سماجی اور نفسیاتی توازن مہیا کرتا ہے جس میں ہر شخص اپنا ہُنر آزمانے کے لیے آزاد ہے۔

عیسائیت نے اپنا سفر دُوسری اور مخالف سمت سے شروع کیا۔ اس کی کوئی شریعت ہے نہ سماج کے لیے خُدا کا دیا قانون ہی اس کے پاس ہے۔ وہ محض مسیح ناصری کے وسیلے سے خُدا کے ساتھ اندرونی تعلق پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس میں دنیاوی قانون دو مختلف روایات (یہودی اور رُومی) کے تال میل سے تشکیل پایا۔ اس جدید دَور میں اس نے بڑی آسانی سے خود کو لادین آراء و افکار سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ عیسائیت نے اپنا داخلی نقشہ بڑی تفصیل سے قابلِ قدر مگر پیچدار دینیات سے ترتیب دیا ہے جب کہ دُوسری طرف مسلم دینیات نے مسلمانوں کی روحانی زندگی میں کبھی دخل اندازی نہیں کی نہ بجبر منوایا۔ کوئی چاہے تو اس سے عقائد کی تشریح تلاش کر

Marfat.com

لے اور چاہے نظر انداز کر دے۔ یہ ایک ایسا اوزار تھا جو عموماً کام میں نہ لایا گیا۔ جہاں تک عیسائیوں کی روحانی زندگی کا تعلق ہے تو وہ پادریوں اور اسقفوں کے رحم و کرم پر تھی چونکہ اسلام میں کوئی پروہت یا پیشوا نہیں، اِس لیے مسلمان دلی طور پر اپنے رب کے ساتھ یک و تنہا ہوتا ہے۔ حقیقتِ مُطلقہ اور اس کے درمیان کسی واسطے یا وسیلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

عیسائی اپنے مقصد کو پانے کی جو اس کی نظروں سے اُوجھل ہوتا ہے، تڑپ رکھتا ہے جو یاس انگیز بھی ہے اور آبرومندانہ بھی لیکن وہ ہمیشہ اُس جانب ایسے انداز اور مزاج سے بڑھتا ہے جو کسی مسلمان کو گوارا نہیں۔ مسلمان کو کسی اور کے در کی جبہ سائی نہیں کرنی پڑتی کیونکہ سب کچھ اس کے اندر ہے اور اس کی فوری پہنچ میں ہے۔ اِنسان بننے کے لیے اُسے بے حد جد و جہد کی ضرورت ہے۔ یقیناً رجعت الی الاصل کے پس منظر اور بنیادی عقائد کے اعادے کے باعث اسلام کو اس سے پہلے آنے والے تمام مذاہب کی تالیف کہا جاتا ہے۔ خُدا کے نازل کردہ مذاہب کے قصرِ عظیم میں اسلام نے آکر آخری خشت رکھی۔ اِسی بنا پر ہر مسلمان یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی صداقت کی توثیق دُوسرے مذاہب سے بھی ہونی چاہیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "فراست مومن کی وہ نافۂ گم گشتہ ہے جسے وُہ جہاں پائے حاصل کر لیتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ وُہ کہاں ملی"۔ مغربی مصنفین کا عام وطیرہ یہ ہے کہ جب وُہ مختلف اقوام میں اسلام کی مختلف ہیئتوں اور اشکال کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اسلام قبل از اسلام خیالات کو دامن سے جھٹک پھینکنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ قرآن کا دین ایسے خیالات کو مٹانے نہیں آیا تھا بشرطیکہ انسانی خواہشات اور جانبداری نے اُنہیں مسخ نہ کر دیا ہو کیونکہ وُہ ماضی کے روحانی خزینوں کا وارث ہے۔ کوئی بھی صداقت اسلام کے لیے غیر نہیں کہ اس عظیم دریا میں بہُت سے چشمے وقت کے دھارے کے ساتھ آکر مل گئے ہیں۔ یہ دریا اب بھی سمندر کی جانب بہہ رہا ہے۔

قرآنِ حکیم نبیٔ کریم کو مخاطب کرتے ہُوئے فرماتا ہے: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

Marfat.com

ترجمہ: "(اے نبیؐ) ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں۔ اُن میں سے کچھ کے متعلق آپ کو بتا دیا ہے اور کچھ کے متعلق نہیں بتایا ہے (مومن (۴۰) : ۷۸)

اور مارٹن لنگز (ابو بکر سراج الدّین) کہتے ہیں "یہودیت اور عیسائیت کے برعکس اِس سلسلے کے مذاہب میں آخری اور خاتم ہونے کے باعث اسلام دُوسرے مذاہب کی طرف رواداری رویّہ رکھنے کی اہلیّت رکھتا ہے۔ مزید برآں اس مذہب کی حیثیت اس سلسلے میں ایک "جامع" کی ہے جس کے باعث وُہ انصاف سے یہ بتانے پر قادر ہے کہ اس سے پہلے کیا کچھ ہو گزرا ہے۔ اُس نے جن اُمور کی صراحت نہیں کی ہے ان کے لیے دروازہ کھُلا تو رہنے دیا ہے"[1] اسی سلسلے میں ڈاکٹر لنگز قرآن کریم کی حسب ذیل آیت کا حوالہ دیتے ہیں: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾

ترجمہ: "جو لوگ خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کریں گے خواہ وُہ مسلمان ہوں یا یہودی ستارہ پرست ہوں یا عیسائی، ان کو (قیامت کے دن) نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وُہ غم ناک ہوں گے (المائدہ (۵) :

کسی ایک مذہب کو خُدا کے بھیجے ہوئے دُوسرے مذہب سے جو گہرا ربط ہے وُہ مذہب کے ہر لحاظ سے انتہائی قدیم ہونے کا ثبوت ہے۔ جب تک ہمارے پاس کوئی ایسی کسوٹی نہ ہو جس سے ہم مذہب کی قدامت اور صداقت پرکھ سکیں، ہمارے پاس ان تمام جھوٹے نبیوں یا غلط مذاہب پر فیصلہ صادر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جنہوں نے بالخصوص اِس صدی میں سر اُٹھایا۔ ہمارے سامنے حالیہ عرصے میں جونز ٹاؤن، گی آنا کے مسٹر جونز کی مثال ہے جنہوں نے اپنے پیروکاروں کے ساتھ اجتماعی خودکشی کر کے خود ہی ہر قسم کے الحاد کا پردہ فاش کر دیا ہے۔ مگر الٰہی مذاہب کی صداقت و

---

1. "With All they Mind", published in Studies in Comparative Religion, Winter-1976

Marfat.com

قدامت مظاہر اور عقائد میں توازن رکھتی ہے۔ مربّع اور مثلّث مختلف اشکال ہیں مگر وُہ دونوں ہندسہ ہی سے متعلق ہیں۔

دین کی ہمہ گیری اِس بات کو مکمل طور پر ختم نہیں کرتی کہ اس کے پیرو اُسے بلا شرکتِ غیرے اپنی ہی میراث سمجھ لیں۔ اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے: کیا مسلمان عیسائیت اور دُوسرے روایتی مذاہب کو دینِ حقہ کی حیثیت سے تسلیم کرتے اور انہیں راہِ نجات سمجھتے ہیں ؟ اس بات کا کوئی دو ٹوک جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس موضوع پر آراء ہمیشہ مختلف رہی ہیں اور آج بھی یہ سُننے میں آتا ہے کہ دُوسرے مذاہب کے پیروکار عذاب سے صرف اسی صورت میں بچ سکیں گے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ انہیں اسلام لانے کا کبھی موقع نہ ملا۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کو جہاں کہیں غلبہ حاصل ہُوا اس نے مثالی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے درمیان رہنے بسنے کے مواقع فراہم کیے اور ان کے وجود کو خوشدلی سے برداشت کیا تاہم کچھ علمائے دین اور فقہاء نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ اس آخری کتاب اللہ کے نزول کے بعد اس سے قبل آنے والے تمام الٰہی صحیفوں کو منسوخ سمجھنا چاہیے۔ پرانے مذاہب سے چمٹے رہنے کا اللہ کے آگے کوئی عذر مسموع نہیں ہوگا۔ اپنے اس خیال کو تقویّت دینے کے لیے اُنہوں نے اس آیت قرآنی سے استنباط کیا ہے

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

” جو بھی کوئی اسلام کے سوا کسی مذہب کی پیروی کرے گا، اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور (وہ) آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہو گا۔“

(آلِ عمران (۳) : ۸۵)

چونکہ ”اسلام“ کے معنی ہیں کامل اطاعت اور خدا کے آگے خود سپردگی، اس لیے اکثر مترجمین اور مفسرین نے قرآنِ کریم کی اس آیت کا یہی مفہوم لیا ہے۔ زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ کسی انسان کے دل، دماغ اور اس کی قوّتِ ارادی کا کُلّی طور پر اللہ کا مطیع

Marfat.com

ہونا ہر مستند مذہب کا بنیادی اصول ہے۔ زمخشری کا جو بارہویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں، مؤقف یہ ہے کہ قرآن مجید اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ نازل کردہ تمام ادیان جن کی بنیاد اس کی توحید پر ہے، باوجود تمام اختلافات کے ایک ماورائی وحدت میں پیوستہ ہیں، اگرچہ مکانی حالات کے سبب ان کے احکام و ارکان میں ان کے ماننے والوں کے مصالح کے لحاظ سے فرق ہے۔

بہر حال یہ بات بھی نظر میں لینی ضروری ہے کہ دیگر جماعتوں کی طرح امتِ مسلمہ میں بہت سے ایسے مومنین ہیں جو اس خیال سے سرشار ہیں کہ تنہا وہی سیدھے راستے پر ہیں اور باقی تمام لوگ گمراہ ہیں۔ فطرتِ انسانی کا خاصہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے دین کا خصوصی حق جماتا ہے اور اُسی کو سچا سمجھتا ہے۔ اس کے اس خیال کو یہ حقیقت بھی تقویت پہنچاتی ہے کہ اگر مختلف مذاہب کو ایک دُوسرے سے متمیز ہونا ہے تو لازماً اُن کے اہم نکات بھی الگ ہونا چاہییں۔

کسی بھی مذہب کے عام سیدھے سادے پیرو سے اگر یہ کہا جائے کہ تمہارے دین کے علاوہ دوسرے ادیان بھی خُدا تک پہنچنے میں معاون ہیں تو یہ بات اُسے طمانیت مہیّا کرنے کے بجائے اُلٹا پراگندہ کر دے گی۔ یہ بات مذہب پر اس کے ایمانِ واثق کو بُری طرح دھچکا پہنچائے گی اور اس کی زندگی کو ناآسودگی سے دوچار کر دے گی۔ کسی کے ایمان و ایقان کو، خواہ وُہ کیسی ہی تنگ نظر اور متبدل عقائد پر مبنی ہو، متزلزل کرنا سنگین معاملہ ہے؛ بالخصوص جب اس کی جگہ پُر کرنے کو ایسے عقائد بھی موجود نہ ہوں جو اس کے سادہ ذہن کو مطمئن کر سکیں۔ بہر حال شوق اور ولولے کے بغیر ایمان مضمحل ساجذبہ ہے۔ ہمیں اِن پُرجوش لوگوں کے ایمان کو جو تنگ نظر خیالات رکھتے ہیں، متزلزل کرتے وقت سوچنا ضرور چاہیے کہ ہم ٹھیک کر رہے ہیں یا غلط!

بیسویں صدی کے آخری دَور کے غیر معمولی حالات کی بنا پر رُک کر سوچنے کے عمل کو زیادہ طول بھی نہیں دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر قدیم ادوار میں اسلام

Marfat.com

اور عیسائیت کے مابین عدم رواداری کا عنصر مذاہب کی اپنی اپنی دُنیا کی سالمیت برقرار رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا تھا اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک روحانی طور پر خود کفیل تھا۔ [1] جیسا کہ قرآن میں آیا ہے، منشائے باری تعالیٰ ہے کہ ایسی مختلف دُنیائیں انسانیت کے جسد واحد میں ساتھ ساتھ رہیں اور یہ ایک فطری بات تھی کہ ہر دین اپنے تحفظ کے لیے اپنے گرد ایک فصیل ایستادہ کر لے تاکہ وُہ خیالات اور نظریات جو اِس کے عقائد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے اس میں دَر نہ آئیں، لیکن حالیہ زمانے میں انسانیت کا نقشہ یکسر بدل گیا ہے اور ایک گروہ ایسا ہے جو اس تبدیلی سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ دُنیا میں ہمارا عرصۂ حیات ختم ہو رہا ہے اور یومِ حشر کچھ دُور نہیں جب تمام مذاہب کے پیرو اپنے اعمال کی میزان لیے اپنے واحد خالق و مالک کے رُوبرُو مجتمع ہوں گے۔ کچھ بھی ہو آج تمام مذاہب معاندانہ اور متحارب انداز میں ایک دُوسرے کے مقابل ہیں اور ایسے سوالات اُٹھ رہے ہیں جو ماضی میں کبھی نہیں اُبھرے تھے۔

کسی مسلمان کے لیے دُوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے بالمقابل اِن سوالات سے بچنا محال ہے۔ دُوسری طرف مذاہب کے اپنے گرد فصیل بنا کر علیحدگی میں رہنا اب کسی طرح تحفظ کا ضامن نہیں رہا بلکہ کمزوری اور مغلوبیت کی علامت ہے۔ وُہ مسلمان اور عیسائی جو عادتاً تمام دُوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو بے دین اور کافر سمجھتے آئے تھے آج خود سے یہ سوال پُوچھنے پر مجبور ہیں کہ آیا وہ ایک ایسے خدا پر ایمان

---

[1] یہاں یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد اپنے دین کو جاننے کے ساتھ دُوسرے ادیان کے وجود سے بھی واقف تھے مگر ان کی آنکھیں اس روشنی سے خیرہ ہو رہی تھیں جو براہِ راست اِن کے سروں پر ضوفگن تھی اور ان سے بہت دُور جو روشنیاں اُفق میں آڑی ترچھی چمک رہی تھیں وُہ اِن کے لیے کوئی مثبت انداز کی کشش اور دلچسپی نہیں رکھتی تھی اور اس سے کوئی مسائل بھی جنم نہیں لیتے تھے۔

1. Ancient Beliefs & Modern Superstitions, Martin Lings

Marfat.com

جاری رکھ سکتے ہیں جس نے اپنی مخلوق کی اکثریت کو ہر دور میں جھوٹے مذاہب کے اتباع کی چھوٹ دی اور وہ اُنہیں جہنم میں صرف اس لیے بھیجے گا کہ اُنہوں نے اس کی عبادت تو کی مگر غلط طریقے سے۔ ایک اور سوال یہ اُبھرتا ہے کہ کیا وہ عبادت رائیگاں جائے گی جسے ہمارے اپنے مخصوص طریقے سے ادا نہ کیا گیا ہو؟ یا خدا صرف وہی دُعائیں سُنتا ہے جو عیسائیوں کے نقطۂ نگاہ سے، عیسیٰؑ کے نام اور وسیلے سے اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے دینِ اسلام کے دائرے میں رہ کر مانگی گئی ہوں؟ اپنے دین وایقان کو ایسے فرضی نظریات کا سہارا دینا مارٹن لنگز کے بقول یوں ہے جیسے "قدرت کے بارے میں بدگمانی" ہو — اور ابنِ عربی کا کہنا ہے کہ جو مسلمان اپنے دین کے سوا دُوسرے ادیان میں ذاتِ الٰہی کا مظہر نہیں دیکھتا اور اپنے رب کو صرف اسی دین میں محدود سمجھتا ہے، وہ گستاخ اور گنہگار ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جونہی ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ان کے عوامل وعواقب نظر میں آتے ہیں، ہر "محصور" دین خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ پھر یہ سوال بھی کسی صاحبِ ایمان کے دل میں اُبھرتے ہیں کہ اگر دانشمند اور نیک نیّت مرد وزن بھٹک سکتے ہیں تو زود یا بہ دیر وہ خود بھی گمراہ ہو سکتا ہے اور کسی بڑے "شعبدے" کا شکار ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اگر ایک انبوہِ کثیر گمراہی کی دلدل میں پھنس سکتا ہے تو اعداد وشمار کے نقطۂ نگاہ سے وہ بھی وسوسوں اور فریبِ نظر میں گرفتار ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس دین کے اپنے مفادات، جس کے نام پہ دُوسرے تمام مذاہب کے لوگوں کی تکفیر کی گئی، بُری طرح مجروح ہوتے ہیں کیونکہ ایک کہاوت کے مطابق "چاہ کَن را چاہ در پیش!"

گزشتہ صدی میں مغرب میں مذہبی میلان کی تباہی میں اس نظریے کا بڑا ہاتھ ہے۔ اب مذہب کے ماننے والے کو کچھ ایسے متبادل سوالات کا سامنا ہے جن سے اس کے اجداد دوچار نہ تھے۔ وہ یہ کہ یا تو تمام مذاہب جھوٹے اور ناقابلِ یقین افسانہ طرازی پر مبنی ہیں جنہیں انسان نما حیوانوں نے ایک لایعنی کائنات میں بے مقصد زندگی سے اکتا کر بائی سمجھ لیا یا پھر یہ کہ ہر مذہب اپنے دائرے میں صحیح اور دُرست ہے اور خصوصی نقطۂ نظر کے حوالے سے ایسی حقیقت کی تعبیر ہے جسے کسی ایک ہی ساخت میں سمویا نہیں جا سکتا۔

Marfat.com

اگر مذاہب کے متعلق جن میں بے حد تضادات ہیں، انسان اگر دوسرے نقطۂ نظر کو اپنانا ہے تو پھر اُسے ایک اور دشواری کا سامنا ہے۔ ایک طرف تو اپنے عجز و انکسار کے تحت، اُسے یہ اصول تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خُدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اس علیم و حکیم کی حکمتیں اور اسرار انسانی ذہن سے بالا ہیں، کیونکہ محدود فکر کسی لامحدود ذات کا ادراک اور احاطہ نہیں کر سکتی، مگر اس سلسلے میں مسلمان خوش قسمت ہیں کہ قرآن مبین میں حقیقتِ عظمیٰ کی آفاقیت کے اشارے موجود ہیں۔ وہ حقیقتِ عظمیٰ جو ہر قسم کے اظہار اور تعبیر سے ورا ہے۔ قرآن مبین اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾

ترجمہ: "ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لیے شریعت اور منہاج مقرر کیا ہے اور اگر خُدا چاہتا تو سب کو ایک ہی اُمّت بنا دیتا مگر جو حکم اس نے تم کو دیے ہیں اس میں وُہ تمہاری آزمائش کرنی چاہتا ہے۔ سو نیک کاموں میں جلدی کرو۔ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر جن باتوں میں تم کو اختلاف تھا وُہ تم کو بتا دے گا۔" (مائدہ (۵): ۴۸)

پس مسلمان کو اس آخری اشارۂ خداوندی کا منتظر رہنا چاہیے جب کہ اس کا دین سب سے بہتر ثابت ہو گا۔ اس بات کو قبول اور تسلیم کرنے میں کسی عیسائی کی راہ میں بڑے سنگ ہائے گراں حائل ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا رابطہ خُدا سے تنہا عیسیٰ علیہ السّلام ہی کے واسطے اور وسیلے سے ہو سکتا ہے؛ البتہ وُہ کسی کلیسائی شخصیت کی جو مذہبی آفاقیت میں شہرت نہ رکھتا ہو، پیروی کر سکتا ہے۔ پوپ پائیس یازدہم تے کوئی ساٹھ سال گزرے، لیبیا کو ایک مسیحی وفد روانہ کرتے ہوئے اپنے خطبے میں کہا تھا: "یہ نہ سمجھ لینا کہ تم کافروں کے درمیان رہنے جا رہے ہو مسلمان بھی بخشش اور نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ اللہ کی طرف لے جانے والے راستے لامحدود ہیں۔" دُوسری طرف کوئی صاحبِ ایمان، اگر اس کا دل کہے تو، مابعد الطبعیات کی راہ اختیار کر لے یا اپنے

Marfat.com

عقلی وجدان کے پیچھے چل پڑے اور اسے معلوم ہوگا کہ ابنِ عربی کے الفاظ ہیں" ربّ الادیان" خدلئے مطلق نہیں، یا ایسا خدا نہیں جیسا ہم سمجھتے ہیں۔ اس پر یہ حقیقت بھی کھُلے گی کہ خُدا کی جیساکہ وُہ ہے، کوئی جامع و مانع تعریف ممکن نہیں۔ وُہ تو ہر تصوّر اور ہر صورت سے منزّہ ہے، اس لیے وُہ ہماری عبادات سے بھی ماوریٰ ہے۔ اب چونکہ ہم خاکی اپنی کم مائیگی کے باعث ایک ایسی ذات کی عبادت کے اہل نہیں ہو سکتے جس کا ادراک سرے سے کسی کو نہ ہو۔ اس لیے اس ارحم الرّاحمین نے ہماری خاطر خود کو کچھ ایسی تعیّنات میں ظاہر کیا ہے جو عبادت گزاروں کے اذہان اور حسیّات نے قائم کی ہیں تاکہ وُہ پہچانا جاسکے اور اس سے محبّت کی جاسکے، کیونکہ ہم فطری طور پر اُسے جانتے اور اُس سے محبّت کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اگر اس نے ہمیں کچھ عطا کیا ہے، ہمیں تعیّنات میں قید، اور بے شمار مظاہر میں خود کو آشکار کیا ہے تو خاکم بدہن ہم نے بھی اُسے اپنی سجدہ ریز جبینوں کا خلوصِ بندگی دیا ہے۔ نظرِ تعمق سے تو ہم پر تحدیدات عائد کر رکھی ہیں تعینات کے پردوں میں ایک مرتبہ اگر اس حقیقت کا اثبات ہو جائے کہ مذاہب اور طرز بندگی کی مختلف النوع اشکال درحقیقت ایک ہی حقیقتِ اصلی کے مختلف حجابات اور لبادے ہیں تو پھر کوئی صاحبِ ایمان اپنے مذہب کے پس منظر کی طرف رجوع کرتے ہوئے زیادہ آزاد ذہن اور قلبِ مطمئن کے ساتھ ان عبادات کو ادا اور اُس اخلاقی لائحہ عمل پر گامزن ہو سکتا ہے جو اس پس منظر و ماحول سے تعلق رکھتی ہوں۔

عظیم مجاہد امیر عبدالقادر الجزائری فرماتے ہیں: "ہمارا خُدا اور ان مذاہب اور اقوام کا خُدا جو ہمارے مخالف ہیں حقیقت میں اپنے مختلف مظاہر کے باوصف ایک ہی خُدا ہے جو لاشریک ہے۔ اس نے اُمّتِ محمّدیہ کے سامنے ہر صورت سے ماوریٰ ہو کر مگر ہر صورت میں اپنے مختلف مظاہر کے باوصف ہو کر خود کو ظاہر کیا، عیسائیوں کے سامنے اس نے اپنا جلوہ عیسیٰ ابنِ مریم ہی کے ذریعہ دکھایا ہے۔ وُہ اپنے عبادت گزاروں پر ہر اُس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں وُہ چاہتے ہیں کیوں کہ کوئی بھی عبادت گزار کسی معلوم اور محدود شے کو محض اس شے کی خاطر نہیں پُوجتا۔ درحقیقت وُہ اِس شے میں صفاتِ باری تعالیٰ کے ذریعے کسی مافوق الفطرت ہستی کو پُوجتا ہے۔" البتہ ہر عبادت میں اُس "ایک" ہی کی پرستش

Marfat.com

کرتا ہے کہ انہوں نے اِن صفاتِ باری کو بہت محدود انداز میں متعین کیا ہے۔[1] ایک دفعہ عیسائیوں نے امیر عبدالقادر کے ملک "الجزائر" پر حملہ کیا تھا اور اُس نے اُن کے خلاف اس لیے جہاد کیا تھا کہ وُہ ایک مسلمان تھا۔ امیر عبدالقادر کو دمشق میں جلاوطن کر دیا گیا تھا، اس کے باوجود اس نے ایک مقامی بلوے میں عیسائیوں کی جانیں بچائیں اور انہیں اپنے گھر میں پناہ دی کیونکہ وُہ ہوشمند اور دانا انسان تھا؛ البتہ جو لوگ اُسے کافر و مشرک قرار دیتے تھے وُہ اس کی تلوار کے گھاٹ چڑھتے تھے کیونکہ چھوٹے لوگ بڑوں کو للکار کر خود کو اسی طرح ہلاکت میں ڈال لیا کرتے ہیں۔

کوئی مسلمان اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے دین اور اعمال کی جڑیں قرآن مجید میں پیوستہ ہیں۔ اگر اس سے یہ اخذ کر لیا جائے کہ جو کچھ اس صحیفۂ مقدس میں درج ہے صرف وہی حقیقی طور پہ اسلام ہے، باقی سب کچھ بدعت ہے تو اس صورت میں یہ قرآن کی آفاقیت اور اس کی ہمہ گیری کے انکار کے مترادف ہوگا کیوں کہ جب قرآن مبین سے صحیح تاریخ کی ابتدائی روایات اور دیومالائی اساطیر میں پائی جانے والی کچھ قدیم صداقتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے یا جب وُہ کچھ مابعدالطبعیاتی نظریات کی جیسے نوفلاطونیت وغیرہ کا ذکر ہے تو ایسا کرنے میں وُہ ڈوبتوں کو نجات اور تحفظ کی وُہ ڈور مہیا کر دیتا ہے جس سے تمام بھٹکے ہوئے مرد و زن فلاح پا سکتے ہیں۔ اِن باتوں اور اِن اذکار سے وُہ بجز آفاقی صداقت یا قدیمی صداقت یعنی دینِ فطرت کی ایک جہت ہماری نظروں کے سامنے نمایاں کر دیتا ہے۔ اس بات سے ہمیں یہ بھی یاد آتا ہے کہ اس رحمٰن و رحیم نے ہم سے پہلے لوگوں کو کسی گمراہی میں مبتلا نہیں کیا، نہ ان کی ہدایت و رہنمائی میں کوئی کوتاہی کی۔

اِنسان کے مختلف طبقوں اور زبانوں میں نازل شدہ کلامِ خداوندی کا وظیفہ یہ نہیں کہ وُہ ہر بات اور ہر مسئلے کی تمام تر جزئیات پر بحث کرے؛ تاہم اس سے یہ بات اخذ نہیں کر لینی چاہیے کہ صداقتِ حقیقی کی تلاش میں روحانی، ذہنی اور تصوراتی

---

[1] ازموقف عبدالقادر موقف نمبر ۲۳۶ فرانسیسی ترجمہ، M. Chod kiemicz Editions

Marfat.com

کسی کد و کاش سے دستبردار ہو جانا مناسب ہے۔ جو لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی رائے یا خیال کی تائید اگر قرآن و حدیث سے نہ ہو تو اسے ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیئے، اپنے حسابوں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے دین کو "خالص" رکھنے کی جدوجہد کر رہے ہیں جب کہ حقیقت میں وہ اسلام کی ہمہ گیری اور آفاقیت کو ایک تنگنائے میں بند کر کے اُسے محض "فرقہ وارانہ" مذہب بنا دینے کے سامان کرتے ہیں۔

ایسے لوگ کتنا ہی انکار کریں لیکن دراصل اس رویے میں اُن مستشرقین سے متاثر ہوئے ہیں جنہیں وہ بڑے زور و شور سے بُرا بھلا کہتے ہیں کیونکہ اس خیال کا آغاز کہ گزشتہ صدیوں میں دُوسرے مذاہب کی رسم و روایات سے بہت سے عناصر مستعار لیے ہیں جن سے اِن کا پورا کردار ہی بدل گیا ہے، مغرب ہی سے ہوا تھا۔ مستشرقین دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن کا دیا ہوا مذہب اتنا "دہقانی" تھا کہ ایک ایسی انتہائی شاندار اور عظیم تہذیب جو فنون، تصوّف اور فلسفے سے مالا مال تھی، اس کے سہارے وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ باعثِ حیرت یہ ہے کہ مسلمانوں میں دینِ خالص کے نام پر لکیر کے فقیر حضرات نے مستشرقین کے اِن دعوؤں کو بلا تنقید تسلیم کر لیا اور یہ نعرہ لگایا کہ اسلام کو اجنبی اور بدیسی عناصر سے پاک کر دیا جائے تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ اسلامی دُنیا کے تمام مسائل کا یہ دلکش اور آسان حل نظر آتا ہے؛ حالانکہ یہ اس بات کا انکار ہے کہ مذہب بھی اسی طرح پھلتا پھولتا ہے جس طرح کوئی بیج، جس کے اندر خواہشِ نمو ہوتی ہے۔

غیر منطقی رویّے شاذ و نادر ہی متوازن ہوتے ہیں؛ چنانچہ وہی لوگ جو مذہب کو اجنبی "توہمات" اور "غیر اسلامی رسوم" سے پاک کرنا چاہتے ہیں؛ بذاتِ خود مغرب کے نظریات سے استفادہ کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے؛ خواہ اِس کے لیے اُنھیں جدیدیّت کی غلاظت ہی کیوں نہ نگلنی پڑے (اور ان سے کہنا یہ ہے کہ اسلام میں "فساد" پیدا نہ ہوتا تو اِنھی خطوط پر نشو و نما پاتا) اور یہی لوگ لادینیّت اور سائنس کے وہ تمام تصوّرات قبول کر لیتے ہیں جو خدا کے انکار پر مبنی ہیں، اور جن کو طرّہ امتیاز پر مقدس چیز سے بے رُخی ہے کیونکہ اُن کے خیال میں انسانی زندگی کا کوئی آخری مقصد یا ہدف

Marfat.com

نہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ آج کے نام نہاد "بنیاد پرست" اِن سیاسی افکار میں کشش محسوس کرتے ہیں جن کا مبداء مارکسیت ہے۔

مسلمانوں کا دُوسرے مذاہب سے بعض روایات اور اعمال کو مستعار لینا ہر طرح دُرست ہے جن پر درحقیقت اُن کا فطری حق ہے کیونکہ علم و دانش کو مومن کی گمشدہ اونٹنی قرار دیا گیا ہے، مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ وُہ تمام چیزیں بھی جن کی جڑیں لادینیت اور لاادریت میں گہری اتری ہوں، پورے نظام کو زہر آلود کیے بغیر اسلام کی گٹھڑی میں باندھ لی جائیں۔ حق تو یہ ہے کہ متبرک اور مقدّس تو ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے جس کا تنوّع غیر مختتم ہے؛ تاہم اِس اعتراف میں کوئی حرج نہیں کہ بعض صداقتیں جو قرآن مجید میں راسخ ہیں، عیسائی دینیات یا یہودی شریعت یا ہندو ویدانت میں نہایت مؤثر طریقے پر پیش کی گئی ہیں مگر اِن کے نام ہی سے "دینِ خالص" کے اِن شیدائوں کو خلجان ہو جاتا ہے؛ جب کہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ مغربی لادین فلسفے کی لایعنی جزویات کو بڑے اعزاز و احترام سے قبول کیا جاتا ہے۔

آج مسلمانوں کا یہ سوال بے حد اہمیّت رکھتا ہے کہ اسلام میں ایمان اور امّت کو خطرے میں ڈالے بغیر کون کون سی چیزیں جذب کی جا سکتی ہیں اور کون سی نہیں تو اس کا جواب دینا آسان نہیں۔ یہ محض اس بات کا تعیّن کرنا نہیں کہ کوئی خاص نظریہ یا عمل قرآن و حدیث کی روشنی میں حلال ہے یا حرام ؟ بلکہ اصل مسئلہ باطنی کسوٹی کے ذریعے اس بات کو پرکھنے کا ہے کہ آیا یہ نظریہ یا طریقہ اسلام کی رُوح اور اس کے ماحول سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں ؟ اس "روح" کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں۔ اس فیصلے پر کہ کیا مباح ہے اور کیا نہیں بہت سے اہلِ علم ٹھوکر کھا سکتے ہیں جب کہ سیدھے سادھے سلیم الطبع اور تعلیم و تربیّت سے تہی مسلمان اپنی جبلّت اور مزاج ہی سے یہ بتا سکتے ہیں کہ اسلام کے مزاج و طبیعت سے کیا چیز ہم آہنگ ہے اور کیا نہیں۔

آج سے چالیس سال قبل ایمیل درمنگھم نے کیتھولک عقائد کا حامل ہونے کے باوجود اسلامی ماحول میں رہ کر اس جذبے کی عکاسی بڑے منفرد انداز میں چند سطور میں کی تھی۔ وُہ لکھتے ہیں:

Marfat.com

"اسلام فرد اور معاشرے کو جاندار آزادی اور توازن، ایک احساسِ عدل، رنگارنگی میں بھی ایک مساویانہ رنگ، جنگ میں رواداری، بڑے بڑے بارونق شہروں میں روحانی افلاس، بیکسی اور بیچارگی میں تمکنت اور جلال، رسوم اور ان کی پاکیزگی، یہ ایقان کہ حقیقتِ مطلقہ کے سامنے سب ہیچ ہے، کا امکان فراہم کرتا ہے، اس تتمّے کے ساتھ کہ ہر وُہ شے جو اپنا وجود رکھتی ہے، حقیقتِ مطلقہ ہی سے ناطہ جوڑ کر باقی رہ سکتی ہے۔ گویا دُوسرے معنوں میں ہر شے دو اعتبارات سے "بے بہا" ہے، اور (بقول لیان بلائے) کہ جو کچھ ہوتا ہے ٹھیک اور قابلِ تحسین ہے۔ دُوسرے یہ کہ حقیقت مُطلقہ کے ساتھ ہم رشتگی و نسبت کے ماسوا جو کچھ ہوتا ہے کسی اہمیّت کا حامل نہیں۔"[1]

یہی وُہ اوصاف ہیں جن کے زیاں سے اسلام اپنے مافیہ سے تہی دست رہ جائے گا، خواہ اس کی شریعت پر کتنا ہی سختی سے عمل کیوں نہ کیا جائے۔

اِس ضمن میں رسولِ مقبول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی دو احادیث بڑی اہمیّت کی حامل ہیں۔ اوّل یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عقل سے زیادہ قابلِ قدر کوئی شے پیدا نہیں کی اور مزید یہ کہ اُس شخص پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے جو اس (عقل) کی تحقیر کرتے ہیں۔ یہاں عقل کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ اس میں ہر سطح پر ادراک وانجذابِ صداقت کی صلاحیّت ہو، جو ایک طرف میزان ہو اور "مطلق" اور "ممکن" میں تمیز کرسکتی ہو اور دُوسری طرف یہ شعور رکھتی ہو کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک دُوسرا قول یہ ہے 'اللہ جمیلٌ ویحب الجمال' یعنی اللہ خود جمیل ہے اور اُسے جمال سے اُنس ہے۔ یہ بھی عین قرینِ فطرت ہے۔ کیونکہ انسان درحقیقت رُوح ونفس کے جمال اور آداب واطوار کے حُسن اور سب سے آخر میں ان اشیا میں قرینے کا نام ہے جو ہم اپنے گرد وپیش جمع دیکھنا چاہتے ہیں، جیسے لباس، گھر، برتن وغیرہ۔ قرآن وحدیث کی رُو سے غصّے کو مکروہ قرار دیا گیا ہے اِس لیے کہ اس سے انسان کی صورت بگڑجاتی ہے۔ بھدّی اور بھونڈی عمارت خواہ ضروریات کی کتنی ہی کفیل کیوں نہ ہو، "غیر اسلامی ہے۔" جیسا کہ ہر بے ہُودہ اور گھٹیا شے ہے، اس لیے یاد رکھنا

1. Te'moignage de l' Islam, published in Lescashiers, du, Sud, 1974

Marfat.com

چاہیے کہ دین اسلام کو سچی اور حسین شے سے رغبت خاص ہے۔ اس میں بے ہودگی اور تہی مغزی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔[1]

ہر مذہب کی ہیئت اور تشکیل جداگانہ انداز کی ہے لیکن مقصد ایک ہی ہے۔ یُوں سمجھئے کہ مذاہب ایسے جہاز ہیں جو جمیع انسانیت کو وجود کے تلاطم خیز سمندروں میں پار اتارنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ بصورتِ دیگر وُہ جن میں غرق ہو سکتے ہیں یہ خُدا کا کرم ہے، ورنہ جو لوگ تیرنا نہیں جانتے وُہ اِن جہازوں کے بغیر بھی ڈوب سکتے تھے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ارشادِ باری ملاحظہ کیجیے:

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝

ترجمہ: "اور ان کے لیے ایک نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لیے ویسی ہی اور چیزیں پیدا کیں جن پر

---

[1] وُہ لوگ جو اسلام میں صرف اخلاقیات اور بنیادی تطہیر کی حد تک سوچتے ہیں یہ سوال عجیب و غریب معلوم ہو گا؛ تاہم اس مصنّف کو بہت دُور دراز علاقوں سے دو ایسی آراء موصول ہوئی ہیں جو اس کا دُوسرا رُخ پیش کرتی ہیں۔ پہلا تبصرہ الجزائر کی ایک مسجد کے خادم کا ہے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ سمندری ملازمت میں گزارا۔ وُہ پہلا سوال یہ کرتا ہے کہ آخر عالم فاضل لوگ اس قدر بحث و تمحیص میں کیوں اُلجھے رہتے ہیں۔

اسلام تو ایک سیدھا سادا دین ہے۔ اسلام دُنیا میں حسین چیزوں سے محبّت کی تلقین کرتا ہے۔ دُوسری رائے ایک مصری کی ہے جو لندن میں کام کرتا ہے۔ وُہ کہتا ہے: "کیا میں آپ کو بتاؤں خُدا کے متعلق میرا تصوّر کیا ہے؟ میں اسے ایک لفظ میں بیان کر سکتا ہوں اور وُہ ہے 'حُسن'! اگر میں ایک دُکان میں جوتے کا ایک خُوبصورت جوڑا دیکھوں جو بہترین طریقے سے بنایا گیا ہو تو مُجھے یہ احساس ہو گا کہ اِس کی خوبصورتی اس وجہ سے ہے کہ وہ بے عیب اور ہر طرح مکمل ہے اور یہی بات میرے ذہن میں خدا کے حوالے سے آتی ہے کہ اُس کا حُسن کامل نہیں اکمل ہے۔"

Marfat.com

سوار ہوتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں، پھر نہ تو ان کا کوئی فریادرس ہو اور نہ ان کو رہائی ملے، مگر یہ ہماری رحمت اور ایک مدت تک کے فائدے ہیں۔" (یٰسین (۳۶) : ۴۱)

ہر جہاز کا ڈھانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا کہ وہ سہولت سے ساحل مراد تک پہنچ جائے۔ ان جہازوں کو حرکت میں لانے والی ہوا وہی ہے جو اسلام میں تخلیق کی محرک ہے، یعنی نفسِ الٰہی؛ تاہم وسیع اور بیکراں سمندروں میں کوئی جہاز یکہ و تنہا نہیں۔ یہ سمندر اگرچہ وسیع ہیں تو افلاس وسیع تر اوزان مختلف جہازوں میں سوار لوگ دوسرے جہازوں کو دیے جانے والے پیغامات کی سرگوشیاں بھی سن سکتے ہیں اور ہواؤں کے دوش پر جاتی ہوئی ان کی دعاؤں کے نفحات بھی سنے جا سکتے ہیں جو سننے والے اپنے دلوں کی استعداد کے مطابق سن اور سمجھ سکتے ہیں یا سمجھنے سے محروم رہ سکتے ہیں۔

اسلام بنیادی طور پر "ان جہازوں" سے غرض رکھتا ہے جو وجود کے بیکراں سمندر میں اس کے نزدیک تر ہیں۔ یہ وہ مذاہب ہیں جو ابراہیم علیہ السلام کے بے ریا پیامِ توحید کے وارث ہیں جس طرح خود اسلام ہے۔ چونکہ یہ تینوں مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام (ہندو اور بدھ مت کے برعکس) اپنا اظہار ایک ہی طرح کی اصطلاحات سے کرتے ہیں، ان کے تناظر میں اختلاف واضح طور پر جداگانہ ہے؛ تاہم ان میں جو چیزیں مشترک ہیں وہ دیگر تمام اختلافات سے زیادہ وزنی ہیں۔

یہودیوں کا کبھی پڑھے لکھے مسلمانوں سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ اسلام کے ساتھ اپنے مذہب کے بعض پہلوؤں کی مطابقت دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اسلام کے بہت سے پہلو جو عیسائیوں کے لیے انتہائی مغائرت کے حامل ہیں جیسے اللہ کا نازل کردہ قانون یا شریعت کسی یہودی کے لیے اجنبی نہیں، کیونکہ وہ اکثر اس کی بازگشت اپنے دین میں سنتا ہے اور زندگی کے متعلق مسلمانوں کے مخصوص رویوں کی جھلک بھی اسے اپنے دین میں نظر آجاتی ہے۔ توریت کے "اسفارِ خمسہ" میں عبرانی کا کوئی لفظ "مذہب" کے مترادف استعمال نہیں ہوا کیونکہ توریت میں

Marfat.com

خانگی اور اجتماعی زندگی کے وُہ پہلو جنہیں "دین" اور "غیر دین" کہا جائے، الگ الگ خانوں میں تقسیم کا قائل نہیں۔ اگر مذہب ہر شے کا احاطہ کرتا ہے تو اِس اصطلاح کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ دراصل یہودیت بھی اسلام کی طرح انسانی زندگی کے معمول کے اعمال سے لے کر دنیاوی اشغال اور افعال تک یکساں تقدّس رکھتے ہیں۔ یا تو خدا موجود ہے یا نہیں ہے۔ خدا ہے تو پھر یہ واضح بات ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ اس کی قلمرو میں داخل ہے اور کوئی بھی شے اس کی سلطنت اور دستِ قدرت سے باہر نہیں۔ اسی بناء پر بہت سے مسلمان قرآنی اصطلاح 'دین' کا ترجمہ "مذہب" کرنے پر معترض ہوتے ہیں کیونکہ اِن کے نزدیک دین زندگی کا ایک مکمل لائحہ عمل ہے جو انسان کے ہر عمل پر حاوی ہے۔ یہودیوں اور مسلمانوں میں نسلی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ ویسے تو 'سامی النسل' ایک مبہم سی اصطلاح ہے۔ اس نسل کا مواد و منبع ایشیا کا وُہ علاقہ سمجھا جاتا ہے جو بحیرۂ روم کے ساحل سے ملحق ہے اور یہی وُہ علاقہ ہے جو بے شمار نسلوں کی کٹھالی بنا رہا ہے اور اس اعتبار سے دُنیا کا اور کوئی خطّہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تاہم یہودیوں کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ فلسطینی الاصل ہیں، اس لیے وُہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ عربی بولنے والے لوگوں سے اُن کا انتہائی قریبی خونی رشتہ ہے۔

یہ بات شاید تعجب خیز نہ ہو کہ صرف ایک صدی قبل جب ڈزرائیلی برطانیہ کا وزیرِ اعظم تھا تو اِن کی مشرقی پالیسی کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے یہ کہا جاتا تھا کہ چونکہ وُہ یہودی ہیں اس لیے اِن کا "مسلم نواز" ہونا یقینی ہے (اور اسی منطق سے اِن کا مخالف عیسائیت ہونا بھی!)

ازمنۂ وسطیٰ میں مسلمانوں کے دورِ عروج میں یہودی اسلامی مملکتوں میں بڑی نمایاں حیثیت کے مالک رہے اور کام میں لگن کے باعث قابلِ عزّت سمجھے جاتے تھے۔ یہ تو حالیہ زمانے میں صیہونیت کی تحریک کے جارحانہ رویّے کے تحت یہ نسلی رشتہ تباہ ہُوا ہے؛ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مبین میں یہودیوں کی شدید مذمت کی گئی ہے، (یہاں ہم یہودی النسل افراد کی بجائے یہودیت کے پیروکاروں سے مراد لیتے ہیں،

Marfat.com

جن میں سے بیشتر، حضورؐ کے زمانے میں عرب آباؤ اجداد کی اولاد تھے) اور یہ دو اسباب کی بنا پر ہے۔ اوّل تو یہ کہ ان کو جو مقدس مشن سونپا گیا تھا اس سے انہوں نے بُری طرح رُوگردانی کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی رُشد و ہدایت کے لیے تواتر سے انبیاء بھیجے جو ان کے لیے منفرد اعزاز تھا، مگر ان لوگوں نے بہت سے نبیوں کی تکذیب اور نافرمانی کی جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی شامل تھے۔ دُوسرے یہ کہ ان لوگوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اس وقت سازشیں کیں جب آپؐ نے اُن کی طرف اعتماد اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

اگر صرف ایک رنگ کے شیشے سے دیکھیے تو عیسائیت کے مقابلے میں، اسلام یہودیت سے زیادہ قریب نظر آئے گا۔ دُوسری طرف اگر کسی اور رنگ کے شیشے سے دیکھیے تو صورتِ حال یکسر برعکس نظر آئے گی اور یہ معلوم ہو گا کہ مسلمان، عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیواؤں کے ساتھ کہیں زیادہ اُنس رکھتے ہیں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ

ترجمہ: "(اے پیغمبر) تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں، اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وُہ تکبّر نہیں کرتے، اور جب اس کتاب کو سُنتے ہیں (جو سب سے پہلے پیغمبر محمدؐ پر نازل ہوئی) تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں"

(المائدہ (۵): ۸۲-۸۳)

ان آیات کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے حالات سے متعلق

Marfat.com

ہونے سے قطع نظر، اِن میں یہودی عالموں اور فرانسیسیوں کی منافقت اور کبر و غرور کا تقابل عیسائی راہبوں اور درویشوں کے انکسار اور ایثار سے کیا گیا ہے جو خُدا کی عبادت میں غرق رہتے تھے اور عیسائیوں کے اِس شرک کی شدّت کو (جو وُہ عیسیٰؑ کو خُدا کا بیٹا کہہ کر پکارتے ہیں) محمّد اسد کے خیال میں اِس طرح کم کیا گیا ہے کہ اس شرک کی بنیاد کوئی شعوری عمل نہ تھا بلکہ وُہ حضرت عیسیٰؑ کی مدح کرتے وقت حقیقت کی حدود سے باہر نکل جاتے تھے[1] ـــــ اس سلسلے میں محمد اسد محولہ بالا سورہ سے پہلے کی سورہ کا حوالہ دیتے ہیں جو یُوں ہے:

يَآهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

"اے اہلِ کتاب! اپنے دین (کی بات) میں حد سے نہ بڑھو، خُدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو، مسیح (یعنی) مریم کے بیٹے (نہ خُدا تھے نہ خُدا کے بیٹے) بلکہ رسول تھے اللہ کے اور اس کا کلمہ تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا اور اس کی طرف سے بھیجی گئی ایک روح تھے، تو خُدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ (نساء (۴) : ۱۷۱)

عیسیٰؑ اور ان کی کنواری ماں مریمؑ قرآنی آیات کی رُوح سے خُدا کے لُطف و کرم کا اشارہ یا علامت ہیں اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک حدیث یہ بیان کی جاتی ہے کہ تمام مرد وزن پر پیدائش کے وقت پنجۂ شیطان کا نشان ہوتا ہے ماسوٰی اِن دو نفوسِ قدسیہ کے۔ اسلام نے یہودیوں کی شدید ملامت اس لیے کی کہ انہوں نے پاک مریمؑ پر بہتان طرازی کی۔ قرآن میں مریم مقدس کا درجہ اور شان ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(ترجمہ) "اور جب فرشتوں نے (مریم سے) کہا: مریم! خُدا نے تم کو برگزیدہ کیا

---

1. The Message of the Qur'an, p. 160, note 97

Marfat.com

ہے اور پاک بنایا اور جہان کی عورتوں میں منتخب کیا ہے"۔

(آلِ عمران (۳) : ۴۲)

حقیقت یہ ہے کہ مریمؑ انسانیت کے لیے اللہ کی رحمت اور کرم کی یادگار ہیں۔ قرآن میں مذکور ہوا کہ جب بھی حضرت زکریاؑ انہیں دیکھنے عبادت گاہ جاتے تو ان کے پاس کھانا موجود پاتے۔ گویا یہ کبھی نہ ختم ہونے والی روحانی غذا کی علامت تھی۔ قرآن کے الفاظ ہیں: حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

(ترجمہ) (اور زکریاؑ یہ کیفیت دیکھ کر ایک دن مریم سے پوچھنے لگے کہ مریم) یہ کھانا تمھارے پاس کہاں سے آتا ہے۔ وہ بولیں کہ خدا کے ہاں سے (آتا ہے) بیشک خدا جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

(آلِ عمران (۳):۳۷)

یہ آیۂ مقدسہ بالعموم مسجدوں کے محرابوں پر کندہ نظر آتی ہے اور مریمؑ کا یہ قول کہ "اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے"، قرآن میں کئی مقامات پر آتا ہے اور جود و کرم کے وفور کو ظاہر کرتا ہے جو انسان کے تصوّر سے ماورا ہے۔ یہ بے مثل خاتون جو اسلام میں خواتین کی صحیح نمائندہ ہیں، اِسلام اور عیسائیت کے درمیان اہم کڑی ہیں۔

درمنگھم کے نظریے کے مطابق جب قرآن تجسیم اور تثلیث کی بات کرتا ہے تو حقیقت میں وہ اِن عقائد کی مذمت سے کہیں زیادہ اِن کی مشرکانہ تعبیروں کی مذمت کرتا ہے۔ وہ عیسائیت کی نہیں بلکہ عیسائیت میں حلول، تجسیم اور دیگر گم کردہ راہ فرقوں کو قابلِ الزام سمجھتا ہے[1] یہ متبذل سی بات ہے تاہم جب مسلمانوں اور عیسائیوں میں فلسفۂ تجسیم پر (یہ عیسائیوں کا شاید واحد عقیدہ ہے جو مسلمانوں کے لیے ناقابلِ قبول ہے) ردّ و کد اور شدید مباحثہ اور مجادلہ ہوتا ہے تو انسان سوچنے لگتا ہے

1. The Life of Mohammad, p.111

Marfat.com

کہ کہیں یہ الفاظ ہی کا ہیر پھیر تو نہیں؟ خود عیسائیوں نے اس عقیدے کی مختلف انداز سے توجیہات کی ہیں۔ دراصل یہ تصور کیشی اور مباحثے کا میدان ہے جہاں ہر بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کسی اصطلاح کا مفہوم کیا لیتے ہیں۔

عیسائیت اور اسلام اپنی داخلی منطق کے مطابق ترقی کرتے ہوئے ایک دوسرے سے مزید دور ہوتے گئے۔ انڈونیشی عالم حکم جائت (Hichem D'Jait) کا کہنا ہے کہ اسلام کے ارتقاء کے تاریخی اثرات یہ مترتب ہوئے کہ مغربی عیسائیت، مشرقی عیسائیت پر غالب آگئی۔

سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں عیسائیت بنیادی طور پر مشرق قریب کا مذہب تھی جس کی مثال آج کے قبطی اور مارونی کلیسا ہیں، تاہم مشرقی عیسائیت سیاسی طور پر اسلام کے زیرنگیں آگئی۔ اور اب مغرب کے "وحشیوں" کے ہاتھ مشعل آگئی اور انہوں نے اس مذہب میں لاطینی اور بعد میں جرمانیک افکار کی رنگ آمیزی کی۔ منٹگمری واٹ کے مطابق تثلیث اور عقیدۂ تجسیم کی تلخ بحثیں بڑی حد تک یونانی زبان بولنے والے عیسائیوں اور قدیم شامی، ارمنی اور قبطی زبانیں بولنے والے عیسائیوں کے مابین جھگڑے ہی کہے جا سکتے ہیں۔ واٹ کا کہنا ہے: "آخرالامر مذہب کی جو اشکال قدیم دین کی حیثیت سے تسلیم کی گئیں وہ یونانی اور لاطینی زبانیں بولنے والوں کے مابین ایک طرح کی مصالحت کی حیثیت رکھتی ہیں، کیونکہ مذہب کی کوئی ایسی شکل جو مشرقیوں کو بھی مطمئن کر سکے، ممکن نہیں تھی؛ اسی لیے مشرقیوں کو کلیسا باہر کر کے بدعتی سمجھ لیا گیا۔"[1]

کلیسا سے اسی اخراج کے باعث مشرقی عیسائیوں نے مسلم فاتحین کو اپنا آزادی دلانے والا اور نجات دہندہ سمجھ کر خوش آمدید کہا؛ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مسلم فتوحات کی بدولت اِن غریبوں کو اپنے ہم مذہبوں کے ظلم و ستم سے نجات میسر آئی۔ اس کے انتہائی دور رس تاریخی اثرات مترتب ہوئے۔ ۳۲۰ ق م میں اسکندرِ اعظم کے ایران فتح کر لینے کے بعد سے اسلام کے آنے تک بحیرۂ روم

1. Islam & the Integration of Society, W. Montgomery Watt, p.268

Marfat.com

کے ساحل سے ملحق ایشیائی خطّہ اور مصر اور شمالی افریقہ مکمل طور پر سلطنتِ روما کے ایک صوبے کی حیثیت سے مغربی دُنیا کے قبضے اور تصرف میں چلے آ رہے تھے۔ یہ علاقہ ایک ہی سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی نمونے میں ڈھل گیا تھا جس میں برطانیہ اور گال (فرانس) بھی شامل تھے۔ پس اسلام کو اس علاقے کے رومی یونانی تہذیب کا ورثہ ملا۔ پھر جب اسلامی سلطنت کا دارالحکومت شام سے منتقل ہو کر بغداد پہنچا تو مشرق و مغرب کے درمیان تقسیم کی دیوار بلند ہو گئی۔

اس کے بعد اسلامی اور عیسائی مذہب کے اختلافات پر زیادہ زور دیا گیا۔ اور عیسائی مُناظر اسے ہوا دیتے رہے اور نتیجہ خیز رابطے منقطع ہوتے چلے گئے۔ اسلام اور عیسائیت اور اسلام اور یہودیت کے مابین اختلافات کو ہم اس لیے یہاں موضوع بنا رہے ہیں کہ ہر مذہب کے بنیادی خصائص واضح ہو جائیں، اور ہم واضح طور پر ہندسی اشکال کے ذریعے مربع دائرہ اور مثلث کو واضح کر سکیں جو ان تینوں مذاہب کی نمائندگی کرتی ہیں؛ اور یہ بنیادی نقطۂ خیال محو نہ ہونے دیں کہ ان کا مرکز ایک ہے، ایک خدا۔ اور ان کا منبع بھی حضرت ابراہیمؑ کا لایا ہُوا دین ہے۔ مسلمانوں کے خیال میں یہودیوں کا اندازِ نظر یہ ہے کہ وحدانیت صرف ایک قوم کا ورثہ اور اثاثہ ہے؛ جب کہ عیسائیت نے عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو خدا بنا کر اسی طرح گہنا دیا ہے جیسے سُورج کو چاند گہن لگا دیا کرتا ہے یا یُوں کہیے کہ یہودیت نے وحدانیت کو ایک وطن اور فوج مہیّا کر کے استحکام تو دیا مگر اس کے ساتھ ہی 'گھر' پر غاصبانہ قبضہ بھی کر لیا۔ دُوسری طرف عیسائیت نے صداقتِ ازلی کو آفاقیت بخشی اور پھر خود ہی اس کا رنگ ہلکا اور پھیکا کر دیا۔ اسلام نے اس دائرے کو بلند کر کے مکمل کر دیا اور دینِ ابراہیم کا "خالص پن" دوبارہ بحال کر دیا جس میں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو ان کی صحیح اور نمایاں حیثیت دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے توحیدِ الٰہی کی رُوح کو تازگی بخشی اور سب خداؤں سے ناتا توڑ کر صرف ایک خدائے واحد کی عبادت کو سنگِ آستاں بنا لیا، نیز اس نے اس وحدانیت کو سماجی اور ذاتی زندگی میں توازن اور ہم آہنگی سے سمونے کی کوشش کی جس کے معنی یہ تھے

Marfat.com

کہ اس نے تمام مخالف و متحارب قوتوں اور مختلف سطحوں پر حاصل ہونے والے انسانی تجربات کے درمیان بھی ایک توازن پیدا کیا۔ امام ابنِ تیمیہؒ (۱۳۲۸ء) کا ارشاد ہے کہ اسلام نے موسوی قانونِ عدل اور عیسوی قانونِ رحمت کو ملا کر ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو یہودیت کی سختی اور عیسائیت کی نرمی کے بین بین تھا۔

انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جہاں موسیٰؑ نے خدا کے جلال کا اعلان کیا اور عیسیٰؑ نے اس کے جمال کا، وہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کے کمال کو بیان فرمایا، اسی ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عیسیٰؑ نے وہ ظاہر کر دیا جس پر سے موسیٰ علیہ السّلام نے پردہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا تھا ؛ یعنی رحمتِ خداوندی اور شفقت و کرمِ الٰہی کے اسرار؛ جب کہ اسلام نے ہر شے کو صداقتِ کلّی کے تناظر میں پیش کیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہودیت شریعت پر زور دیتی ہے۔ عیسائیت ایک شخص کی ذات کے گرد گھومتی ہے اور اسلام کا مرکز و محور خُدا ہے۔ پروفیسر لوئی ماسینیوں کے لفاظ میں یہودیت امید پر قائم ہے، عیسائیت نیک دلی اور محبّت کا درس دیتی ہے جب کہ اسلام کا محور اور مرکز 'ایمان' ہے۔ بہر حال یہ "سہ گوشہ" فرق، عیسائی نقطۂ نظر سے ہے، جب کہ مسلمان کہتے ہیں کہ یہودیوں نے حقیقی دین کو صرف ایک قوم کے لیے مخصوص کر دیا۔ عیسائیوں نے اُسے ایک "مظہر" میں محدود کر دیا جب کہ اُس کے برعکس اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ اسے کسی طرح بھی محدود یا مخصوص نہیں کیا جا سکتا نہ کوئی تاریخی ہستی یا مظہر اسے کمزور کر سکتا ہے۔ اسلام کے مزاج میں یہ عزم بالجزم پایا جاتا ہے کہ خُدا کو کسی انسانی دستور یا انسانی تصوّر کی انواع کا پابند بنایا جا سکتا ہے نہ اُسے کسی تعریف میں مقید کیا جا سکتا ہے۔ اسی پیمانے سے انسانوں کی پسند و ناپسند معروضی صداقت کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور یہ خیال کہ ہم اس احسن الخالقین کے ادنیٰ بندے، اپنے مخصوص اندازوں اور مفادات کی کسوٹی پر اُن کو جانچیں، مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ایک انتہائی گستاخانہ جسارت ہے۔ عیسائیت کے جس پہلو کو مسلمان شدت سے رد کرتے ہیں وہ ہے تاریخی عمل میں "خُدا" کا اذیت اُٹھانا، جو اُسے کاملاً خود مختار اور خود کفیل ظاہر نہیں کرتی (جیسا کہ قرآن کا بیان ہے)

Marfat.com

اور عیسائیت کے عقائد سے یہ اندازہ ہوتا ہے جیسے وُہ مختارِ حقیقی نعوذ باللہ، بے طاقت اور بے اختیار ہے؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور بخشش و کرم کا اظہار اپنی مخلوقات کے ایک ایک ذرّے سے بخوبی کر رہا ہے۔

مسلمانوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عیسائی اپنے پیغمبر عیسیٰؑ کی شان و شوکت اور عظمت سے اتنے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اُنھوں نے تنزیہ و تقدیسِ الٰہی کو پسِ پُشت ڈال دیا ہے اور ذاتی اور انفرادی زہد و تقویٰ کے حصول کو بہت کچھ سمجھ کر انسانی سماج کو صراطِ مستقیم سے بھٹک جانے دیا ہے اور دنیاوی معاملات ان لادین قوتوں کے تصرّف میں جانے دیے ہیں جن کے نزدیک ابدی اقدار اور اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس صورتِ حال کی تلافی اور اصلاح ضروری ہو گئی تھی اس بنا پر نہیں کہ نعوذ باللہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام میں کوئی نقص تھا یا موسیٰ علیہ السلام کے پیغام میں کسی قسم کی کمی تھی بلکہ اس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ انسانوں نے وقت گزرنے کے ساتھ اس میں ایسی تحریفات کر لی تھیں جن میں وحیِ الٰہی کا مخصوص توازن متزلزل ہو گیا تھا پس جو کچھ ہو گزرا تھا اس کی وضاحت کے لیے ایک آخری بیانِ حق کا اضافہ کر دیا گیا جسے ایک ایسے صادق الوعد الامین پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ بھیجا گیا اور جس نے اس پیغام کی نہ صرف تشریح کی بلکہ اس کے مطابق زندگی گزار کر ایک عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ مزید برآں جس اُمت کی تشکیل اس پیغام اور اس عملی نمونے کے تحت ہوئی اس کا یہ بھی فریضہ ٹھہرا کہ وُہ اِس پیغامِ عظیم کو انتہائی حزم و احتیاط سے محفوظ رکھے اور اس کی شکل بگڑنے نہ دے نیز اس پیغام کو بے کم و کاست دُنیا کے کونے کونے میں پہنچا دے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا دل ہر وقت "بدعت" کے خوف سے لرزاں رہتا ہے۔ اپنے ہر عمل میں وُہ نہایت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں جب کہ کوئی مسیحی زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق مذہب میں ضروری "کتر بیونت" کو ناگزیر قرار دے گا۔ نظامِ عالم میں انسان کا وظیفہ، اس کی تقدیر اور فرائض واضح طور پر معین ہیں۔ جو کچھ انسانوں سے کہا جاتا تھا وُہ کہا جا چکا۔ اب انسانیّت کے لیے کسی "تذکرہ" کرنے والے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

Marfat.com

اب اگر مرد و زن نسیان کا شکار ہوتے ہیں یا وہ "منزّل من اللہ" صداقت کو مسخ کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں تو اِن کی اصلاح اور نجات کی کوئی اُمید نہیں رکھنا چاہیئے۔

عیسائیوں کے لیے اکثر اِن حقائق کو گرفت میں لینا اور وحدانیت میں جلوہ نما حقیقتِ مجرّدہ، کو پا لینا کوئی آسان عمل نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی معجزاتی پیدائش اور عظمت و رفعت کی مثال اِن کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کر دیتا ہے کہ صداقت معروضی ہونے کی بجائے ذاتی اور شخصی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ خود رحمِ انسانی میں حلول نہیں کرتا نہ معجزات کے ذریعے مذہب اور عقائد تبدیل کرواتا ہے، وُہ اپنی معرفت کا علم اور اپنا اِرادہ جس سے انسان خُدا کے خلیفہ اور نائب کے طور پر کسی حد تک بذاتِ خود نجات حاصل کر سکتا ہے؛ جب کہ عیسائی اپنی نجات کا بارِ گراں عیسیٰ علیہ السلام کے کاندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔

اسلام اِنسان کو اسی حیثیت میں قبول کرتا ہے جیسا کہ وُہ ہے اور اس کی اسی حیثیت کو مدِّنظر رکھ کر وُہ اسے اس کے فرائض کی تعلیم دیتا ہے اور عقبیٰ کی طرف اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اسلام میں یہ اس لیے ممکن ہُوا کہ وُہ عیسائیت کے اِس عقیدے کو مسترد کر دیتا ہے کہ انسان کی سرشت اور فطرت میں گناہ اور آلودگی ہے۔ برخلاف اس کے اسلام کا تصوّر یہ ہے کہ انسان ضعیف، فراموش گار اور کم عقل ہے مگر اس کے وجود کا مرکز پاک و صاف ہے۔ اِس لیے اُس کی نجات کے لیے کسی معجزے کی بھی ضرورت نہیں جب کہ عیسائیت کے نزدیک گناہ ہر انسان کے صمیمِ قلب میں جاگزیں ہے اور وُہ یہ فرض کرتی ہے کہ ہبوطِ آدمؑ کے معاملے میں پُوری دُنیا ملوث تھی جس سے ہر پتّی، ہر کلی اس اوّلین گناہ سے آلودہ ہو گئی۔ اس تصوّر نے اس "دنیا دار دُنیا" میں انسانی خواہشات کی تسکین کے لیے انتہائی ظالمانہ انداز میں فطرت کی لُوٹ کھسوٹ کو رواج دیا۔ تورات کی "کتاب استثنا" میں آتا ہے کہ "تیرا رب ایک جلانے اور بھسم کر دینے والی آگ ہے" اور یہودیت کا یہی عنصر عیسائیت میں انجیل کے عہد نامہ عتیق کی وساطت سے چلا آ رہا ہے۔ محبت کی آگ اور قربانی کی آگ سخت دلوں کو موم کی طرح پگھلا دیتی ہے اور عیسائی اِسی طرح

Marfat.com

حرارت کا جویا ہوتا ہے جیسے کوئی مسلمان وسعت اور کشادگی کا۔ اگر عیسائیت "آگ" ہے تو اسلام "برف" ہے۔ اگرچہ یہ بھی خدا کی "آیات" میں سے ہے مگر قرآن نے اس کی مثال نہیں دی؛ تاہم اسلام ایک وسیع و عریض اور شفاف برفانی چادر سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو ہر بدوضع اور مکروہ شے کو ٹھنڈے نور سے ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کی ٹھنڈک اور متانت ایک ہی مذہبی پس منظر کا حصّہ ہے۔ فرتھ جوف شوآن Frithjof Schuon کہتے ہیں کہ عیسائی ہونا ایسا ہے جیسے کسی تند و تیز رومان کا آغاز جس کے سامنے انسان کی ساری گزشتہ زندگی حقیر اور بے وقعت نظر آتی ہے؛ گویا یہ "حیاتِ نو بعد الممات" ہے۔ اس کے برعکس مذہب تبدیل کر کے داخلِ اسلام ہونا گویا ناآسودہ محبّت سے چونک اُٹھنا یا مدہوشی سے ہوش میں آنا ہے؛ یا جیسے تکلیف دہ رات کے بعد صبح کی تازگی! عیسائیت میں، اپنی پیدائشی انانیت کے باعث روح برف کی طرح منجمد ہو جاتی ہے اور عیسیٰؑ وُہ شعلۂ فروزاں ہیں جو اسے حرارت پہنچا کر زندگی کی رَو بحال کرتے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کا یہ حال ہے گویا نفس (Soul) اناکے ایسے ہی شکنجوں میں جکڑا ہُوا ہونے کے باعث گلوگرفتہ ہوتا ہے مگر اسلام خلا کی خُنک، حیات آفریں وسعت بن کر سانس لینے اور "لامحدود" فضا میں "پھیل" جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔[1]

مذاہب کے ایسے تمام تقابلی مطالعوں میں ہمیں اُن کے عقائد کے اختلافات سے غرض نہیں بلکہ "آب و ہوا" اور ماحول کے اختلافات سے ہوتی ہے جو صرف طرزِ فکر ہی پر نہیں بلکہ تصوّر اور احساس پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ سُورج کی وُہ تیز، آتشیں شعاعیں جو جنوبی ریگستانوں میں انسانوں اور جانوروں کو بھسم کر ڈالتی ہیں، شمالی منطقوں میں چھن چھن کر آتی ہیں جن میں نہ صرف آب و ہوا مختلف ہو جاتی ہے بلکہ سارا منظر ہی بدل جاتا ہے؛ حالانکہ ہمارے نظامِ شمسی کا سُورج ایک ہی ہے۔ انسانی زندگی کے متنوع حالات ہمیں کئی متبادل صورتیں پیش کرتے ہیں جن میں

---

1. Gnosis, Divine Wisdom, F. Shuon, John Murray, London, 1957, p.15

Marfat.com

سے ہم حسبِ ضرورت انتخاب کر سکتے ہیں۔ ہم بیک وقت دو مقامات پر نہیں ہو سکتے نہ بیک وقت دو بالکل مختلف نظریے اپنا سکتے ہیں، خواہ دونوں ہی میں معقولیت اور مناسبت نظر آ رہی ہو۔ ہر مذہب کے "بہترین عناصر" جمع کر کے، کسی ایک آفاقی مذہب کی تشکیل کا ناممکن ہونا محض اسی واضح سبب سے ہے۔ انسانی زندگی پر اثرانداز ہونے والی مختلف قوتوں اور واقعات کو مختلف مذاہب جس انداز سے دیکھتے ہیں، اُسی سے اُن کے اصل رُوپ کو نمایاں کرنے کے اہم اشارے ملتے ہیں اور انسان کی جنسی زندگی کے بارے میں اِن کا جداگانہ رویّہ اِن کے مخصوص نقطۂ نظر کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیتا ہے۔ اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرتے وقت یہی بات نمایاں ہو جاتی ہے، کسی اور بات نے ان دونوں مذاہب کی طویل معاندانہ سرگرمیوں میں سب سے زیادہ غلط فہمیاں پیدا نہیں کیں۔ حال ہی میں جو "اباحت" کلیساؤں میں دَر آئی ہے (جس سے صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے کہ اب مسلمان، مسیحوں کو اخلاقی بے راہ روی پر ملامت کرتے ہیں!) اس سے قبل مسیحوں کو مسلمانوں کی "بے لگام جنسیت" سے زیادہ کوئی اور چیز نہ تو ہراساں کرتی تھی — نہ لبھاتی تھی! محمدؐ کو بیک وقت "عیّاش" اور "جھوٹا نبی" (معاذاللہ) کہا جاتا تھا اور آج بھی 'حرم' کے متعلق طرح طرح کے مذاق اور لطیفے لوگوں کی طبیعتوں کو گدگداتے ہیں۔ عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب میں مسلمان احمقانہ حد تک معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں اور "دیندار" لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ کا اپنی ازواجِ مطہرات سے جنسی تعلق محض احساسِ فرض پر مبنی تھا!

آج اِس بات کی کوشش کی گئی کہ دُنیا کے مذاہب کو دو قسموں میں بانٹا جائے، ایک وُہ جو زندگی کا اثبات کرتے ہیں اور دُوسرے وُہ جو زندگی کی نفی کرتے ہیں۔ اس سے معاملات زیادہ ہی سہل ہو گئے ہیں تاہم یہ جملہ تخلیق کے مبہم کردار کو بیان کرنے کا ایک طریقہ ہے، بلکہ ہر اُس شے کو بیان کرنے کا جو "غیر اللہ" کہی جا سکتی ہے۔ ایک طرف یہ عالمِ آب و گل خُدا کی تخلیق ہے، وُہ تخلیق جسے "کتاب پیدائش" کے مطابق،

Marfat.com

خُدا نے اچھا سمجھا اور اسلام کا تصور بھی یہ ہے کہ یہ تخلیق بمنزلہ رحمتِ خداوندی کے ہے جس پر اس کی تمام رعنائیاں اور مسرتیں بخوبی شاہد ہیں۔

دُنیا اپنے اصل مصدر و منبع سے بہت دُور جا پڑی ہے۔ موت، مصائب اور انسانی خواہشوں کے حصول میں ناکامی نے اِس میں دراڑیں ڈال دی ہیں جن سے اس منبع سے دُوری کا تکلیف دہ احساس زیادہ شدّت سے ہوتا ہے۔ یہ عدم اور خلاء کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے اتنی قریب ہے کہ اس کی ہر چیز عارضی ہے جو عدم سے وجود میں آکر پھر عدم میں گم ہو جاتی ہے۔

دُوسرے لفظوں میں یُوں کہیے کہ عملِ تخلیق، مرکز گریز بھی ہے اور مرکز مائل بھی۔ اس کے ذریعے خُدا باہر کی طرف سے منصوبہ سازی کرتا ہے اور پھر اُسے اندر کی طرف لے آتا ہے تاکہ اس عالم کو یا تو ایک ایسی راہ سمجھا جائے جو بہشتِ بریں کی تجلیات سے دُور لے جاتی ہے یا اپنے لغوی معنوں میں "شریعت" ہے یعنی ایسی راہ جو بہشت کو واپس جاتی ہے؛ یا پھر اِسے بیک وقت دونوں ہی کہا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ایسی متعدد آیات ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ خُدا کیسے بندوں کو گمراہ بھی کرتا ہے اور ہدایت و فلاح کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ یہ کچھ ایسا ہے جیسے تخلیق کی پرشور ہوائیں انفرادی ارواح کو وادی ظُلمات کے کناروں تک لے جاتی ہیں اور پھر اگر ان ارواح نے اپنے آپ کو منبع سے بالکل منقطع نہیں کر لیا اور اپنا آغاز بالکل ہی فراموش نہیں کر دیا تو خُداوندی مرکز کی مقناطیسی کشش اُنہیں واپس کھینچ لیتی ہے۔

صرف مسلمان ہی نہیں، دُوسرے بھی اقرار کرتے ہیں کہ عالم میں ہر شے ہر منصوبہ ہر قوت اور ہر واقعہ کے دو پہلو ہیں؛ ایک روشن، دُوسرا تاریک۔ وُہ پہلو جو روشن ہے خُدا کی طرف رُخ رکھتا ہے اور وُہ غیر منقطع طور پر اپنے آغاز سے پیوستہ ہے۔ دُوسرا پہلو نفی اور عدم کے رُخ پر ہے؛ گویا ایک رُخ شفّاف ہے دُوسرا غیر شفّاف۔ حضرت امام غزالیؒ (وفات ۱۱۱۱ء) نے فرمایا تھا: "ہر شے کا ایک چہرہ اپنا ہوتا ہے اور ایک اُس کے رب کا۔ جہاں تک اس کے اپنے چہرے کا تعلّق ہے سو وُہ لاشے

Marfat.com

ہے اور جو چہرہ اس کے رب کا ہے وہی درحقیقت "الوجود" ہے۔ دونوں ہی چہرے موجود ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اُن میں سے کس چہرے سے ہم اپنے آپ کو منسلک اور واصل کرتے ہیں[1]۔

اصل عیسائیت اس مفروضے پر استوار ہے کہ انسانی فطرت میں خرابی دراصل "پہلے گناہ" کے باعث ہے۔ اسی وجہ سے عیسائیت کو یقین ہے کہ انسان فطرتاً تاریک پہلو ہی منتخب کرے گا۔ اسلام حقائق پسند ہے' اس لیے اس کے مخالف نقطۂ نظر نہیں رکھ سکتا لیکن چونکہ وُہ اپنی فکری بنیاد اس خیال پر رکھتا ہے کہ اگر صحیح ہدایت دی جائے اور پُوری طرح نظم وضبط کا عادی بنایا جائے تو انسان میں روشن پہلو اختیار کرنے کی اہلیت اور اس کے ذریعے وُہ "وجہ اللہ" دیکھ سکتا ہے۔

تخلیق میں ابہام کا احساس نسائی اور جنسی پہلو میں مرتکز نظر آتا ہے اور یہی وُہ موڑ ہے جہاں شفّاف اور غیر شفّاف کا تصوّر اہم ہو جاتا ہے۔ اسلام میں "شفاف پن" یا صفائے باطن کے معیار کو سبقت حاصل ہے کیونکہ قرآن کے مطابق تمام اشیاء اللہ کی آیات ہیں وُہ اُسے ظاہر کرتی ہیں اُس کے وجود کا اظہار کرتی ہیں اور انہی کے ذریعے اس کی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے۔ عیسائیت اِس صفائے باطن کی اصولی طور پر مخالف نہیں تاہم وُہ اس بات میں تشکیک کا شکار ہے کہ آیا انسان اِس سے کوئی استفادہ حاصل کر سکتا ہے؟ اور وہ تمام مظاہرِ فطرت کو بالخصوص جنس کو ترغیب و

---

[1] یہی نکتہ جو انسانی حالت کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے مثنوی مولانا روم میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ وُہ فرماتے ہیں ؎

ہر وجودے کز عدم بنمود سر　　بر یکے زہر است و بر دیگر شکر (دفتر۵: ۴۲۳۶)

(ہر شے جو عدم سے وجود میں آتی ہے ایک شخص کیلئے جامِ شیریں اور دُوسرے کے لیے سمِ قاتل ہے) ہر یکے زاجزائے عالم یک بیک　　بر غبی بنداست و بر استاد فک

اِس عالم کا ہر جزو بیوقوف کیلئے جال ہے اور دانشمند کیلئے راہ نجات)

دفتر۶: ۴۲۸۰

Marfat.com

تحریص گردانتی ہے۔ اِس فرق کو سمجھنا ضروری ہے کہ افراطِ تفریط پیدا نہ ہو۔ اسلام وقتی اور جنسی تعلقات کا شدید مخالف ہے۔ عیسائیت کو بھی اِس سے نفور ہے، تاہم مسلمانوں کے نزدیک اِس میں کوئی عیب نہیں کہ مرد کسی نہایت قبول صورت عورت کو دیکھ کر اُس سے وصل کی خواہش کرے؛ اور جب کوئی عورت کسی ایسے ہی مرد کو دیکھے تو اس کی طرف کھینچتی چلی جائے۔ یہ طبعی جذب و کشش اشیاء کے اُس نظام کا حصّہ ہے جسے مشیتِ الٰہی نے طے کر دیا ہے۔ اپنی ذات میں یہ بھی ایک غیر مشروط ہے خواہ اسے کتنی ہی پابندیوں میں جکڑنا ضروری ہو۔

اسلام اور عیسائیت کے نظریات کا فرق ذیل کے دو حوالوں سے اور کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ پہلا قول سینٹ تھامس اکوائنس (St. Thomas Aquinas) کا ہے جنہوں نے کہا تھا: "جنسی خواہش مفقود ہو تو مناکحت اور زیادہ پاکیزہ ہو جاتی ہے۔" بنیادی پر عیسائیت افزائشِ نسل کے لیے جنسی ملاپ کو مباح ضرور قرار دیتی ہے مگر یہ اجازت بھی بہ امرِ مجبوری دی گئی ہے جب کہ جنسی ملاپ برائے شہوت رانی کی مذمت کی جاتی ہے۔

دُوسرا حوالہ ہسپانیہ کے مشہور صوفی اور فیلسوف ابنِ عربی کا ہے جنہیں شیخ اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ وُہ کہتے ہیں: "ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت میں انتہائی کامل استغراق و اِرتکاز عورتوں کے وسیلے سے میّسر آتا ہے، اور وصل کی انتہا، ازدواجی فعل ہے۔"

موجودہ زمانے میں پوپ جان پال دوم نے شادی شدہ زندگی میں بھی "ہوس رانی" کی مذمت کی ہے؛ اور عصرِ حاضر کے ایک مسلم مصنّف سرا ہے کہتے ہیں "شبِ عروسی میں جب دو نفوس باہم یکجا ہوتے ہیں تو اللہ الرحم الرّاحمین اِن کے تمام سابقہ گناہ معاف کر دیتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کردگارِ حقیقی کو مناکحت کس حد تک پسند ہے۔"

حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ مناکحت نصف دین ہے اور آپ نے اپنے صحابہ کو یہ بتا کر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ

Marfat.com

کسی انسان اور اس کی زوجہ کے مابین ہر دفعہ فعلِ جنسی کا بہشت میں اجر دیا جائے گا اور ایک دُوسرے موقع پہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "جب زوجین ایک دُوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہیں تو ان کے گناہ انگلیوں کی پوروں سے جھڑنے لگتے ہیں"[1]

عیسائیوں کو شدید صدمہ پہنچتا ہے حضورؐ کی قوّتِ مردمی کے بارے میں سُن کر (یہ خارج از بحث ہے کہ یہ کہانیاں مشکوک ہیں) کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ، روایت کرتے ہیں کہ ہم کہا کرتے تھے کہ رسولِ مقبولؐ میں تیس۳۰ آدمیوں جتنی قوّت ہے۔ عام سیدھے سادے مسلمانوں کو جن کے سینے جدید علوم سے گراں بار نہیں، اس حدیث سے کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوتی بلکہ پیغامِ الٰہی اور حاملِ پیغامِ الٰہی کی عظمت کا نقش اور پختہ ہو جاتا ہے۔

قرآنِ مبین میں جب بہشت کی غزال چشم حوروں کے متعلق یہ آتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی اپنی اوڑھنی دُنیا پر گرا دے تو ساری دُنیا معنبر اور معطر ہو جائے، تو یہ بھی کسی عیسائی کے لیے چونکا دینے والی بات ہے۔ بھلا وُہ عیسیٰؑ کے اس بیان کی، کہ بہشت میں شادی بیاہ کا کوئی معاملہ نہیں ہوگا، کس طرح قرآن کی ان آیات سے مطابقت پیدا کرے؟ اب یہ خُدائی مصلحت کا معاملہ ہے کہ لوگ بہشت کے بارے میں بے حد محدود اور دنیاوی نقطۂ نظر رکھنے پر مائل ہیں، اس لیے اُنہیں بتانا پڑا کہ بہشت اُس طرح نہیں ہے جس طرح تم سوچتے ہو لیکن چونکہ اس دُنیا کی وُہ تمام خوبصورت اور لطیف اشیاء جو ہمارے دل کو بھاتی ہیں بہشت سے غائب نہیں ہوں گی، اِس لیے جو کچھ ہمیں دُنیا میں حاصل ہے وُہ گویا جنّت میں ملنے والی خوشیوں کی چاشنی ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ دنیاوی لذائذ کے تمام تصوّرات، جنّت کے لذائذ کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ عیسائیت اسی عدمِ اکتفا پر زور دیتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن واضح انداز میں لذاتِ حسّی کے حوالے سے بات کرتا ہے کیونکہ

---

[1] Mercy Oceans از شیخ ناظم القبرصی صہ ۱۴۷

Marfat.com

جو لذتیں ہمارے حواس اس دُنیا میں محسوس کرتے ہیں وُہ عیانِ بہشت ہی کا پرتو ہیں اور قرآن یہی سمجھانا چاہتا ہے۔ حواس کی جڑیں اعیانِ بہشت میں ہیں، اس لیے وُہ ان لذائذ سے بہشت کی لذّتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں کیونکہ جو رشتہ علامت کو حقیقت سے مربوط کیے ہوئے ہے، نہ صرف علامت کے مخرج تک پہنچانے کا ذریعہ ہے بلکہ دُوسری سمت میں روحانی یادآوری کا مرتعش تار بھی ہے۔ اس سے جہاں روح کو یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ بہشت بے حد مرغوب جگہ ہے وہاں ان بیانات کے ذریعے "زمین پہ زندگی کو گمُشدہ جہت کی خوبیوں سے مزیّن کرنا ہے"[1]

یہاں پھر ہمیں اپنے سابقہ تجربے کے ابہام کا سامنا ہے، یعنی یہ بات کہ علامت ایک ایسی حقیقت کی عکاس ہے جو اس کے بغیر ناقابلِ بیان اور نارسا ہے، اور یہ کہ ہمارا مطلوب حقیقت نہیں۔ اس دُنیا کی اشیا بہشتی اشیا کا محض عکس ہونے کے ساتھ غیر حقیقی اور گمراہ کُن ہیں۔ اگر بجائے خود ان اشیاء کو حقیقت فرض کر لیا جائے۔ ان مخالف اور متنوع نظریات میں سے کسی خاص نظریے کو کس موقع پر اپنائیں، اس کا فیصلہ حکمت و دانائی سے کیا جا سکتا ہے۔

ابنِ عربی نے جنسی اختلاط کی اہمیّت پر جو زور دیا ہے، اس کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ کسی مسلمان کے لیے اِس طاقت کا سرچشمہ خُدا کے سوا کوئی نہیں۔ یہ قوّتِ جنسی نہ صرف اولاد کے جملہ عطایا میں سے ایک زبردست انعام وعطا ہے بلکہ یہ ہماری توجہ کو ان تمام لغو باتوں سے ہٹانے والی ہے جس طرف ہم اپنی ہوائے نفس سے متوجہ رہتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ رُوح کو وہی آسودگی دینے ممد ثابت ہوتی ہے جو مذہب کا عین مقصود ہے۔ عیسائیت کے نزدیک اس تجزیے کی اوّلین اہمیّت یہ ہے کہ اس سے ایک مضبوط رشتہ پیدا ہوتا ہے جس طرح ہر ارضی حُسن ایک مستقل تعلق قائم کرتا ہے۔ (پھر جُوں ہی ہم اس حُسن کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اسے آلودگی اور معصیّت

---

1. What is Sufism, Martin Lings, p.55

Marfat.com

قرار دے دیا جاتا ہے۔) اسلام اس کے جبلّی اور عارضی کردار کو "حجاب" سے زیادہ وقعت نہیں دیتا اور اس بنا پر اسے "حدثِ اکبر" قرار دے کر مکمل طہارت کے لیے سر سے پاؤں تک غسل کا حکم دیتا ہے تاکہ اس سے دنیاوی مکروحات اور آلودگیاں دُھل جائیں اور صرف حُسنِ ازلی کا رنگ اور انداز باقی رہ جائے۔

بہرحال یہ بات ظاہر ہے کہ گوشت پوست کے جسم انسانی کا حُسن اس تجلّی کا پرتو ہے جو اس پر کہیں اوپر سے ہی پڑتی ہے، اور اس تجلّی سے آگہی ایک طرح سے حُسنِ ازلی جل شانہٗ کا مراقبہ ہے۔ شدید جنسی بے راہ روی کے واقعات میں یُوں نظر آتا ہے کہ انسان کسی ایسی چیز کو پکڑنا اور ملکیّت بنانا چاہتا ہے جو نہ پکڑی جا سکتی ہے نہ ملکیّت بنائی جا سکتی ہے۔

اسلام کے نزدیک یہ تمام مظاہرِ عالم گویا ایک شفّاف شیشے کی مانند ہیں جن کے آر پار وُہ حُسنِ حقیقی کے جلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے اور مصنوعات کے آئینہ خانے سے ہو کر صانع کی کرشمہ سازیوں تک پہنچ جاتا ہے جب کہ عیسائیت کا نقطۂ نظر کے برعکس ہوتا ہے۔ بقول شواں Schuon وہاں تسکین کا طالب حُسنِ ازلی کی تلاش میں ان پردوں اور حجابات کو تار تار کرنے کے دَرپے ہو جاتا ہے جن میں تجلّیاتِ حُسنِ ازلی کی بُنت ہوتی ہے۔ ہمیں ان مباحث میں کہ کون سا زاویۂ نظر دُرست یا غلط ہے، سر مغزی نہیں کرنی چاہیے۔ دونوں نظری زاویے بساطِ حقیقت پر انسانی زندگی اور عصری تقاضوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور پر اہم ہے کہ ہبوطِ آدم سے متعلق انجیلی داستان میں حوّا کو آدم کے بہشت سے نیچے پھینکے جانے کا اصل ذمہ دار گردانا اور عورت کو ترغیب دینے والی سمجھا جاتا ہے جو مغربی ذہنیت کا مرکزی خیال ہے۔ قرآن مبین نے ہبوطِ آدم کی جو داستان بیان کی ہے اس میں یہ پہلو نظر نہیں آتا۔ اس میں اس واقعہ کا تمام تر ذمہ دار ابلیس؛ یعنی شیطانی قوت ہے جس نے نسلِ انسانی کے پہلے جوڑے کو ورغلا کر نافرمانی کروائی۔ آدم و حوّا کے بہشتِ بریں سے نکالے جانے

Marfat.com

پر منتج ہوئی۔ اب یہاں اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عیسائیت اپنے مخصوص دیومالائی انداز فکر سے اس امر پر مجبور نظر آتی ہے کہ عورتوں کو مشکوک سمجھے اور عورت ذات کو "غضبِ خداوندی کا باعث" گردانے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل منطقی ہے کہ عیسائی جنسیت کو ہبوط کا سبب قرار دیں؛ اور بعض اوقات اُن کا جنسی مذاق پھکڑ بن جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں تو یُوں محسوس ہوتا ہے کہ عیسائیوں اور اِن کے لادین وَرثہ نے انسان کے فانی ہونے کا تصوّر اپنی جنسی فطرت کی وجہ سے کیا ہے اور شاید اسی لیے اِن کے ذہن میں یہ خیال سما بھی نہیں سکتا کہ کوئی مُسلم فنافی اللہ درویش بھی ہو سکتا ہے جو استغراقِ عبادت میں اتنی مختصر غذا کھاتا ہو جو محض جسم وجان کا رشتہ قائم رکھنے میں مدد دیتی ہو اور جو اپنی ذلّت کے لیے تمام جائز آسائش اور لذّات ترک کر چکا ہو؛ اور جو بقول اِن کے اس دُنیا میں ایک مُردے کی طرح چلتا ہو۔ وہ صرف شادی کرتا ہے بلکہ ایک سے زیادہ بیویاں بھی رکھتا ہے۔ کوئی مغربی، خواہ وُہ صاحبِ ایمان ہو یا لادین، یہی کہے گا کہ اس انداز کی راہبانہ زندگی کے مطابق تو اس کے لیے تجرّد کی زندگی ہی مناسب ہے۔ دُوسری طرف مسلمان اِس بات سے مطمئن ہوتے ہیں کہ اس عابد وزاہد بندے نے اپنا رشتہ انسانی سماج سے منقطع نہیں کیا بلکہ پوری کوشش اس بات کی کر رہا ہے کہ اپنے ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کے نقشِ قدم پر چلے۔

ایک اور تہذیبی عنصر بھی ہے جو انسان کی جنسی زندگی کے بارے میں عیسائیت اور مابعد عیسائیت کے نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اپنے مکمل پس منظر کی رُو سے عیسائیت مجبور تھی کہ کلاسیکی دُنیا کی فطرت پرستی کے خلاف جس کی قلب ماہیّت پر تُلی ہوئی تھی، ردِّعمل کا اظہار کرے۔ یہ فطرت پرستی اپنی تقدیس کھو کر لایعنی اور متبذل ہو چکی تھی۔ مغرب کے لوگ فطرت کو اپنا دُشمن تو نہیں سمجھتے لیکن یہ سودا ضرور اپنے سر میں رکھتے ہیں کہ اُسے مفتوح کریں اور اُسے زیرِ دست بنائیں۔ اُس کی دسترس سے باہر ہوں یا اُس کے اپنے اندر ہوں، مغرب کا انسان عالمِ فطرت کے قوانین اور ضروریات کا خود کو تابع بنانا پسند کرتا؛ جب کہ یہ قوانین اور ضروریات کسی مسلمان

Marfat.com

سے کے لیے بنیادی طور پر ازلی اور ابدی ہیں اور اپنے اصل اور کردار میں انتہائی مقدس ہیں۔

مسیحی اور اس کے وارث اخلاقی تہوار کو بہت سراہتے ہیں اور بعض اوقات نفسیاتی ترغیبات میں گھرے ہونے کو بھی منفعت بخش سمجھتے ہیں کیونکہ ان ترغیبات سے انہیں فطری تقاضوں پر ضبطِ نفس کا موقع ملتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمان سمجھتا ہے کہ ترغیبات سے نبرد آزمائی سے بھی اہم کچھ اور کام ہیں۔ وہ ترغیبات کو اصل مقصد یعنی خدا خوفی اور یادِ خدا میں حائل ہونے والی مکروہات ہی سمجھتا ہے۔ چونکہ وہ قرآن کے اس فرمان پر یقین رکھتا ہے کہ انسان اپنی سرشت میں ضعیف اور کمزور ہے، اس لیے اس کے خیال میں علائقِ دنیوی اور ترغیباتِ نفسی سے بچنا آسان نہیں۔ اس لیے وہ ایسے مواقع ہی نہیں آنے دیتا جو اسے کسی امتحان میں ڈال دیں۔ اسی بنا پر مخالف صنفوں کی علیحدگی اور زنانہ لباس کے قوانین بنائے گئے ہیں۔ معاشرے کے بعض طبقوں میں تو یہاں تک سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی مرد اور عورت کو کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تو ان کا ایک دوسرے کے قریب آجانا ایسا ہی یقینی ہے جیسے لوہے کے ذرات کا کسی مقناطیس کی طرف کھنچ آنا۔ خدا نے ان دو جنسوں کو بنا کر ان میں باہمی وصل کی یہ تڑپ خواہ مخواہ تو نہیں رکھ دی اور یہ بات تعجب خیز تو ہونی چاہیے، باعثِ ملامت نہیں۔ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ جب پیغمبرِ خدا اپنے آزاد کردہ غلام کی زوجہ زینب کو (جن کے ساتھ بعد میں آپ نے نکاح فرما لیا تھا) بے پردہ اور اتفاقاً دیکھ لیا تو فرمایا تھا: "حمد ہے اس ربِّ کریم کی جو ہمارے دلوں کو بدلنے کے بعد جو چاہتا ہے اُن سے کرتا ہے"۔

بعینہٖ یہی سبب ہے کہ اسلام، جو فطری تقاضوں اور اعمال کو اتنی اہمیت دیتا ہے اور انھیں "متبرک" سمجھتا ہے، مرد اور عورت کے درمیان خطِ فاصل کو سختی سے کھینچتا ہے اور اس خط، یعنی قانونِ شریعت، سے ذرا سا تجاوز بھی سخت ترین سزا کا موجب بنتا ہے۔ سماجی اور نفسیاتی توازن کے تقاضے، بچوں کی نگہبانی اور عورتوں

Marfat.com

کا تحفظ ہی شریعت کے نفاذ کی وجہ ہیں اور چونکہ ہمارے معاشرے کی پوری عمارت خاندان اور کنبے پر استوار ہے اِس لیے ان میں دست اندازی پورے معاشرے کا امن وسکون درہم برہم کر سکتا ہے؛ چنانچہ اِس کی سزائیں بھی انتہائی سخت رکھی گئی ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک تہذیب اور طرزِ زندگی کی حیثیت سے اسلام نظم وضبط اور آزادی، اور معاشرے اور فرد کے درمیان نازک توازن کے ہونے یا نہ ہونے ہی سے قائم رہ سکتا یا مٹ سکتا ہے۔

متشرقین میں سے بعض نے اسلام کو "انفرادی" اور بعض نے "اجتماعی" مذہب قرار دیا ہے جب کہ اِس میں دونوں باتیں ہیں۔ اِس میں شانہ بشانہ، صفیں باندھ کر باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے جس سے مسلمان یک جان بن جاتے ہیں اور یہ اللہ کی ایک ایسی ناقابلِ یقین فوج ہے جس میں فرد مقدس جماعت میں گُم ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی جب وُہ کسی ریگستان میں تنہا، سب سے الگ، اللہ کے آگے سربسجود ہوتا ہے، تو گویا پُوری مِلّت کا نمائندہ، اور زمین پر خدائی احکام بجالانے کا مجاز ہوتا ہے۔ ہر چیز فنا ہو سکتی ہے، مگر جہاں یہ فرد ہے وہاں اسلام ہے اور یہی بات ان لوگوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سُنّت کی پیروی کرتے ہُوئے رات کے خاموش لمحات میں عبادتِ الٰہی کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ سارا عالم خوابِ خرگوش میں ہوتا ہے لیکن اُمّت جاگ رہی ہوتی ہے اور خُدا کے سامنے استادہ ہوتی ہے۔ ملّت میں رہ کر بھی کوئی فرد خُدا کے سوا کسی اور کو رُوحانی یا دنیاوی اختیارات کا مالک نہیں سمجھتا۔ قرآن یہ ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط

"جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اُس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا۔" (المائدہ (۵): ۳۲)

منجملہ دیگر اہم نِکات کے جو اسلام کو دیگر مذاہب سے ممتاز بناتے ہیں، ایمان کا زبان سے اقرار یعنی "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہنا ہی قوسِ قزح کے سارے

Marfat.com

رنگوں کو ملا کر یک رنگ بنانا ہے۔ یہی "توحید" ہے جو ہر فرد کی ذات میں جھلکتی ہے اور انسانیت کی عمدہ مثال ہے اور یہی وحدت، اُمّت کے باجماعت نماز ادا کرنے اور شریعت کی پیروی کرنے میں نظر آتی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

باب سوم

حق اور رحمت

ان لوگوں کے لیے جو اصنام پرستی میں یقین نہیں رکھتے اور اسے ابتدائی دورِ جہالت کے عقائد میں شمار کرتے ہیں اور جو ذی شعور اور عاقل لوگوں کے تخیل سے اُتنا ہی دُور ہے جیسے آج کے اِنسان سے آدم خوری، اسلام کا نعرہ توحید؛ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (یعنی یہ گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) بے معنی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وُہ اس بات سے بھی لاعلم ہوں کہ پورے قرآن کو ان ہی چند الفاظ کی تفسیر یا تشریح کہا جا سکتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی روایات (توریت یا عہد نامۂ عتیق) میں اس سے ملتا جلتا اعلان ہے۔ خُدا نے کوہِ طور پر موسیٰؑ سے ہم کلام ہو کر کہا تھا؛ میں وہی ہوں جو کہ ہوں؛ شاید یہ کلمات اُن لوگوں کے لیے جن کا صحیفہ انجیلِ مقدس ہے، کچھ زیادہ اہمیت کے حامل نہ ہوں اور وُہ یہ وضاحت طلب کرتے ہیں کہ یہ 'وُہ'، کیا ہے؟ اگرچہ کہ وُہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ 'وُہ'، تمام تعبیرات سے ماوریٰ ہے۔

کلمۂ شہادت؛ یعنی اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اسلام کے تمام عقائد کا

Marfat.com

سرچشمہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہ ہونے کی بات کے معنی یہی ہیں کہ کوئی ہستی اِس ذاتِ مُطلق کے سوا مطلق نہیں اور کوئی شے اِس حقیقتِ عظمیٰ کے مقابلے میں جو اپنی ذات میں واحد اور غیر منقسم ہے، حقیقی نہیں؛ اور ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ جو اشیا سینما کے پردے پر آنے جانے والی تصویروں کی طرح آج آئیں اور کل چل دیں، کس طرح صحیح معنوں میں حقیقی کہی جا سکتی ہیں؟ اور اسی کے تحت جو بھی شے یہاں خواہ ایک ثانیے یا ایک ہزار برس کی مُدّت کے لیے وجود پذیر ہو اُس کُل کے جزو کی حیثیّت ہی سے اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ یا دُوسری طرح یُوں کہہ لیجیے کہ وُہ مشیّت اور ارادۂ الٰہی کے تحت ہی موجود ہے جس کی شان یہ ہے کہ جب وُہ کسی شے کو کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے "کُن" ہو جا اور وُہ ہو جاتی ہے، اور جب اس بھری پُری دُنیا کے خاتمہ کا وقت آئے گا تو یہ دھوئیں کے مرغولے کی طرح اُڑ جائے گی؛ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَٰلِ وَالْإِكْرَامِ ۝

(رحمٰن (۵۵):۲۷-۲۶)

(ترجمہ) جو کچھ زمین کے اُوپر ہے فنا ہونے والا ہے۔ اور باقی رہے گی ذات تیرے پروردگار کی۔ صاحبِ بزرگی اور صاحبِ انعام کی۔

لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللهُ خُدا موجود ہے اور وُہ ہے کیونکہ وُہ ہے۔ اس کے وجود کو کسی سبب یا وجہ کی ضرورت نہیں وُہ ازل سے ہے؛ چنانچہ اپنی ذات کا تعارف یُوں فرماتا ہے:

قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ ۝ اَللهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝
وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ (۱۱۲)

کہہ دیجیے (اے محمدؐ) وُہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے احتیاج ہے۔ نہیں جنا اِس نے اور نہ جنا گیا؛ اور نہیں واسطے اس کے کوئی برابری کرنے والا۔

Marfat.com

اور انہی آیاتِ مبارکہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی قوت اس کے آگے قوت نہیں، کوئی رحمت اس کے آگے رحمت نہیں؛ اور کوئی مددگار نہیں سوائے اُس "نصیر" کے، اور پھر دُوسری طرف یہ بھی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی "ہالک" (فنا کرنے والا) بھی نہیں اس سے زیادہ کوئی منتقم بھی نہیں۔ وہی (مُعِزّ) عزت دینے والا ہے اور وہی (مُذِلّ) ذلت دینے والا۔ وہ چاہے تو بے حساب رزق اور دولت دے، اور چاہے نعمتیں چھین کر احتیاج و افلاس مُسلّط کر دے۔ وہی راحت دیتا ہے اور کلفت و رنج بھی۔ وہی مُسبّب الاسباب بھی ہے اور خود سبب بھی۔ اگر خُدا کی مرضی نہیں تو ایک ہزار مُسلح آدمی بھی میرے خلاف صف آرا ہو جائیں تو میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرے دشمن میرے خلاف لاکھ سازشوں کے جال بچھائیں دُشمنی میں زہر اُگلیں، اگر اللہ کی مرضی نہیں ہے تو وُہ میرے آگے ناکام و نامراد ہی ہوں گے۔

کلمۂ شہادت، خدا اور ماسوا کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے اثباتِ خُداوندی کو قائم کرتا اور ماسویٰ کو مسترد کر کے اس کے اصلی مقام پر پہنچا دیتا ہے؛ اور جو لاشریک ہو اُس کا کوئی شریک کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک حدیثِ قُدسی ہے کہ خُدا اس وقت بھی تھا، جب کچھ نہ تھا۔ کہا جاتا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اِس میں یہ اضافہ فرمایا تھا کہ وُہ آج بھی اپنی ذات میں ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا۔ یہی تنزیہہ کامل اسکا جُزو لازم ہے۔ چونکہ اس ذاتِ واحد کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر ہو تو پھر وُہ بھی اپنی جگہ خُدا ہو گا، اس لیے تمام ممکنات و مخلوقات اسی حقیقت ازلیہ و ابدیہ کا پرتو اور انعکاس ہیں۔ ہم "الوہیت" کو کوئی اور مفہوم دیں تو وُہ معکوس ہو کر خود "الٰہ" بن جائے گا۔

اسلام کے معنی ہیں ذاتِ واحد کی کامل بندگی اور قرآنِ مبین ہمیں بتاتا ہے کہ پوری کائنات میں کوئی شے بھی ایسی نہیں جو طوعاً یا کرہاً ہر لحظہ، ابتدا سے انتہا تک اس احکم الحاکمین واحد و قدیم کے آگے سر نہ جھکاتی ہو جس کے بعد کچھ نہیں، کوئی وجود نہیں، کوئی نُور نہیں، کوئی رُوح نہیں۔ چنانچہ اپنی ربوبیّتِ کاملہ کا حوالہ وُہ بزرگ و برتر یوں بیان

Marfat.com

فرماتا ہے:

قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ يَّمۡلِكُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ (یُونس (۱۰): ۳۱)

"کہہ دیجیے (اے نبیؐ) کون تمہارے لیے آسمانوں اور زمینوں سے رزق اتارتا ہے۔؟ کون مالک ہے سماعت و بصارت کا۔؟

ہم صامت ہیں، وُہ ناطق ہے۔ ہم بے بصر ہیں، وُہ بصیر ہے۔ ہم بہرے ہیں، وُہ سمیع ہے۔ ہم ذائقے سے محروم ہیں، وُہ ذائقے کا مالک ہے۔ ہم اس کے بغیر راحت و تسکین نہیں پا سکتے جب کہ وُہ انبساط و سرور کا منبع ہے۔ یہ اُس کی رحمت ہے کہ ہمیں سارے حواس عطا کیے مگر ان حواس کا اختیار اُس کے پاس ہے جیسا کہ حضورؐ فرماتے تھے:

لَاحَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الۡعَلِيِّ الۡعَظِيۡمِ

اللہ بلند و برتر کے سوا اور کوئی طاقت، کوئی قوت نہیں۔ (یعنی وہی ہر طاقت اور صلاحیت کا بخشنے والا ہے)

اللہ عزّ و جل کو اکثر مقامات پر 'اَلۡبَيِّنِ' یعنی بدیہی طور پر ظاہر و آشکار بیان کیا گیا ہے؛ تاہم حق تو یہ ہے کہ ہمارے کج مج الفاظ اس مفہوم کا کہاں احاطہ کر سکتے ہیں جو اس لفظ 'البیّن' میں پوشیدہ ہے۔ اس کی مثال کچھ یُوں سمجھئے کہ کسی تپتے ہُوئے ریگستان میں سفر کرنے والے کے لیے سُورج محض 'نمایاں' ہونے سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وُہ جھلسا دینے والا اور اپنا آپ منوانے والا ہوتا ہے جس سے مفر نہیں۔ مسلمانوں کے لیے اللہ کی ذات اِسی طرح ایک حقیقت ہے۔ فرتھجوف شوآن Frithjof Schuon صحرا کے ان خانہ بدوشوں کی تشبیہہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اِن لوگوں کے لیے ذاتِ الٰہیہ کی ازلی "تمازت" بھی ہر دم موجود سُورج کی طرح ہے جس کی روشنی کے آگے انسان 'لاشے' ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ خلیفۂ دوم عُمر بن خطابؓ نے قدیم دُنیا کا ایک بڑا حصّہ فتح کر لیا تھا یا یہ کہ حضرت رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی بکریوں کا دُودھ خود دوہ لیا کرتے تھے تو دونوں کی حیثیت

Marfat.com

ایک سی ہے کیونکہ عام معنوں میں "انسانی عظمت" کا کوئی پیمانہ نہیں اور نہ انسان کو غرور اور بے جا فخر کرنے کا کوئی حق ہے۔ اگر عظمت ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کیلئے اور وہی کبریا ہے اور اُسی کی عظمت لائقِ حمد و ستائش ہے[1]

جو ذات اِس قدر واضح اور عیاں ہو، اس کے بارے میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی[2] اسلام نے جو فضا پیدا کی ہے، اُس میں آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ "خُدا ظاہر و باہر ہے۔ 'میں' غیر واضح اور دھندلا ہوں" دھندلکے پُراسرار ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی دُنیا میں ہر ابہام، راز ہے۔ انسانیّت میں ابہام اس لیے ہے کہ وہ اضافی ہے مطلق نہیں۔ ہو سکتا ہے انسان جتنی لمبی عمر پائے اتنا ہی اُسے انسانی داخلیت پسندی کی پیچیدگیوں کا زیادہ ادراک ہو جائے یا انسانوں کی اپنی اپنی داخلیت پسندی میں مڈبھیڑ کا احساس ہو؛ یہاں تک کہ وہ اپنے اذہان کے جالے اُتار کر صرف اُس ذات کی طرف رجوع کریں جو آئینہ کی طرح روشن ہے۔

توحید کی شہادت کا تجزیہ کئی طریقوں سے کیا جا سکتا ہے جن سے وہ ہمارے دل و دماغ پر پُوری طرح نقش ہو جائے، مثلاً شہادت کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک نفی یعنی انکار اور ایک اثبات؛ یعنی تسلیم اور اقرار "لَا اِلٰہَ" کا تعلق اُس دُنیا سے ہے جس کی نفی کی جا رہی ہے اور جو اپنی اصل سے دُور ہو گئی ہے یا دُور سمجھی جاتی ہے الّا اللہ اثبات ہے اور اس کا تعلق ذاتِ حق سے ہے جس سے پہلے دنیا (یا انا) کی نفی کی جا چکی ہے کیونکہ دُنیا خود اپنے آپ کو چھوٹا موٹا خُدا منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ توحید کی شہادت کے اس مختصر کلمے ہی میں "ہاں" یا اثبات پوشیدہ ہے جو دُنیا کو اپنی اصل یاد دلا کر ذاتِ واحد کا اطاعت گزار اور

---

[1] Frithjof Schuon, Dimensions of Islam صہ ۶۹ فرتھجوف شوان۔

[2] محمود شبستری کے بقول ذلّتِ مطلق، اس قدر واضح اور بدیہہ ہے کہ اپنی شدّتِ ہدایت کی وجہ سے انسانی آنکھ میں سما نہیں سکتی۔

Marfat.com

مکمل تابع بنا دیتا ہے۔ اس کلمے کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے تاکہ اس کا مفہوم راسخ ہو جائے۔ پہلے 'لَا' کے لفظ کو لیجیے۔ کوئی عرب 'لَا' یعنی نہیں کا لفظ استعمال کرتا ہے تو ایک دھماکا سا ہوتا ہے۔ یہاں اس سے دھماکا ہی مقصود ہے تاکہ تمام اوہام اور وسوسے فنا ہو جائیں اور مادّی اشیاء اور خود غرضیوں کی کائنات میں کثرت کا ہر بُت پاش پاش ہو جائے۔ ہمارا تجربہ کہتا ہے کہ ہر چیز زود یا بدیر، یوں نظر آتی ہے گویا کوئی علیحدہ وجود رکھتی ہو اور اللہ کے مدِمقابل، خُدا بننے کی کوشش میں ہو۔ لفظ "الٰہَ" ایسی ہی کسی شے یا تمام اشیاء کے لیے آیا ہے۔ لفظ "اِلَّا" ان+لا کا مرکب ہے اور بعض اوقات اسے نفی اور اثبات کے درمیان برزخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے "پار" حقیقتِ ازلی یعنی اللہ ہے۔ یہاں پہنچ کر ہر چیز کی نفی ذاتِ خداوندی میں گُم ہو کر اثباتِ حقیقت بن جاتی ہے۔

ان کلماتِ توحید کی تصریحات کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ قرآن نے اسے بالخصوص 'نور' کی اصطلاح سے واضح کیا ہے۔ قرآنِ مبین میں آیا ہے کہ اللہ نورِ سمٰوٰت و ارض ہے اور اسلامی عقائد کے مطابق جو کچھ ذاتِ الٰہی سے جدا ہے، وہ اِس نور کے بے حساب حجابات میں مستور ہے اور اس اعتبار سے 'لا' اِن حجابات کا مظہر ہے جو اِس نور کو مستور کیے ہوئے ہیں جو "غیر شفّاف" ہی ہے۔ "الٰہَ" اس نور کا عکس ہے جو اصل سرچشمہ سے جُدا ہے۔ "اِلَّا" ایک شفّاف نقاب ہے جس میں سے روشنی مکمل طور پر گزر جاتی ہے اور "اللہ" نورِ حقیقی ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بہ ظاہر تو ایک تازیانہ ہے ایک بھُولے ہوئے سبق کو یاد دلانے کا؛ مگر اگر بہ نظرِ غور دیکھیے تو یہ انسان کی فطری اور سرشت کی انتہائی اندرونی تہوں تک سرایت کیا ہُوا ہے؛ تاہم اس کے حقیقی ادراک کے لیے سخت اقدامات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور قرآن کہتا ہے:

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَلَی النَّارِ ؕ اَلَیْسَ ھٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا (احقاف (۴۶): ۳۴)

Marfat.com

اور جس روز منکرین آگ کے سامنے کیے جائیں (اور کہا جائے گا) کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو کہیں گے کیوں نہیں ہمارے پروردگار کی قسم (حق ہے)

لقائے حق کا یہی انداز ہو گا جس کا میلان ہماری سرشت میں رکھ دیا گیا ہے اور جو ہمارے اعمال کے نتیجے میں مقدر ہو چکا ہے۔ جب وہ حق کے رُوبرو ہوں گے اور اس کا اظہار پوری شدت سے ہو گا تو منکر بھی اُس دن ایمان لے آئے گا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ قسم ہے پروردگار کی یہ حق ہے[1]۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اپنے مالک کا صرف حالتِ غفلت اور خواب ہی میں انکار ممکن ہو سکتا ہے، اور خود فریبی ہی اس حقیقتِ ازلی کا حجاب بنتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۗ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (النور ۲۴: ۳۹)

"جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ میدان

---

[1] جب اس بازی گاہ عالم کا پردہ چاک ہو گا اور اس کی انگنت تصویریں، نقوش، واقعات اور حوادث نوچ پھینکے جائیں گے اور دُنیا کا خاتمہ یا ایک انفرادی حیثیت رکھنے والے وجود کا خاتمہ ہو گا تو صرف ایک ہی پکار سُنی جا سکے گی:

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝ (الانعام ۶: ۴۰-۴۱)

"کہہ دو! تمہارا کیا خیال ہے جب تم پر خُدا کا عذاب آئے گا یا قیامت آئے گی تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو (مدد کے لیے) پکارو گے، اگر تم سچے ہو نہیں، تم اُسی (خُدا) کو پکارو گے تو اگر وہ چاہے تو جس کو اس کے ساتھ پکارتے تھے اُسے ظاہر کر دے گا اور تم اس کے جو شریک بناتے تھے وہ سب بھول جاؤ گے۔"

Marfat.com

ہیں ریت کہ پیاسا اُسے پانی سمجھے یہاں تک کہ جب اُس کے پاس آئے تو اُسے کچھ بھی نہ پائے اور خُدا ہی کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اس کا حساب پُورا پُورا چُکا دے، اور خُدا جلد حساب کرنے والا ہے۔"

اور پھر اللہ سبحانہٗ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ ۲: ۱۱۵)

"اور مشرق اور مغرب سب خُدا ہی کا ہے۔ تو جدھر تم رُخ کرو اُدھر خُدا کی ذات ہے۔"

اب زندگی کے ہر اُفق پر شاہراہِ حیات کے ہر اختتام پر اور ہر جملۂ نہاں میں اس مالکِ کون و مکاں کا "چہرہ" موجود ہے۔ وُہ حاضر و ناظر ہے۔ پس ہمیں انتہائی محتاط ہو کر وُہ راہ پکڑنی چاہیے جو اس کی مرحمت اور بخشش کا موجب ہو، اس کے غضب کا باعث نہ بنے۔

فلسفی جسے حقیقتِ مطلق سمجھتا ہے وُہ عام آدمیوں کے لیے جو روزمرّہ کے دُنیاوی اعمال میں منہمک ہیں، ایک قوّت ہے۔ ہمیں حقیقتِ ازلی کا سامنا ایک قوّت کے طور پر ہوتا ہے۔ قرآن عام انسانوں کے تجربات اور مشاہدات ہی کی اصطلاح میں بات کرتا ہے۔ شہادتِ توحید ایک عقیدہ ہی نہیں ایک سرچشمۂ اعمال بھی ہے یا یُوں سمجھیے تمام اعمال کی کنجی ہے۔ اس کی سچائی رگ و پے میں جاری و ساری ہو کر زندگی کو اپنا تابع بناتی ہے۔ بلکہ جب ہم اسلامی عقائد کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد کسی مفروضے سے نہیں بلکہ اُس طرزِ زندگی سے ہوتی ہے جو ہر مرد و زن کو بسر کرنا چاہیے۔ اِن کا چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کام اور آرام ایک دُوسرے سے معاملت محبّت کی باتیں، حتّٰی کہ فصلوں کی بوائی، کٹائی، نل کی ٹونٹی تک کھولنا اور بند کرنا غرض حیات اور موت سب اسی شعور کے تحت ہونا چاہیے۔

اِس بات کو سمجھنے کے لیے کہ یہ نسخہ کیا شافی و کافی ہے، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ عام مسلمان کی زندگی میں اِس کا کیا مقام ہے جو حق کی شہادت ہر بحران میں تھمنے

Marfat.com

پر اور ہر لمحے دیتا ہے۔ جب دُنیا اُسے روند ڈالنے پر آمادہ ہوتی ہے؛ اور یہی گواہی وُہ اس وقت دیتا ہے جب وُہ نزع کے عالم میں ہوتا ہے۔ کوئی متقی مسلمان اس کلمۂ شہادت سے اپنے غصّے پر قابو حاصل کرتا ہے اور اپنے بپھرے ہوئے جذبات کو اس سے سرد کرتا ہے۔ وضع حمل کے وقت کرب کی حالت میں جب کوئی عورت کراہتی ہے تو اسی کلمۂ شہادت کو یاد کر کے خاموش ہو جاتی ہے۔ کوئی طالب علم امتحان کے حال میں میز پر جھکا ہُوا لکھنے میں مشغول ہے اچانک وُہ کلمۂ شہادت کو یاد کر کے سر اُٹھا کر پڑھتا ہے تو پُورے ہال میں سکون کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ تمام سوالات کا یہی شافی جواب ہے[1]

کسی مسلمان کے لیے شرک سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ دُوسرے لفظوں میں بُت پرستی اور تعدّد الٰہ۔ خود اللہ قرآن مبین میں فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا ۝ (النساء (۴) : ۴۸)

خُدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا۔

بُت پرستی اور تعدّد الٰہ پر یقین، حقیقت ازلی کے بارے میں محض گمراہی نہیں بلکہ ایسا فعل ہے جو فساد کی بنیاد ہے اور جس سے انسان کا اللہ سے ناطہ ہی ٹوٹ

---

[1] مصنّف کے ایک دوست اپنی اہلیہ اور دو چھوٹے بچّوں کے ساتھ مشرقی افریقہ کے کسی دُور افتادہ، غیر آباد علاقے میں موٹر پر سفر کر رہے تھے۔ ان کی گاڑی ایک خندق میں جا پھنسی۔ گاڑی کو نکالنے کی جب کوئی راہ کامیاب نہ ہوئی تو انہوں نے ایک طرف کھڑے ہو کر بہ آواز بلند کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، تو یکلخت جھاڑیوں میں چھپے ہوئے مسلمان دہقان باہر نکلے۔ انہوں نے گاڑی کو باہر نکالا اور اس خاندان کی مدارات میں جو کچھ انہیں میسّر تھا پیش کر دیا۔

Marfat.com

کر رہ جاتا ہے مگر اس میں اس کی اپنی قوتِ ارادی کا دخل ہے۔

گزشتہ صدی میں ارتقائے ادیان کے جو ابلہانہ نظریات کارفرما تھے اب وہ گہری نیند سو چکے ہیں۔ اب عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اصنام پرستی اور کئی خداؤں پر یقین اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب الوہی "طاقتیں" (جو ابتداءً خدائے مطلق کی صفات کہی جاتی تھیں) الگ الگ خدا بن جاتی ہیں اور انھیں اس حیثیت سے پُوجا جانے لگتا ہے۔ اس میلان کے بنیادی اسباب کسی نہ کسی رنگ میں دُنیا پرستی ہی کہے جا سکتے ہیں اور یہ منظر قدیم یونان کے مذہب، قدیم افریقی قبائلی مذاہب اور ہندو مت میں واضح ہے۔ قرآن مبین میں صرف زمانہ جاہلیت کے عرب معاشرے میں اس مذہب کا ذکر صرف اس لیے آتا ہے کہ عرب کس طرح راہِ حق سے بھٹک گئے تھے۔ یہ لوگ "اللہ" کے نام سے ناآشنا نہ تھے مگر انھوں نے اس کے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی تھیں اور کچھ دیگر اشیاء کو اس کا شریک بنا لیا تھا۔ یہ بڑا سہل اور قابلِ عمل نسخہ تھا کہ ایسے خدا تراش لیں جن سے "معاملہ" آسان ہو اور وہ اپنے پجاریوں سے کوئی اُلٹا سیدھا مطالبہ بھی نہ کر سکیں!

"حقیقت یہ ہے کہ اصنام پرستی علامات کی مقصود بالذات پرستش کا نام ہے؛ خواہ یہ علامات کسی چیز پر کندہ اشکال کی صورت میں ہوں یا محض انسانی تخیّل کی تخلیق ہوں۔" فرتھ جوف شوآن لکھتے ہیں کہ "میں کلاسیکی اور روایتی اصنام پرستی میں نجات کے لیے صداقت اور اثر پذیری کا فقدان، عبادت گزاروں کی ذہنیت میں تبدیلی سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ ان علامتوں کے آخرالامر باطل ثابت ہونے سے۔ یہ ذہنیت ہے جو کبھی سوچ بچار پر مبنی تھی اور صُور کی مابعد الطبیعیاتی تنگ ظرفی کا شعور رکھتی تھی، بالآخر جذباتی اور دنیا دارانہ بن گئی، اور انجام کار محض اوہام پرستی رہ گئی۔ وہ علامت جس کے ذریعے حقیقت کی نقش گری کی جاتی تھی، ابتداءً واضح تصوّر رکھتی تھی مگر رفتہ رفتہ کوئی ٹھوس یا ناقابلِ فہم شکل یا بُت بن گئی۔"[1]

1. Understanding Islam, Frithjof Schuon, p.55

ـــلـہ

Marfat.com

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے پہلے اہلِ مکہ کے زوال میں تیزی یوں آئی کہ اُنہوں نے ناقابلِ فہم علامتوں کی جگہ انسان کے تراشیدہ "کھلونے" بُت بنالیے جو بے معنی تھے، جس طرح صحرا میں نصب سنگ میل، جو کسی منزل کا پتا دیتے ہوں؛ ہر وُہ چیز جس میں بُت پرستی کا ذرا بھی شائبہ ہو، مثلاً انسانی، حیوانی اشکال، مسلمانوں کے نزدیک مشتبہ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جب انسان خُدا کی صورتوں میں پنہاں، حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے اور انہیں محض مادّی اشکال نہ سمجھے، تو اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ وُہ ہر مادّی شے کو بالذّات لائقِ عبادت سمجھنے لگتا ہے۔

متعدد خُداؤں پر یقین اور بُت پرستی "باضابطہ" شرک ہے۔ بعض حالات میں یہ عیّارانہ عالمگیر صورت اختیار کر سکتا ہے۔ آج کے دَور میں محض تجربات کرنے اور اپنے مشاہدات درج کرنے والے سائنس دان نہیں بلکہ وہ سائنس دان بھی جو بڑے بڑے نظریات پیش کرتے ہیں، ایک لحاظ سے "مشرک" ہیں کیونکہ وُہ عناصرِ فطرت اور تمام تخلیقی اداروں کو بالذّات "قوتیں" سمجھتے ہیں اور کسی واحد مشیتِ الٰہی کا آلۂ کار نہیں سمجھتے، اور یہی بات اِس آدمی پر بھی صادق آتی ہے جس نے اپنی زندگی کا مقصود کسی دنیوی شے؛ مثلاً طاقت یا دولت کے حصول کو بنا رکھا ہو اور یہ بھول چکا ہو کہ اس کا منتہائے مقصود کیا ہے یا وہ شخص جو خُدا کی رضا حاصل کرنے کی بجائے کسی دنیاوی شے کی طلب میں سرگرداں ہو۔ اس لحاظ سے ہر وُہ عمل جس میں خدائی احکامات سے سرتابی کی جائے شرک کی صف میں آتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی نوعیت کے شرک کا مرتکب ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ

(النحل (۱۶): ۶۱)

"اور اگر خُدا لوگوں کو اِن کے ظُلم کے سبب پکڑنے لگے تو کسی جاندار کو زمین پر زندہ نہ چھوڑے، لیکن اِن کو ایک وقتِ مقررہ تک مہلت دیئے جاتا ہے"۔

عام طور پر کلمۂ شہادت میں "لَا شَرِيْكَ لَهٗ" بھی شامل کیا جاتا ہے؛ یعنی اِس

Marfat.com

ذاتِ واحد کا کوئی شریک نہیں۔ لیکن ہم قول و فعل سے، دانستہ یا نادانستہ، اُس خُدا کا، جس کا کوئی شریک نہیں، شریک ٹھہراتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اس ارحم الرّاحمین کا کرم بے پایاں ہمارے شاملِ حال نہ ہو تو کوئی بھی جہنّم کی آگ سے نہیں بچ سکتا۔ دراصل "چھوٹا خدا" وُہ سایہ ہے جو ہر شے کی پُشت پر ہے، ہمارا اپنا نفس، ہماری اَنا ہے، جو خود مختار ہونے کی خام خیالی میں مبتلا ہے۔

وُہ راہ جو روشنی سے تاریکی تک جاتی ہے، شرک کو کفر میں بدل دیتی ہے۔[1]

عام طور پر "کافر" کی اصطلاح "ایمان سے عاری شخص" کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ اس حالت میں دُرست ہے جب تک اس میں ایک اختیاری حالت پائی جاتی ہو یعنی جس میں اِرادہ اور عقل دونوں میں فساد پیدا ہو چکا ہو۔ محمد اَسد نے اِس کا ترجمہ "منکرِ حق" کیا ہے اور حقیقت یہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ "کُفر" کسی کلیّے کو سمجھنے میں عام ذہنی معذوری سے زیادہ ہے اور اس کا مفہوم خود اس لفظ میں پوشیدہ ہے۔ کافر کے لغوی معنی ہیں "چُھپانے والا" جیسے کوئی کسان بوائی کے وقت اپنے بیجوں کو زمین میں چُھپا دیتا ہے یا پھر جس طرح رات کی تاریکی روشن دن کو چُھپا لیتی ہے۔ محمد اسد نے اسکی تصریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اپنے تجریدی مفہوم میں اسم اور فعل دونوں ہی ڈھانپنے اور چھپانے

---

[1] Atheism الحاد۔ بحیثیت مذہب دُشمنی کے فی الواقع مغرب میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہاں عام طور پر مذہب سے لاتعلقی سی پائی جاتی ہے؛ تاہم سویت یونین میں الحاد سرکاری مسلک ہے اور وہاں کی مسلم رعایا کو اس سے سخت چڑ ہے۔

"مسلمانوں کے نزدیک ملحد محض خوش فہم باغی، یا کوئی اعلیٰ درجے کا آزاد خیال فلسفی نہیں، بلکہ انسان سے بھی کم تر اور محدود عقل رکھنے والی ہستی ہے، جو زیادہ نہیں تو جانوروں کی سطح پر ضرور ہے ۔۔۔"

The Islamic Threat to the Soviet State, Alexandre Bennigsen & Marie Broxup

Groom Helm, 1983.

Marfat.com

کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں، یعنی حقیقت کو یا کسی موجود شے کو چھپانا یا کسی ایسی شے کا انکار کرنا جو حق اور سچ ہے۔ قرآن میں لفظ 'کافر' ایک وسیع روحانی مفہوم میں اس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جو انکار کرے یا کسی صداقت کو قبول کرنے سے منکر ہو، خواہ اس کا تعلق صداقتِ عظمیٰ کی پہچان سے ہو یا کسی عقیدے یا قانونِ خداوندی کے انکار سے ہو، یا کسی واضح اخلاقی اُصول کو تسلیم کرنے سے ہو یا کوئی انعام ملنے پر خوشنودی یا احسان پر شکریہ ادا کرنے سے ہو۔[1]

جونہی کوئی شخص یہ جان لے کہ مذکورہ بالا حقائق خود فطرتِ انسانی میں مستور ہیں، (اگرچہ پس پشت ڈالی جا چکی ہیں) جیسا کہ قرآن بار بار کہتا ہے، تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ معاملہ محض اتنا نہیں کہ جو بات کہی جائے ہم اسے تسلیم کرنے کے قائل نہیں بلکہ یہ حقیقتاً ذاتی مفادات کے سبب اس بات کو ماننے سے صریحاً انکار ہے جسے ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ کسی بات کو اپنے آپ سے بھی چھپانے کا تعلق ارادے سے ہے۔ فرتھجوف شوآن کہتے ہیں کہ کفر کی خرابی یہ ہے کہ اُس سے قوّتِ ارادی بے لچک ہو جاتی ہے اور اس سختی کا سبب علائقِ دُنیا سے رغبت ہے۔ ایمان کا خاصا یہ ہے کہ وُہ ابتدائی اور اساسی انسان کی بنیادی جبلّت سے وابستگی پیدا کرتا ہے؛ یعنی اُسے سکھاتا ہے کہ وُہ اُسی حالت اور فطرت پر رہے جس پر اُسے خُدا نے پیدا کیا اور اُسی کی رضا میں راضی رہے۔[2] آج جسے "حقیقت پسندی" سے تعبیر کیا جاتا ہے وُہ دراصل یہی ارادے کی سختی اور دُنیا داری ہے کیونکہ اس دُنیائے ناپائیدار کو پائیدار اور کافی سمجھ لینے ہی سے ہم داخلی طور پر معلوم اور خارجی طور پہ آشکارا حقیقت کو ڈھیروں اشیاء اور خوابوں تلے دفن کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ

---

1. Message of the Qur'an, Mohammad Asad, p.907, note-4

2. Logic & Transcendence, Frithjof Schuon, p.200

Marfat.com

يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ٥ (مطففین (۸۳): ۱۴ - ۱۵)

"دیکھو یہ جو (اعمالِ بد) کرتے ہیں ان سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔ بے شک یہ لوگ اس دن اپنے پروردگار (کی رحمت) سے اُوٹ میں ہوں گے۔"

اِن آیات میں بھی اِرادے کی اہمیت واضح کی گئی ہے لیکن یہاں کسی ایک منکرانہ عمل کا ذکر نہیں بلکہ اِن تمام چھوٹے بڑے اعمال کا مجموعی ذکر ہے جن سے انکارِ خدا لازم آتا ہے۔ منکر گویا یہ تاثر پیش کرتا ہے جیسے خدا موجود نہ ہو اور وہ اپنی سی کرنے میں آزاد ہو۔ دُوسرے لفظوں میں گنہگار اپنے حسابوں خود کو ایک چھوٹا موٹا خدا سمجھ بیٹھتا ہے۔ اگر صوفیوں کے اس قول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ہر انسان کے قلب میں رحمتِ خداوندی کا کبھی نہ خشک ہونے والا چشمہ موجزن ہوتا ہے تو پھر سے کہنا پڑے گا کہ گنہگار نے اسے اپنے گناہوں سے ڈھانپ کر خود کو اُس سے محروم کر لیا ہے۔

کسی کافر اور مومن میں عملاً بہت سادہ اور معمولی سا فرق ہے مگر دونوں کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے بہت بڑا ہے؛ یعنی اپنی ذات اور اعمال کے سبب اُن کا "قبلہ" کیا ہے؟ لیکن ہم انسانی فطرت کی اُلجھنوں اور بوقلمونیوں کا لحاظ نہیں کرتے یا اپنے ہم جنس مرد و زن پر محاکمہ کرنے سے نہیں چُوکتے۔ اس سے ہمیں اپنے آپ کو دُوسروں کی نظر سے دیکھنے میں مدد نہیں ملتی اور دُوسرے لوگ بھی ہمارے دلوں میں جھانک نہیں سکتے نہ ہماری اصلی نیّتوں کو جان سکتے ہیں۔ لوگ عام طور پر وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی وہ ہوتے ہیں جو خود کو سمجھتے ہیں۔ صرف ایک ہی ذات ایسی ہے جو ہمیں پوری توجہ اور غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھتی ہے، اور ہمیں شکرگزار ہونا چاہیے کہ وہ ذات رحیم ہے، کریم ہے اور ستّارِ عیوب ہے۔

ہر مرد و زن درونِ ذات ایک شہر ہے جس میں بہت سے فرقے اور طبقے ہوتے ہیں۔ آج ایک "طبقہ" حاوی ہے تو کل کوئی دُوسرا ہوگا۔ وہ لوگ جن میں گروہوں کی نبرد آزمائی نہیں ہوتی نیک و کار لوگ ہیں جو تمام مخالف طاقتوں کو اعلیٰ اصول کے

Marfat.com

تحت رکھتے ہیں، اور دُوسرے وُہ لوگ ہیں جنھوں نے ہوا و ہوس کے آگے سپر ڈال دی ہے اور اس بھلاوے میں ہیں کہ انھوں نے سکون و اطمینان حاصل کر لیا ہے؛ حالانکہ یہ سکون بد ترین جنگ سے بھی بد تر ہے۔

زندگی کے ان دو انتہائی کناروں کے درمیان ایک میدانِ جنگ ہے۔ یہ حقیقت گمراہ کُن ہے کہ بے شمار انسان خاموشی سے عام سی زندگی گزارتے ہیں۔ وُہ نہ آسمان کی طرف دیکھتے ہیں نہ زمین کے اندر جھانکتے ہیں، نہ دائیں دیکھتے ہیں نہ بائیں، کیونکہ ہر ذی حیات کا تنِ خاکی متضاد اور متحارب خیالات اور جذبات کی آماجگاہ ہوتا ہے؛ تاہم اس کی اندرونی کشاکش اس وقت تک خوابیدہ رہتی ہے جب تک کسی بڑے خطرے کا سامنا نہیں ہوتا یا کسی جزا کی توقع نہیں ہوتی۔ جب انسان مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ خُفیہ جذبے: خواہ وُہ خیر کے ہوں یا شر کے، بیدار ہو جاتے ہیں۔ اگر اس مرحلے پر شر اس پر غالب آ جائے تو پھر وُہ مذہب کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

نفسِ متکبّرہ سے زیادہ کوئی شے مذہب کو اپنا لقمۂ تر بنانے کی خواہش مند نہیں ہوتی۔ یہ اَنا اپنی ہوس اور آرزوہائے نارسیدہ کی آسودگی کے لیے مذہب کو بے دریغ استعمال کرتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض دُنیا دار انسانوں کے دلوں میں قتل اور خونریزی کے جذبات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ موقع ملتے ہی یہ خُدا کے نام پر قتل کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جنّت کے آرزومند، جہنّم کے اُوپر تنے ہوئے باریک پُل پر چل رہے ہوتے ہیں۔ انعام جتنا بڑا ہو گا، تکلیف بھی اُتنی ہی بڑی اُٹھانی پڑتی ہے۔

بہرحال روشن تو روشنی ہی ہے۔ وُہ اُن چیزوں کو بھی اُجاگر کر دیتی ہے جنھیں ہم پردۂ اخفا میں رکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ اس کا کام ہر چیز کو نمایاں اور روشن کرنا ہے، اور یہی بات یومِ حساب کے لیے کہی جا سکتی ہے جس کا آخرالامر ہم سب کو سامنا کرنا ہے۔

کسی "لا ادری" کے نزدیک مذہب کا تصوّر عجیب و غریب ہوتا ہے۔ وُہ سمجھتا ہے کہ جو شخص بھی یہ دعویٰ کرے کہ وُہ خُدا پر ایمان رکھتا ہے اُسے فوراً کامل ہو جانا چاہیے، ورنہ وُہ منافق اور جعلساز ہے۔ وُہ سمجھتا ہے مذہب کا پیرو بن جانا ہی منزل ہے جب کہ یہ

Marfat.com

تو آغاز ہے ایک انتہائی مشکل راہ پر ایک صبر آزما سفر کا۔ "لا ادری" مذہبی لوگوں کو ایک جیسا دیکھنا چاہتا ہے؛ حالانکہ خود اس میں یک رنگی نہیں ہوتی۔

یہ بات کہ ہم دُوسروں میں یک رنگی چاہتے ہیں (اور اس کے فقدان سے ششدر رہ جاتے ہیں) خود شافی ثبوت ہے کہ ہم انسانی شخصیت کو ایک اُصول کے تابع ہونے کے فوائد سے آگاہ ہیں۔ مذہب کا سب سے مشکل پہلو اس کی سادگی ہے کیونکہ سادہ انسان ایک کُل ہوتا ہے اور اس کے اجزاء اس کی زندگی کی سرزمین پر بکھرے ہوئے نہیں ہوتے، گویا وُہ ظاہر و باطن میں یکساں ہوتا ہے؛ خواہ آپ اُسے کسی رُخ سے دیکھیں۔ یہ بات تو صرف ولیوں ہی کو سزاوار ہے کہ وُہ اپنے لیے "میں" کا استعمال کریں۔ ہم سب کو تو یہی زیب دیتا ہے کہ ہم کہیں "ہم ایک گروہ ہیں"۔ انسان کے باطن کے اندر مختلف "فرقوں" کی کثرت دراصل انسانی شخصیت کے اندر خارجی صدائے بازگشت ہے۔ تجزیہ کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ ایک طرف تو گوشت پوست کے ایک ملفوف میں کئی انسان سانسیں لے رہے ہیں، دُوسری طرف منتشر شدہ کائنات میں کئی خدا ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ 'توحید' دین ہی نہیں، ایک نفسیات بھی ہے؛ بعینہٖ اسی طرح جس طرح یہ گواہی ہے: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"

کسی لا ادری کے لیے یہ سمجھنا بھی دشوار امر ہے کہ وُہ لوگ جو کسی دین پر ایمان لانے کی اہلیت رکھتے ہیں اور کوئی مذہب اختیار کر لیتے ہیں، اپنی شخصیت کی مختلف سطحوں پر بالکل مختلف اور متضاد باتوں پر ایمان لا سکتے ہیں۔ اس تضاد کی نشاندہی ایک سیاستدان مصنّف "کونر کروز اُو برائن Conor Cruise O'Brien" کے ایک حالیہ اخباری مضمون سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے آئرلینڈ کے دُور افتادہ گرجا کے کسی پادری سے گفتگو کا ایک حوالہ دیا ہے۔ پادری صاحب سے جب یہ پُوچھا گیا کہ آپ کے گرجا کے کیتھولک مقتدیوں کی اکثریت 'حیات بعد از موت' کے متعلق کیا خیالات رکھتی ہے، تو انہوں نے فرمایا: "وُہ رُوح کے لافانی ہونے، مر کر دوبارہ جی اُٹھنے اور سزا و جزا کے متعلق وہی کچھ مانتے ہیں جو گرجا انہیں بتاتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس بات کا بھی اضافہ فرمایا کہ مقتدی اِس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ جب کوئی انسان

Marfat.com

مرجاتا ہے تو وُہ کسی جانور ہی کی طرح مردہ ہوتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔"[1]

سچ تو یہ ہے کہ لوگ زیادہ تر بوجہ پیدائش کسی مذہب کے پیرو ہوتے ہیں بربنائے انتساب و اختیار کم۔ عام طور پر ایک عیسائی، عیسائی اور ایک مسلمان، مسلمان اسی لیے کہلاتا ہے کہ وُہ عیسائی یا مسلمان گھرانے اور ماحول میں پیدا ہُوا؛ چنانچہ وُہ اسی بنا پر یہ باور کر لیتا ہے کہ اس کے عقائد اس کے دیگر ہم مذہبوں جیسے ہیں، گویا یوں کہیے کہ اس کی شخصیت کا ایک حصہ دین کو قبول کرتا ہے اور ایک حصہ رَد، اور اسی حوالے سے یہ بات ان لوگوں کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے جو کسی لادین ماحول اور بے خدا معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بھی وہی نعرے بلند کرتے ہیں جو ان کی مخصوص تعلیم اور تربیت نے اُنہیں سکھا رکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُنہیں علم نہ ہو کہ وُہ "ایمان" سے خاصی حد تک قریب ہیں۔ اِس مخصوص صورتِ حال میں جو زنگ اِن کے قلوب پر چڑھ گیا ہے وُہ بیرونی فضا کی پیداوار ہے اندرونی کی نہیں۔ اس سلسلے میں الجزائر کے عظیم شیخ احمد العلوی کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں۔ ۱۹۳۴ء میں اپنی وفات سے پہلے اُن کے ایک فرانسیسی ڈاکٹر کارے Carret سے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے جو چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کرنے کے لیے شیخ سے ملتے رہتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر کارے نے اپنی لا ادریت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ وُہ لوگ جو مذہب کے دعویدار ہیں، دنیاوی زندگی کو بھی اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں"۔ شیخ نے یہ سُن کر توقف کیا اور کہا: "افسوس ہے آپ اپنی رُوح کو اپنے وجود سے بلند ہونے نہیں دیتے تاہم آپ جو کچھ بھی کہیں یا تصوّر کریں آپ اپنے خیال سے کہیں زیادہ خُدا کے قریب ہیں۔"[2] آج کے پراگندہ دَور میں کتنے ہی ایسے ایمان والے ہوں گے جو باطن میں کافر ہیں اور کتنے ہی ایسے کافر ہیں جو اپنے وہم و

---

1. The Observer, London, 22 Feb, 1981 — ؂۱

2. A Sufi Saint of 20th Century, Martin Lings, p.29 — ؂۲

Marfat.com

گمان سے کہیں زیادہ اِس خُدا کے قریب ہیں جس کے متعلق اِن کا خیال ہے کہ وُہ اُسے نہیں مانتے۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اس قسم کے تناقضات سے آگہی رکھیں کیونکہ آج لوگوں کا مذہب پر سے (یا کم از کم منظم مذہب پر سے) اعتماد اُٹھتا جا رہا ہے اور مغرب میں یہ رجحان زیادہ ہے۔ یہ بے اعتمادی غور و فکر سے پیدا ہونے والے شکوک کے باعث نہیں بلکہ مذہب پرستوں کے اپنے طرزِ سلوک کے باعث ہے۔ حقیقتِ اصلیہ کا تو ذکر ہی کیا، ایک لاادری مذہب کی مافوق الفطرت جہات تک سے غرض نہیں رکھتا۔ وُہ برف کے تودے کی صرف وُہ سطح دیکھتا ہے جو پانی سے باہر ہے اور اُسے بدہیئت کہتا ہے۔ یہ افسوسناک بات کسی ذہین بچّے نے کتنی دانشمندی سے دُعا مانگتے ہوئے کہی کہ "اے خُدا اچھے لوگوں کو دین دار بنا اور دین دار لوگوں کو اچھا۔"

اسلام کے پیرو کو 'مسلم' کہا جاتا ہے (وُہ جو خُدا کے آگے سر جھکا دے) 'مومن' نہیں (وُہ جو ایمان رکھتا ہو) اور اس کی وجہ بڑی دُرست ہے۔ قرآن مبین اِس فرق کی صراحت یُوں کرتا ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۴)

"(صحرا کے) اعرابی کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے — کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں اور ایمان تو ہنوز تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہُوا۔"

ہر مذہب میں تین جہات دیکھی جا سکتی ہیں: خوف، محبّت اور علم و آگہی۔ رُوحانی سفر کے آغاز میں خوف کا جذبہ غالب رہتا ہے۔ "خُدا کا خوف، دانائی کا سرچشمہ ہے۔" انسانی شخصیت میں کچھ عناصر ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف سزا کے خوف سے متاثر ہوتے ہیں؛ بعینہٖ اُسی طرح شخصیّت کے کچھ دُوسرے عناصر صرف محبّت سے رام ہوتے ہیں۔ پھر کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو کسی بات کو صرف علم کی روشنی ہی میں قبول کرتے ہیں؛

Marfat.com

گویا وجود کے امن و امان قائم کرنے کے لیے ڈرانے اور دھمکانے کی ضرورت پڑتی ہے، تب کہیں جا کر محبّت اور ایمان کا الاؤ روشن کرنے کی جگہ ملتی ہے از روئے اسلام "ایمان" کی جو تعریف کی گئی ہے وُہ یہ ہے کہ یہ نہ صرف تصدیق بالقلب ہے بلکہ زندگی بسر کرنے کا مکمل انداز ہے۔ زبان دلب ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور اعضاء اور جوارح اس اس کی مقتضیات اور ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اس کے بعد کی راہ علم کی ہے جو ایقان کے ہم پلہ ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہیے کہ یہی راہ انسان کو رویتِ باری تعالیٰ کی طرف لے جاتی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے رسول یا پیغمبر کے پرشکوہ القاب سے یاد نہیں کیا گیا۔ ان کا پہلا شرف "عبد" یعنی "بندہ" ہونے کا تھا۔ پیغمبر ہونے کے لیے کسی انسان کو سب سے پہلے حقیقتِ ازلی کے سامنے خود کو بندہ بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے اور بندے کی تعریف یہی ہے کہ وُہ اپنے آقا و مالک کے سامنے اپنے جسم و جان کا نذرانہ پیش کرنے کے ساتھ ہر ملکیّت، ہر دعوے، ہر مطالبے سے دستبردار ہو کر بے چون وچرا سرِ اطاعت خم کر دیتا ہے۔ اب یہ آقا کی رضا پر منحصر ہے کہ وُہ اپنے بندے کے درجات بلند کرے یا نہ کرے۔

اہلِ اسلام کی اطاعت و بندگی کے انداز کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ غلط فہمیاں کچھ تو تعصبات کی پیداوار ہیں اور کچھ فی الحقیقت اس بنا پر بھی ہیں کہ ایک تہذیب دُوسری تہذیب کے قلبی اور روحانی محرکات کا احاطہ کرنے میں کماحقہٗ کامیاب نہیں ہوتی۔ اہلِ مغرب کی نظر میں مسلمانوں کو اس طرح دکھایا جاتا ہے گویا وُہ کسی انتہائی جابر و قاہر معبود کے سامنے گڑگڑا رہے ہوں اور قربانی کے جانوروں کی طرح اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر ہوں۔ اس سے زیادہ کوئی بات حقیقت سے بعید نہیں ہو سکتی۔ مسلمان خدا سے اِس لیے ڈرتا ہے کہ وُہ حقیقت پسند ہے۔ وُہ خُوب جانتا ہے کہ کچھ چیزوں سے ڈرنا ہی چاہیے اور یہ کہ تمام اشیاء کا، خواہ وہ تلخ ہوں یا شیریں، خالق ایک ہی ہے۔ وُہ اِس لیے اپنے خالق و مالک کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ خالق اکبر نے تمام اشیاء کا ایک نقش اور بنیادی ہیولا

Marfat.com

پہلے ہی قائم کیا ہوا ہے جو ذہانت اور حسنِ تخلیق کا بے مثال مرقع ہے۔ اس مرقعے میں وُہ اپنی جگہ پانے کی خواہش رکھتا اور اس سے ہم آہنگ ہونا چاہتا ہے۔ اُسے یہ بھی خوب معلوم ہے کہ وُہ کسی ہدایت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا، اور چونکہ ان ہدایت کا منبع اللہ ہی ہے اس لیے اُن پر حرف بحرف عمل کرنا ضروری ہے۔ وُہ خدا کی رضا کے آگے گردن ہی نہیں جھکاتا، بلکہ وُہ اس رضا کا جویا ہوتا ہے اور جب اِسے پا لیتا ہے تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔[1]

۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں محمد اسد نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے زندگی کے متعلق مسلمانوں کا ذہنی پس منظر بڑی خوبی سے اجاگر ہو جاتا ہے۔ بحیثیت ایک نوجوان سیّاح اُنہیں صحرائے سینا میں سفر کرنا پڑا۔ یہ خطہ تیز و تُند آندھیوں کی زد میں تھا جس کے باعث وُہ پناہ لینے پر مجبور ہوئے، جہاں گاؤں کے "نمبردار" نے اُن کی ضیافت کی اور دُعا دی کہ خُدا آپ کو سلامت رکھے۔ یہ گھر آپ ہی کا ہے۔ اللہ کا نام لے کر شروع کیجیے۔ ہمارے پاس بس یہی کچھ ہے مگر یہ کھجوریں بُری نہیں۔ کھجوریں اتنی عمدہ تھیں کہ اس سے پہلے اُنہوں نے کبھی چکھی نہ تھیں۔ اُن کے میزبان نے بات جاری رکھتے ہُوئے کہا کہ اِن آندھی کے جھکڑوں نے ہماری زندگی کو سخت مشکل بنا دیا ہے مگر یہ

---

[1] تقدیرِ مبرم کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ "میری" تقدیر "میری" ذات کا اتنا ہی غیر منفصل حصّہ ہے جتنا کہ "میرے" جسمانی اور نفسیاتی خواص۔ بعض صوفی فلسفیوں نے تقدیر کو مجسم بنا کر پیش کیا ہے اور اس نقطۂ نظر سے ہر انسان کی اپنی تقدیر اس کا "ہم زاد" ہے، اور اس کی شخصیّت کی تکمیل کے لیے اس "جزو" کا اتصال ضروری ہے جیسا کہ خدا کی نظر میں وُہ ایک "کُل" ہے۔ وقت نے ہمیں جدا کر رکھا ہے جس کی وجہ سے ہم اس زندگی میں کبھی "کُل" نہیں بن سکتے۔ ہر وجود ایسے قالین کی طرح ہے جو ماہ بماہ اور سال بسال آہستہ آہستہ کھلتا چلا جاتا ہے مگر ہم اس کے بیل بُوٹے اُسی وقت پُوری طرح پہچان سکتے ہیں جب وُہ پورے کا پورا کُھل جائے ــــ اور یہ تو "یومِ حساب" سے پہلے ممکن نہیں!

Marfat.com

مشیتِ الٰہی ہے۔ یہ آندھیاں ہماری فصلوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں اور ہمیں ہمیشہ اپنے پودوں کو ریت میں دفن ہو جانے سے بچانے کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے مگر ہم خدا سے شاکی نہیں کیونکہ ہمارے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ کہتا ہے: "تقدیر (الدّہر) کو برا بھلا مت کہو کیونکہ میں ہی تقدیر (الدّہر) ہوں۔"

محمد اسد کا بیان ہے: "میں نے اس سے پہلے کبھی ایسے راضی بہ رضا لوگ نہیں دیکھے تھے، کبھی حقیقت کا ایسا زبردست اثبات اتنی خاموشی اور ایقان سے نہیں سُنا تھا۔ بدو شیخ نے بے پرواہی سے اپنے بازو کو ہوا میں گھما کر ایک دائرہ بناتے ہوئے یہ الفاظ کہے تو مجھے یوں محسوس ہُوا کہ یہ دائرہ ہر اس شے پر محیط ہے جو زندگی سے متعلق ہے۔ یہ میلا مٹیالہ تاریک کمرہ، چنگھاڑتی چیختی ریگستانی ہوائیں، خس و خاشاک اور ریت کی یلغار، فرحت و شادمانی کی آرزوئیں اور مقدّر کے آگے صبر۔ میرے سامنے کھجوروں سے بھرا طشت۔ گھر کے پیچھے آندھیوں کے خلاف ان کے باغ کے اشجار کی مزاحمت، چولہے میں روشن آگ، مکان کے زنانہ حصّے میں کسی خاتون کے قہقہے کی گونج۔ اس سارے ماحول اور اس سادہ دل شیخ کی حرکات و سکنات کے درمیان مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں اِس نفسِ مطمئنہ کی مناجات سُن رہا ہوں جس کے آگے حالات کی کوئی رکاوٹ نہیں ـــ اور جو اپنے آپ میں مطمئن اور سرشار ہے۔"[1]

حقیقتِ ازلی کے آگے کامل عجز و نیاز سے جھک جانا، جب کہ اس میں جمال بھی ہو اور لطف و کرم بھی، ان معنوں میں تقدیر پرستی یا رواقیت نہیں کہی جاسکتی جن میں مغرب اُسے لیتا ہے، کیونکہ اس کے محرکات قطعی جداگانہ ہیں۔ بقول عظیم مفسّر قرآن فخر الدّین الرّازی "آنکھوں کی عبادت گریہ، کانوں کی عبادت سماعت، زبان کی عبادت حمد، ہاتھوں کی عبادت صدقہ، بدن کی عبادت جدّ و جہد، قلب کی عبادت بیم و رجا اور رُوح کی عبادت عبدیت و بندگی میں کمال عجز اور اللہ جل شانہ پر کامل

1. The Road to Mecca, Mohummad Asad, (Simon & Schuster, 1954), p.93

Marfat.com

بھروسا اور طمانیت ہیں[1]۔ یہاں ہم ایک حسابی قاعدہ استعمال کر سکتے ہیں: تقدیر (جو نامعلوم ہے) مساوی ہے اسلام کے (خُدا کے آگے سر جھکانا) جو برابر ہے عبادت کے جو مثبت، فعال اور مسرّت بخش ہے۔ ہماری تقدیر کے ذریعے خُدا ہم سے بات کرتا ہے اور ہم اپنی عبادت کے وسیلے سے اُس سے ہمکلام ہوتے ہیں۔

انسانی تجربے کی روشنی میں اطاعت و تسلیم ایک ایسی شے ہے جس کا تعلق اقلیم ظلمات سے ہے، کیونکہ ہم ان واقعات و حوادث کی کوئی توجیہ و تعلیل نہیں کر سکتے جو روزمرّہ کی زندگی میں ہمیں پیش آتے ہیں اور جن سے گلو خلاصی کی کوئی سبیل نہیں۔ عقلیت پرستانہ نقطۂ نظر کے اعتبار سے زندگی ایک "بے حس" شے ہے لیکن مسلمان اپنی عبودیت اور عجز سے روشنی تلاش کرتا ہے اور اُسے یہ یقین ہوتا ہے کہ اندھیری سُرنگ کے آخری سرے پر وُہ اُسے پالے گا۔ یوم آخرت کے متعلق قرآنِ مُبین کا ارشاد ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (الحدید ۵۷: ۱۲-۱۳)

اور جس دن تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ اُن کے ایمان کا نور اُن کے آگے آگے اور داہنی طرف چل رہا ہے (تو ان سے کہا جائے گا کہ) تم کو بشارت ہو (کہ آج تمہارے لیے) باغ ہیں جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں، اُن میں ہمیشہ رہو گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے کہیں گے کہ ہماری طرف نظر (شفقت) کیجیے کہ ہم بھی تمہارے نُور سے روشنی حاصل کریں۔ ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے کو لوٹ جاؤ اور (وہاں) نُور تلاش کرو۔

---

1. Constance padwick, Muslim Devotions, (S.P.C.K.)

Marfat.com

اُس نور کے آگے جبینِ نیاز ٹیک دینا جو ہماری ہستی سے ماوری ہے اور جسے ہماری اندرونی روشنی خوش آمدید کہتی ہے، درحقیقت مزید حصولِ نور کی شدید خواہش پیدا کرتا ہے۔ اس نور کے حصول کیلیے یہ کیا خوب دُعا ہے:

"اے اللہ! میرے دل کو منوّر کر دے! میرے سامنے بھی روشنی ہو اور میرے پیچھے بھی، میرے داہنے ہاتھ پر بھی روشنی ہو اور بائیں پر بھی، میرے اُوپر بھی نور ہو اور میرے نیچے بھی، میری بصارت بھی منوّر ہو اور میری بصیرت بھی۔ میرا چہرہ بھی روشن ہو اور میرا گوشت پوست بھی، حتّٰی کہ میرا خون اور میری ہڈیاں تک بھی منوّر ہوں۔ میرے لیے نور میں اضافہ فرما اور مجھے نور عطا فرما۔"[1]

کلمہ طیبّہ کا پہلا حصّہ کسی مرد یا عورت کا تشخص بہ حیثیت مسلمان قائم کرتا ہے۔ یہ اظہارِ حقیقت ہے، اور انتہائی خیرہ کن سادگی کے باوجود، (انسانی نقطۂ نظر سے) محض تصوّر ہے اگر اس فقرے کو مکمل نہ کیا جائے؛ اسی لیے اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ بھی اضافہ کر دیے گئے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ (محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں)

پہلا اقرار یہ ہے کہ اگر کسی کی ہستی ہے تو وُہ خدا ہی کی ہے۔ دُوسرا اقرار یہ ہے کہ تمام اشیاء کا رشتہ اور تعلّق اُسی ذات بابرکات سے ہے۔ قرآن مبین اِس صُورتِ حال کو مزید یُوں واضح کرتا ہے:

قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ (۲): ۱۵۶)

تو کہتے ہیں ہم خُدا ہی کا مال ہیں اور اس کی طرف لَوٹ کر جانیوالے ہیں۔

منبعِ حقیقی سے "دُوری" کی جس حالت میں ہم رہ رہے ہیں (اور جس کے بغیر "زندگی" کا مفہوم کچھ نہیں)، اُن حجابات کی وجہ سے ہے جو ہمارے اور خُدا کے درمیان حائل ہیں جن کے پار ہماری آنکھیں دیکھنے سے عاری ہیں؛ تاہم اس دُوری کے باوجود، ہم کسی بھی لمحے

---

1. Constance Padwick, Muslim Devotions

Marfat.com

تنہا اور بے نگراں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف ہمارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے بلکہ ہمارے ہر خیال سے بھی واقف ہے اور کیوں نہ ہو کہ وہی تو الخبیر ہے جس کی باخبری سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ دُنیا میں کچھ وقت گزار کر ہمیں وہیں جانا ہے جہاں سے ہم آئے تھے۔ اس کے متعلق ارشادِ باری ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ (یونس (۱۰): ۴۵)

اور جس دن خدا ان کو جمع کرے گا (تو وہ دُنیا کی نسبت ایسا خیال کریں گے) گویا (وہاں) گھڑی بھر دن سے زیادہ رہے ہی نہیں تھے۔

ہماری جدائی یا دُوری کا وقفہ نیند میں خواب کی طرح مختصر معلوم ہوگا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "(زندگی میں) لوگ سوتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو بیدار ہوتے ہیں۔" ہم اپنے خوابوں کو حقیقی سمجھتے ہیں کیونکہ ہمارے تجربے میں کوئی اور شے ایسی حقیقی نہیں جس سے اِس کا مقابلہ یا موازنہ کیا جا سکے۔ اس کے بر عکس کچھ ممکن بھی نہیں کیونکہ آخر تو ہمارے خواب بھی اسی ذات کی رضا کے تابع ہیں جو ہم سے کہیں زیادہ حقیقی ہے۔ اِن خوابوں میں وُہ عکس جھلملاتے ہیں جن کا وجود کہیں اور ہے۔

یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کلمۂ طیّبہ کا دُوسرا جُزو پہلے جُزو کو واضح کر دیتا ہے اور اگر اِس دُوسرے جُزو سے انکار کیا جائے تو اس کے پہلے جُزو سے ربط ٹوٹ جائے گا۔ رسول ہونے کی بنا پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم، اللہ تعالیٰ سے انتہائی قریب ہیں بقول قرآن:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (احزاب (۳۳): ۶)

اس اعتبار سے اِنؐ کی حیثیت خالق اور مخلوق کے درمیان ایک وسیلے اور رابطے کی ہے۔

"محمّد" صلی اللہ علیہ وسلّم کے معنی ہیں "وُہ جس کی تعریف کی گئی ہو" اور چونکہ

Marfat.com

وُہ بشر، ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، اس سے منجملہ اور باتوں کے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ حسنِ تخلیقِ پروردگار کا کامل ترین نمونہ ہیں، کیونکہ جو تخلیق اپنے خالق کے منشا اور ارادے کے مطابق ہو وُہ کامل ترین تصوّر ہو گی۔ اور خُدا نے چاہا کہ وُہ اچھا ہی رہے جیسا کہ کتاب "پیدائش" ہمیں بتاتی ہے۔ آپؐ انسانیت کا بہترین نمونہ ہیں، اِس لیے ہر مسلمان کے لیے کامل رہنما ہیں۔ اس نمونے کے بغیر ہم ہرگز اپنی شخصیات اور زندگیوں کو کلمۂ طیبّہ کی پیش کردہ حقیقت کے مطابق نہیں ڈھال سکتے۔ اگر آپ مافوق الفطرت انسان یا فرشتے کے پیکر میں انسانوں کی رشد و ہدایت کے واسطے بھیجے گئے ہوتے تو ہم کبھی آپؐ کے اُسوہ اور سنّت کے اتباع کی جرأت نہ کر سکتے۔ چونکہ آپؐ گوشت پوست سے بنے اِنسان ہیں اور اسی طرح فانی ہیں جس طرح ہم، اس لیے آپؐ انسان ہوتے ہوئے بھی مقتدا ہیں۔ حضورِ اکرمؐ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ آپؐ اِنسان تو ضرور ہیں مگر دُوسرے انسانوں جیسے نہیں، آپؐ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پتھروں میں ہیرا۔

13۱ بُت پرستی کے خوف اور مسلمانوں کی توجّہ ذاتِ واحد کی عبادت سے ہٹ جانے کے ڈر سے اسلامی روایت ایک لمحے کو بھی کسی ایسے فلسفے یا نظریّے کو برداشت نہیں کر سکتی جس میں تجسیم کا ذرا سا بھی شائبہ پایا جاتا ہو۔ خُدا کبھی اِنسان نہیں بن سکتا، کیونکہ وُہ دُنیا کے کسی بھی مفہوم کے اعتبار سے "بنا" نہیں۔ وُہ ہے ہمیشہ سے اور ہمیشہ رہے گا؛ تاہم وُہ ہمیں اپنے بارے میں، اپنے ہونے کے بارے میں بتاتا رہتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ رسولِ مقبولؐ نے فرمایا: "جس نے مجھے دیکھ لیا، سمجھو الحق کو دیکھ لیا۔" فرتھ جوف شوآن (Frithjof Schuon) نے اس حدیث کا مفہوم یُوں بیان کیا ہے:

"جب سُورج کسی جھیل پر منعکس ہوتا ہے تو سب سے پہلی چیز جو واضح ہوتی ہے وُہ سورج ہے، اس کے بعد روشنی کی شعاعیں نظر آتی ہیں اور آخر میں سُورج کا عکس۔ اس بات پر بے تکان گفتگو کی جا سکتی ہے کہ جس شخص نے محض عکس کو دیکھا (جب کہ سُورج کسی شے کی اُوٹ میں تھا) تو اُس نے صرف پانی کو دیکھا یا اُس نے سُورج کا کچھ حصّہ بھی دیکھا۔؟ اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ سُورج کے بغیر پانی کو دیکھا بھی نہیں

Marfat.com

جاسکتا اور کسی عکس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو کوئی سُورج کا انعکاس دیکھتا ہے وُہ کسی نہ کسی نوعیت میں سُورج کو بھی دیکھ لیتا ہے[1] بہرحال اس قسم کے موضوعات پر لامتناہی بحث اِس وقت تک چلتی ہی رہے گی جب تک دُنیا باقی ہے اور جب تک زبانیں خاموش نہیں ہو جاتیں؛ تاہم اِس قسم کی تعریفات پر مناظرہ ایک بیکار اور عبث مشغلہ ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ کو عربی میں عموماً "رسول اللہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مغرب میں (Prophet) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (عربی میں یہ نبی ہے) اور یہ ان لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا ہے جن کا صحیفہ انجیل مقدّس ہے۔ اسلام اُن دونوں القاب میں واضح فرق کرتا ہے۔ رسول وُہ ہے جسے خُدا کا پیغام پہنچنے کے ساتھ یہ بھی ہدایت ملتی ہے کہ اِس پیغام کو عام کر دیا جائے تاکہ یہ ہماری انسانیت کے لیے ایک رُوحانی ضابطہ بن سکے۔ جب کہ لفظ 'نبی' سے مراد وُہ ہستی ہے "جسے خبر دی گئی ہو" یا "خبر پہنچی ہو"۔ اس کے ذریعے کسی پہلے سے موجود دین کی اصلاح کی جاتی ہے یا نئی ہدایت کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ محرّف صحیفوں کو دُرست کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے ادیانِ ماسبق میں خرابیاں پیدا ہوئیں جیسا کہ کئی اسرائیلی پیغمبروں کے سلسلے میں ہُوا ہے۔ ہر رسول نبی ہوتا ہے جیسا کہ موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم وغیرہ لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔

جدید ذہن جس طرح قیود و بندشوں سے بیزار ہے، اسی طرح قوانین و قواعد کو ناپسند کرتا ہے۔ اُسے رسول کے مقابلے میں 'نبی' کا لفظ زیادہ پسند ہے۔ انگلستان جیسے ملک میں، جہاں عیسوی مذہب پر عمل کرنے والے اقلیت میں ہیں، حالیہ جائزوں سے ظاہر ہُوا ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد خُدا پر اعتقاد کا دعویٰ رکھتی ہے اگرچہ اس کے خیال میں "منظّم مذہب" بے سود ہے، مذہب کا صرف شاعرانہ پیرایہ، جس

1. F. Schuon, Dimensions of Islam, P.75

Marfat.com

میں آگ اور برف کا ذکر ہے، ان لوگوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے کیونکہ مذہب کے متعلق وہاں عام تاثر یہی ہے کہ وہ رُوح کو پابند کر دیتا ہے اور یہ بنیادی طور پر "خشک" ہے۔ یہ احساسات کی جگہ فرائض پر زور دیتا ہے اور اس کے ذریعے کچھ غیر دلچسپ لوگوں سے رابطہ استوار کرنا پڑ جاتا ہے۔ اِدھر صورتِ حال یہ ہے کہ شاعری ایک ایسا "دارالامان" تعمیر کرنے سے قطعاً قاصر ہے جس میں یہ لیے یقین مرد و زن الہامی طرزِ زندگی اپنا سکیں۔ اسی سبب سے قرآنِ مبین میں حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کے متعلق نہایت واضح انداز میں کہا گیا ہے کہ وُہ شاعر نہیں ہیں۔ یاد رکھیے کہ رسول جو کچھ لاتا ہے وُہ محض ملائے اعلیٰ کی "خبر" نہیں ہوتا، بلکہ اِس میں تو اس دُنیائے آب و گل میں زندگی گزارنے کا ایک مکمل خاکہ بھی ہوتا ہے تاکہ ہم جہنّم کی لپیٹ سے محفوظ رہ سکیں۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چُکا ہے حضرت محمدؐ کا ایک اور بھی لقب ہے جو اِن کے فرائضِ رسالت کے سرانجام دہی کی بشری بنیاد ہے اور وُہ ہے "عبداللہ" یعنی اللہ کا بندہ۔ "غلام" کے مقابلے میں "بندہ" کا لفظ بہتر ہے کیونکہ غلام کے متعلق مغرب کا تصوّر از حد بھیانک ہے اس لیے کہ ایک طرف تو اس کے امریکہ کے سیاہ فام غلاموں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ دُوسری طرف اس سے غلاموں پر ڈھائے گئے ظلم و ستم یاد آتے ہیں۔ قدیم عرب کے معاشرے میں غلاموں کے تمام خدوخال اتنے بھیانک نہ تھے اور اس لیے یہ کوئی رسوا کن اصطلاح نہ تھی۔ اگرچہ "بندہ" کی اصطلاح میں کچھ فوائد ہیں تاہم اس سے عربی لفظ 'عَبد' کا مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا بلکہ ایک حد تک یہ اس کے معنی کو بگاڑ دیتا ہے کیونکہ خادم یا بندہ اس وقت تک کام کرتا ہے جب تک اُسے اُس کی خدمات کی اُجرت ملتی رہتی ہے۔ اگر ملازمت کی شرائط اُسے گوارا نہ ہوں تو وُہ کنارہ کر سکتا ہے اور اگر اس کے جی میں آئے تو وُہ اپنی مرضی اپنے آجر پر ٹھونس سکتا ہے مگر باری تعالیٰ سبحانہٗ کوئی آجر نہیں نہ اس کے پیغمبر ان معنوں میں ملازم ہیں۔ "اللہ کا بندہ" اپنی مرضی اپنے آقا کے حوالے کر دیتا ہے اور ایک مثالی "فقر" کا نمونہ پیش کرتا ہے جو اسلام کی بیخ و بُن ہے۔

Marfat.com

غلامی کا یہ وصف؛ یعنی آقا و مالک کے سامنے انتہائی تسلیم و رضا، اس دنیا میں ایک پیغمبر کے فرائض میں شامل ہے کیونکہ اگر کبھی اس بات کا شائبہ بھی ہو کہ نزولِ وحی کے وقت حاملِ وحی کی اپنی مرضی اور ایما اس میں شامل ہو گئی ہے تو پیغامِ الٰہی کی صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرکارِ دو عالمؐ اپنے اقوالِ مبارک ادا فرماتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے آپؐ بحیثیت ایک انسان بات کر رہے ہیں۔ ایسے مواقع پر آپؐ اکثر خود سے سہو و خطا سرزد ہو جانے کی بھی بات کرتے تھے مگر جب وحی کے ذریعۂ قرآنی آیات اُترتیں تو آپؐ کا رویّہ ایک سچّے اور محتاط 'کاتب' کا ہوتا تھا۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: "قرآن کریم کی ایک عام آیت بھی محمدؐ اور اس کے خاندان سے زیادہ گراں مایہ ہے" اور چونکہ آپؐ کی زندگی اور پورا کردار قرآنی تعلیمات کا مثالی نمونہ تھا اور آپؐ روزمرّہ زندگی میں بھی ازحد محتاط اور اپنے رب کے احکامات کے لیے ہمہ تن گوش رہتے تھے اس بنا پر آپؐ خود خُدا سے بندے کو پہنچنے والے پیغام کا حصّہ تھے اور اگر اس پہلو کو ایک بے تعصب عیسائی کے نقطۂ نظر سے دیکھیے:

"اس کیفیت کا اعلیٰ ترین نمونہ رسولِ اسلامؐ کی ذات اور آپؐ کے بعد عمر بن الخطابؓ جیسے جانشینوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اپنے معبود کے ساتھ 'عبد' کا معاملہ ایک مستقل خاصۂ آگہی ہے۔ جو اسلام میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔[1] مشہور ماہرِ اسلامیات محمد اسد نے اپنے ترجمۂ قرآنِ مجید میں اس عزم و احتیاط کو 'تقویٰ' کہا ہے جس کا ترجمہ خوفِ خُدا یا "خُدا آگہی" کیا جاتا ہے جس کے معنی ہیں مسلسل باخبری، بیدار مغزی اور تیاری کی حالت میں رہنا جو ہر سچّے مسلمان کی امتیازی خصوصیت ہے۔

رسول جو 'عبد' بھی ہے، اپنی مرضی کو خُدا کی رضا کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کے قلب و دماغ میں کوئی بھی ایسی رکاوٹ نہیں ہوتی جو وحی کے نزول میں مخل ہو سکے۔ حضرت محمدؐ اللہ کے 'عبد' بھی ہیں اور رسول بھی اور وہ "نبی الامّی" بھی ہیں، گویا یوں سمجھیے

---

1. Kenneth Cragg, Call of the Minaret, p.46

Marfat.com

ایک لوح سادہ ہے جس پر ربِّ کائنات کا قلم چلتا ہے اور اس لوح پر کسی اور کے قلم کا کوئی نشان نہیں۔ اس پر علم مکسوب یا کسی دنیاوی حکمت کا کوئی معمولی سا اثر بھی نہیں کیونکہ رسول انسان کے ذخیرہ علمی کا خوشہ چین نہیں ہوتا نہ وُہ عام انسانوں کی طرح زینہ بہ زینہ اکتسابِ علم کرتا اور پھر اس علم کو دُوسرں تک پہنچاتا ہے۔ اس کے ہاں کسبِ علم کا ذریعہ تجلیٔ الٰہی ہے جو قلب و رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے اور اس تجلّی کے حصول کیلئے اِس کا سارا وجود ہمہ تن تیار رہتا ہے اور پھر اُسے دُوسرں تک پہنچا دیتا ہے اور اس طرح وحیٔ الٰہی کا چشمہ بغیر کسی آلودگی کے ایک بڑی جھیل میں جا گرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآنِ مبین من وعن اسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح یہ ربِّ کائنات نے نازل فرمایا تھا جس طرح کلیسا مریم مقدّس کی قدیمی عفت و عصمت کی تقدیس کرتا ہے کیونکہ ان کے ذریعے ہی دُنیا میں "کلمۃ اللہ" کا ظہور ہُوا، اسی طرح اسلام حضرت محمدؐ مصطفیٰ کے اُمّی ہونے کو اہمیت دیتا ہے جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہوتا ہے کہ آپ کسی قسم کی دُنیوی، مکروہات سے آلودہ نہ تھے؛ یعنی آپؐ فلسفیوں کی منطق، بُت پرستوں کی قیل وقال اور دُنیاوی اثرات سے پاک تھے۔ لیکن یہی پہلو ہے جو اسلام اور عیسائیت کے درمیان مابہ النزاع ہے۔

عیسائی حضرت محمدؐ مصطفیٰؐ کا مقابلہ حضرت عیسیٰؑ سے کرتے ہیں جس کا فائدہ ہمیشہ حضرت عیسیٰؑ ہی کو پہنچتا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک حضورؐ کئی لحاظ سے حضرت عیسیٰؑ سے مختلف تھے۔ اسی طرح وُہ قرآن اور انجیل کا موازنہ بھی کرتے ہیں مگر جیسا کہ شوآن اور دیگر فضلاء نے کہا ہے کہ اگر موازنہ کیا جاتا ہے تو ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اور مریم مقدّسہ میں ہونا چاہیے اور دُوسری طرف قرآن اور حضرت مسیحؑ میں ہونا چاہیے کیونکہ عیسائیوں پر "کلمۃ اللہ" گوشت و پوست یعنی عیسیٰؑ ابنِ مریم کی ذات میں ظاہر ہوا، اور مسلمانوں پر قرآنِ مبین کی صورت میں نازل ہُوا۔ اگر بغور دیکھا جائے تو مسلمانوں کی نماز میں قرآت کا منصب وہی ہے جو عیسائیت میں عیسیٰؑ کی "عشائے ربانی" کا ہے۔ اسی طرح، مریم مقدّسہ نے عیسیٰؑ کو اس حالت میں جنا کہ اُن پر کسی دُنیاوی گناہ کا اثر تک نہ تھا اور محمدؐ وحیٔ خداوندی کا ایسا وسیلہ بن گئے جس میں انسانی علم وحکمت کی

Marfat.com

کوئی آمیزش نہ تھی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی محبت اور آپؐ کی سیرت میں اپنے آپ کو ڈھالنا، اس لیے نہیں کہ مسلمان اُنھیں (عیسائیوں کی طرح) مجسّم "نجات دہندہ" سمجھتے ہیں بلکہ یہ محبت تو انسان کی رُوحانی زندگی کا مرکز ہے کہ اسی سے سادہ اور "خشک" مذہب میں بیک وقت نرمی اور جذبات کی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ آپؐ سے محبّت آپؐ کی شجاعت اور نرم دلی کے باعث ہے۔ جہاں آپؐ عظیم رہبر اور جنگوں میں سالارِ اعظم ہیں وہیں ایک مثالی شوہر، ایک شفیق باپ اور ایک انتہائی مخلص رفیق بھی ہیں۔ انتہائی درماندہ مرد یا عورت اپنی پریشاں خاطری میں اگر کسی مونس و غمخوار کا خواب بھی دیکھتے ہیں تو اُن کی نگاہیں آپؐ پر ہی ٹھہرتی ہیں۔ آپ سے انتہائی قربت رکھنے والوں کو مرید نہیں صحابہ کہا جاتا ہے۔ چودہ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی مسلمان اس شفقت مجسم کی رفاقت کے سبب آپؐ کو تنہائی کا مونس اور خستہ حالی میں سہارا سمجھتے ہیں۔ آپؐ کے بغیر یہ دُنیا انتہائی سرد مہر اور درشت خُو ہو جائے گی۔

کانسٹنس پیڈوِک جو محبّت کے اس جال میں "پھنس" گئے تھے، لکھتے ہیں: "کوئی شخص بھی بطورِ مذہب اسلام کی قوّت کا اس وقت تک اندازہ نہیں کر سکتا جب تک وُہ ہستیؐ کے بارے میں مسلمانوں کی عقیدت اور محبت سے لبریز جذبات کو گرفت میں نہیں لیتا۔ یہی وُہ ذاتِ والا صفات ہے جس کے دامن میں پہنچ کر شریعتِ خُداوندی کی سخت گیری میں دبے ہوئے جذبات جراُتِ اظہار پاتے ہیں۔ یہ گرمجوش جذبات کسان اور صوفی دونوں میں مشترک ہیں۔ اِس ہستیؐ سے محبّت اِس دین سے وابستہ رہنے والوں کا سب سے مضبوط بندھن ہے اور اس میں وابستہ اور پیوستہ رکھنے کی زبردست قوت موجود ہے[1]۔"

صدیاں گزرنے کے بعد بھی نعت احمد مرسلؐ کا چمن شگفتہ سے شگفتہ تر ہے اور یہ

---

1. Constance Padwick, Muslim Devotions, p.145

Marfat.com

نعتیں پیدائش سے لے کر سفرِ آخرت تک اور مسلمانوں کی دینی محافل میں وفورِ شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اِن نعتوں میں سرورِ کائناتؐ سے بے پایاں عقیدت اور الفت کا اظہار کیا جاتا ہے جو اِن لوگوں کو حیران کر دیتا ہے جو اس مذہب کے صرف ایک ہی رُخ سے شناسا ہیں۔ اِن نعتوں میں اکثر صدرِ اوّل کے سُنہری ایام میں موجود ہوتے کی تڑپ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ تڑپ محض اس لیے مسلمانوں کے دل میں موجزن نہیں کہ اگر اس دَور میں وُہ ہوتے تو اُنہیں اس عظیم و جلیل ہستی کی ہم نشینی اور قرب کی سعادت میسّر آتی بلکہ اس لیے بھی کہ یہی وُہ زمانۂ مبارک تھا جس میں گزرنے کے بعد پھر کبھی واپس نہیں رہی۔ حضور ختمی مرتبتؐ کی حیاتِ مبارکہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ جو دُنیوی پہلو سے معمولی ہی کیوں نہ نظر آئے، ایسا نہیں جو بالذات انتہائی اہمیّت نہ رکھتا ہو اور لائق صد ستائش نہ ہو۔ ہر شے جو آپؐ کے جسم اطہر سے چھو گئی تقدس کی حامل ہو گئی۔ ایک مختصر سی مراکشی نظم اس کیفیت کی بڑی خوب عکاسی کرتی ہے:

"وُہ متبرک خواتین قبروں کی تاریکی میں محوِ استراحت ہیں جن کے متوّر ہاتھوں نے محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کی قبائے مبارک بُنی تھی۔ کہاں ہیں اِن بھیڑوں کی دُودھ کی طرح سفید ہڈیاں جنہوں نے اِس قبائے پاک کے لیے اپنا اُون دیا تھا؟ اور جب یہ اُون دھو کر خشک کرنے کے لیے دُھوپ میں پھیلائی گئی تو اس کی نمی قطرہ ہائے ابرِ گوہر بار بن کر ستاروں سے بھی بلند ہو گئی۔ وُہ قبا دُھند کی طرح نرم تھی اور جب حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُسے ہوا میں لہرایا تو یہ اس طرح لہرائی جیسے ہوا کے دوش پر بادل لہراتے ہیں۔ یہ قبائے مبارک ہوا کی طرح شفاف تھی اور جن خوش نصیبوں نے اس کے دامن کو چوما تھا وُہ آج بہشت میں گنگناتے ہوئے چشموں سے جام پر جام نوش کر رہے ہیں اور ربِّ کائنات اِن پر ابدی اور ازلی مسکراہٹ بکھیر رہا ہے۔"[1]

وہ مبارک عورتیں، وُہ بھیڑیں اور وُہ قبا مُدّت ہوئی رخصت ہو چکیں اور اب دُنیا ان

1.Quoted in Maroc: Terret et. Ciel (Lausanne: La Guide du Livre, 1954)

Marfat.com

سے تہی ہو چکی ہے۔

حضرت ختمی مرتبتؐ سے محبت کرنا ایک بات ہے اور اِن کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا، اِن کے مبارک طریقوں کو اپنانے کی کوشش کرنا ایک جُدا فعل ہے۔ حضورِ انورؐ اللہ کے آخری رسول اور اس کے آخری نبی تھے۔ سو ایک ایسی ذات کی نقل نہیں کی جا سکتی جو اپنی صفات میں فرید و یگانہ ہو اور اس کے دوبارہ آنے کا امکان نہ ہو۔ سب سے پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیکیاں اپنانی چاہییں جو ان کو باسٹھ سالہ حیاتِ مبارکہ میں مثالی انداز میں قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں۔ سرکار ختمی مرتبتؐ یتیم تھے مگر محبتِ پدری کی گرمی سے آشنا تھے جو اُنھیں اُن کے دادا عبد المطلب کی شفقت نے بخشی تھی۔ آپؐ سالہا سال تک صرف ایک بیوی (حضرت خدیجہؓ) کے نہایت درجہ غم گسار اور دلدار شوہر رہے اور اِن کے وفات پا جانے کے بعد متعدد ازواجِ مطہرات کے اُسی درجے وفا کیش اور دلدار شوہر رہے۔ آپؐ اولاد کی نعمت سے بھی بہرہ ور ہوئے جس کے آگے دُنیا کی دیگر مسرتیں ہیچ ہیں۔ سرکار دو عالمؐ نے ماسویٰ ایک بیٹی کے باقی تمام اولاد کے داغِ مفارقت اپنی زندگی میں سہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تو جوانی میں چرواہے بھی رہے اور تاجر بھی۔ ابھی جوانی پوری طرح رخصت بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک حکمران، رموزِ سیاست کے ماہر، سالار عساکرِ اسلامی اور شارع کے مناصبِ جلیلہ پر فائز ہو گئے۔ آپؐ کو اپنے مولد اور وطن شہر مکہ سے محبت تھی اور اسی سے آپؐ کو ہجرت پر مجبور بھی کیا گیا اور ایک دن اِسی شہر میں آپؐ ایک فاتح کی حیثیت سے واپس ہوئے، اور عفو اور درگذر کی ایسی مثال قائم کی جو دنیائے عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ آج ہم نہ صرف آپؐ کی پوری سیرت سے آگاہ ہیں بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپؐ نے جملہ اُمور کس طرح سرانجام دیے۔

لیکن اب ایک سوال باقی رہتا ہے کہ بحیثیت رسول آپؐ نے اپنے فرائض کس طرح ادا کیے۔ قرآن بیان فرماتا ہے کہ انسان کو حقیقت میں "خلیفۃ اللہ فی الارض"، یعنی انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ یا نائب مقرر کیا گیا ہے۔ ایک عام آدمی رسول نہیں

Marfat.com

ہے کیونکہ اسے براہِ راست خُدا کا پیغام نہیں پہنچتا۔ یہ پیغام اِسے محمدِ مصطفیٰ ؐ کے واسطے اور وسیلے سے پہنچتا ہے اور اس سے یہ توقع وابستہ ہے کہ وُہ اس پیغام کو من وعن، احتیاط اور صحت سے دوسروں تک پہنچائے گا جس میں اِس کے اپنے احساسات و جذبات کا ہرگز دخل نہیں ہوگا۔ اس معنیٰ میں کسی متقی و پرہیزگار مسلمان سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وُہ اپنی ذات کی حد تک ہر وُہ کام سرانجام دے گا جو سرورِ کائنات ؐ نے آفاقی سطح پر انجام دیا تھا۔

حضور سیدِ عالم ؐ کا ایک لقب ایسا ہے جس میں ہر صاحبِ ایمان شریک ہے اور وُہ ہے "عبد ہونا"۔ سرکارِ دوجہاں ؐ کامل درجے کے عبد تھے۔ ہر مومن کو اس مرتبۂ عبدیت کے کمال کے حصول کے لیے بھرپور سعی کرنی چاہیے۔ جس طرح رسولِ کریم ؐ عبد، ہوئے بغیر اپنا فریضہ انجام نہیں دے سکتے تھے اسی طرح خلیفۃ اللہ فی الارض یعنی ایک مسلمان بھی اس نیابتِ الٰہی کا حق اللہ کی غلامی اور بندگی میں مخلص ہُوئے بغیر انجام نہیں دے سکتا۔

زمین پر خُدا کی نیابت پر زور دینے کے بعد ہم ایک وادیٔ پرخطر میں جا پہنچتے ہیں۔ لوگوں کا خاصہ یہ ہے کہ اُنھیں نخوت پسندی میں کسی ہمّت افزائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ تم زمین پر خدائے لایزال کے نمائندے ہو تو وُہ خود نمائی اور خود پرستی کے مراق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دَورِ جدید میں انسان اپنی سطحی آزادہ روی کے باوصف، سابقہ ادوار کے انسانوں کے مقابلے میں انسان کی بدنہادی پر مقدرت سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہ بدی ایک لحاظ سے انسانی عظمت کا معیار ہے۔ (یاد رہے کہ کوئی جانور بد نہیں ہوتا) سایہ جتنا گہرا ہوگا اس کے عقب میں روشنی بھی اتنی ہی تیز ہوگی۔ آج جس عظیم پیمانے پر انسانوں میں مُنہ زوری اور ظلم گھر کر گیا ہے وُہ اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں نے خُدا کا عبد، بنے بغیر اس کی نیابت کا جامہ پہن لیا ہے۔ صرف اِنسان ہی اس پیمانے کی تنگِ اِنسانیت حرکت کر سکتا ہے کیونکہ صرف وہی زمانے کے نشیب و فراز اور حادثات پر حاوی ہو سکتا ہے یا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب

Marfat.com

یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگر خدا کی نیابت کا مسئلہ نہ ہوتا تو دوزخ بھی نہ ہوتی کیونکہ اس صورت میں کوئی بھی دوزخ میں ڈالے جانے کا مستحق نہ ہوتا۔ درحقیقت انسان اپنے فرضِ منصبی سے رُوگردانی کے نتیجے میں سزا کا مستوجب ہوتا ہے جو اپنی سطح سے نیچے رہ کر زندگی بسر کرے گا، روندے جانے کا خطرہ مول لے گا۔

انسان کے لیے، خدا کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے پیغامِ حق دُوسروں تک بے کم و کاست پہنچانا تھا (جس طرح رسول نے پہنچایا)، کئی پہلو رکھتا ہے۔ یہ پیغام اُن پہلودار شخصیات کی ضروریات کی رعایت رکھتے ہوئے دیا گیا تھا جو اس کے مخاطب تھیں؛ مگر یہ تمام الٰہی پیغامات ایک طلائی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں جو رفاقت و رحمت کی زنجیر ہے۔ پیغامِ الٰہی یعنی قرآن اور کلمۂ توحید کے دُوسرے جزو؛ یعنی یہ کہ حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، کی کڑی نہ ہو تو یہ دُنیا ایک ایسے منجمد سیّارے کی مانند ہو جائے جو قوّت بخش حرارت دینے والے سُورج سے بہت دُور ہو۔ حقیقتاً یہ کڑی ہی ایک طرح کا کرم اور رحمت ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (الانبیاء(۲۱): ۱۰۷)

اور (اے محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم) ہم نے تم کو تمام جہان کے لیے رحمت (بنا کر) بھیجا ہے۔

پیغمبر آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کے القابِ مبارکہ میں ایک لقب "رحمۃٌ للعالمین" بھی ہے جسے رحمت کی کلید سمجھنا چاہیے اور یہ صفت خدا تک لے جاتی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبیِّ کریمؐ سے پُوچھا: "کیا ہر شخص اللہ کی رحمت و کرم ہی سے جنّت میں داخل کیا جائے گا؟" جواب میں حضور اکرمؐ نے تین بار فرمایا: "کوئی شخص بھی اللہ کی رحمت و کرم کے بغیر جنّت میں داخل نہیں ہو گا۔" اس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پُوچھا: "کیا آپ بھی اے اللہ کے رسول؟" آپ نے جواب دیا: "ہاں، مَیں بھی تاوقتیکہ اللہ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ نہ لے۔"

حضور اکرمؐ نے ایک موقع پر صحابۂ کرامؓ سے کہا: "جب اللہ عزّ و جل تخلیقِ کائنات

Marfat.com

سے فارغ ہُوا تو اس نے اپنے عرش کے اُوپر یہ لکھ دیا:
"میرا کرم میرے غضب پر سبقت رکھتا ہے" اور یہ حدیث مسلمانوں کے لیے فیصلہ کن ہے کہ قرآن میں باری تعالیٰ کے وُہ تمام اسمائے حسنہ جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے مختلف پہلو نمایاں کرتے ہیں جن کا تعلق انسانیت سے ہے "رحمت" ہی کے تابع ہیں۔

ایک مرتبہ صحرا کے رہنے والے کسی بدّو نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے نواسہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کرتے دیکھ کر تعجب سے پُوچھا: "آپؐ بچوں کو پیار کرتے ہیں؟ ہم تو ایسا نہیں کرتے" اِس پر حضورؐ نے فرمایا: "میں کیا کر سکتا ہوں اگر اللہ نے تمہارے دلوں سے رحمت نکال لی ہو!"

صیغہ واحد متکلم میں بات کرتے ہُوئے اللہ عزوجل قرآن مبین میں فرماتا ہے:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف (۷): ۱۵۶)

میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔

اور یہ رحمتِ خداوندی صرف اُنہی کو ملتی ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں، چنانچہ ارشاد باری ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم (۱۹): ۹۶)

اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کیے خُدا ان کی محبّت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کر دے گا۔

اور پھر یہ بھی ارشاد فرمایا:

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (الحجر (۱۵): ۵۶)

(ابراہیم نے) کہا کہ خُدا کی رحمت سے (میں مایوس کیوں ہونے لگا، اُس سے) مایوس ہونا گمراہوں کا کام ہے[1]

---

[1] اس روایت کو صحیح مسلم اور بخاری دونوں نے نقل کیا ہے۔ ایک مرتبہ حضورِ اکرمؐ کے سامنے کچھ جنگی قیدی لائے گئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کی چھاتیوں سے دُودھ

باقی حاشیہ صفحہ ۱۴۲ پر

Marfat.com

کلمۂ توحید کے دونوں اجزا کے بعد جو کلمہ مسلمانوں کے لبوں پر اکثر رواں رہتا ہے، "بسم اللہ" ہے جس کے الفاظ ہیں، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط "شروع اللہ کے نام سے جو نہایت رحم والا، مہربان ہے۔"

ایک سُورت کے سوا قرآن حمید کی ہر سُورت کا آغاز اِن ہی مبارک کلمات سے ہوتا ہے۔

کچھ مفسرینِ کلامِ الٰہی کا کہنا ہے کہ یہ دُنیا "الرحمٰن" کے سانس سے تخلیق ہوئی ہے اور اس نظریے کے مطابق، اسی رحمت کی وسعت اور تجلّی نے جس میں ہر شئے کو ڈھلنے اور حرارت بخشنے کی قوّت ہے، تمام خارجی اشیاء کو تخلیق کیا ہے۔ خُدا اپنی ذات میں بے نیاز ہے اور کسی کا محتاج نہیں پھر بھی "استعارۃً" یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُسے دُوسروں سے ہم کلام ہونے کی "حاجت" ہے کیونکہ اُس کی رحمت اپنے اظہار کے لیے بے تاب رہتی ہے اور وُہ تمام صحراؤں کی ریت کے ذرّوں سے بھی زیادہ شمار سے باہر ہے۔ چونکہ بسم اللہ تخلیق کے وقت پڑھی گئی تھی، اس لیے مسلمان ہر کام کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں جس سے وُہ کام نیک اور پاک ہو جاتا ہے اور اس کا ناتا اِس مقصدِ اولیٰ سے دوبارہ استوار ہو جاتا ہے جس کے بغیر ہر کام، ہر حرکت اتنی ہی بے معنیٰ اور اضطراری ہو گی جس طرح کسی تنِ مُردہ میں اینٹھن ہوتی ہے۔

صُوفی اس رحمت کی شدّت سے چکاچوند ہو کر بعض اوقات اِس کا اُصولی طور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱ کا) بہہ رہا تھا۔ وُہ عالمِ اضطراب میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی تھی جب اُسے اس کا بچّہ مل گیا تو اس نے یک لخت اسے اپنی چھاتیوں سے لگا لیا؛ تو حضورِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے صحابہ سے فرمایا، "کیا تمہارا خیال ہے یہ عورت اپنے بچّے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟ جب اُنھوں نے جواب دیا نہیں، وُہ یہ نہیں کرے گی تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، خُدا اپنے بندوں پر اس عورت کے اپنے بچّے سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔"

Marfat.com

ہی پر نہیں بلکہ اپنے اردگرد اور خارجی لحاظ سے نظارہ کرتے ہیں۔ ایران کے مشہور صوفی ابوالحسن خرقانیؒ (متوفی ۱۰۳۳ء) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک شب آپ مصروف عبادت تھے تو غیب سے ایک آواز آئی: "اے ابوالحسن! کیا تو پسند کرے گا کہ میں تیرے باطن سے لوگوں کو آگاہ کر دوں تاکہ لوگ تجھے سنگسار کر دیں؟" ابُوالحسن نے جواب دیا: "اے ربِّ کریم، اگر تیری رضا ہو تو میں لوگوں پر تیری رحمت کا حال کھول دوں تاکہ ایک جبیں بھی تیرے آگے سجدہ ریز نہ ہو؟"[1] آواز آئی تو اپنا راز چھپائے رکھ، میں اپنا راز چھپائے رکھوں گا۔[2] تاہم عام خیال یہی ہے کہ اللہ کی رحمت اس وقت جوش میں آتی ہے جب کوئی جبیں عرقِ ندامت سے تر ہو کر عفو و بخشش کی طالب ہوتی ہے، اور جو لوگ توبہ و استغفار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اُن کے قلوب گناہوں کے زنگ سے ڈھک جاتے ہیں اور اُن پر کوئی نیکی اثر نہیں کر سکتی۔

عربی میں 'ر ح م' کے مادّے سے جو الفاظ مشتق ہوئے ہیں اُن میں 'رحمۃ'، "الرحمان" یعنی رحم والا اور "الرحیم" کے یعنی مہربان شامل ہیں۔ "رحم" کے بنیادی معنی عورت کے رحم یا کوکھ کے ہیں جس سے رحمت کا مادری پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ رحم کا خاصہ بھی تو یہی ہے کہ وُہ ایک بے یار و مددگار، نازک و نرم انسانی مخلوق کو کمال شفقت اور ملاطفت سے پرورش کرتا ہے۔ عربی سے ملتی جلتی سُریانی زبان میں اِسی لفظ کے معنی "محبّت" کے ہیں۔

---

[1] ایک متفق علیہ حدیث کے مطابق رسولِ خُدا نے ایک موقع پر فرمایا کہ ہر مومن کو اللہ سے یہ توقع رکھنے کا حق حاصل ہے کہ وُہ اُن لوگوں کو سزا نہیں دے گا جو اِس کے ساتھ کسی بُت وغیرہ کو شریک نہیں کرتے۔ اس موقع پر کسی نے کہا: "کیا میں یہ خوشخبری لوگوں تک پہنچا دُوں؟" آپؐ نے فرمایا: "نہیں، لوگوں کو یہ نہ بتائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وُہ صرف اسی بات پر تکیہ کر کے بیٹھ جائیں۔"

2. Nicholson R.A., Mystics of Islam p.136

Marfat.com

کہا جاتا ہے کہ 'الرحمان' کا لفظ نیلگوں، متین اور روشن آسمان کے مانند ہے جو ہمارے سمیت تمام اشیاء و مخلوق پر سایہ فگن ہے جب کہ "رحیم" نرم شعاع کی مانند ہے جو اس آسمان سے ہماری انفرادی زندگیوں اور زمین پر رُونما ہونے والے واقعات کو متاثر کرتی ہے اور زمین کو توانائی بخشتی ہے۔ قرآن مبین کا ارشاد ہے:

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الۡبَیَانَ (رحمٰن (۵۵): ۱-۴)

اُس رحمان نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔ اُسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اُسی نے اُسے بیان (کی طاقت دی) سکھایا۔

اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر خدائے واحد (الاحد) "الرحمان" نہ ہوتا تو کوئی تخلیق وجود میں نہ آتی، کسی شے کا کوئی مظہر نہ ہوتا، یعنی حرم قدس صرف ذاتِ باری کی "صمدیت" ہوتی ــــ اور اگر وُہ ذات "الرحیم" نہ ہوتی تو ساری مخلوقات برف کی طرح منجمد ہو جاتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو شخص رحم اور مہربانی سے عاری ہے اُس کا دل برف کی طرح منجمد ہو چکا ہے جسے صرف آگ ہی پگھلا سکتی ہے۔

اگر 'الرحمان' کی مثال روشن آسمان کی ہے تو اُسے 'انبساط' بھی کہا جا سکتا ہے۔ انبساط اپنی نوعیت کے اعتبار سے وسیع ہے اور دُور دُور تک اثر کرتا ہے۔ اس میں 'الرحیم' دُور تک اثر پذیری کا مفہوم رکھتا ہے۔ اس کا اطلاق، بشمول آرٹ (فن) انسان کے اُن تمام اعمال پہ ہوتا ہے جن کے ذریعے ابلاغ ہوتا ہے، اسی لیے "خلق" کے ساتھ "بیان" کا لفظ آیا ہے۔ انسانوں میں، جو اس دُنیا میں ایک دُوسرے سے مختلف حجابات کے باعث اس طرح جُدا ہیں کہ ہر ایک کی اَنا اپنے خول میں بند ہے، ابلاغ (بیان) رحمت ہے، محبّت کا ذریعہ ہے جو ہمیں ایک دُوسرے سے ملاتا ہے۔ ہر مقدس فن کی طرح یہ ہمیں بہشت سے پہلے ہی متعارف کرا دیتا ہے۔ ہمیں نطق عطا ہُوا ہے، ہم بولتے ہیں، اور مخاطب ہماری بات سمجھ لے تو گویا برف کی دیوار پگھل جاتی ہے اور اس میں سے ایسے چشمے پھُوٹ بہتے ہیں جو بہشت کے چشموں کے مانند ہوتے ہیں۔

Marfat.com

مگر لامحدود اور محدود، پائیدار اور ناپائیدار ہیں منطقی طور پر کوئی ربط ممکن نظر نہیں آتا، اور بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ معجزہ ہی قرار پائے گا اور اسی بنا پر قرآن کو اسلام کا ایک عظیم معجزہ کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خارج از گمان و قیاس فاصلے سے انسان سے ہمکلام ہوتا ہے اور اس کی بات سُنی بھی جاتی ہے، اور وُہ باتیں جو لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتیں، جیسے ہم کسی درخت یا مکان کا نقشہ الفاظ میں کھینچتے ہیں، وُہ پوری طرح بیان ہوئی ہیں۔ مقصود یہ نہیں کہ ہم جانوروں کی طرح صرف سطحی "غور" کریں (جو صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں) بلکہ ہمیں یہ ترغیب دی گئی ہے کہ ہم الفاظ کی دُنیا سے نکل کر معانی کی کائنات میں سفر کریں۔ مسلمانوں کی ایک مناجات اِسی معجزۂ عظیم کو یُوں بیان کرتی ہے:

"اے معبود! تیری تعریف بیان کی گئی ہے اگرچہ تیری ذات ہر تعریف سے بالاتر ہے۔ تُو پردۂ غیب میں ہے مگر ہم سے اُوجھل نہیں۔ تُو بصیر ہے، جو خود نظر نہیں آتا۔ تُو جس کو تلاش کیا جاتا ہے اور پایا جاتا ہے، آسمان، زمین یا اِن کے درمیان خلا تجھ سے ایک لحظے کے لیے بھی خالی نہیں۔ تو نُورالانوار ہے، مالکِ کُل ہے، سب پر محیط اور غالب ہے۔ سب حمد اسی کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ جو سمیع و بصیر ہے۔"

Marfat.com

Marfat.com

باب چہارم

دُنیائے قرآن

قرآنِ مبین کے مطالعے کا ارادہ ہو تو یہ ضروری ہے کہ پہلے میدان ہموار کر لیا جائے۔ یہ میدان خاصا خاردار ہے اور دشواری یہ ہے کہ یہ خاردار جھاڑیاں فوراً نظر نہیں آتیں۔ ہر مذہبی روایت اور ہر قدیم داستان میں متبرک اشیاء، اور مقامات مقدسہ کی بے حد حفاظت کی جاتی ہے اور ان تک رسائی کے لیے صفائی قلب اور کوشش درکار ہوتی ہے، اور قرآن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

مغرب کو جو اوّلین غلط فہمیاں اسلام کے متعلق پیدا ہوتی ہیں وہ یہیں سے یعنی دین کے سرچشمے ہی سے شروع ہوتی ہیں۔ ہر اُس غیر مسلم کو جو کسی بھی وجہ سے اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو، سب سے پہلے قرآن کا کوئی ترجمہ تھما دیا جاتا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس صحیفۂ کاملہ کے کم از کم تیس تراجم صرف انگریزی زبان ہی میں ہیں۔ ایسے جویائے حقیقت شخص سے کہا جاتا ہے اور یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ کہ یہ کتاب اسلام میں ایمان کی اساس ہے اور اُس میں اُسے اسلام، مسلمانوں، اُن کے عقائد، اُن کے محرکات، ان کے سیاسی عزائم اور ثقافتی ورثے کے بارے

Marfat.com

ہیں سب کچھ مل جائے گا۔ یہ غیر مسلم قاری صدقِ نیت سے اِس میں اپنے خیال کے مطابق حکمت تلاش کرنے پر کمر بستہ ہو جاتا ہے کیونکہ وُہ سمجھتا ہے کہ جو کتاب اتنے بہت سے آدمیوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت بنی ہوئی ہے، خالی از دلچسپی نہیں ہوسکتی مگر اِس کے شوق اور تجسس کا نتیجہ اکثر مایوسی اور پریشانی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اِس کتاب میں بظاہر ایسی کوئی بات نہیں جو مغربی ذہن کے قاعدے اور قانون کی پابندی کے مزاج کے مطابق ہو۔ اس کے برعکس اُسے الفاظ کا ایک ایسا جنگل نظر آتا ہے جو اِس کے خیال کے مطابق بالکل بے ربط ہے اور جن کو سمجھنے کے لیے اس کے پاس کوئی کنجی بھی نہیں۔ یہاں ہم ایک بار پھر اس مقام پر آگئے ہیں جہاں دونوں مذاہب میں عدم مفاہمت کی وسیع خلیج حائل ہے۔ یہ دو تہذیبوں اور دو ذہنیتوں کا فرق ہے۔ ایک طرف تو کسی سیدھے سادے مسلمان کے لیے یہ بات بعید از فہم ہے کہ کوئی غیر مسلم قرآن پڑھتے ہی کیوں مسلمان نہیں ہو جاتا۔ دُوسری طرف غیر مسلم یہ سوچتا ہے کہ اگر یہی وُہ کتاب ہے جسے مسلمان ایک صحیفۂ مقدسہ سمجھتے ہیں تو یقیناً وُہ ضرورت سے زیادہ سادہ لوح واقع ہوئے ہیں۔

وُہ غیر مسلم جو قرآن مبین کا ترجمے کے ذریعے مطالعہ کرتے ہیں اُسے ادھورا ہی چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اِس منفی تاثیر کو تقویت قرآنی سُورتوں کی ترتیب ہی پہنچاتی ہے۔ قرآن مجید کا نزول بائیس تیئیس برس کی مدت میں ہوا۔ اوّلین اور بہت زیادہ شعری آہنگ والی سُورتیں سب سے آخر میں درج کی گئی ہیں جب کہ بعد کی وُہ سورتیں جو دنیوی معاملات سے متعلق ہیں ابتدا میں آئی ہیں۔ مغربی اذہان کو آخر میں درج سورتیں زیادہ پُرکشش محسوس ہوتی ہیں کیونکہ ان کے لب ولہجے اور زبان میں پیغمبرانہ رفعت ہے اور ان میں آخرت کی باتوں کا ذکر ہے اور انسانی مقدر کے انجام و انتہا کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ قرآنی ترتیب کی اوّلین سورتوں اور آیات میں، بشارت اور نوید کے بجائے "پیغام" کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ قرآن کریم اپنی ترتیب کے لحاظ سے ترتیبِ نزولی کے بالعکس ہے۔ ممکن ہے اِس کا سبب یہ ہو کہ انسان رفعت

Marfat.com

کی منازل طے کرتے ہوئے سب سے پہلے عملی دُنیا کے معاملات میں رہنمائی کا محتاج ہے اور ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وُہ اپنی دینوی زندگی کیسے گزارے اس کے بعد ہی وُہ عقبیٰ کی باتوں پر دھیان دے سکتا ہے۔

جو لوگ ترجمے کے وسیلے سے مطالعۂ قرآن کرتے ہیں ان کی راہ میں زبان کا مسئلہ بھی حائل ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے پیغامِ الٰہی کی اثر انگیزی اور قوت نہ صرف الفاظِ وحی کے لغوی معنی میں مضمر ہوتی ہے بلکہ اُس متن میں بھی ہے جس میں مفہوم پوشیدہ ہے۔ پس اہمیّت تنہا مواد کی نہیں، اس ظرف کی بھی ہے جس میں یہ مواد پیش کیا گیا ہے اور اگر دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا جائے تو مطلب ضبط ہو جائے گا۔ ترجمے میں اسی بنا پر اصل کی سی قوّت نہیں ہوتی۔

قرآن مبین نے بالتصریح اپنا تعارف "عربی کے صحیفے" کی حیثیت سے کرایا ہے۔ اس بنا پر پیغامِ الٰہی اِس منتخب زبان کے دقیق قواعد کے مطابق ہی ڈھالا گیا ہے۔ عربی کے یہ لسانی قواعد تمام یورپی زبانوں سے مختلف ہیں۔ اگر کوئی شخص بیشتر مسلمانوں کی طرح عربی سے واقفیت نہ بھی رکھتا ہو تب بھی اُسے یہ ضرور جاننا چاہیے کہ کس طرح قرآن کی زبان میں لفظ و معنی، ماہیت اور پیکر یک جان ہیں۔ ہر عربی لفظ کا ایک مادہ ہے جو تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس بنیادی مادّہ سے بارہ[۱۲] کے قریب مختلف افعال اور متعدد اسماء صفات مشتق ہوتے ہیں۔ اسی مادّہ یا مصدر کو ثلاثی مجرد کہا جاتا ہے۔ اس مادہ میں مختلف اعراب یا سابقوں اور لاحقوں کے اضافے سے بالکل نئے الفاظ وجود میں آتے ہیں۔ مادّہ جب تک مادّہ (Root) کی شکل میں ہوتا ہے، ایک طرح سے "مُردہ" ہوتا ہے؛ یعنی اس کا کوئی تلفظ نہیں ہوتا تاوقتیکہ اُس پر اعراب نہ لگائے جائیں؛ یعنی کہ اُس کی کوئی صوتی شکل نہ بنائی جائے۔ اعراب کی اہمیت یہ ہے کہ انہی کی مدد سے مادّہ (Root) کا بنیادی مفہوم مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ کسی لفظ کے بنیادی مادّے کو لفظ کا "جسم" اور اعراب کو اس کی "روح" کہا جا سکتا ہے؛ گویا یہ جڑ ہے جس سے تناور درخت پھوٹتا ہے۔ ٹائٹس برک ہارٹ کا کہنا ہے کہ عربی میں مختلف مادّوں سے مشتق الفاظ کا ذخیرہ وسیع اور

Marfat.com

لامتناہی ہے۔ یہ ہمیشہ نئے برگ و بار پیدا کرتا رہتا ہے اور بنیادی الفاظ کے ایسے ایسے معنی نکالتا ہے جو خوابیدہ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحرانشین بدوؤں کی زبان کس طرح ایک عظیم تہذیب کے اظہار و تکلم کا ظرف اور پیمانہ بن گئی جو علمی اور ذہنی اعتبار سے مالا مال تھی۔[1]

ہر زبان میں تھوڑا بہت ابہام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان زندہ ہے اور سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے درمیان ایک پل ہے۔ ریاضی کی ٹھوس قطعیت کی ضد، محض صفت ابہام نہیں بلکہ معنی کا تانا بانا ہے جو بعض اوقات اُلجھا ہُوا ہوتا ہے مگر ہر لفظ دُوسرے لفظ کو واضح کرتا ہے۔ تمام اشتقاقات ایک ہی مادّے یا فعل کے گرد گھومتے ہیں جو ثلاثی مجرد کہلاتا ہے۔ ایک ہی فعل سے ایسے ایسے الفاظ مشتق ہوتے ہیں جو بظاہر ایک دُوسرے سے متعلق نہیں ہوتے؛ تاہم اگر کوئی مادہ سے واقف ہو تو الفاظ کا باہمی ربط اس کی سمجھ میں آجائے گا اور اس سے الفاظ کا پورا "قبیلہ" اس کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔

اِس بات کو لفظ "فطرت" سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مادّہ "ف۔ط۔ر" ہے۔ اس سے پہلے فعل فَطَر جس کے معنی ہیں "جُدا کیا"، "پھاڑا"، "جنم دیا" یا "تخلیق کیا"۔ یہاں 'پھاڑنے' اور 'تخلیق کرنے' کے درمیان تعلق خالی از دلچسپی نہیں، خاص طور پر جب ہم تسلسل کے عمل کو ذہن میں رکھیں جو اس کا خاصہ ہے۔ مختلف قدیم تہذیبوں کی قدیم روایتوں میں آیا ہے کہ تخلیق کی ابتدا زمین و آسمان کے ایک دُوسرے سے جُدا ہونے سے ہوئی۔ قرآن مبین میں اللہ جل شانہٗ کو 'فاطر السمٰوات والارض' کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں "زمین و آسمان کا خالق"۔ اسی مادّہ سے 'عید الفطر' بھی ہے۔ وہ تہوار جس پر ماہِ رمضان ختم ہوتا ہے اور اسی سے "افطار" نکلا ہے جس کے معنی ہیں "روزہ کھولنا" اور اسی مادہ سے 'فطر' نکلا ہے (جس کے معنی ہیں دراڑ) اور "فطری" بھی جس کے معنی ہیں "قدرتی"

---

1. Art of Islam: Language and Meaning, Titus Burckhardt, World of Islam Festival Pub.Co., Lahore, p.43

Marfat.com

یا جبلّی۔ پھر فطیرہ، ہے جس کے معنی ہیں "تازہ، جاں بخش، بے خمیر روٹی"۔

یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہر لفظ (افطار، فطر، فطری، فطیرہ وغیرہ ایک ہی قالب سے ڈھل کر نکلا ہو، بنیادی طور پر جس کے رنگا رنگ معانی ہیں جو ایک دُوسرے سے نہایت لطیف انداز میں ربط رکھتے ہیں؛ یا یُوں کہہ لیجیے جب ایک تار ہلایا جاتا ہے تو اس کے پس پردہ بہت سے تار تھرتھرا اُٹھتے ہیں اور الفاظ و معنی کے اسی تعلق باہمی سے توحید جو اسلام کا بنیادی رکن ہے، بے پناہ کثرت میں وحدت کو ظاہر کرتی ہے۔ الفاظ کا باہمی تعلق یعنی گوش و دماغ میں بازگشت اور ارتعاش لامحدود گہرائی تک لے جاتے ہیں اور ہمارے ادراک کو اشیاء کے ایک دُوسرے سے مربوط ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ حضرتِ احمد مجتبیٰؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بیک وقت ظاہری اور باطنی معنی نہ ہوں اور ان کے ساتھ بہت سے اور معنی بھی اس میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلام الٰہی کی ہر تفسیر آگہی اور روشنی کا سرچشمہ ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں سمجھ لیجیے کہ اس کتاب کے بے شمار دروازے اس زندانِ آب و گل سے نکل کر فضائے بسیط میں جانے کیلئے کھلے ہوئے ہیں اور اس کے شواہد اسلامی فنون میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مارٹن لنگز مثلاً قرآنی صفحات کے حاشیوں پر بنے ہوئے کھجور کے ننھے ننھے پودوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ اس بات کی علامت ہیں کہ قرآن کی تلاوت خواہ سرّی ہو یا جہری، ایک لاانتہا وجد اور ارتعاش کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ ایسی لہر کا زیر و بم ہے جو بالآخر ساحلِ ابد سے جا ٹکراتا ہے بلکہ یہ اس "ساحل" سے بھی ماورا ہے اور اس کے حواشی پر نمایاں ہے۔ فن کے اظہار کے مختلف پہلوؤں مثلاً کھجور کے درختوں، میناروں کے کلسوں، پتھر میں کھدے ہوئے نقوش اور بیل بُوٹوں سے ابدیت مقصود ہے۔[1]

1. Martin Lings, "The Quranic Art of Calligraphy and Illumination," (World of Islamic Festival Trust.) p.74

Marfat.com

عربی جیسی قدیم زبان صرف ایک لفظ سے اظہارِ خیال کے مختلف پیرائے ممکن ہیں جو ٹھوس حقیقت سے استعاروں بلکہ مافوق الفطرت تک لے جاتے ہیں۔ مغرب کے لوگ جو رکاوٹیں روحانی اور دُنیوی امور کے درمیان کھڑی کرتے ہیں، زبان ہی اُنھیں عبور کرتی ہے۔ انگریزی اور دُوسری دوغلی زبانیں بولنے والے، جو اسم، کو باقی اجزائے کلام سے الگ تھلگ حیثیت دینے کے عادی ہیں، لسان القرآن تک رسائی حاصل کرنا دشوار پاتے ہیں۔ اس کے لیے اُنھیں اپنے تخیّل اور تصوّر کو خاصی مہمیز دینا پڑتی ہے۔

اشیاء و مظاہرِ قدرت قدیم عربوں کے لیے اپنے اندر معانی اور مفاہیم کی ایک دُنیا رکھتے تھے اور ان کی زبان سے بھی اس تنوّع اور رنگارنگی کا بخوبی اظہار ہوتا تھا۔ دُوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ زبان انتہائی مالدار تھی۔ تبھی تو کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کی عربی حضرت موسیٰؑ کی عبرانی سے، جو اس سے دو ہزار سال قبل بولی جاتی تھی، کہیں زیادہ مالدار اور جامع تھی[1]۔ عربی میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری ہے کہ ہمارا کوئی تصوّر، کوئی خیال ایسا نہیں جس کا یہ احاطہ نہ کرتی ہو۔ عربی کی اسی انفرادیت کے سبب اسے "وحدت فی الکثرت" کی وحی کا ذریعہ منتخب کیا گیا۔

عربی کے اسی پہلو کے باعث قرآن حمید کا کوئی بھی ترجمہ، خواہ کتنا ہی بہتر نہ کیوں نہ کیا گیا ہو، قرآن ہے نہ ہو سکتا ہے اور اُسے یہ حیثیت دی بھی نہیں جاتی۔ کوئی بھی مسلمان قرآن مُبین کو میز وغیرہ پر دُوسری کتابوں یا کسی اور شے کے نیچے نہیں رکھتا؛ تاہم خالص ترجمے کے ساتھ یہ احتیاط اور آداب نہیں برتے جاتے۔ اُسے لوگ عام کتابوں کے ساتھ الماری یا میز پر رکھ دیتے ہیں؛ خواہ وُہ ترجمہ کیسا ہی وقیع، جامع اور صحیح کیوں نہ ہو۔

وحی اور الہام میں فرق و امتیاز اسلام میں بنیادی اہمیّت کا حامل ہے؛ خواہ

---

[1] دیکھیے مارٹن لنگز کی کتاب: The Ancient Beliefs of Modern Superstitions, p.14

Marfat.com

الہام بھی خداوندی کیوں نہ ہو، اور یہی پہلو کسی مغربی انسان کو اُلجھا دے میں ڈال دیتا ہے چونکہ اسے یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مسلم بائبل (انجیل) ہے۔ عہد نامہ عتیق (توریت) کی تصنیف کا سہرا کئی مصنفوں کے سر باندھا جاتا ہے جنہوں نے ایک طویل مُدت میں اِس کی تالیف و ترتیب کا کام سرانجام دیا۔ اِن میں سے بعض وُہ تھے جنہیں الہامی ہدایت ملتی تھی اور کچھ ایسے تھے جنہیں علم حاصل ہُوا، جب کہ عہد نامہ جدید (انجیل) کا موازنہ قرآن سے نہیں، بلکہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث سے کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں مسیح ناصری کے اقوال و اعمال بیان ہوئے ہیں۔ انجیل تو جامۂ ہزار رنگ ہے جب کہ قرآن مجید کا ایک ہی رنگ ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں جاسکتی مسلمانوں کے نظریے کے مطابق وحی، انسانی ذہانت اور ان کی تنگ دامانی سے ماورا ہے، جب کہ الہام انسانی ذہانت اور ادراک کو منور کرتا ہے؛ تاہم وُہ انسانی خرد کی معذوریوں کو دُور نہیں کرتا۔ "الہامی" تحریر بہرحال انسانی تصنیف ہے۔ اسلام میں اسلاف کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن "غیر مخلوق" ہے، اگرچہ جس کتاب کو ہم اپنے ہاتھوں سے چھوتے ہیں، اُس کا پیرایۂ اظہار "انسانی" ہی ہے۔

فرتھجوف شوآن کہتے ہیں: "یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ فانی کی غریب اور مجبل زبان کلماتِ خداوندی کے شدید بوجھ تلے دَب کر ہزاروں ٹکڑوں میں بکھر گئی ہے یا یوں محسوس ہوتا ہے گویا حق تعالیٰ سبحانہٗ کو ہزار صداقتیں بیان کرنے کے لیے صرف چند درجن الفاظ پر اکتفا کرنا پڑا۔ اس لیے اس نے معنی کی گہرائیوں تک ہمارے اذہان کو پہنچانے کے لیے تلمیحات و کنایات اور اختصار اور علامات وغیرہ سے کام لیا ہے[1] چنانچہ اس کیفیت کا اظہار باری تعالیٰ یُوں کرتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ
سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ط (لقمٰن ۳۱: ۲۷)

اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں

---

1. Frithjof Schuon, Understanding Islam, pp.44-45

Marfat.com

اور سمندر (کا تمام پانی) سیاہی (اور) اس کے بعد سات سمندر اور (سیاہی ہو جائیں)، تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔

قرآن حکیم کے بحرِ بے کراں سے جرعہ بھر استفادہ کے لیے بھی اُن تمثیلوں، علامات اور اشاروں کا سہارا لینا پڑتا ہے جو اس کتابِ مُبین میں آتی ہیں۔ یُوں سمجھئے گویا یہ روزن ہیں جو ایک وسیع منظر کو عیاں کرتے ہیں مگر اس منظر میں ہر شخص اپنے خیال کے مطابق رنگ بھرتا ہے۔

قرآنِ مقدس جو کہ حکمت و دانش سے لبریز ہے، خدائے بزرگ و برتر کے پاس سے آیا ہے اور ہمیشہ سے اُسی کے پاس تھا۔ اس میں منشائے الٰہی کا اظہار ہمارے دُنیاوی تجربات کے لحاظ سے، مخلوق، حقائق اور واقعات کے حوالے سے ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پسِ پردہ کوئی آسمانی ذات ہے جو خود خاموش ہے مگر ایک ایسی زبان اور خیال کے ذریعے بول رہی ہے جو اس معاشرتی ماحول کے لیے مقسوم تھی۔ کسی انسانی زبان میں لاکھ وسعت سہی تاہم وُہ صدقِ ازلی کے کماحقہٗ بیان اور ندرتِ خیال کے اظہار سے قاصر ہے۔ ہماری زبانوں کے محدود ظرف کا تو یہ عالم ہے کہ کسی ایک عام سے واقعے کے بیان میں بھی ہم سخت دقت محسوس کرتے ہیں اور اپنے احساسات کی شدید گہرائیوں کا اظہار خاطر خواہ انداز میں نہیں کر سکتے نہ خیالات کو جن کا خاکہ ہمارے مافی الضمیر میں انتہائی واضح ہوتا ہے۔ مناسب طریقے سے دُوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ حالانکہ زبان ہماری ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ فہم انسانی کے مطابق زبان کو ڈھالنے کے لیے قرآن میں خاصی "کاوش" نظر آتی ہے۔ کہیں اختصار ہے، کہیں چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، کہیں بات نامکمل چھوڑ دی گئی ہے اور کہیں جملوں سے ایک آدھ لفظ محذوف ہے (جو مترجمین کو توسین میں بیان کرنا پڑتا ہے)۔ یہ وُہ "فعل" ہے جنہیں ہمیں اپنی سوچ اور عقل کے مطابق عبور کرنا ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ازواجِ مطہرات نے آپ سے پُوچھا

Marfat.com

کہ اِن میں سے کون پہلے دُنیا سے پردہ کرے گی۔ آپؐ نے فرمایا وُہ جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں۔ اِن سب نے بڑی سنجیدگی سے ایک دُوسری کے ہاتھ ناپنا شروع کر دیے۔ خاصے عرصے بعد انہیں اِس بات کا علم ہوا کہ آپؐ کا اشارہ اُس کی طرف تھا جس کے ہاتھ صدقہ و خیرات میں کشادہ ہوں۔ ہمیشہ ایسے مسلمان موجود رہے ہیں جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی ازواج مبارک کی طرح استعارات و تلمیحات کے لفظی معنوں کو لیا اور کچھ لوگ ایسے بھی رہے ہیں جن کا خیال یہ تھا کہ قرآن کے حقیقی باطنی معنی اِن پر یوم قیامت ہی کو ظاہر ہوں گے جب اللہ دلوں کے بھید طشت از بام کرے گا اور کچھ وُہ ہیں جو قرآن کے ظاہری معنوں کو ایک "حجاب" سمجھتے ہیں جو "دُنیا داروں" کی نظر سے عظیم و جلیل حقیقت چھپانے کے لیے ہے۔ اس موضوع پر جو اختلافات اور نزاع پیدا ہوئے ہیں اِن سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پس یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی طبیعت اور مزاج کے موافق نظریے کو اپنائے۔

بہر حال اس میں کلام نہیں کہ قرآن کریم میں عمیق غور کیا جائے یا سطحی طور پر، یہ ہر نوع کے انسان کے لیے، خواہ وُہ ذہین ہوں یا کم عقل، نجات فراہم کرتا ہے۔ محدود معنی لیے جانے سے اس کی اثر پذیری میں کوئی فرق نہیں آتا، بشرطیکہ یہ معنی کسی خاص شخص یا گروہ کی روحانی ضروریات پوری کرتے ہوں۔ یہ ایک واضح سی بات ہے کہ کسی انسان کی تصنیف کردہ کوئی بھی کتاب ہر کس و ناکس کے لیے نہیں ہوتی جبکہ کلامِ الٰہی ہر خاص و عام کے لیے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اسے کسی انسان کی تصنیف یا تالیف کردہ کتاب کی طرح نہیں پڑھا جا سکتا۔ اُس کی مثال چاند سُورج اور بارانِ رحمت جیسی ہے جو سب کے لیے ہیں، تاہم اِن نوامیس قدرت کا اثر ہر ایک پر مختلف ہوتا ہے۔ کچھ کے لیے دُھوپ، چاندنی اور بارش پیامِ حیات لاتے ہیں اور کچھ کے لیے پیغامِ اجل۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کے فیوض و برکات بھی اسی انداز کے ہیں بلکہ زیادہ صحیح تو یہ بات ہے کہ سُورج، چاند اور بارش کے وظائف، اعمالِ قرآن کی طرح

Marfat.com

ہیں۔ اِن سب کا مصنف خدائے واحد ہی تو ہے، گویا یہ کسی کتاب میں لگے ہوئے رنگین صفحات کی مانند ہیں۔

یہ بات اسلام میں ایک پختہ عقیدے کا درجہ رکھتی ہے کہ قرآنِ کریم کی مثل کوئی اور عبارت نہیں ہو سکتی۔ کوئی انسان لاکھ سر مارے ایک شذرہ، ایک سطر بھی اِس کی مثل نہیں لکھ سکتا۔ ضروری نہیں کہ اُس کا ادبی پایہ بلند ہی ہو۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کوئی اعلیٰ درجے کا ادب پارہ 'مقدّس' ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اِس کی زبان، اِس کے مفہوم کو پُوری طرح اِدا کرتی ہے! الفاظ کی کیسی ہی اشکال و تراکیب کیوں نہ اختراع کی جائیں، وحی الٰہی کے مقابل نہیں ہو سکتیں۔ یہ قرآن کے الفاظ کا صحیح استعمال ہے (یعنی اُنہیں کس معنے میں استعمال کیا جاتا ہے اور کہاں کہاں اُنہیں بچا کر رکھا جاتا ہے) کہ جس کی نقالی ممکن نہیں۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اپنی ذات اور اپنے خیالات کے ریشے بٹ کر دُوسروں کے لیے نجات کی ریسمان تیار کرے۔

قرآن کریم دیگر کتابوں کے ساتھ طاق میں رکھا ہوا ہو تو بھی اس کے اثرات دُوسری تمام کتابوں سے مختلف ہوں گے اور اس کی جہت بھی مختلف ہو گی۔ یہ اس کی عظیم برکات ہی تو ہیں کہ کوئی اَن پڑھ چرواہا بھی جب اِس کی قرأت سُنتا ہے تو اِس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ چودہ[۱۴] سو سال کے عرصے میں اُس نے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں میں اِنقلاب عظیم برپا کیا ہے اور بعض ایسے منتخب روزگار ذہنوں کی پرورش و پرداخت کی ہے جنھوں نے تاریخ عالم میں اپنے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اسی قرآن نے کئی متشکّکین کو ولی بنا دیا۔ یہی کتاب دقیق فلسفے اور فنِ لطیف کا منبع ہے۔ جن کے معانی و مطالب کا اظہار انتہائی بلیغ انداز میں ہُوا ہے۔ اسی صحیفۂ کاملہ نے انسانوں کے خانہ بدوش جہاں گرد منتشر گروہوں کو شعوب و قبائل کی لڑیوں میں پرو کر تہذیب و تمدّن سے آراستہ کیا۔ نظرے گزرے سے بھی اِن تہذیبوں اور تمدّنوں پر اس کتابِ مقدّس کی گہری چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک مسلمان کی شخصیّت، اِس کی نسل یا قوم سے قطع نظر،

Marfat.com

غیروں سے مختلف ہے کیونکہ اس پر قرآن کا اثر ہوتا ہے اور قرآن ہی اس کی تشکیل کرتا ہے۔

دُوسری تمام کتابیں ''انفعالی'' ہیں۔ اُن تک پہنچنے کے لیے قاری کو خود پہل کرنی ہوتی ہے جب کہ کلام الٰہی بالوجی ایک قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ خدائے برتر و اعلیٰ کا فرمان اور حکم ہے۔ یہ اس برق تجلّی ریز کی مانند ہے جو کسی انفرادی پسند و ناپسند کو خاطر میں نہیں لاتی۔ بنا برایں اس کا اثر ان لوگوں پر ہوتا ہے جو خیر کے انجذاب کی صلاحیّت رکھتے ہیں۔ یہ کلام اُنہیں دُنیا میں خلیفۃ اللّٰہ کی حیثیت سے اِن کے فرائض یاد دلاتا ہے۔ یہ سُننے والوں کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے اور اُنھیں اِس طرح زندہ اور متحرّک کر دیتا ہے جیسے مفلوج اعضا میں دوبارہ جان پڑتی ہے۔ کلامِ الٰہی اپنے قاری پر رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے اسوۂ حسنہ کے حوالے سے یہ منکشف کر دیتا ہے کہ اُس سے کس کردار کی توقع کی جا رہی ہے؛ گویا وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والا کلامِ الٰہی ہمیں ان پستیوں سے نکال کر جس میں ہم گرے ہوئے ہیں، فطرتِ سلیمہ پر لے آتا ہے۔ وُہ انسانی ذہانت کی اعلیٰ صداقتوں کے معلوم کرنے اور سمجھنے کی معدوم صلاحیّت دوبارہ بحال کر دیتا ہے اور اِنسان کی قوّتِ ارادی کو روح کے اندر باہم دگر عناصر سے مقابلے اور مجادلے کی قوّت بخشتا ہے، اور یہی کلام خدائے بزرگ و برتر اور ہر اُس چیز سے جو اس کی یاد دلائے، محبّت کے جذبات کو اصلی قوّت پر بحال کر دیتا ہے۔

قرآن مجید کے متعلق یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ وُہ علم و آگہی کی مَنّاد نہیں حقیقت تو یہ ہے کہ خبر دار کرنا تو اِس کے بنیادی فرائض میں سے ہے جیسا کہ اس نے خود بھی دعویٰ کیا ہے؛ تاہم اسے محض ایک وسیلۂ خبر و اطلاع سمجھنا درست نہیں۔ اس کا اثر ایمان والوں کے دل ہی پر نہیں، رُوح پر بھی ہوتا ہے، لیکن یہ بات صرف قرآن کے عربی متن ہی کے بارے میں صحیح ہوگی۔ سامع اِس کے لیے اس کا آہنگ اور قاری کے لیے اس کی تحریر انقلاب انگیز اثر رکھتی ہے۔ جدید پسند تو یہی کہے گا کہ ''لاشعور'' کو متاثر کرتا ہے۔ اس پر بات کی جائے تو طولِ کلام کا ڈر ہے۔

Marfat.com

جس کا یہاں کوئی موقع نہیں، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم اپنے اثرات شخصیت کے ان گوشوں پر بھی مرتسم کرتا ہے جو عملاً ہمارے شعور سے مخفی ہیں اور ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔ جب ہم انسانی "روح" کی بات کرتے ہیں تو اِس سے مُراد حواسِ خمسہ اور صلاحیتوں کا ماحصل نہیں۔ اُن کی تہہ میں کارفرما دیگر عوامل بھی ہوتے ہیں جو اپنا اظہار اِن کے وسیلے سے کرتے ہیں۔ چونکہ قرآن اصلاً کلامِ الٰہی ہے (جس سے خود ہماری آفرینش بھی وابستہ ہے) اس لیے یہ ہمارے وجود کے ہر خلا کو پُر کرنے کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وُہ تو اِن خلاؤں میں جمع کثافتوں کو نکال باہر کرنے اور اِن کی جگہ ازلی اور ابدی حق جاگزیں کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

جنابِ رسولِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ کوئی ایمان والا جب تلاوتِ کلامِ پاک کرتا ہے تو اس کی مثال "گُلِ نارنج" کی سی ہے جس کی مہک اور ذائقہ دونوں شیریں ہیں۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو اس کلامِ پاک کو حفظ کرتا ہے اور اس حالت میں سو جاتا ہے کہ اُس کا سینہ قرآن سے لبریز ہوتا ہے تو اس کی مثال ایک ایسی تھیلی کی سی ہے جس میں مُشک بھرا ہُوا ہو۔ جب ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ دلوں کو بھی اسی طرح زنگ لگ جاتا ہے جیسے پانی سے لوہے کو، تو اُنہوں نے پوچھا کہ اس زنگ کو کس طرح چھڑایا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے جواب دیا کہ موت کو ہمیشہ یاد کرنے اور قرآنِ مُبین کی متواتر تلاوت سے[1] فرتھ جوف شوآن کہتے ہیں

---

[1] حضورِ اکرمؐ کے ایک صحابی ابنِ مسعودؓ کے مطابق کوئی شخص اگر قرآن سیکھ کر اسے عقیدت سے اپنے سینے میں بند کر لے تو اسے اپنی راتوں کی قدر ہو گی۔ جب لوگ محوِ خواب ہوتے ہیں، اُسے اپنے دنوں کی قدر ہو گی جن میں عام لوگ محوِ لہو و لعب ہوتے ہیں۔ جب لوگ دنیاوی لذات میں گم ہوں تو اُسے اپنی شکستہ دلی کی قدر ہو گی اور اپنی فروتنی اور عجز و انکسار کی قدر جب ہو گی جب لوگ غیظ و غضب میں آپے سے باہر ہوں۔ دُوسرے لفظوں میں وہ

باقی حاشیہ صفحہ ۱۵۹ پر

Marfat.com

کہ قرآن کثرت میں وحدت کا جلوہ رکھتا ہے۔ نفس، سیلِ حوادث کا عادی ہوتا ہے اور کسی مزاحمت کے بغیر حوادث سے پسپا ہو جاتا ہے اور اسی سبب سے بکھر کر رہ جاتا ہے۔ کلامِ الٰہی میں یہ خوبی ہے کہ وُہ نفس کی اِس معذوری کو سمجھتے ہوئے حوادث کا رُخ موڑ دیتا ہے کیونکہ اس کی زبان اور مندرجات آسمانی ہیں۔ اِس کی وجہ سے نفس بحرِ کائنات میں کسی خوف اور رکاوٹ کے بغیر تیرتا ہے اور بالآخر آغوشِ خداوندی میں سکون حاصل کرتا ہے۔ قرآن تو ہر شے کی جس کا تصوّر انسانی دل و دماغ اور احساسات میں آسکتا ہے، ایک تصویر ہے — اسی وسیلے سے خُدا انسان کے اندرونی اضطراب کو ختم کر دیتا ہے اور مومن کے دل کو سکون، اطمینان اور وقار کی دولت بخشتا ہے[1]

ایک سچا مسلمان بیک وقت دو دُنیاؤں میں رہتا ہے۔ ایک دُنیا عام محسوسات و تجربات اور معاملاتِ زمانہ کی ہے۔ دُوسری دُنیا وُہ ہے جس میں وُہ بحیثیت نومولود اپنے کان میں اذان کو سُنتا ہے۔ یہ دُنیا "کتاب" کی دُنیا ہے۔ بچپن ہی سے اُسے قرآن کے کچھ اجزا سکھائے جاتے ہیں اور جب وُہ کچھ بڑا ہو جاتا ہے تو نماز میں بھی قرآن کے اجزا پڑھتا ہے، اور دمِ آخر، یہ اس کی خوش قسمتی ہو گی کہ وُہ قرآن سُنتے ہوئے جان، جانِ آفریں کو سونپ دے۔ اس کے ساتھ ہمارے تجربات کی دُنیا، قرآن کی اُن آیات و ہدایت سے مالا مال ہوتی رہتی ہے جنہیں ہم روزمرّہ کی گفتگو میں تواتر سے استعمال کرتے ہیں۔

مغربی اِنسان (خواہ وُہ عیسائی ہو یا لاادری) جب کہتا ہے "خُدا کا شکر ہے"،

---

[1] 1. Understanding Islam از فرتھ جوف شوآن صفحہ ۵۰

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۸ کا) زندگی کے ہر لمحے کا قدردان ہوگا اور اسی کے پیشِ نظر وُہ شریف ہوگا، اور کبھی تندی و تلخی کو اپنی طبیعت میں جگہ نہ دے گا؛ اور اس کی طرح ہرگز نہ ہوگا جو بازار میں ہنگامہ کرتا ہے اور نہ اس کی طرح جو مغلوب الغضب ہوتا ہے۔

Marfat.com

"خدا تمھارے ساتھ ہو"، "خدا حافظ" یا "اگر خدا نے چاہا" تو یہ الفاظ بالعموم یقین سے تہی ہوتے ہیں۔ کچھ بدنصیب مسلمان بھی ہیں جو اسی قبیل کے قرآنی الفاظ محض برائے بیت استعمال کرتے ہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت الحمد اللہ، کہتی ہے تو اس کے مفہوم سے بخوبی آگاہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس جملۂ تحمید پر مسلمان کا ہر عمل ختم ہوتا ہے اور وُہ "پاک" ہو جاتا ہے؛ جس طرح "بسم اللہ" سے ہر کام کا آغاز کرنے سے برکت حاصل ہوتی ہے۔ پھر جب کسی مسلمان کے لبوں سے "اللہ اکبر" نکلتا ہے تو وُہ بھی اللہ بزرگ و برتر کی یکتائی اور عظمت کی شہادت ہوتی ہے۔ یہ اعلان یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اللہ نہ صرف بڑا ہے بلکہ تمام قابلِ فہم و تصوّر عظمتوں سے کہیں زیادہ عظیم و برتر ہے اور ہر موقع پر "اللہ اکبر" کا اعادہ اور عزو جل کے سامنے کسی بھی انسانی وجود کی بے وقعتی اور کمتری کو ظاہر کر دیتا ہے کہ بڑے سے بڑا جابر بھی اللہ کے جبروت کے آگے ہیچ ہے اور خدا کے سامنے ہر شے حقیر ہے۔ عجائباتِ تخلیق کو دیکھ کر بیک انسان سکتے میں رہ جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ خوفِ خدا کے بغیر تقویٰ بے معنی و بے اصل ہے۔

جب کوئی مسلمان "انشاء اللہ" کہتا ہے تو گویا وُہ تقدیرِ الٰہی پر انحصار سے واقف ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ مستقبل کے لیے کوئی مضبوط اور پائیدار منصوبہ بندی نہیں بنا سکتا، نہ کسی معاملے میں خود کو مستقل طور پہ پابند کر سکتا ہے کیونکہ وُہ اپنی تقدیر کا آپ مالک نہیں۔ ہم کسی اُمید یا آرزو کا اظہار تو کر سکتے ہیں مگر مستقبل میں آنے والے واقعات کے متعلق، جو پردۂ اسرار میں ہیں اور جن کا علم سوائے خُدا کے کسی کو نہیں ہو سکتا، کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ اِن شاء اللہ اور اسی قبیل کے دُوسرے فقرے جو عام گفتگو میں بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں، دراصل نشانِ راہ کی مانند ہیں اور ازل کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ نشان پیدائش سے موت تک کے سفر کا رستہ دکھاتے ہیں اور بے رنگ و بے لُطف جادہ کو نئی جہت عطا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو حُکم دیا گیا ہے کہ وُہ قرآن کی تلاوت میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے۔ اسی طرح جیسے اُسے نماز باجماعت کیلئے دیر ہو جانے کی صورت میں دوڑنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ سکون اور توقّف عطیۂ الٰہی

Marfat.com

ہے اور جلد بازی کا کام شیطان کا ہے۔ اللہ عزوجل نے سورۃ الفرقان میں سچے مسلمان کے یہ اوصاف گنوائے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا

اور وہ کہ جب اِن کو پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو اُن پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ غور و فکر سے سنتے ہیں)۔ (الفرقان (۲۵): ۷۳)

مشہور مفسر علامہ زمخشری نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ وہ (قرآن کو) کھلے کانوں سے سننے اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، قرآن ہر قرآن خوان کے لیے ایک آئینہ ہے۔ اگر کوئی اِس کا مطالعہ غلط جذبے اور غلط اسباب کے تحت کرے گا تو اُسے اِس صحیفۂ نورانی میں کچھ نہیں ملے گا۔ اِسی طرح اگر کوئی سطحی انداز میں اِس کا مطالعہ کرے گا تو اُسے اِس میں سطحی باتیں ہی ملیں گی اور غواص کو گوہرِ آبدار ـــــ جو اِس کی تلاوت غرور و خود پسندی کے جذبات سے کرے گا تو اُسے اِس اکڑ اور خود پسندی کی "حمایت" اس میں نظر آئے گی (کیونکہ یہ کہاوت سچ ہے کہ آسمانی صحیفے کا حوالہ تو شیطان بھی دے سکتا ہے) اور اگر کوئی اِس کی تلاوت ذاتی مفاد یا لالچ میں کرے گا تو اسے اِس کا تلخ پھل ملے گا۔

مولانا جلال الدین رومی (وفات ۱۲۷۳ء) نے اِس کتابِ مبین کو ایک ایسی عروس سے تشبیہ دی ہے جو اپنا گھونگھٹ کسی درشت خو، ڈھیٹ عاشق کے سامنے اُٹھانا پسند نہیں کرتی! اور سب سے ڈھیٹ قسم کے عشاق وہ ہیں جو اِس کی گہرائیوں میں کسی محنت شاقہ اور صبر و انکسار کے بغیر اُترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ محض استعارہ نہیں کہ قرآن کو "جیتنا" ہو تو اس کو مسلسل پرچانا پڑتا ہے۔ وہ لوگ جو علم سے بہرہ یاب نہیں اور فرطِ عقیدت میں اس کی آیات کا تعویز بنا کر گلے میں پہن لیتے ہیں یا اِسے محبت سے چوم لیتے ہیں، سطحی مطالعہ کرنے والے سے زیادہ حقیقت کے قریب ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ عزوجل نے آدم و حوّا کے جنت سے نکالے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

Marfat.com

"وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

"تب ہم نے حکم دیا کہ (بہشتِ بریں سے) چلے جاؤ تم ایک دُوسرے کے دُشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے (اور معافی مانگی) تو اس نے اُن کا قصور معاف کر دیا بیشک وُہ معاف کرنے والا (اور) صاحب رحم ہے۔ ہم نے فرمایا کہ تُم سب یہاں سے اُتر جاؤ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اُس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وُہ غم ناک ہوں گے۔" (البقرہ (۲) ۳۶ - ۳۸)

اب اِس ہدایتِ خداوندی کے حصول یا اس سے استفادہ کرنے کی شرط یہی ہے کہ ہم اپنی مجبوریوں سے آگاہ ہوں اور اِس حقیقت سے واقف ہوں کہ زندگی کے اِس بے حد و بے حساب وسیع میدان میں صرف انسانی صلاحیتوں کے وسیلے سے اپنی راہ متعین نہیں کر سکتے۔ مسلمان (اور زمانۂ قدیم کے عیسائی) بدیہی طور پر جانتے تھے کہ قوتِ استدلال اور منطق اُس وقت کارآمد ہیں جب کوئی مسئلہ سامنے ہو، جو اوّل اوّل خالق نے پیش کیا مگر یہ کہنا کہ جدیدیۂ فکر، فلسفے اور نظریہ سازی کی سبک سری ظاہر کرتا ہے جو خلا میں اپنا وظیفۂ عمل جاری کر سکنے کی خام خیالی میں مصروف رہتے ہیں اور صرف طبعی ماحول کے "حقائق" سے سروکار رکھتے ہیں (بشرطیکہ وُہ حقائق ہوں)۔ عقل، علم کا سرچشمہ نہیں بلکہ یہ تو علم کا ایک آلہ ہے۔ اس کی اپنی ذات میں کوئی ایسی حرکی قوت مضمر نہیں ہوتی کہ خود بخود کام کرنے لگے (ڈیکارٹ کا جملہ ملاحظہ ہو "میں سوچتا ہوں اس لیے مَیں ہوں") یہ اسی مواد پر کام کرتی ہے جو کہیں اور ہی سے موصول ہُوا ہو۔ یہ مواد وحی، وجدان یا حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ کہنے کے لیے کہ بیان "ب"، دُرست ہے اس لیے اس

Marfat.com

کا نتیجہ "ج" نکلنا چاہیے، پہلے "ب" کا ہونا ضروری ہے۔ یہ اصرار کہ عقل اسی صورت میں دُرست سمجھی جا سکتی ہے جب وُہ اس عالم کے مشہود مظاہر پر عمل کرے، اسے بلا جواز محدود کر دینا ہے۔

وحی اور عقل کے مابین تنازعہ جو اکثر اوقات اُبھر کر سامنے آتا ہے بے معنی ہے۔ عقل کو حواسِ خمسۂ ظاہری کے بجائے مافوق الفطرت ذرائع سے خبر ملے تو وُہ کوئی علیحدہ چیز نہیں بن جاتی۔ وُہ تو ہر حالت میں وہی قوت رہتی ہے۔ اس کا وظیفہ تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ چاقو اشیاء کو کاٹنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اگر اس کے کاٹنے کے لیے کوئی چیز فراہم نہ کی جائے تو وُہ استعمال نہیں ہو سکتا۔ عرفِ عام میں ہم جسے عقلیت پرستی کہتے ہیں اس کا تعلق عقلِ محض سے کم ہی ہوتا ہے۔ وُہ صرف اس مفروضے پر قائم ہے کہ جو اشیاء حواسِ خمسہ کی مدد سے دیکھی جائیں صرف وہی حقیقی ہیں صرف انہی کو معقولیت پسندی کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ یہ خیال اپنی جگہ غیر معقول ہے۔

اب حقیقت یہ ہے کہ عقلیت پرستی کے ضمن میں جو سب سے بڑا مسئلہ نزاعی ہے وُہ یہ یقین ہے کہ جو اطلاعات ہمیں اپنے حواسِ طبیعیہ کے ذریعہ موصول ہوتی ہیں وُہ حتمی اور ناقابلِ اعتراض ہیں اور یہ ایقان جسے محض خوش فہمی کہا جا سکتا ہے، آج کے جدید اذہان میں بھی جُوں کا توں راسخ ہے، حالانکہ اس صدی میں سائنس نے عرفِ عام میں "ٹھوس مادّے" کا نظریہ باطل کر دیا ہے۔ رینے گینوں (Rene'Gue'non) اسی ذہنی رویّے کو (یا اُس انداز کو جس سے دُنیا کو دیکھا جاتا ہے) "انجمادِ عالم" کا نام دیتا ہے جسے ہم اس دورِ آخر میں مشاہدہ کر رہے ہیں[1]۔ شاید ہمارے دَور میں ایمان کی طرف پہلا قدم کامل تشکیک ہے جس کا زہر جھوٹے اعتقادات کو گلاتا رہتا ہے اور ہمیں یہ یقین دلاتی رہتی ہے کہ ہم ایک ایسے بحرِ ذخّار کے تیراک ہیں جن کی موجیں لحظہ بہ لحظہ رنگ بدلتی ہیں اور جہاں ہمارے عافیت طلب ہاتھوں کو سہارے

---

1. The Reign of Quantity or the Sign of Time, Rene' Gue'non, Luzac & Co., London.

Marfat.com

کے لیے تنکا تک میسّر نہ ہو۔ یہ حقیقت کہ کیا عارضی اور چند روزہ ہے اور کیا ازلی اور ابدی، اُسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم واقعیؑ "سمندر" میں اُتر جائیں۔

اسلام پر غور کرتے وقت، نہ صرف اس کی منفرد اور خود کفیل حیثیت سے بلکہ دوسرے مذاہب سے موازنہ کرتے وقت بھی یہ ضروری ہے کہ ایک سوال اٹھایا جائے جس کا جواب کچھ ایسا آسان نہیں۔ وُہ سوال یہ ہے کہ قرآن کس نے نازل فرمایا۔ دُوسرے لفظوں میں اِس سوال کے بطن سے استفسار بھی اُبھرتا ہے: کیا مسلمان عیسائیوں کی طرح کسی "خُدا" پر یقین رکھتے ہیں؟ اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ اس پر منحصر ہے کہ ہم 'ذاتی' سے کیا مراد لیتے ہیں تو یہ بات کسی حد تک درست کہی جا سکتی ہے؛ تاہم اس سے ہمیں زیادہ مدد نہیں ملتی۔ قرآن نازل کرنے والا اللہ عزوجل ہے جس کی کُنہ کسی نوع یا درجے کے انسانی خیال میں نہیں سما سکتی، زبان ولسان کا تو ذکر ہی کیا۔ وصف تو صرف مخلوقات کا بیان ہو سکتا ہے، جب کہ اللہ تو خود خالق ہے۔ جو چیز اُس نے خود اپنے "ہاتھوں" سے بنائی ہو (یاد رہے کہ یہاں لفظ "ہاتھوں" محض استعارہ ہے) وُہ بنانے والے کا احاطہ کیسے کر سکتی ہے؟ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے جو اسمائے حُسنہ دیے ہوئے ہیں وُہ محض اِس کی صفات اور مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ اس کی ذات کی کُنہ و ماہیت کے بارے میں وُہ کچھ نہیں بتا سکتے۔ وُہ خود اپنے متعلق فرماتا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

(اور وُہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اُس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وُہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اور وُہ بھید جاننے والا خبردار ہے۔ (الانعام (۶): ۱۰۳)

قرآن کا ایک پہلو جس میں غیر مسلم بہت اُلجھن محسوس کرتے ہیں باری تعالیٰ کے لیے اسمائے ضمیر کا استعمال ہے۔ خالق ارض وسمٰوات اس میں خود اپنے لیے 'مَیں'، 'ہم'، اور 'وُہ' کا لفظ استعمال کرتا ہے اور اسمائے ضمیر میں بالعموم تداخل ہو جاتا ہے۔ اللہ قرآن مبین میں اپنے متعلق فرماتا ہے:

اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (النحل (۱۶): ۵۱)

Marfat.com

معبود وہی ایک ہے تو مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

اسمائے ضمیر تو فانی اشیاء کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ہم کوشش کر کے "اُسے" ایک قابلِ فہم تصور تک لاتے ہیں اور "اُس" کی کوئی جامع صفت تسلیم کرنے پر رضامند ہو جاتے ہیں تو وُہ ہم سے پہلو بچا جاتا ہے مگر وُہ ہمیں استعاروں کے ذریعے اپنا آپ سمجھنے کی اجازت بھی مرحمت فرماتا ہے، چنانچہ ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے۔ خُدا اپنے متعلق فرماتا ہے:

"میں ایسا ہوں جیسے میرا بندہ مجھے سمجھتا ہے اور جوں ہی وُہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہو جاتا ہوں"۔ اِس کا ایک متبادل ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ "میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں۔ اور جیسے ہی میرا نام اِس کے لبوں سے نکلتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں"۔

اُندلس (اسپین) کے عظیم صوفی بزرگ ابنِ عربی نے اس معاملے میں ایسی جرأت کا مظاہرہ کیا جس نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو چونکا دیا تھا۔ اِن کا کہنا تھا کہ درحقیقت عام مومن جس کی عبادت کرتا ہے وُہ اِس کا خود ساختہ ہیولا ہوتا ہے اور یہ خُدا کا کرم اور رحمت ہے کہ وُہ اِس ہیولے میں داخل ہونا قبول کر لیتا ہے۔ ابنِ عربی کا یہ بیان عام مسلمانوں کے لیے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو، اس میں کلام نہیں کہ اِس نے حق تعالیٰ شانہٗ کو قابلِ پرستش بناتے ہوئے "بے نام" رکھنے کی سعی کی ہے۔ کسی مغربی غیر مسلم کے لیے، جسے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ذاتِ الٰہی کے تمام تصورات (جس میں خود "خُدا" کا تصور شامل ہے) اپنے ذہن ہی کا انعکاس ہیں، ابنِ عربی کا یہ بیان موجب بصیرت ہو سکتا ہے۔

اسلام میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خُدا کوئی شخص نہیں، کیونکہ ایسا کہنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ وُہ کسی لحاظ سے اس سے بھی کم تر ہے کہ تشخص سے بھی عاری ہو۔ شخصی اور ورائے شخصی، دونوں کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تسمیہ (کچھ چیزوں میں خدائی جلوہ دیکھنے) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ذاتِ باری کی کارفرمائی کا کنایہ یا استعارہ ہے۔ بہرحال اشارے کنائے اور تفصیل و تشریح میں بڑا لطیف مگر اہم فرق ہے۔ یہی بات قرآن پاک

Marfat.com

کی اُن آیات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جن میں خُدا کے "سمیع" و "بصیر" ہونے کا حوالہ آتا ہے۔ وہاں معاً ہمارا دھیان اپنی بصارت اور سماعت پر جاتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے یہ حواس خُدا کے مقابلے میں کتنے ہی ضعیف اور کمتر کیوں نہ ہوں، یہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ عنصر فطرتِ ازلی کا رکھتے ہیں اور اُنھیں خُدا کی اعلیٰ صفات کا انتہائی دھندلا عکس ہی کہنا چاہیے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ اندھیری رات میں کسی چٹان کے نیچے چیونٹی کو دیکھتا ہے جب کہ ہم صرف اس شے کو دیکھ سکتے جو ہماری نظروں کے سامنے ہو جن کی حدِ بصارت مختصر ہے۔ وُہ مالک الملک ہر چیز کی ہلکی سی سرسراہٹ تک سنتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وُہ اپنی مخلوق کے دلوں کے راز سے بھی باخبر ہے جب کہ ہم محض اُن آوازوں کو سُنتے ہیں جو خاصی اُونچی ہوتی ہیں۔ ہمیں یہ حواس اس لیے حاصل ہیں کہ وُہ خود ان کا مالک ہے لیکن یہ اتنی محدود اور کمتر حالت میں ہمارے پاس ہیں کہ محض عطائے خُدا ہی کے مدِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ ہم دیکھتے اور سُنتے ہیں۔ اسی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ افضل طور پر "شخص" ہے جس کے سامنے ہمارا اپنا تشخص ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہونے لگتا ہے۔ یہ محض اِس الرحم الراحمین کا کرم اور رحمت ہے کہ وُہ ہمیں اپنے لیے 'میں' کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرماتا ہے۔

مسلمانوں کی نظر میں عیسائیت میں ذاتِ باری کو شخصی رنگ دیا گیا، حتیٰ کہ اسے انسانی روپ میں اس حد تک پیش کیا گیا ہے کہ اِس کی تجسیم پورے مذہب پر حاوی ہو گئی ہے۔ ذاتِ الٰہی کا تصوّر تو ارفع اور اعلیٰ ہے مگر اعلیٰ خیالات بعض اوقات بھونڈے پن کی حد تک سہل بنا دیے جاتے ہیں اور عیسائیت میں مجاز کو حقیقت سمجھنے سے ہی اِس جدید دَور میں لا ادریت اور بے یقینی پیدا ہوئی ہے۔ مغرب میں جب کوئی انسان یہ کہتا ہے کہ خُدا مجھ سے محبّت کرتا ہے' تو اِس کا تصوّر یہی ہوتا ہے کہ جس طرح انسان، انسانوں سے محبّت کرتے ہیں اِسی طرح خُدا جو کسی ناقابلِ تصوّر مقام پر ہے، انسانوں سے محبّت کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وُہ زیادہ صاحبِ جبروت ہے۔

Marfat.com

اور جب یہ سمجھ لیا جائے تو لامحالہ پھر یہ سوال بھی ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ جب وُہ ہم سے محبت کرتا ہے تو پھر اُس نے انسانوں کو دُکھ اور تکلیف میں مبتلا کیوں کیا ہے، اور اگر وُہ قادرِ مُطلق ہے تو پھر اس نے ایک مطمئن اور آزار سے خالی دُنیا کیوں تخلیق نہ کی؟ یقیناً جس سطح سے یہ سوالات کیے جاتے ہیں اِس کے مطابق اُن کے جوابات نہیں دیے جاسکتے۔

اب دُوسری طرف مسلمان ہیں جو ذاتِ باری تعالیٰ کو بہت ہی سادگی سے ایک عظیم باجبروت بادشاہ کا رُوپ دیتے ہیں۔ وُہ جو چاہتا ہے ناپدید اسباب سے کرتا ہے اور اس کی مرضی میں کسی کو دَم مارنے کی مجال نہیں، نہ اس سے وجہ پوچھی جاسکتی ہے۔ یہ خیال بھی خُدا کو ایک شفیق اور محبت کرنے والے "باپ" کے رُوپ میں دیکھنے کے مقابلے میں کم ناقص نہیں۔ لیکن عملاً یہ تصوّر ہم عصر عیسائی تصوّر کے مقابلے میں دین کی صحت کے لحاظ سے کہیں زیادہ سُودمند اور کارگر ہے۔ جو کچھ بھی کہا جائے، بات وہیں آکر رکتی ہے کہ خُدا کا جو بھی تصوّر ہم اپنے اذہان اور قلوب میں تراشیں (جو انسانی ضرورتوں پر پُورا اُترتا ہو) ناکافی اور اہلِ تشکیک کے حملوں کی تاب نہیں لاسکتا۔

اب یہ پُوچھنے کے بعد کہ قرآن کس ہستیٔ عظیم نے نازل فرمایا، ہمیں یہ پوچھنے میں بھی باک نہ ہونا چاہیئے کہ یہ فرقانِ عظیم کس پر اُتارا گیا ہے؟۔ اور اس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ قرآنِ حمید میں فرماتا ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اِس کو دیکھتے کہ خُدا کے خوف سے دَبا اور پھٹا جاتا ہے اور یہ باتیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وُہ غور کریں۔ (الحشر (۵۹): ۲۱)

لیکن یہ قرآن پہاڑوں پر نہیں ایک انسان پر اُتارا گیا تھا اور وُہ ریزہ ریزہ نہیں ہُوا کیونکہ اس کلامِ الٰہی کا امانت دار بننا اِس کا مقدر ہوچکا تھا۔ الہام و القا تو انسان

Marfat.com

کو "رقیق" اور "نرم" حالت میں رکھتا ہے۔ جب کہ وحیٔ الٰہی ایک برہنہ طاقت ہے، یعنی عام شہود میں حقیقت کا نزول ہے۔ نوعِ انسان کا دُوسری تمام مخلوقات سے امتیاز واضح طور پہ یہ ہے کہ جب بارِ گراں کا کوئی اور متحمل نہ ہو سکا وُہ بار تنہا انسان نے بغیر ریزہ ریزہ ہوئے اُٹھالیا۔

اور یہ تو اِس بارِ عظیم کا صرف ایک پہلو ہے کہ انسان نے یہ بوجھ کسی خُدائی حکم کے دباؤ میں نہیں اپنی رضا اور منشائے آزاد سے قبول کیا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (احزاب (۳۳): ۷۲)

ہم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو اُنھوں نے اُس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور اُس سے ڈر گئے۔ اور انسانوں نے اس کو اُٹھالیا۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

پہاڑ مضبوطی اور استقامت کے آئینہ دار ہیں۔ جو اوصاف اُنھیں تخلیق کے وقت کردگارِ حقیقی نے ودیعت کئے تھے اِن میں وُہ کامل ہیں۔ اِسی طرح زمین اپنی تمام تر نیرنگی اور بُوقلمونی کے ساتھ اُن قوانینِ قدرت کی تابعداری کرتی ہے جو اِس کی فطرت میں رکھ دیے گئے اور افلاک بھی، خواہ وُہ خلا کا نیلگوں دُھندلکا ہوں یا مسکنِ ملائک مشیت اور ارادہ الٰہی کے تابع فرمان ہیں اور اپنے دائرۂ کار سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ جس بارِ اُمانت، کا ذکر قرآن حمید میں آیا ہے اُس کی ماہیت اور اصلیت کے متعلق اختلافِ آراء پایا جاتا ہے؛ تاہم عمومی سطح پر اس سے یہی مستنبط ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اِنسان کی ان صفات سے ہے جو اُسے دیگر تمام مخلوق پر شرف بخشتی ہیں جیسے خود شعوری، نسبتاً آزاد ارادہ، خیر و شر کے درمیان امتیاز کی صلاحیت؛ مزید برآں اِس کی وُہ آگہی جس کی کوئی حد نہیں۔ یہ امتیازی اوصاف ہیں جو دیگر مخلوقات کے مقابلے میں اِنسان کے لیے بنائے فضیلت ہیں۔ پس اللہ عزّ و جل نے اُس حیوانِ ناطق کو جو دیدۂ بینا اور صلاحیتِ اختیار رکھتا تھا،

Marfat.com

اور بنا بریں خیانت و خطا کاری کا اہل بھی تھا، اس بارِ عظیم کا حامل بنانا منتخب فرمایا۔ اسی لیے اُسے وحی کا اہل سمجھا گیا اور اُسے اپنی ذات اور وجود کے قوانین سے آگاہ کیا گیا، اور یہ آگہی جانوروں جیسی نہیں تھی جو محض جبلت کے سہارے وظائفِ اعمال معمولہ ادا کرتے ہیں بلکہ یہ آگہی خاص ہدایتِ ربّی کے تحت تھی جس کو آزادانہ انداز میں قبول یا نظر انداز کرنے کی قوت بھی اُسے ودیعت کی گئی تھی۔

انسان جب اس امانت میں خیانت کرتا ہے تو گویا عہد شکنی کرتا ہے۔ اسلام کی زبان میں یہ عہد "روزِ الست" کو کہا گیا، قرآن مبین میں آتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ (اعراف (۷): ۱۷۲)

"اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی اِن کی پشت سے ان کی اولاد نکالی تو اِن سے خود ان کے مقابلے میں اقرار کرا لیا (یعنی ان سے پُوچھا کہ) کیا مَیں تمہارا پروردگار نہیں ہُوں؟ (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ) وُہ کہنے لگے کیوں نہیں، ہم گواہ ہیں (کہ تُو ہمارا پروردگار ہے)"

اِس یاددہانی کے اسباب بیان کر کے یہ مضمون یُوں ختم ہوتا ہے کہ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ (۷: ۱۷۲-۱۷۳)

"(یہ اقرار اس لیے کرایا تھا) کہ قیامت کے دن (کہیں یوں نہ) کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر ہی نہ تھی، یا یہ (نہ) کہو کہ شرک تو پہلے ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو اِن کی اولاد تھے جو اُن کے بعد پیدا ہوئے۔"

دُوسرے لفظوں میں یُوں کہیے۔ کہ ہماری فطرت ہی میں توحید اور خُدا کی عبدیت کا عنصر موجود ہے اور ہم شعوری زندگی کے آغاز سے قبل ہی خود کو اس کا پابند کر چکے ہیں۔ قرآن مبین کا ایک معتد بہ حصہ اُن قصص پر مشتمل ہے جن میں کفر و ایمان کی کشمکش یا اِن لوگوں کے مابین آویزش دکھائی گئی ہے جو وعدۂ الست کے با اخلاص پابند یا منکر

Marfat.com

تھے۔ قرآنی قصص میں ہم ایک طرف سرور کائنات صلعم کو مکّے کے مشرکین کے مقابلے میں مسلسل نبرد آزما دیکھتے ہیں اور دُوسری طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے ہو گزرنے والے ان اسرائیلی اور عرب پیغمبروں کا ذکر دیکھتے ہیں جو کتاب اللہ کا تحفہ اپنی قوم کے لیے لائے تھے اور ان کی قوم نے رُوگردانی کی اور انبیاءؑ کو ایذائیں اور تکلیفیں پہنچائیں قرآن مجید نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل کی قدم قدم پر رہنمائی کی گئی، خُدا کس طرح انبیاء سے ہم کلام ہوا اور کس طرح بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کے باوجود اُن پر نعمتیں نازل ہوئیں۔ اس تفصیل کے مقابلے میں دُنیا کی ساری تاریخ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

ایک مسلم مؤرخ کے متعلق تعجب سے کہا جاتا ہے کہ اُس نے حضرت یوسفؑ کے قصّے پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کر دیے جب کہ عروج و زوالِ رُوما کی داستان کے لیے گنتی کے چند صفحات مخصوص کیے۔ اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو مسلم مؤرخین کی ترجیحات دل کو لگتی ہیں کیونکہ انسانیت کی حقیقی تاریخ اخبار کی شہ سرخیوں، یا ان واقعات سے جو ان سرخیوں کو جنم دیتے ہیں، غرض نہیں رکھتی۔ ایک تاریخ ایسی بھی ہے جس پر توجہ نہیں دی جاتی اور جس کے وقائع درج نہیں ہوتے مگر وُہ روزمرّہ کے سانحات و واقعات سے بڑھ کر مؤثر ہے، کیونکہ ایسے واقعات تو پادرِ ہوا ثابت ہوتے ہیں۔ بھلا آج کون اسباب کو اہمیت دیتا ہے کہ فلاں فلاں بادشاہ اتنی مدّت جیا پھر مر گیا؟ جب کہ پیغمبروں اور رسولوں کی داستانیں زمانی قیود سے بے نیاز ہوتی ہیں، اور قرآن نے انھیں اس خیال سے بیان کیا ہے۔ اس میں زمانی تقدیم و تاخیر کا لحاظ نہیں رکھا گیا، اور یہی بات مغرب کے مستشرقین پر گراں گزرتی ہے۔

یہ لوگ اس بات سے بھی مضطرب ہوتے ہیں کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اُمّی تھے، دُوسری طرف قرآن میں قدیم اساطیر اور داستانیں بھی دی گئی ہیں جن میں سے کچھ وُہ ہیں جن کا اِس سے پہلے انجیل میں ذکر ہو چکا ہے اور یہ عرب تمدّن اور ثقافت کا حصّہ تھیں۔ مغربی مستشرقین ایک غلط مفروضہ یہ قائم کر

Marfat.com

لیتا ہے کہ یا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلومات براہ راست خدا سے حاصل ہوئیں یا پھر اُنھوں نے اپنے زمانے کے ماحول اور روایتوں سے اخذ کیں۔ قرآن اس سلسلے میں یہ کہتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ (ابراہیم (۱۴): ۴)

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ انہیں (احکام خدا) کھول کھول کر بتا دے۔

یہاں "زبان" کی اصطلاح بہت وسیع معنی رکھتی ہے اور یہ محض ایک مجموعہ الفاظ نہیں جو کسی زمانے میں کسی قوم میں مستعمل تھے۔ اس میں بے شمار امثال اور پیکرِ خیال بلکہ پورا تمدن شامل ہے جس سے لوگ شناسا تھے کہ صرف اسی طرح لوگوں کو پیغام الٰہی کا صحیح ادراک ہو سکتا تھا۔ انجیل میں مرقوم داستانوں کے ساتھ عربوں کی کچھ روائتی قصص بھی شامل ہیں، جیسے ہودؑ اور صالحؑ وغیرہ کی کہانیاں، جو اُس ماحول کا حصہ تھیں، جس میں قرآن کا پیغام جاگزیں ہوا۔ جس طرح وحیٔ الٰہی نے ابلاغ عام کی خاطر، مبہم اور نوساختہ زبان استعمال کرنے کی بجائے عام اور مروّج الفاظ استعمال کیے ہیں، اسی طرح اس نے ان تمثیلی کہانیوں کا استعمال بھی کیا ہے جو انسانی اذہان کے ذخائر میں اِس وقت موجود تھیں۔ کسی بھی مذہب میں یہ قول بدیہات کا درجہ رکھتا ہے کہ خدا اسی مواد (یعنی اساطیر و اسالیب) سے کام لیتا ہے جو ایک خاص دَور کے ماحول میں دستیاب ہوتا ہے، تاہم یہ مواد اسی کا تخلیق کردہ ہوتا ہے، جس نوع اور حالت میں قرآن مجید دُنیا میں موجود ہے، (اگرچہ اِسے مخلوق نہیں کہا جا سکتا) اس کی ترتیب یقیناً اس ماحول کی نسبت سے ہوئی جس میں اس کا ابلاغ مقصود تھا۔ اس کی مثال عین اسی طرح ہے جیسے رُوح، پیکرِ انسانی میں داخل ہونے کے بعد اپنا پیرہن انہی مادی اور نفسیاتی تاروں سے بنتی ہے جس سے اس کا پیکر بنا ہوا ہے۔

خالقِ اعلیٰ کا مقصود و منشا انسانیت کی حفاظت اور خبردار کرنا ہے، تاریخی اطلاعات فراہم کرنا نہیں، چنانچہ اِس بات کی تصریح قرآن مُبین یوں کرتا ہے:

Marfat.com

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ
فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (ہود (۱۱) : ۱۲۰)

"(اے محمدؐ) اور پیغمبروں کے وُہ سب حالات جو ہم تم سے کرتے ہیں ان سے ہم تمہارے دل کو قائم رکھتے ہیں اور ان قصص میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا اور (یہ) مومنوں کے لیے نصیحت اور عبرت ہے۔"

دُوسرے لفظوں میں یُوں کہیے کہ اِن قصص سے مقصود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو ملنے والے پیغام کی توثیق اس اعتبار سے تھی کہ اس میں تسلسل برقرار ہے، اور یہ اظہار بھی کرنا تھا کہ اِن میں کوئی تعجب خیز یا دور از کار بات نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس میں حضورؐ سے پہلے ہو گزرنے والے پیغمبروں کو پیش آنے والے شدائد اور تکالیف بھی یاد دلائی گئی ہیں اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ تاریخ کے ہر دَور میں انسانیت نے حق سے رُوگردانی کی اور "امانت" کا حق ادا کرنے میں ناکام رہی۔

جناب محمد اسد لکھتے ہیں: "اس بات پر زور دینا تحصیل حاصل ہے کہ قصص اور داستان سرائی قرآن کا مقصود نہیں۔ وُہ جب بھی ماقبل اسلام کے پیغمبروں کے احوال یا قدیم تاریخی کہانیوں، واقعات، یا قبل از نبوت حضرت پیغمبرِ اسلام کے عہد کے واقعات کا حوالہ دیتا ہے تو اس کا مقصد وحید اخلاقی سبق آموزی ہی ہوتا ہے اور چونکہ ایک ہی واقعے یا داستان کی کئی تعبیریں کی جا سکتی ہیں جن سے کئی اخلاقی مفہوم برآمد ہو سکتے ہیں، اس لیے قرآن مُبین اِن حکایات اور داستانوں کو بار بار دہراتا ہے اور ہر بار بنیادی حقیقت کے مختلف گوشوں کو روشن کرتا ہے جو من حیث المجموع وحیِ قرآنی کا نکتۂ ماسکہ ہے[۱]۔" کسی اور مقام پر وُہ فرماتے ہیں: "ان قصص میں پوشیدہ "تہہ در تہہ حقیقت"، بالعموم روحِ انسانی میں موجود گہرائیوں اور اُلجھنوں سے تعلق رکھتی ہے[۲]۔"

---

[۱] The Message of Qur'an از محمد اسد ص ۳۲۱

[۲] محولۂ بالا کتاب محمد اسد ص ۵۷۶

Marfat.com

قرآن فلسفے کی کوئی کتاب نہیں، تاہم یہ فلسفے کے منبع اور مصدر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ نفسیات کا کوئی رسالہ نہیں مگر اس کی کنجی کہا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے ہی نقطۂ نظر سے جو محمد اسد سے مختلف مگر اس کے خیال سے مطابقت رکھتا ہے۔ سید حسین نصر لکھتے ہیں کہ تاریخی اصطلاحات میں لپٹا ہوا پیغام الٰہی "انسانی رُوح سے مخاطب ہے۔" وُہ منافق جو مذہب کے سلسلے میں جھوٹ پھیلا کر لوگوں میں فرقہ بندی کرتا ہے یا وُہ شخص جو راہ سے بھٹک گیا ہے یا وہ متّقی جو صراطِ مستقیم پر قائم ہے، مقدس تاریخ کے کردار ہیں جو قرآن نے بیان کیے ہیں اور یہ نفسِ انسانی کے اندر مختلف قوتوں کے نمائندہ ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن انسان کے وجود ارضی کی عظیم تفسیر ہے۔[1]

ایک سوال یہ بھی اُٹھایا جا سکتا ہے کہ قرآن میں کافروں کے متواتر ذکر سے قرونِ وسطیٰ کا کوئی مسلمان کیا تاثر لیتا ہے؟ اگر وُہ کافروں کی نفسیات سے آگہی نہیں رکھتا (کیونکہ اس دَور میں شاید ہی یہ "مخلوق" اُسے نظر آئی ہو) تو وُہ یقیناً یہی سمجھتا کہ ایسے لوگوں کا سرے سے کوئی وجود ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ہمارے موجودہ دور ہی میں کسی سیّاح کی ملاقات عرب کے کسی دُور افتادہ مقام میں کسی بدّو سے ہُوئی تو اُس نے باصرار یہ کہا کہ دُنیا میں ہر شخص مسلمان ہے۔ اُسے قطعاً یہ اندازہ نہیں تھا کہ اِس کرۂ ارض پر کہیں نہ کہیں عیسائی اور لادین بھی بستے ہیں!

وُہ مسلمان جو اِس ہدایت قرآنی کے مطابق "تدبّر" اور "تفکّر" پر عمل پیرا ہیں جانتے ہیں کہ خود اِن کے اپنے نفس میں کئی طرح کے کافر بستے ہیں جن کے خلاف اُنہیں مسلسل جہاد کرنا ہے۔ اگر وُہ یہ قائمی ایمان اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ایک عیسائی "شکوک" کی بات کرتا ہے اور بعض اوقات اُنھیں قابلِ احترام بھی سمجھتا ہے وُہ پوچھتا ہے کہ کیا تمام آراء لائقِ تعظیم نہیں ہوتیں؟ جب کہ ایک مسلمان اُنہیں شیطان کی سرگوشی یا دُوسرے لفظوں میں "وساوس طاغوت" قرار دیتا ہے۔ جس کی عادت ہی بقول قرآن

---

1. Syed Husain Nasr, Ideals and Realities of Islam,; p.51

Marfat.com

الَّذِی یُوَسْوِسُ فِی صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ (النّاس (۱۱۴) : ۵)
جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ ایک شب جب نبی اکرمؐ اپنے بستر سے کچھ وقفے کے لیے اُٹھ کر باہر گئے تو میں بے حد پریشان ہوئی اور پھر واپس آئے تو آپؐ نے مجھے سخت مضطرب پایا اور پوچھا: "کیا بات ہے؟ کیا تم رشک و حسد میں مبتلا تو نہیں ہو گئیں؟ اس پر میں نے کہا: "مجھ سی کوئی عورت آپ سے انسان کے معاملے میں رشک و حسد میں مبتلا ہو تو کیا عجب!" اس پر آپؐ نے فرمایا: "پھر تو تمہارا شیطان تمہارے اندر داخل ہو گیا" اس پر میں نے پوچھا: "یا رسول اللہ! کیا میرے اندر ایک شیطان ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "ہاں ہے"۔ اس پر میں نے پوچھا کیا آپؐ کے اندر بھی ایک شیطان ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "ہاں، لیکن میرے اللہ نے مجھے اس پر غلبہ پانے میں امداد دی ہے . . ."

احادیثِ نبوی میں یہ باتیں کسی مغربی انسان کو جو عیسائی پس منظر رکھتا ہے، عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔ جب اُسے اسی طرح کی کوئی بات قرآنی آیات میں نظر آتی ہے تو وہ حیران اور مضطرب ہو جاتا ہے، اور پوچھتا ہے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ خالقِ ارض و سماوات وحی کے ذریعے، جس کا مقصد انسانیت کے معظم حصّے کی ہدایت تھی، رسول کی ازواج کو اِن کے فرائض کی تلقین کرے، آپؐ کے مہمانوں کو خبردار کرے کہ وہ ضرورت سے زیادہ رسول کے پاس نہ رُکیں، یا کسی نوعمر لڑکی کی برأت فرمائے جس کے بارے میں کچھ غلط شبہات و شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ یہ آخری مثال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہار کا گم ہو جانا تھی جس پر اتہام تراشی کی گئی اور اس پر بڑی چہ می گوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

احادیث میں اس واقعے کی تفصیل اِس طرح مروی ہے کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم چھٹے سن ہجری میں اپنے لشکر کے ساتھ ایک غزوے سے واپس آ رہے تھے۔ آپؐ نے اپنے واپسی کے سفر میں مختصر وقفے کے لیے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ حضرت عائشہؓ

Marfat.com

حوائجِ ضروریہ سے فراغت کے لیے منزل گاہ سے باہر تشریف لے گئیں۔ جب آپ واپس آئیں تو آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے گلے سے یمنی سنگِ سلیمانی کا ہار غائب ہے۔ آپ اس کی تلاش میں واپس اس مقام تک گئیں جہاں حوائجِ ضروریہ کی فراغت کے لیے تشریف لے گئی تھیں۔ ہار کی تلاش میں خاصی دیر ہو گئی اور لشکر کے کوچ کا وقت آ گیا۔ جن لوگوں نے آپ کی اُونٹنی پر کجاوہ وغیرہ کسا تھا انہیں یہ احساس نہ ہوا کہ آپؓ اس میں موجود نہیں۔ لشکر نے کوچ کر دیا اور آپ پیچھے ہی رہ گئیں۔ لشکر کے چھوٹ جانے پر وُہ ریت میں جا بیٹھیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئیں۔ لشکر کے عقب میں آنے والے ایک نوجوان نے اُنہیں دیکھ لیا اور اپنے اُونٹ سے اُتر کر اس پر اُنہیں سوار کرایا اور تیزی سے اُسے چلاتا ہُوا لشکر سے جا ملا۔

جیسا کہ متوقع تھا، اس واقعے پر زبانیں چل نکلیں اور وُہ لوگ جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر حضرت عائشہ صدیقہ یا اُن کے والد کے اثرات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے خصوصیت سے بہتان تراشنے میں سب سے آگے تھے۔ وُہ معاندانہ جذبات جو اس سے قبل سوئے ہُوئے تھے یک لخت سطح پر اُبھر آئے اور لوگوں نے پیغمبرِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مختلف مشورے دینے شروع کر دیے۔ اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے داماد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا: "اس قسم کی باتیں بہت سے شوہروں کو سہنا پڑتی ہیں اور پھر دُنیا میں دُوسری عورتوں کی کچھ کمی تو نہیں۔" یہ وُہ تبصرہ تھا جسے عائشہ رضی اللہ عنہا نہ بھولیں، اور جس سے بعد میں بڑے تکلیف دہ تاریخی اثرات برآمد ہُوئے۔ خود عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس واقعے سے بُہت غمگین تھیں اور مسلسل روتی رہیں، اور اپنے مؤقف پر سختی سے جمی رہیں۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم آپؓ کے پاس از حد ملول و متفکر تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "مجھے معلوم ہے لوگ میرے متعلق کیا کیا باتیں بنا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی اس کا یقین ہو گیا ہے مگر میرا حال یعقوب علیہ السلام کا سا ہے جنہوں نے فرمایا تھا کہ صبر ہی عمدہ ہے اور اللہ ہی کی امداد و استعانت طلب کرنا چاہیے۔"

Marfat.com

ایک ماہ گزر گیا اور حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نزول وحی بھی نہیں ہوا۔ پھر آخر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو صبر کا اجر مل گیا اور کسی خواب یا رویا کے ذریعے نہیں بلکہ آیاتِ وحی کے ذریعے اللہ نے آپ کی اس اتہام (قذف) سے برأت فرمائی اور الزام تراشیوں کی سخت مذمت فرمائی۔ یہ آیات برأت قرآن مجید کے سورۂ نور میں موجود ہیں جو اس طرح ہیں:

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ
وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ (النور ۲۴: ۱۵)

جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہتے تھے جس کا تم کو کچھ بھی علم نہ تھا اور تم اُسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور خدا کے نزدیک وہ بڑی (بھاری) بات تھی۔

اور اس کے بعد ہی وہ آیات نازل ہوئیں جو بدکاری کے الزام سے متعلق تھیں۔ اور آج بھی شریعت میں اسی طرح زندہ ہیں۔

آپ نے دیکھا اتہام تراشی کا ایک معاملہ جسے اس وقت کے لوگوں نے ایک معمولی بات سمجھا تھا — اور آج بھی زمانہ اور ماحول بدلنے کے باوصف لوگ اس قبیل کی باتوں کو معمولی ہی سمجھتے ہیں — اللہ کے نزدیک کتنی بھاری بات قرار پائی — حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اگرچہ اس معاملے کی حدود کا احاطہ نہ کر سکی ہوں گی جس میں اُنہیں اپنا کردار ادا کرنا باری تعالیٰ سُبحانہٗ کی طرف مقدر کیا گیا تھا؛ تاہم اس اسٹیج پر جو کچھ ہوا انتہائی صاف واضح اور روشن انداز میں ہوا، اور اس کے ایسے عظیم وجلیل نتائج مرتب ہوئے جن کی بناء پر ہمیں متعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ خدائے قدوس نے اس معاملے میں مداخلت فرمائی۔ اس کے پس منظر کی روشنی میں اسلام کے ارتقاء کے سلسلے میں اس کی اہمیت کو نظر انداز بھی ہو جانا چاہئے کہ ایک پندرہ سالہ لڑکی کے گلے کے ہار کو آخر ثوابت وسیار کی تباہی سے زیادہ کیوں اہمیت دی گئی۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہو گی کہ مختلف تہذیبوں اور معاشرتی پس منظر سے

Marfat.com

تعلق رکھنے والے افراد ایک ہی بات کو دو مختلف انداز میں کہیں اور پھر ان کے جداگانہ معنی لیں۔ کوئی مغربی آدمی رات کے وقت آسمان کا مشاہدہ کرتا ہے تو علمِ فلکیات کی رُو سے خلا پر بات کرتے ہوئے بعض اوقات ایک کپکپی کے عالم میں یہ اقرار کرتا ہے کہ وُہ خلا اور زمین کے فاصلوں کے درمیان خود کو انتہائی حقیر اور لایعنی سمجھتا ہے جب کہ مسلمان پہلے ہی اپنے ناچیز ہونے کا اقرار کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ورد سے کر چکا ہوتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ وُہ اِس اجنبی اور بسیط وعریض کائنات میں خود کو تنہا ہرگز محسوس نہیں کرتا اور وُہ یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ قدرتِ الٰہی کی مظہر یہ دُنیا انسان ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے ــــــ مغربی انسان نہایت پرجوش انداز میں اس سے اتفاق کرتا ہے اور بلڈوزر لے کر زمین کی تہیں اُلٹنے پلٹنے لگتا ہے۔

مسلمان قدرت کی عظمتوں اور بیکرانیوں کے درمیان خود کو بونا یا بالشتیا نہیں سمجھتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اُسے زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔ وہ ان مہیب اور بیکراں مظاہرِ قدرت کے سامنے قدم جمائے کھڑا رہتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم قد کاٹھ میں منحنی ہونے کے باوجود ستاروں کو دیکھتے ہیں جب کہ وہ ہمیں نہیں دیکھتے۔ ہم انہیں اپنے شعور میں داخل کر کے اِن کے حجم اور فاصلے کا اندازہ اپنے علم وفہم کے مطابق کرتے ہیں جب کہ وُہ ہمارے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ہم اِن کے مدار میں پہنچ کر اُنہیں تسخیر کر لیتے ہیں جب کہ وُہ اپنے بیکراں وجود کا کوئی اندازہ نہیں رکھتے۔ صرف انسانی شعور ہی اشیاء کے حجم، ہیئت اور وزن کے اندازے لگا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے انسان کو خدا کی آنکھ کہا جا سکتا ہے اور اِس لیے وُہ تمام اشیاء ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ان کا وجود ہمارے شعور اور آگہی میں جاگزیں ہوتا ہے اِس لیے یہ ہمارے وجود ہی کی توسیع ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا کہ یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق کی گئی ہے، اس لیے مسلمانوں کے نزدیک یہ عالم ایک بہت بڑی تصویری کتاب ہے جس کے ذریعے خدائے تعالیٰ اپنے خلیفہ (نائب فی الارض) سے ربط وضبط رکھتا ہے اور اِسی عزوجل کی کوئی خواہش اس تصویری کتاب کو کسی شرارتی بچے کی طرح پھاڑ پھاڑ کر ورق ورق کرنے کی نہیں۔

Marfat.com

قرآن اور مظاہر قدرت، ذاتِ الٰہی کے نمود کے دو انداز ہیں۔ اسلام کے زاویۂ نظر سے یہ بساطِ گیتی اپنی تمام بوقلمونی کے ساتھ ایک ایسی رنگا رنگ چادر ہے جس کی بُنت میں قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ٹکی ہوئی ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ توجّہ ہے کہ "آیات" کا لفظ قرآنی وحی کے جملوں اور مظاہرِ قدرت دونوں کے لیے استعمال ہُوا ہے؛ گویا یہ زمین، آسمان، پہاڑ، ثوابت و سیّار، متواج سمندر، جنگلات اور اُن میں پائی جانے والی زندگی، فطرت کی مقدّس کتاب کی آیات ہی ہیں، اور خدائے تعالیٰ اپنے کلام میں ان کی مثالیں جا بجا پیش فرماتا ہے؛ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ط

"خدا اِس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اُس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے۔" (الشعرا (۲۶) : ۲)

عملِ تخلیق ایک ہی تھا جس کی ذات یکتا و یگانہ نے قرآن اتارا، اُسی نے مظاہر کو تخلیق کیا۔ دونوں ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ رابطہ رکھتا ہے:

وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (الجاثیہ (۴۵) ۴-۵)

"اور تمہاری پیدائش میں بھی اور جانوروں میں بھی جن کو وہ پھیلاتا ہے، یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں، اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں اور وہ جو خدا نے آسمان سے (ذریعہ) رزق نازل فرمایا، پھر اس سے زمین کو اُس کے مر جانے کے بعد زندہ کیا۔ اُس میں اور ہواؤں کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔"

پھر اس عملِ تخلیق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اس جل علا نے مزید فرمایا:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ

Marfat.com

وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (بقرہ (۲) :۱۶۴)

بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دُوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے لیئے رواں ہیں اور مینہ میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اُس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز) کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لیے (خُدا کی قدرت) کی نشانیاں ہیں۔

پھر اِس بات پر مزید زور دیتے ہُوئے فرمایا :

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ (الرعد (۱۳) :۳)

"اور وُہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا پیدا کیے۔ اور ہر طرح کے میووں کی دو دو قسمیں بنائیں۔ وہی رات کو دن کا لبادہ پہناتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔"

اَب ہم حضور کی بیکراں وسعتوں پر نظر ڈالیں یا اپنے اندر اُتر کر دیکھ سکیں۔ پیغام ہر اعتبار سے ایک ہی ہے؛ چنانچہ ارشادِ ربّی ہے :

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (حٰم السجدۃ (۴۱) :۵۳)

"ہم عنقریب اُن اطراف (عالم) میں بھی اور خود اُن کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔ کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے۔"

مغربی شاعری میں عالمِ طبیعی ایک کتاب[1] سمجھا جاتا ہے۔ اب اسے اگر محض خیالی

[1] 'That Universal and Public Manuscript' as sir Thomas Brown Called it.

Marfat.com

یا جذباتی بات نہ بھی کہا جائے تب بھی یہ صرف ایک استعارہ ہی ہے جب کہ کسی مسلمان کے لیے یہ ایک امرِ حقیقت ہے، اسی طرح کی حقیقت جیسے یہ کہا جائے کہ انسان کی دو آنکھیں ایک ناک ہوتی ہے۔ اب یہ ایک جُدا بات ہے کہ قدرت کی نشانیوں کو ہم پڑھ سکتے ہیں یا نہیں ؟ لیکن اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہمارے چاروں طرف محسوس طور پہ بکھری ہوئی ہیں۔ اِسی طرح جیسے صفحۂ کاغذ پہ کوئی تحریر۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز بے معنی نہیں۔ یہ معنی کسی ورق پر بکھرے ہوئے محض الفاظ نہیں بلکہ ایک دُوسرے سے ہمرشتہ و پیوستہ ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا مفید طلب ہوگا کہ قدیم علمِ ہیئت اس مفروضے پر استوار نہیں کہ ستارے اور دیگر اجرام فلکی انسانی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد اِس بات پہ ہے کہ ہم اور یہ ایک ہی تخلیق سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس نمونے کے ایک عنصر کا دُوسرے عناصر سے تعلق ہونا ایک لازمی سی بات ہے، اور یہی چیز ہمیں اس کلیدی تصوّر کی طرف لے جاتی ہے جسے "توحید" کہتے ہیں۔ عام طور پر اسے اسلام کے مترادف بھی سمجھا جاتا ہے۔

"واحد" کا مصدر 'وحد' ہے جس کے معنی بیک وقت 'وحدت' اور "اتحاد" ہیں۔ 'وَحَدَ' کے معنی ہیں وُہ منفرد، یکتا اور یگانہ ہُوا، اور جب 'ح' مشدد ہو یعنی "وَحَّدَ" ہو تو اِس کے معنی ہوں گے، اس نے وحدت یا ایکتائی پیدا کی، یا اُس نے ایک بنایا جب کہ 'واحِد' کے معنی ہیں 'ایک'، اور "وحدانیت" کے معنی ہیں: 'تنہائی، علیحدہ ہو جانا، (اُردو میں یکتائی)، 'مُوَحِّد' کے معنی ہیں خدائے واحد کا ماننے والا، اور 'مُتَواحِد' سے مراد ہے تنہا یا اکیلا — چونکہ اسلام کی بنیادی رُوح خدا کی وحدت ہے اور اس کی مخلوقات کی یگانگت ہے۔ پس بدیہی طور پہ اِس کا مصدر، یعنی 'وحد' جس سے تمام اشتقاقات حاصل ہُوئے، مذہب کی روح اصلی قرار پائے گا۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے جوہر کے اعتبار سے رشتۂ وحدت میں پیوستہ ہُوا ہے اور اس سے اُن طبیعی قوانین سے بھی جن کے یہ تابع ہیں، توحید کی شہادت ملتی ہے۔ ہم سے لا انتہا

Marfat.com

دُور اجرامِ فلکی سے لے کر اجسامِ انسانی تک اور ہر وُہ شے جسے ہم استعمال کرتے ہیں، ایک وحدت میں گُندھی ہوئی ہے۔ مادّے کی اندرونی ساخت کے متعلق خواہ کچھ بھی کہا جائے، اس کی ماہیئت ایک راز ہے جسے عالم الغیب والشہادت ہی بہتر جانتا ہے۔

بدیہی طور پر یہی نظر آتا ہے کہ یہ دُنیائے آب و گل ایک ایسا جامۂ خوش رنگ ہے جو اَن گنت دھاگوں سے بُنا ہُوا ہے اور اس میں تمام جانداروں کی زندگیوں کا انحصار براہِ راست یا بالواسطہ 'سورج' کی روشنی اور بادلوں سے برسنے والے مینہ پر ہے۔ اسی طرح اِن سب کا لمحہ بہ لمحہ زندہ رہنا نورِ خداوندی اور حیات بخش فیضانِ کرم پر منحصر ہے۔ وجودِ حقیقی ایک ہی ہے اِس کے علاوہ جو کچُھ ہے اسی ذاتِ واحد میں شامل ہے اور ایسا کوئی راستہ نہیں جس کے تحت اِس وجودِ حقیقی کا تجزیہ و تقسیم ہو سکے اور اگر بالفعل ایسا ہو بھی جائے تو پھر تقسیم شدہ اجزا 'یک لخت' 'لاشے'، ہو جائیں گے۔ عصرِ جدید کا اِنسان اِسی لیے ہلاکت کی طرف گامزن ہے کہ اس نے اِس کارخانۂ قدرت کا مطالعہ اسی نظر سے کیا ہے، گویا یہاں کی ہر شے علیحدہ علیحدہ درجوں میں منقسم ہے۔

تمام جاندار اور غیر جاندار اشیاء جیسے چٹانیں، مٹی وغیرہ کے وجود میں ہم کیمیائی عمل کا دائرۂ کار دیکھتے ہیں جو سُورج کی حرارت، فضا اور سمندر کے اجزا و عناصر کے باہمی عمل سے جاری و ساری ہے۔ ان سب میں پانی بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اس کا ذکر قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے؛ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (النور ۲۴: ۴۵)

اور خُدا ہی نے ہر چلنے پھرنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا تو اُن میں سے بعضے ایسے ہیں کہ پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ خُدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

Marfat.com

قرآن میں پانی کو اللہ کے کرم، رحمت، زرخیزی اور پاکیزگی کی جاں پرور علامت قرار دیا گیا ہے۔ بادلوں کے بننے اور بارش برسنے تک کا پورا عمل آسمان و زمین کے درمیان ایک عظیم رابطے کا کام سرانجام دیتا ہے[1]۔ رسولِ کریمؐ کے قریبی صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ایک مرتبہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے تھے کہ بارش کا ایک چھالا برسا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا لباس ذرا سا ہٹایا اور آپؐ پر بارش کے قطرے گرے۔ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپؐ نے ایسا کیوں کیا تو آپؐ نے جواب دیا کہ یہ اس لیے کیا کہ یہ پانی ابھی کچھ دیر پہلے اپنے رب کے قریب تھا۔"

پانی نظامِ قدرت میں واحد عنصر ہے جو تین حالتوں، ٹھوس، سیّال اور بخارات میں خود کو تبدیل کر لیتا ہے۔ اس کے اس عمل میں بھی قدرتِ ربّ کا ایک پیغام موجود ہے۔ ہمیں اس کی خنکی بھلی لگتی ہے۔ اس خنکی کے باوصف اس میں حرارت کو جذب کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے۔ کسی جھیل کی ٹھہری ہوئی غیر متلاطم سطحِ آب سکون و طمانیت کی علامت ہے۔ پھر جب یہی پرسکون پانی بارش کے قطرات میں بدل جاتا ہے تو متلاطم سمندر اور سیلاب سے اُبلتے ہوئے دریا بن جاتا ہے۔ مشرق بعید میں تو اسے عاجزی اور انکسار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ پانی بذاتِ خود اگرچہ بے جان ہوتا ہے مگر اس کے بغیر زندگی کا تصوّر ممکن نہیں۔ مسلمانوں کے لیے طہارت کے لیے ضروری ہے جس سے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ اس کا تعلق وضو و غسل سے بھی ہے جو نماز کے لیے فرض ہے۔ پانی کے متعلق ارشاد باری ہے:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (الانبیا (۲۱): ۳۰)

---

[1] اس باب میں مظاہر قدرت اور وحیٔ الٰہی کے تعلق کے سلسلے میں مصنف مسٹر جے، پیٹر ہابسن کے ہنوز غیر مطبوعہ اوراق سے استفادے کے لیے ممنون ہے۔

Marfat.com

"کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے جُدا جُدا کر دیا اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے؟"

اگر سائنس، کے کوئی واضح معنی ہیں (کہ یہ حقیقت اصلی کے ادراک کا علم ہے) تو پھر یہ توحید کی سائنس ہے؛ اور یہ بات پورے دلائل کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ کسی کافر کو طبیعی علوم کے قریب نہیں پھٹکنے دیا جانا چاہیے نہ اُسے اِس سے غرض ہونی چاہیے کیونکہ اس کے پاس اِس تک پہنچنے کی کلید ہی نہیں جس کی وجہ سے اِس کا راہ سے بھٹکنا اور دُوسروں کو گمراہ کرنا یقینی ہے۔ وُہ لوگوں میں یک جہتی پیدا کرنے کی بجائے انتشار و افتراق پیدا کرتا ہے، اور اِس کا خود منتشر دماغ صرف پریشان خاطری کو جنم دیتا ہے۔ اِس لیے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ اِس نے ایٹم، کو پھاڑا جس کے ہولناک نتائج برآمد ہوئے۔ جو لوگ "اصل الاصول" سے واقفیت نہیں رکھتے وُہ اس کے مظاہر کا مطالعہ کس طرح کر سکتے ہیں؟ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـــُٔوْلًا (بنی اسرائیل (۱۷): ۳۶)

اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اِس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل اِن سب (جوارح) سے ضرور باز پُرس ہوگی۔

اگرچہ ہر اُس شے میں جو ہماری نظروں کے سامنے آتی ہے الٰہی نشانیاں موجود ہیں اور ان کے پیغامات اِسی طرح ہم تک پہنچتے ہیں جیسے ہماری دہلیز پر بہتا ہوا کوئی دریا اپنی سطح پر ہمارے لیے پیغام لیے بہہ رہا ہو، تاہم قرآن دُوسری تمام مقدس کتابوں کی طرح مشاہدے کی بات کرتا ہے کیونکہ اسے تو ہر دَور اور ہر زمانے کے لیے صداقت بننا ہے۔ یہ خود کو کسی ایک عہد کے سائنسی نظریات سے کیوں کر باندھ سکتا ہے! ہمارے تجربے کے مطابق اِس کی امثال تو قدرت کے مظاہر ہیں جیسے سُورج کا طلوع و غروب، گنبدِ نیلگوں اور پہاڑ ــــ گویا زمین کے چاروں کھونٹ پتھر رکھ

Marfat.com

دیے گئے ہوں۔ سائنسی مشاہدات، مشاہد کے خیال، ارادے اور اس کے ہاتھوں میں موجود آلات کی تبدیلی کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں، اور ان اخذ کردہ تجربات پر انسانی دماغ کے ظن وتخمین کے عمل کی کشاکش اثر انداز ہو کر نت نئے زاویے اور عجیب وغریب نظریاتی ہیولے تراشنے لگتی ہے مگر اس نظر آنے والی کائنات کے بارے میں انسان کے تجربات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ سورج آج بھی میرے لیے اسی طرح طلوع ہوتا ہے جیسے دس ہزار برس قبل کے کسی انسان کے لیے طلوع ہوتا تھا۔

علامتیت ہمارے تجربات میں آنے والے ان گنت واقعات اور صوری مظاہر میں نظر آتی ہے؛ تاہم اشیاء کے نیچے یا عقب میں آسانی سے نظر نہیں آتی۔ بہرحال یہ قدرت کی میکانیت ہے۔ اس کی مثال ایک کلاک سے دی جاسکتی ہے۔ اس کے سامنے کے رُخ لگی سوئیاں ہمیں وقت بتاتی ہیں، اس کے اندرونی کل پُرزے نہیں۔

الٰہی پیغامات و اطلاعات سے خاطر خواہ آگہی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس عالم رنگ وبُو کا انتہائی قریبی مشاہدہ کریں اور یہ عادت ہمارے دَور کے لوگوں میں تقریباً ناپید ہوتی جارہی ہے۔ جو شخص فطری مناظر اور مظاہر کو اہمیّت نہیں دیتا وہ ایک ایسے ہی شخص کی طرح ہے جو قرآن کی طرف سے کان بند کرلے۔ ایسا شخص نہ صرف اپنے چاروں طرف پھیلی دُنیا سے کٹا ہُوا ہوگا بلکہ اُس کی اپنی ذات کے بھی کئی بخرے ہوں گے۔

مشہور فرانسیسی مصنّف ژاک ایلیل Jacques Ellul جن کی کتاب 'لاٹیکنیک' 'La technique' جدید دُنیا پر ایک انتہائی وقیع اور باشعور تنقیدی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں ایلیل لکھتے ہیں کہ جو کچھ مقدّس ہے وُہ قدرت کے اِس نظام کے زمرے میں آتا ہے جس کے تحت پیدائش، اموات، نسل کی توسیع اور قمری گردشیں وغیرہ عمل میں آتی ہیں۔ انسان اس قدرتی ماحول سے اگرچہ خود کو خاصا علیحدہ کرچکا ہے؛ تاہم اس کے احساسات اور تصوّرات اسی نظامِ قدرت کے پُر تقدیس گردو پیش

Marfat.com

کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں لیکن ان احساسات کو اب تجربات کے ذریعے زندہ اور توانا نہیں بنایا جاتا۔ شہر کا انسان فطرت کی رعنائیوں سے تقریباً کٹ چکا ہے اور اس کے نتیجے میں قدرت کے مقدس مظاہر سے تجربات کا ربط باقی نہیں رہا۔ شہری اور تکنیکی ماحول کی مصنوعی دُنیا سے کوئی مدد نہ ملنے کے باعث یہ احساسات خشک ہو جاتے ہیں۔ "مصنوعی"، "عقلی" اور "منظم ذہنی اعمال اب اس قسم کے تجربات کی تخلیق میں ناکام ہیں۔[1]

ژاک کا کہنا ہے کہ "مقدس" کا تعلق جنگلات، صحرا، سورج، چاند، بارش، طوفان، سمندر اور درختوں سے ہے۔ ایک اور موقع پر "مقدس" سے انسانی رشتے کی صراحت میں لکھتے ہیں کہ یہ انسان کو ایک طرح کی ضمانت تھی کہ اُسے ایک غیر منطقی خلا میں لاانتہا مُدت کے لیے خواہ مخواہ نہیں دھانس دیا گیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہمارے دَور کی بُوالعجبی یہ ہے کہ اب انسان کے انتہائی عمیق تجربات فطرت سے وابستہ نہیں۔ وُہ آج ٹیکنالوجی کے محیط میں گھر کر یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنے وجود کو صحیح سمت میں ڈالنا ہے اور ایک انتہائی ناپائیدار بے اعتبار دُنیا میں اپنی اصل دریافت کرنا اور اس کے معنی اور ابتداء کو سمجھنا ہے۔[2]

اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ معاشرے کی تقدیس پر زور دینا شروع ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی "تقدیس شکن" لوگوں یعنی مارکس، نٹشے اور فرائڈ کی اہمیّت بھی بڑھ گئی۔ مقدس صحیفوں کی جگہ سیاسی منشوروں نے لے لی، اور نتیجہ اس سب کا یہ نکلا کہ خون کی ندیاں بہہ نکلیں اور دریدہ جسموں کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ نئی "اضام پرستی" پہلے کی بُت پرستی سے کہیں زیادہ تباہ کُن تھی کیونکہ یہ انسانوں کی بھینٹ طلب کرتی ہے۔ اس جدید اضام پرستی کے دام تزویر سے بچنے کے لیے مسلمان کو قرآن کا سہارا درکار ہوتا ہے مگر اُسے اس کا "تتمہ" بھی چاہیے یعنی مظاہر قدرت کی تشریح کرنے

---

1. The New Demons, Jacques Ellul, p.62

2. Ibid., pp. 65-67.

Marfat.com

والی" وحی" جس کے بغیر حقیقی معنوں میں قرآن فہمی ممکن نہیں۔
اسلام کے بنیادی ارکان خاص طور پہ پانچ نمازیں اور ایک ماہ کے روزے میکانی ذرائع سے متعین ہونے والے وقت کی بجائے نظام قدرت کے تحت دن اور رات کی گردش سے بندھے ہوئے ہیں۔ پانچ نمازوں کے اوقات پو پھٹنے سے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر جب دن نصف النہار کو پہنچتا ہے تو دُوسری نماز یعنی ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور پھر جب دن گھٹتے گھٹتے سہ پہر کو پہنچتا ہے تو تیسری نماز عصر کا وقت ہو جاتا ہے، اور غروبِ آفتاب کے فوراً بعد مغرب کی نماز شروع ہو جاتی ہے؛ اور دن کے اختتام پر پہنچنے کے بعد پانچویں نماز یعنی عشاء کا وقت ہوتا ہے۔ رمضان کے آغاز و اختتام کی تاریخوں کا حساب گو تقویم میں درج ہوتا ہے؛ تاہم فرض یہ ہے کہ رمضان کو باقاعدہ آنکھوں سے چاند دیکھنے کے بعد شروع اور ختم کیا جائے۔ اس کے معنی واضح طور پر یہی ہیں کہ سائنسی حساب دانی کی بجائے نظامِ قدرت کے مظاہرے براہِ راست مشاہدے کو فوقیت دی جائے، کیونکہ "زندہ" تجربہ، سائنسی اعداد و شمار پہ مقدم ہے۔ آج کمپیوٹر کی مدد سے کسی بھی علاقے میں نئے چاند کے طلوع ہونے کا صحیح وقت نہ صرف منٹوں بلکہ سیکنڈوں کے تعین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے؛ تاہم اِس کی اہمیت وُہ نہیں جو کھلی آنکھوں سے باریک اور روشن ہلالِ نو کو اُفق پر دیکھنے میں ہے۔ مغرب میں رہنے والے مسلمانوں سمیت تمام مسلمانوں کا بصری طور پر رویتِ ہلال کی تصدیق سے چمٹے رہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس معمورۂ عالم میں بکھری ہُوئی قدرت کی نشانیوں کو دیکھ کر ذاتِ خداوندی کا ادراک زیادہ بہتر ہے بجائے اِس کے کہ محض مفروضوں سے اس تک پہنچنے کی سعی کی جائے۔
پچھلے صفحات میں ہم نے اِس عالمِ قدرت کا تقابل ایک تصویری کتاب سے کیا تھا۔ اِس میں اس قدر اضافہ اور کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو زندگی اور حرکت و عمل سے لبریز ہے اور اس کتاب کے اوراقِ رنگین سے تصاویر مچل مچل کر باہر آ رہی ہیں۔ اِن کا کام خُدا کی حمد بیان کرنا ہے۔ اِن کی زندگیوں کا استقرار اور توانائی

Marfat.com

محض خُدا کی رحمت ہے؛ چنانچہ اس کی تصریح باری تعالیٰ سُبحانہٗ اِن الفاظ میں فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ۝ وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (النور (۲۴): ۴۱ — ۴۲)

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خُدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ اور پَر پھیلائے ہوئے جانور بھی، اور سب اپنی نماز اور تسبیح (کے طریقے) سے واقف ہیں، اور جو کچھ وُہ کرتے ہیں (سب) خدا کو معلوم ہے۔ اور آسمان اور زمین کی بادشاہی خُدا ہی کے لیے ہے۔"

پھر اس بات پر مزید زور دینے کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْہِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَہُوْنَ تَسْبِیْحَہُمْ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝

ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ اُن میں ہیں سب اُسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ بے شک وُہ بردبار (اور) غفار ہے۔ (بنی اسرائیل (۱۷): ۴۴)

اور اپنے مسجودِ خلائق ہونے پر مزید زور دیتے ہوئے ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو (مخلوق) آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چارپائے اور بہت سے انسان خُدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ (الحج (۲۲): ۱۸)

ایک حدیث مبارکہ ہے کہ ایک موقع پر پیغمبرِ خُدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں کو بتایا کہ ایک مرتبہ کسی پیغمبر کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا تو اُنھوں نے حکم دیا کہ چیونٹیوں کی پُوری بستی جلادی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں تنبیہہ فرمائی اور کہا کہ ایک چیونٹی نے

Marfat.com

تمہیں ڈنک مارا تو تم نے اُن کا وہ پورا قبیلہ جلا ڈالا جن کے لبوں پر ہماری حمد و ثنا تھی۔ (یاد رکھو) تمام مخلوقات اور مظاہرِ قدرت کو اپنے وظیفہ اعمال میں اللہ کی طرف سے ہدایت و رہبری ہوتی ہے اور وہ اپنی اپنی "تقدیر" کے مطابق رہنمائی حاصل کرتے ہیں جو نظامِ کائنات میں اِن کا مقدور ہے؛ چنانچہ اِس ضمن میں ارشادِ باری ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا

(النحل (۱۶):۶۸—۶۹)

"اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور (اونچی اونچی) چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنا۔ اور ہر قسم کے میوے کھا۔ اور اپنے پروردگار کے صاف رستوں پر چلی جا۔"

وہ حمدِ باری جو ہر مخلوق کے لبوں سے نکل کر ملائے اعلیٰ کی طرف جاتی ہے گویا ان گنت آئینوں میں منعکس ہو کر ربِ جود و الکرم کی طرف سے دوبارہ بصورت رحم و کرم نزول کرتی ہے جو کہ تمام مخلوق کے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ جمالِ فطرت اور ربوبیتِ باری تعالیٰ جو تمام زندہ مخلوقات کا وجود برقرار رکھتی ہے اور بارش جو مردہ زمین کو ازسرِ نو حیات بخشتی ہے، یہ وہ مثالیں ہیں جو قرآن میں بار بار دی گئی ہیں۔ اِن سے اس الرحم الرّاحمین کی رحمت کا احوال عیاں ہوتا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۝ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ (رحمٰن (۵۵):۱۰-۱۳)

اور اسی نے خلقت کے لیے زمین بچھائی، اس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں جن کے خوشوں پر غلاف ہوتے ہیں، اور اناج جس کے ساتھ بھس ہوتا ہے اور خوشبودار پھول۔ تو اے گروہ جن و انس، تم اپنے پروردگار کی

Marfat.com

کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟ اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا اور جنّات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔ تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟"

اور پھر اپنی نعمتوں کی مزید صراحت کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے :

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝ (۸۰ : ۲۴ - ۳۲)

"تو انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے، بے شک ہم ہی نے پانی برسایا، پھر ہم ہی نے اس میں اناج اُگایا، اور انگور اور ترکاری، اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارا، (یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے لیے بنایا"

یہاں بھی توحید کا اُصول کثرت کے باریک پردوں میں نظر آتا ہے کیونکہ تمام مخلوق اُس غذا کے سہارے زندہ ہے جو باہمی انحصار کے تحت انتہائی پیچیدہ عمل کے ذریعے ایک سے دُوسرے کو پہنچتی ہے۔ اس عمل میں مسابقت اور تعاون دونوں کی کارفرمائی ہے۔ ایک کی موت دُوسرے کی زندگی ہے، ایک کا عطیہ، ایک ہی کی نہیں کئی دُوسروں کی ضروریاتِ خوراک کی کفالت کرتا ہے۔ باہمی انحصار کا یہ انتہائی نازک پردہ، جس کے نیچے تمام مخلوقات رہتی ہے۔ خلا کے باریک سائبان کی وجہ سے مہلک تابکاری کے اثرات سے محفوظ ہے۔ یہ "سائبان" بامِ ثریّا سے لے کر تحت الثّریٰ کے گرم ترین بطن تک کی تنگنائے پر تنا ہُوا ہے۔ عزم کی طبیعی اقالیم کے اُوپر اور اندر "الغیب" ہے جو افلاک سے پرے اور ہمارے وجود کی عمیق ترین تہوں میں جلوہ فرما ہے۔

فطرتاً ہم ناتواں تو ہیں ہی، سو اس تنگنائے میں انتہائی محتاط انداز میں قدم رکھنا چاہیے اور اس زمین کی ویسی ہی توقیر کرنی چاہیے جیسی کہ ہم کتاب اللہ کی کرتے ہیں، اگرچہ

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ

Marfat.com

رِزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ۝ (الملک (۶۷): ۱۵-۱۶)

"وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو نرم کیا تو اُس کی راہوں میں چلو پھرو اور خُدا کا (دیا ہوا) رزق کھاؤ اور (تم کو) اسی کے پاس (قبروں سے) نکل کر جانا ہے۔ کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو کہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور وُہ اِس وقت حرکت کرنے لگے۔"

قرآن بار بار ہمیں اس بات کی یاد دہانی کراتا ہے کہ اِس دُنیا کی ہر شے انتہائی بودی اور فانی ہے۔ جو فصلیں، سبزہ اور روئیدگی بارانِ رحمت کے سبب زمین کا سینہ چیر کر نکل آتی ہے، بہُت جلد خشک ہو کر بھُوسا بن جاتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ پہاڑوں کو بھی، جو مضبوطی اور استحکام کا پیکر نظر آتے ہیں، قطعی مستحکم نہیں کہا جاسکتا۔ نہیں بھی نازک صورتِ حال کا سامنا ہے؛ چنانچہ قرآن میں خدُا کا ارشاد ہے:

وَتَرَی الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ (۲۷: ۸۸)

"اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ (اپنی جگہ پر) کھڑے ہیں مگر وُہ (اُس روز) اسی طرح اُڑتے پھریں گے جیسے بادل۔"

دن اور رات کی طرح موت اور حیات کی تصریف (آنا جانا) چلتی پھرتی پرچھائیوں کا سا کھیل ہے اور پرچھائیاں چاند کی روشنی میں برقرار نہیں رہتیں۔ چاند پہ بھی جو ماہ و سال کے شمار اور تقویم کا ایک پیمانہ ہے، خدائے قدوس کے الفاظ میں یہ کیفیت گزرتی ہے کہ:

حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ (النمل (۳۶): ۳۹)

"(گھٹتے گھٹتے) کھجور کی پُرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔"

اِس دُنیا کی ہر شے آنی جانی ہے، کسی بھی چیز کو ثبات نہیں۔ کسی کو بھی موت کے بے رحم ہاتھوں سے مفر نہیں؛ تاہم حیات کی ناپائیداری اور کمزوری کے باوجود زندگی کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں۔ وجود کے شفاف پردے کے پار اس دُنیا سے ماوری دُنیا

Marfat.com

کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر یہ پردہ بھاری یا ٹھوس ہوتا تو اس کے آر پار کچھ نہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کسی انسان کو موت کا ڈر نہ ہوتا تو وُہ کبھی خُدا کے متعلق کچھ نہ سوچتا۔

عالمِ شہود کی کثرت اور زمان و مکاں کی لامحدود پہنائیوں سے ماوریٰ، اللہ وحدہٗ کی ذات ہے جس کا نام سُنتے ہی ہر مسلمان کے لبوں پر جل جلالہٗ اور لاشریک لہٗ جاری ہو جاتا ہے؛ یعنی اس کردگارِ عالم کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وُہ نور کے ستر ہزار اور ظلمت کے ستر ہزار پردوں میں ہے۔ اگر وُہ تمام عالم کو بے حجاباً اپنا جلوہ دکھا دے تو پلک جھپکنے میں ہر شے اس طرح پگھل جائے جیسے ہماری دُنیا سُورج کے انتہائی قریب ہو جانے پر۔ ہماری زندگیوں کا حال تو یہ ہے جیسے ہم طلوع یا غروبِ آفتاب کے جھٹپٹے میں جی رہے ہوں۔ اپنی زندگی کے اعمال میں ہم آزاد ہیں اور اس خیالِ خام کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم ہر طرح محفوظ ہیں؛ خواہ شریعت و قوانینِ الٰہی کی پیروی کریں یا نہ کریں اور اگر چاہیں تو حق و صداقت سے آنکھیں اور کان بند کر لیں۔ یُوں ہم خود کو پابند کر لیتے ہیں، اپنی شخصیت کا اظہار کرتے ہیں اور واضح طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔ "یہ مختصر سا لمحہ" جلد ختم ہو جاتا ہے اور امتحان اور فیصلے کی گھڑی آ جاتی ہے۔

قرآن کا ضمنی نام "الفرقان" بھی ہے جس کا مصدر "فَرَقَ" ("اُس نے جدا کیا") ہے۔ عموماً اس کا ترجمہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا کیا جاتا ہے۔ اس سے اس کتاب کی حیثیت "شمشیرِ قاطع" کی طرح نظر آتی ہے جو حق و باطل کا خیر و شر کے بارے میں انسانی ذہنوں کے اُلجھاؤ کو دُور کر دیتی ہے۔ انتشار اور افراتفری کے ماحول میں انسان دھندلکے میں جیتا ہے جہاں ہر چیز مُبہم ہوتی ہے۔ قرآن بار بار ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ کسی رسول کا آسمانی پیغام کے ساتھ آنا دراصل یومِ حساب کا "نمونہ" اور پیش رَو ہے جس کے بعد گو مگو میں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ وحیِ الٰہی پورے منظر کو منوّر کر دیتی ہے جس سے ہر چیز صاف صاف نظر آتی ہے اور اپنا اپنا مقام پا لیتی ہے۔

قرآن مجید میں آیا ہے:

Marfat.com

لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ (بقرہ (۲): ۲۵۶)

دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت (صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے اُس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔ ہمیں قرآن یہ بھی بتاتا ہے :

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (انعام (۶) : ۱۳۲)

"تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے اور وہاں کے رہنے والوں کو (کچھ بھی) خبر نہ ہو۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (۱۰ : ۴۷)

اور ہر ایک اُمت کی طرف پیغمبر بھیجا گیا جب اُن کا پیغمبر آتا ہے تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کچھ ظلم نہیں کیا جاتا۔

کوئی فرد خواہ کتنا ہی غیر جانبدار نظر آتا ہو جب تک وہ کسی "تاریک" ماحول میں سانسیں لے رہا ہے اور اس ماحول میں اس کے بنیادی میلانات خواہ کیسے ہی غیر واضح اور دھندلے ہوں، جوں ہی وحیٔ الہٰی سے اُس کے دل و دماغ مس ہوتے ہیں، اس کے اندرونی میلانات اور رجحانات ایک واضح صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ جس طرح طبیعی روشنی تمام مضمر تضادات کو اُبھار کر اجاگر کر دیتی ہے اسی طرح روحانی روشنی ہر چیز کی مثبت یا منفی قدر عیاں کر دیتی ہے — حاملِ وحیؐ خود اعلان فرماتے ہیں کہ میں ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اب اپنے لیے راہ چن لو اور ہمیشہ اس انتخاب کے نتائج کے ساتھ رہو۔ اور ایسی ہی صورت کے لیے تو کہا جاتا ہے کہ جب بہشت کے

Marfat.com

دروا ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی جہنم کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں ۔ ایک مشہور امریکی ضرب المثل ہے : "سچ کے ڈسنے سے پہلے ہی، سچ سن لو۔"

قرآنِ کریم کے جملہ بنیادی موضوعات میں ایک موضوع انسان کا حقیقت سے اعراض ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے باوجود کہ خدا اور اس کی ذات ہر چیز سے ماوری بھی ہے اور تمام موجودات پر محیط بھی، کفر یہی فرار اور اعراض ہے۔ ہر دور میں مرد و زن، حقیقتِ کلی سے بچنے کی کوشش کرتے اور اپنے اپنے تاریک گوشوں میں پناہ ڈھونڈتے رہے ہیں۔ عام روزمرہ زندگی میں ہر سطح پر انسان موت کے خیال ہی سے آنکھیں چُراتا رہتا ہے۔ ہم اپنے باطن کی تنہائی سے بچنا چاہتے ہیں مگر گہری یاد باشی بھی اس سے نجات نہیں دلا سکتی، اور ہم اپنی مجبوریوں اور گناہوں کا اعتراف کرنے سے انکار کرتے رہتے ہیں۔ بہشتِ بریں سے نکالے ہوئے انسان کی خو یہ ہے کہ بڑی آسانی سے خدا کو فراموش کر دیتا ہے۔ مگر ہر میدان میں "نسیان" تو پایا ہی جاتا ہے!

قرآن کی شمشیر قاطع انسانوں کو خوابوں کے پنجے سے بھی رہائی دلاتی ہے، خواہ برفیلے پانی کی بوچھاڑ کی طرح، خارجی حالات اور سانحات حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے اُن کی آنکھیں کھول ہی کیوں نہ دیں۔ خواب، ہر فرار پسند شخص کی آخری پناہ گاہ ہوتے ہیں۔ یہ نفس پر اُس وقت بھی قابض ہوتے ہیں جب باقی سب ترغیبات کی گرفت نرم پڑ چکی ہو۔ بقول ایک عیسائی مصنف گستاف تھیبان Gustave Thibon کے "ہمیں نیند نہیں، خوابوں کے خلاف حصار کھینچنا چاہیے۔ اُس شخص کو جو خوابوں کی دُنیا میں رہنے کا عادی ہو جائے، نیند کے ماتے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل سے جگایا جا سکتا ہے۔ نیند، خدا کا غیاب ہے مگر خدا کی وہمی شبیہ ہے؛ گویا حالتِ خواب میں خدا دو اعتبار سے غائب ہوتا ہے کیونکہ اوّل تو خدا کی جگہ خواب میں خالی ہوتی ہے؛ دوم یہ کہ اس خالی جگہ میں جگہ ایسی شے ہوتی ہے جو خدا نہیں ہوتی۔ یوم الدین تو رات کو اچانک آنے والے چور کی طرح ہے جو سونے والوں سے زیادہ خواب دیکھنے

Marfat.com

کو پریشان کرے گا۔[1]

قرآن مُبین میں متعدد مقامات پر اس دَور کے التباس کی قلعی کھولی گئی ہے کہ جب تک ہم کسی کی نظروں میں نہیں آتے اور اپنے خیال میں پاک صاف اور بے ضرر زندگی گزارتے ہیں، ہم محاسبے اور تعزیر سے صاف بچ سکتے ہیں۔ آسودگی اور اطمینان کے یہی واہمے ہیں جن کا پردہ یومِ حساب کو چاک ہوگا اور جن کے بارے میں قرآن قبل از وقت آگاہ کرتا ہے اور یہی وُہ پس منظر ہے جس میں زندگی کو ایک انتہائی مختصر مگر نادر موقع قرار دیا گیا جو ایک ہی بار ملتا ہے۔ اِس باعث پورے قرآن میں باربار شدّت سے تنبیہہ کی گئی ہے اور لہو و لعب کو عقلِ سلیم کی توہین قرار دیا گیا ہے کیونکہ جو مختصر وقت ہمیں میّسر ہے مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے اُسے لہو و لعب میں گنوانا احمقانہ عیاشی اور اسراف ہے، اور ایسے ہی لوگوں کو قرآن نے خاسرین قرار دیا ہے۔ یہی لوگ انتہائی نقصان میں ہوں گے اور وُہ تمنّا کریں گے کہ کاش اُنھیں کچھ وقفے کے لیے دوبارہ دنیاوی زندگی میں لوٹا دیا جائے، اور یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اِن بلاکشان عذاب و عقوبت کے لیے دوبارہ زندگی کا ایک دن بھی کسی قیمتی خزانے سے کم نہیں جو اِن کی پوری زندگی سے زیادہ بیش بہا ہوگا؛ چنانچہ اِس ضمن میں ارشادِ باری ہے:

وَاَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ (۱۴:۴۴)

اور لوگوں کو اُس دِن سے آگاہ کرو جب اُن پر عذاب آجائے گا تب ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں تھوڑی مُدّت مہلت عطا کرتا کہ ہم تیری دعوتِ (توحید) قبول کریں اور (تیرے) پیغمبروں کے پیچھے چلیں۔

قرآن اور حدیث دونوں ہی میں اِن لوگوں کی بے چارگی کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے

---

1. Gustave Thibon, L'E'chelle de Jacob, Lardenchet, Paris, p.108

Marfat.com

جو مر چکے ہیں اور جو گویا برزخ میں ہیں اور انہیں سوالوں کا سامنا ہے جس کا خاتمہ یومِ حساب کو ہوگا اور اس حالت کے بالمقابل زندگی کے وقفے کو آزادی کا ایک عظیم موقع اور خوش نصیبی قرار دیا گیا ہے۔ ہمیں یہ آزادی پروردگار کے کرم اور رحمت سے ملی ہے۔ اس لیے زندگی کا یہ وقفہ اُسی مالک الملک کی امانت ہے۔ کیونکہ ارشادِ باری ہے:

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (۳۶:۶۷)

اور اگر ہم چاہیں تو اُن کی جگہ پر اُن کی صورتیں بدل دیں، پھر وہاں سے نہ آگے جا سکیں اور نہ (پیچھے) لوٹ سکیں۔

پھر جس طرح پیروں سے مفلوج کوئی شخص اُس وقت کو نہیں بھولتا جب وُہ قدم بقدم چلا کرتا تھا اور اُسے اس نعمت کے لیے شکر گزار نہ تھا۔ اسی طرح مرنے والے اپنی سابقہ زندگیوں کی رواں دواں کیفیت کو یاد کرتے ہیں۔ اہلِ اسلام میں ایک ضرب المثل شاید اسی رعایت سے بن گئی ہے کہ ـــــ "زندگی کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے"۔ پھر یاد رکھنا چاہیے کہ یومِ حساب کو جو فیصلہ کر دیا جائے گا اس کے بعد افسوس اور پچھتاوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کیفیت کی صراحت قرآن کریم میں یوں کی گئی ہے:

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ (۱۴:۲۱)

اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔ کوئی جگہ (گریز اور) رہائی کی ہمارے لیے نہیں ہے۔

عیسائیوں پر بھی روزِ حشر کا احوال روشن ہے کیونکہ جو لوقا کی انجیل میں پڑھتا ہے "وُہ پہاڑوں سے کہیں گے ہم پر گر جاؤ اور ٹیلوں سے استدعا کریں گے ہمیں ڈھانک لو"۔ انجیل کی "کتاب وحی" میں وُہ یہ بھی پڑھتا ہے: "اِن ایّام میں انسان موت کا متلاشی ہوگا اور اُسے نہیں ملے گی۔ وُہ مرگ کی آرزو کرے گا اور وُہ اُس سے دُور بھاگے گی"۔ جب وعید سنا دی گئی، شریعت کا اعلان ہو گیا، تمام قصّے بیان کر دیے گئے اور

Marfat.com

امثال وضع ہو گئیں تو قرآن نے یومِ آخرت کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝ (۸۱: ۱—۱۴)

شروع خُدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ جب سُورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تارے بے نُور ہو جائیں گے، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، اور جب بیانے والی اُونٹنیاں بے کار ہو جائیں گی، اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں گے، اور جب دریا آگ ہو جائیں گے، اور جب رُوحیں (بدنوں سے) ملا دی جائیں گی، اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہو پُوچھا جائے گا، کہ وُہ کس گناہ پر مار دی گئی؟ اور جب (عملوں کے) دفتر کھولے جائیں گے، اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی، اور بہشت جب قریب لائی جائے گی، تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وُہ کیا لے کر آیا ہے۔

اور جب وُہ لمحۂ انصاف آئے گا۔ قرآن کے الفاظ میں:

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝ (۱۰۱: ۴—۵)

(وُہ قیامت ہے) جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے، اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دُھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اُون۔

اور زمین جو آفرینش سے یومِ آخرت تک بڑے صبر سے منتظر رہی، اپنے مدفون ذخیرے اُگل دے گی۔ ارشادِ باری ہے:

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَہَا ۙ
وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَہَا ۙ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَہَا ۚ یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ
اَخۡبَارَہَا ۙ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَہَا ؕ (۹۹ : ۱ — ۵)

"شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی اور زمین اپنے (اندر کے) بوجھ نکال ڈالے گی، اور انسان کہے گا کہ اِس کو کیا ہُوا ہے؟ اس روز وُہ اپنے حالات بیان کر دے گی کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا (ہو گا)"

اُس وقت حقیقت کا انفجار ہوگا اور وُہ تمام خواب چکنا چُور ہو جائیں گے جنہیں ہم نے زندگی بنا لیا تھا:

ذٰلِکَ الۡیَوۡمُ الۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا ۚ اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰکُمۡ
عَذَابًا قَرِیۡبًا ۚ یَّوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰہُ وَ یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ
یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا (۷۸ : ۳۹ — ۴۰)

"یہ دن برحق ہے۔ پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنا لے۔ ہم نے تم کو عذاب سے جو عنقریب آنے والا ہے، آگاہ کر دیا ہے جس دن ہر شخص اُن (اعمال) کو جو اُس نے آگے بھیجے ہوں گے، دیکھ لے گا اور کافر کہے گا کہ اے کاش میں مٹّی ہوتا۔"

وُہ دن زمانی اعتبار سے وقتِ اختتام ہوگا تاہم یہ وُہ دن ہے جو حال پر بھی سایہ فگن ہے؛ گویا روزِ قیامت نظر کے سامنے ہے کیونکہ صداقتِ اُولےٰ صداقتِ ادنیٰ پر حاوی ہوتی ہے۔ ایک لحاظ سے "یہاں" اور "اب" ہے۔ علاوہ ازیں، ہر انفرادی موت اور ابدی، اُس فرد کے لیے، دُنیا کا انجام ہے۔

فرتھ جوف شواَن لکھتے ہیں: "ایمان والوں کی بڑی تعداد بھی اس بات کا بہت زیادہ ادراک نہیں رکھتی کہ خُدا نہ صرف ہمارے "اُوپر" آسمانوں میں ہے بلکہ اس دُنیا کے خاتمے پر ہم سے پہلے موجود ہوگا؛ یا یوں کہیئے کہ ہماری زندگی کے خاتمے پر موجود ہوگا؛

Marfat.com

گویا زندگی ہمیں پوری قوت سے آگے دھکیلتی ہے اور اس کے خاتمے پر خدا ہمارا منتظر ہے۔ یہ کرۂ ارض ایک دن کسی ناقابلِ تصوّر معجزے کے تحت ملیامیٹ ہو جائے گا۔ یہ معجزہ ناقابلِ تصوّر اس لیے ہو گا کہ اس سے پہلے اس سے بڑھ کر اور کوئی عمل انسانی مشاہدے میں نہیں آیا نہ اس کا اندازہ ہی اس کے لیے ممکن ہے؛ اور نہ اس سے ردّوبدل کر سکتے ہیں؛ بعینہٖ جیسے کوئی مکھی موسموں کے تغیّر و تبدّل میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جو بچّہ رات کے وقت پیدا ہُوا ہو اور اس کی عُمر صرف ایک دن ہو، بھلا سُورج کے طلُوع ہونے کی کیفیات کا ادراک کیسے کر سکتا ہے؟ ... اور اسی طرح خُدا کا سامنا ہو گا ۔۔ اور اس ایک ظہور کے سوا کچھ نہ ہو گا جس سے تجربات کی دُنیا ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔[1]

ہم میں سے ہر شخص ایک عظیم ڈرامے کا کردار ہے جو کائناتی اور ماورائے کائناتی اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑے زلزلے، طوفان، اور آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا، تھیٹر کا سین بدلنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، مگر قرآن میں اوّل تا آخر، غالب موضوع اللہ کی رحمت ہے جس کے کارساز اور کارآفرین ہاتھوں میں یہ عظیم ڈراما بھی ایک معمولی شے ہے؛ اور ہمیں اس بات کی یقین دہانی بھی کرائی گئی ہے کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہو اُن کے لیے ڈر کی کوئی بات نہیں۔ سفر کے انجام پر ہمارا استقبال اِن الفاظ میں ہو گا:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ الفجر (۸۹: ۲۷-۲۸)

اے نفسِ مطمئنّہ! اپنے پروردگار کی طرف لَوٹ چل تُو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ط

---

1. Light on the Ancient Worlds, F. Shuon, London, Perennial Books, p. 49.

Marfat.com

وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ (۵۸ : ۲۲)

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیضِ غیبی سے اُن کی مدد کی ہے اور وہ اُن کو بہشتوں میں جن کے تلے نہریں بہ رہی ہیں، داخل کرے گا۔ وہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔ خدا اُن سے خوش اور وہ خدا سے خوش"

Marfat.com

Marfat.com

باب پنجم

رسولِ خُدا علیہ الصلوٰۃ والسلام

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے اور اسے خاطر خواہ انداز میں سمجھنے کے لیے عیسائی، لادین اور اُن تمام لوگوں (بشمول بعض معاصر مسلمانوں کے) کو جن کی ذہنی تربیت جدید مغربی تعلیم و افکار کے تحت ہوئی ہے۔ بالکل اِسی طرح اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے جیسے قرآنِ حکیم کے فہم کے لیے ضروری ہے۔ ایک عیسائی کو جو تفہیم اسلام کا خواہاں ہو عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تقابل کے اپنے فطری میلان کو کسی حد تک دبا دینا چاہیے کیونکہ اُن دونوں پیغمبروں کا مشیتِ الٰہی کے ساختہ منصوبے میں یہی جُداگانہ کردار تھا۔ اس طرح ایک لادین کو بھی کچھ تبدیلیاں اپنے اندر پیدا کرنا ازبس ضروری ہیں۔ اُسے اور کچھ نہیں تو تصوراتی طور پر ایک ایسے شخص کے حیات سے استفادہ کے لیے خود کو تیار کر چاہیے جس کا کردار اور عمل سرتاپا مرضئ الٰہی کے تابع تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر مقدس امور کا ذائقہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

عصرِ جدید کے ذہن کا خاصہ یہ ہے کہ وُہ مظاہرِ فطرت کے اسباب و علل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور جب وہ کسی طرح یہ دریافت کر لیتا ہے کہ فلاں فلاں واقعات

Marfat.com

دیکھے ہوئے تو یہ پوچھنا بھول جاتا ہے کہ آخر ایسا ہوا کیوں؟ اس کے برعکس راسخ العقیدہ روایتی مسلمان کے نزدیک مخلوقات کے عالمِ وجود میں آنے کا طریق کار اور ہے۔ وُہ سمجھتا ہے کہ اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ جب اپنے امکانات کے اس خزانہ پر ارادۂ تخلیق کی نظر ڈالتا ہے تو ہنوز پردۂ غیب میں ہے تو اشیاء خلعتِ وجود سے آراستہ ہو کر پردۂ ہستی پر آنے لگتی ہیں، جیسا کہ بیان کیا گیا:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (۳۶ : ۸۲)

اِس کی شان یہ ہے کہ جب وُہ کسی چیز کا اِرادہ کرتا ہے تو اِس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وُہ ہو جاتی ہے۔

جو باتیں ہمیں اسباب و علل کے تحت وقوع پذیر ہوتی نظر آتی ہیں، وُہ ہیں جن کا نقشہ خُدا تعالیٰ کے ذہن میں پہلے ہی ترتیب پا چکا ہے۔ ہر واقعہ کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے، کیونکہ اِس پورے نظام میں سبب اور مسبّب ایک رشتے میں منسلک ہیں۔ انسانی ذہن اسی عالمِ اِسباب میں مصروفِ عمل ہوتا ہے، اور اِس کی حالت اُس نابینا کی طرح ہے جو ٹٹول کر ایک سے دُوسری چیز تک پہنچتا ہے؛ تاہم یہ اسباب اِس بات کی وضاحت نہیں کر سکتے کہ کوئی واقعہ ضروری کیوں تھا؟

اِس زمانے میں رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے جدید سیرت نگار کچھ اِس انداز سے آپؐ کی زندگی کے واقعات کا جواز تلاش کرتے ہیں کہ چونکہ فلاں فلاں واقعات آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو پیش آئے جن کے نتیجے میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ایک عظیم اِنسان کی طرح یہ یہ قدم اُٹھائے، اور جو کچھ آپ نے کہا کر دکھایا، وغیرہ: اس لیے یہ اندازِ فکر ایک راسخ العقیدہ روایتی مسلمان کو لایعنی اور دور از کار معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُس کے نزدیک یہ عظیم المرتبت انسان وہی کچھ تھے جو کچھ اُنھیں ہونا چاہیے تھا۔ انھوں نے وہی کچھ کیا جو کچھ اُنھیں کرنا تھا اور اُنھوں نے وہی کہا جو اُنھیں مرضیٔ خُداوندی کے مطابق کہنا چاہیے؛ اور مقصود و منشائے الٰہی کے متعلق خود اس کاتبِ تقدیر کا فرمان ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳۸ : ۲۷)

Marfat.com

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو (کائنات) اُن میں ہے اُس کو خالی از مصلحت نہیں پیدا کیا۔ یہ اُن کا گمان ہے جو کافر ہیں۔

مستشرقین جن میں خاص طور پر فان گروینیم Fon Grunebaum بھی شامل ہے نے حضرت محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اچھی تقدیر کا ذکر کیا ہے، گویا اُن کے حسابوں اس وقت یہ دُنیا کسی راہِ ہدایت سے تہی تھی، اور یہاں کے باسیوں کے سامنے سرے سے کوئی راستہ ہی کھلا ہوا نہ تھا۔ اس لیے بقول اِن کے حضورِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوئے دین کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ایسے وقت میں اسے قیام و استحکام کے سامان فراہم ہو گئے یا شاید دُوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہتے ہوں کہ انسانیت کی حالت الٰہی پیغام سے تبدیل کرنے کے فیصلہ کے بعد خُدا نے انسانوں سے منہ موڑ لیا تھا اور باقی تمام اُمور پیش آمدہ واقعات و حوادث پر چھوڑ دیے تھے۔

ایک مسلمان کے نقطہ نظر سے دُنیا کے جس خطے میں رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی، وُہ خطہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام اور آپ کے اسوہ حسنہ سے حاصل ہونے والی مثال کے لیے نہایت موزوں و مناسب تھا، اور اِس پیغام کو اللہ نے اِس زمانے کی مناسبت سے وضع کیا تھا۔ گویا یُوں سمجھیے کہ وحیٔ الٰہی کا دُرِ بے بہا اپنے گردوپیش اور ماحول کی نسبت سے نہایت مناسب تھا، اور یہ احوال اور گردوپیش کا ماحول بھی اس دُرِ بے بہا کے شایانِ شان تھا۔ یہ قیاس کر لینا کہ اِس کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا تھا، صریح طور پر کائنات میں اتفاق کے فلسفے کو متعارف کرانے کے مصداق ہے جس کے سیاق و سباق میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت کے وقت جزیرۃ العرب تین منطقوں میں منقسم تھا۔ اِس کا شمالی حصہ دو عظیم سلطنتوں کے قرب میں واقع تھا۔ ایک مسیحی بازنطینی سلطنت جسے عرب مملکتِ رُوم، کہہ کر پکارتے تھے اور دُوسری ایران کی آتش پرست زرتشتی حکومت۔ زیرِ سایہ اِس دور کی یہ دو زبردست سُپر طاقتیں مسلسل اور مستقل انداز

Marfat.com

میں ایک دُوسرے سے مسابقت اور بالادستی کی جنگ میں دست وگریباں چلی آ رہی تھیں۔ دونوں کی قوّت ڈنڈی کے تول کی طرح کچھ ایسی برابر تھی کہ کوئی ایک سلطنت دُوسری پر نتیجہ خیز فتح و غلبہ حاصل نہ کر سکی تھی۔ اس وقت یہ دو طاقتیں پردہ سرائے عالم پر اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔ جزیرۃ العرب کے شمالی علاقے کے عرب ان کے پروں تلے بدلے ہوئے حالات اور اپنے مفادات کی خاطر کبھی ایک کا ساتھ دیتے تو کبھی دُوسری کا۔

جنوبی عرب میں مائن سبا، قطبان اور حضر موت کے قبائل آباد تھے جو تاریخ کے لیے اجنبی نہیں تھے کیونکہ اِن ہی کے علاقے سے تو پُوری دُنیا کو لوبان اور عُود کی فراہمی ہوتی تھی اور اِن خوشبویات کے باعث ہی رومن لوگ اسے اریبیافیلیکس یعنی سرسبز و شاداب عرب علاقہ کہتے تھے۔

بدقسمتی سے جزیرۃ العرب کے اس جنوبی علاقے کو اپنی مِلک بنانے پر ہر ایک کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ حبشہ یعنی حال کے ایتھوپیا کے بادشاہ نجاشی کے عیسائی مذہب قبول کر لینے کے بعد اس کے ملک کو عیسائی بازنطینی ریاست کی دوستی اور تحفّظ فراہم ہوگیٔ تھی۔ بازنطینی حکومت ہی کی شہ پر چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں اُس نے خلیج کے آبی تنگنائے کو عبور کر کے عرب کے اِس زرخیز علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس علاقے کی زرخیزی اس کے لیے بلائے جان بن گئی تھی اور یہ ضرب المثل کہ بظاہر خوش قسمت ہی اچھی تقدیر سے محروم ہوتے ہیں، اسی پر بھی صادق آتی تھی[1]

---

[1] اور اس طرح ایک ہزار برس کی ترقی یافتہ تہذیب ختم ہوگئی اور یہ تمام ساحلی بستیاں ویران ہوگئیں اور ان کے باسی یہاں سے ترکِ سکونت کر کے یا تو زمانۂ قدیم کی خانہ بدوش زندگی گزارنے سوئے صحرا چل دیے یا پہاڑوں میں جا بسے جہاں اُنھوں نے ڈھلوانوں کو تراش کر چھوٹے چھوٹے قطعات زراعت کے لیے نکال لیے۔ مائن، قطبان، اوسان، حضر موت، سبا اور ہمیار کی عظمت و شوکت کی داستانیں لوگوں کے ذہنوں سے معدوم

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۵ پر)

Marfat.com

ایک سنگدل اور ظالم فاتح کے ہاتھوں اجڑنے سے پہلے جنوبی عرب کے لوگوں نے وسطی عرب کے عظیم ریگستانوں کو تجارت کے لیے کھول دیا تھا اور یہاں وہاں نخلستانوں میں بڑی بڑی تجارتی منڈیاں بھی قائم کر لی تھیں۔ یہ صحرا کے بدو قافلوں کی رہبری کا کام بھی کرتے تھے۔

اہلِ جنوب کی علامت اگر خوشبودار گوند کا درخت تھا تو ریگستانی علاقوں کے رہنے والوں کی علامت کھجور کا پیڑ تھا۔ ایک سامان عیش و راحت کا مظہر تو دوسرا سامان خوراک کا۔ حجاز، جس کے متعلق جنوبی علاقے کے ایک شاعر نے کہا تھا کہ جہاں نہ کوئی چڑیا گاتی ہے اور نہ گھاس کی کوئی کونپل سر اُٹھاتی ہے کو کوئی بھی اپنی جاگیر بنانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس علاقے کی کوئی بھی چیز کسی اہلِ ہوس کے لیے وجہِ کشش نہ تھی، ایک قوی انسان کا اپنے سے کمتر درجے کے انسان کو اور ایک قوم کا دوسری قوم کو اپنا غلام بنانا صدیوں کی روایت تھی، تاہم قبائلِ حجاز کو یہ تفوّق حاصل تھا کہ وُہ کبھی کسی کے مفتوح نہیں ہوئے اور نہ ہی کسی عظیم ظلم و ستم کا شکار بنائے گئے اور اِسی آزادہ روی کے باعث وُہ کبھی کسی کو "آقا" یا "عالیجناب" کہہ کر مخاطب کرنے پر مجبور نہ ہوئے۔ اپنی اس حیثیت میں وُہ واقعی منفرد تھے۔ اور اس اعتبار میں اِن کا تقابل صرف سائیبریا کے پہاڑی علاقوں کے منگولوں یا شمالی امریکہ کے اِن قبائل سے کیا جا سکتا تھا جو سفید فام

(صفحہ ۲۰۴ کا حاشیہ) ہوگئیں اور خوشبوئیات برآمد کرنے والی راہ کو بھی لوگوں نے فراموش کر دیا حتیٰ یہ کہ حمیری کتبوں کی تحریروں سے بھی ایک صدی بیتنے کے بعد بے معنی ہو کر رہ گئیں اور خوشبودار گوند والے درخت عنقا ہو گئے کیونکہ ان کی کاشت پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ اس علاقے کا نظامِ آبپاشی بھی استعمال نہ ہونے کے باعث تباہ ہو گیا اور کھیت ریگستانوں کا حصہ بن گئے۔ قرنِ اوّل کے مسلمانوں نے یوں ایک تہذیب کو اُجڑتے دیکھا۔

Marfat.com

کے وہاں داخلے سے قبل آباد تھے۔

غربت اور بدحالی حجاز کے لوگوں کا سب سے بڑا تحفظ تھی، تاہم یہ بات مشکوک ہے کہ آیا وُہ خود کو غریب بھی سمجھتے تھے؛ غربت کا احساس اِن لوگوں کو ہوتا ہے جو اہلِ دولت کو رشک و حسد سے دیکھتے ہیں، جب کہ ان لوگوں کو کسی سے حسد تھا نہ رشک۔ یہ اپنی دولت و ثروت، اپنی آزادی، اپنی غربت، اپنی خاندانی نجابت اور فقید المثال زبان کو سمجھتے تھے۔ یہ عظیم و جلیل زبان فنِ شاعری میں ان کا بہترین اوزار تھی؛ خاص طور پر یہ دیکھتے ہوئے کہ وُہ شاعری کے علاوہ اور کوئی فن جانتے بھی نہ تھے۔ آج جس شے کو ہم تمدن اور ثقافت کا نام دیتے ہیں اس کی کلیتاً مظہر ان کی شاعری ہی تھی، اور اس کے لیے اُنہیں پُر تکلف اور پُر تصنع ساز و سامان درکار نہ تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا بے ساختہ روزمرّہ کی بولی میں کہتے۔ آزادی و جرائت کی تعریف، کسی دوست کی مدح، کسی دُشمن کی ہجو، کسی قبیلے کے افراد کی دلیری اور بے باکی کا قصیدہ اور کسی خاتون کے حُسن و جمال کی ستائش کے لیے یہ زبان ایک انتہائی مؤثر وسیلۂ اظہار تھی۔ اسی شاعری کی ابیات وُہ بیکراں صحرا میں کاسۂ آسمان تلے کسی الاؤ کے گرد بیٹھ کر گنگناتے۔ یہ نیلگوں آسمان اِس چھوٹے سے گروہ انسانی کی عظمت کا شاہد تھا جو دُنیا کے اُجاڑ اور ویران علاقوں میں ہمیشہ گرم سفر رہتے تھے۔ قدیم زمانے میں صحرا کے بدوؤں کے لیے الفاظ کی کاٹ تلوار سے زیادہ تھی۔ جب وُہ متحارب قبیلے ایک دُوسرے سے میدانِ کارزار میں نبرد آزما ہوتے تو عام رواج کے مطابق فریقین اپنے بہترین شعراء کو سامنے لاتے جو اپنے قبیلے کی شان و شوکت کی مدح سرائی اور اپنے دُشمن کی مذمت میں تیغِ زبان کا پُورا زور صرف کر دیتے اور اس کی حد یہ تھی کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک قبیلے کے شعر سیفِ زبان کے وُہ جوہر دکھاتے جن کے آگے مدِ مقابل بغیر ایک تیر چلائے پسپائی اختیار کر لیتا۔[1]

---

[1] اس میلان اور رجحان کا مظاہرہ آج بھی اس وقت دیکھنے میں آجاتا ہے جب کوئی عرب

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۷ پر)

Marfat.com

زمانہ قدیم میں دو ماہر شعرا کے درمیان اس قسم کے مقابلے اور مجادلے حقیقی جنگ و جدل سے کہیں زیادہ دلچسپی اور توجہ سے سُنے اور دیکھے جاتے اس کی حیثیت جنگ سے زیادہ کھیل تماشے کی ہوتی۔ اس انداز کی قبائلی جنگوں میں جانی نقصانات عموماً بہت خفیف ہوتے تھے۔ یہ محاربہ آرائیاں بالعموم ایک اقتصادی مقصد کو پورا کرتی تھیں اور وہ تھا مالِ غنیمت کا حصول اور اس کی تقسیم۔ اِن جنگوں میں فاتح قبیلہ بہت زیادہ آگے بڑھ کر مفتوح قبیلے پر اپنی بالادستی کا شکنجہ کسنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ جب فریقین جنگ میں سے کوئی اپنی شکست تسلیم کر لیتا تو پھر دونوں طرف ہلاک ہونے والوں کا شمار کیا جاتا۔ فاتح اس موقع پر مفتوحین کے مقتولوں کا خون بہا ادا کرتا جو ایک طرح کی ریت تھی۔ اِن اعمال سے قبائل کی طاقت کا ایک صحت مند توازن برقرار رہتا۔ آج کی مہذب دُنیا کی جنگوں کا اِس دَور کی جنگوں سے موازنہ کیا جائے تو دونوں کا فرق حیرت انگیز معلوم ہوگا۔

یہ صحرانشین بادیہ پیمائی میں مصروف ہوتے یا آپس میں جدال و قتال میں منہمک۔ اُن کی بقاء کا انحصار جرأت، تکالیف کی سہار، اپنے قبیلے سے وفاداری اور ذاتی اوصاف کی بلندی پر تھا اور اِن بلند اوصاف میں کمزوروں، خاص طور پر عورتوں کا تحفظ بھی شامل تھا جن کے کاندھوں پر قبیلے کی افزائشِ نسل کا بارگراں ہوتا تھا۔ یہ لوگ بچّوں سے تعرض کرنا بھی کسرِشان سمجھتے تھے کیونکہ بچّے ہی تو قبائل کا مستقبل سمجھے جاتے تھے۔ ماقبل اسلام کی عرب شاعری کا ہیرو بالعموم کوئی بدو سردار ہوتا تھا جو ایک محدود دُنیا میں آسمان تلے گرم ریت اور سنگلاخ پتھروں کے درمیان ایک مستحکم چٹان کی طرح سرتانے کھڑا نظر آتا تھا۔ غربت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶ کا) قائد ایک انتہائی پُراشتعال دھواں دار تقریر کے بعد گھر لوٹتا ہے تو اپنے دل میں ہر طرح مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے ایک عظیم جنگ جیت لی ہے اور اپنے دشمنوں کو تحس نحس کر دیا اور جب اِس کے دُشمن اس کھیل میں شریک ہو کر مردہ سپاہی بن کر میدان میں گر جانے سے منکر ہوتے ہیں تو وُہ استعجاب اور حیرت کی تصویر بن جاتا ہے۔

Marfat.com

اور فلاکت میں بھی اِس کا پُر فخر سر بلند رہتا تھا۔ وُہ خوشی اور مسرت اپنی ذاتی شہامت اور شجاعت سے کشید کرتا تھا۔ وُہ ہر قسم کے جلب زر کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ موقع پڑنے پر اپنی جان کی بازی لگا دینا اس کا سب سے بڑا افتخار تھا۔ ایسے مادہ جری اور پُر جوش لوگ نہ تو تلچھٹ ہوتے ہیں اور نہ جھاگ۔ دوسرے لفظوں میں یُوں کہہ لیجیے کہ یہ لوگ ان اصولوں پر زندگی گزارتے تھے جو مغربی روایات کے مطابق اصیل امراء اور اعیان کا طرزِ زندگی ہوتا ہے۔

یہی وُہ اصول ہیں جن کی کارفرمائی شہریوں کی زندگی میں نہیں ہوتی۔ چھٹی صدی عیسوی ہی میں حجازی عربوں نے شہری زندگی کے عیش و نشاط کا مذاق پیدا کر لیا تھا۔ قدیم خانہ کعبہ مُدت دراز تک اس سادہ صحرائی زندگی کا مرکز بنا رہا۔ اس کے گرداگرد کوئی خانہ بدوش بدّو قبائل کے صف در صف خیمے ایستادہ ہوتے تھے۔ کوئی ایک صدی بیشتر ایک مضبوط قریش سردار قُصیّ نے ایک مستقل بستی کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام 'مکّہ' رکھا جسے عرفِ عام میں 'بکہ' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ قدیم سائنس کی زبان کا لفظ تھا جس کے معنی تھے "مقامِ مقدس" یا حرم محترم'

اُس دَور کے حالات اِس بات کے متقاضی تھے کہ اِس شہر کی توسیع و ترقی ہو اور یہ تجارتی مرکز بنے۔ ایرانیوں اور بازنطینوں کی محاربہ آرائی اور جدال و قتال نے شمالی سمت سے مشرق اور مغرب کی تجارتی شاہراہیں تقریباً بند کر دی تھیں، اور اہل حبش (حال کے ایتھوپیا) نے جنوبی عرب کو فتح کرنے کے بعد وہاں کی خوشحالی کا خاتمہ کر دیا تھا۔

اِس شہر مکّہ کی عظمت میں اِس بناء پر بھی اضافہ ہوا کہ یہ تمام عرب قبائل کا مرکز عبادت بھی تھا۔ قبیلۂ قریش چونکہ کعبے کا متولی تھا اس لیے اس قبیلے کو انتہائی اعزاز اور شرف حاصل ہو گیا؛ گویا وُہ دُنیوی اور اُخروی دونوں سعادتوں سے بہرہ یاب تھا۔ اپنی عظمت اور شرف کو ثابت کرنے کے لیے وُہ پُوچھتے تھے کہ کیا وُہ ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اسمٰعیل کی اولاد نہیں؟ دولت اور روحانی فوقیت کے فخر نے

Marfat.com

ان کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں کر دیا تھا کہ سطح زمین پر ان سے زیادہ کوئی باعظمت نہیں۔ ان کی رفعت، سطوت وشہامت سورج کی سی ہے اور دوسرے لوگ ان کے گرد ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی طرح ہیں۔

اس شہر مکّہ سے تجارتی شاہراہیں دُور دُور علاقوں تک جاتی تھیں امیر و کبیر تاجر اپنے ذاتی تجارتی قافلے سارے سال باہر بھیجتے رہتے تھے؛ تاہم سال میں دوبارہ اہم اجتماعی قافلے روانہ کیے جاتے تھے جن میں ساری آبادی کا سرمایہ شامل ہوتا تھا۔ ایک قافلہ موسم گرما میں یمن کی طرف، دوسرا موسم سرما میں شام روانہ کیا جاتا تھا۔ ان قافلوں کی تجارت میں شمولیت کے لیے قرض کا ایک انتہائی قدیم اور مرتب نظام تھا جس کے باعث غریب سے غریب شہری بھی اس تجارت میں حصّہ لے سکتا تھا۔ ان سالانہ قافلوں میں دو تین ہزار اونٹوں کی قطاروں پر سونا چاندی چمڑے کا سامان اور قیمتی اشیا بار کر کے لے جائی جاتی تھیں۔ قافلوں کی حفاظت کے لیے تین سو افراد تک کی ٹولی ہتھیاروں سے لیس ساتھ ہوتی تھی۔ یہ لوگ پورے شہر مکّہ کے باسیوں کے لیے منافع کی رقم لاتے تھے۔ یہ شہر کبھی جمودی حالت میں نہیں رہا۔ اس کی تنگ گلیوں اور بازاروں میں ہمہ وقت سامان سے لدے اونٹوں کی قطاریں رواں نظر آتیں جن کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں ایک نغمگی سے بجتی رہتیں۔ ان قافلوں میں عیسائی ، یہودی اور افریقی ہُوا کرتے تھے۔ یہ لوگ سفر کی گراں باری کو دُور کرنے کے لیے جادُوگروں، شعبدہ بازوں اور فاحشہ عورتوں کو ساتھ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے متمول تاجر جن کی ڈاڑھیاں اور بال خوشبوئیات اور مُشک میں بسے ہوتے اعلیٰ درجے کی سلکی پوشاکیں پہنے کروفر سے چلتے۔ ان کی جلو میں روکڑیے یعنی سکّے تبدیل کرنے والے پکار پکار کر بازنطینی اور ایرانی سکّہ جات کی شرحِ مبادلہ کا اعلان کرتے چلتے۔

صحرا کے بدو جو اپنا حقیر درجے کا مال فروخت کرنے مکّہ آتے اکثر یہاں کے تاجروں کے ہاتھوں ٹھگے جاتے۔ ان بدوؤں کا کہنا تھا کہ لفظ قریش اس لفظ سے

Marfat.com

مشتق ہے جس کے معنی ہیں رشارک، یعنی پتّے باز۔

ہر روحانی مرکز کی اور دُنیا میں وہی حیثیت ہوتی ہے جو جسم میں دل کی، مگر مکّہ کو کئی اور نوعیتوں سے بھی مرکزیت کا درجہ حاصل تھا۔ کسی ملک کی تجارتی شاہراہیں اس ملک کے جسم کی وریدیں اور شریانیں تصوّر ہوتی ہیں۔ ان کی بڑی اقتصادی اہمیّت ہوتی ہے کیونکہ اِن ہی کے وسیلے سے کسی ملک کو، لوگوں کو دولت فراہم ہوتی ہے۔ دولت ایسی شے ہے جو بعض وقت لوگوں کے دل بھی سیاہ کر دیتی ہے۔

مکّہ میں بگاڑ دو سطحوں پر پیدا ہوا۔ پہلے سطح روحانی تھی اور دُوسری مزاجی۔ روحانی سطح پر بایں اعتبار کہ کعبہ مدّت سے ایک خُدا کا گھر نہیں رہا تھا۔ دُوسری قوموں کی طرح عرب بھی اب بُت پرستی کا شکار ہو رہے تھے اور توحید کی رفعتوں سے بُت پرستی کی پستیوں میں آگرے تھے اگرچہ اِن کے دلوں سے اللّٰہ کا تصوّر کُلیّتاً ختم تو نہیں ہوا تھا تاہم وُہ اس ذاتِ یکتا اور یگانہ کو بھی ایک بہت دُور افتادہ اور ناقابلِ پہنچ دیوتا سمجھنے لگے تھے جس کا اِن کی ذاتی زندگیوں، کاروبار اور دیگر معاملات سے دُور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں وُہ اس سے کمتر درجے کے دیوتاؤں، رُوحوں اور جن و پری سے استمداد اور اعانت طلب کرتے تھے اور نوبت یہاں تک جا پہنچی تھی کہ کعبے میں تین سو ساٹھ بُتوں کا ایک جنگل بس گیا۔ لوگ اپنے انتخاب کے مطابق ان بُتوں کے پجاری بن کر ان سے منّتیں، مرادیں مانگتے تھے۔ دُور و نزدیک سے آنے والے عقیدت مند قبیلۂ قریش کے اور زیادہ مالدار بننے میں ممد و معاون ہو رہے تھے۔ دولت کی اس افزونی اور فراوانی کے باعث اہلِ قریش کے دلوں کی کثافت اور غلاظت بڑھتی جا رہی تھی۔ دُوسرے سرے پر ریگستانوں اور صحراؤں کے سخت کوش خانہ بدوش بدّو تھے جن کے لیے اِس شہر میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ شہر مکّہ کے انتظام و انصرام پر قبائلی سرداروں، متموّل تاجروں، اور شعلہ بیاں خطیبوں اور شاعروں کا کنٹرول تھا۔ یہی لوگ مقدمات کے فیصلے کرتے اور تجارت اور کاروبار کے ضابطے مقرّر کرتے تھے۔

Marfat.com

اِن لوگوں کے دلوں میں ایسی عیش پرستی اور لہو لعب نے گھر کر لیا تھا جو ان کے اجداد کے واسطے یقیناً ننگ و عار خیال کی جاتی۔ شہر میں قمار بازی، شراب نوشی اور رقص و سرود کی محفلوں کی گرم بازاری تھی۔ قریش کے آسودہ حال لوگ شرحِ مبادلہ، اشیاء کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ، تجارتی قافلوں کی آمد اور جنگ و جدال میں لوٹے ہوئے سامان پر سٹے بازی کرتے تھے۔ حقیقی عزت و ناموس کی جگہ جھوٹے وقار اور ساکھ نے لے لی تھی۔ بعض خاندانوں میں پرانی روایت کے تحت کمزوروں اور مسکینوں کے تحفظ کو اہمیت دی جاتی تھی مگر اس تحفظ میں باہر سے آکر آباد ہونے والوں کو شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ دُوسرے علاقوں سے بے شمار لوگ یہاں آکر بس گئے تھے مگر قبائلی زندگی کے دروازے ان پر بند تھے۔ مکّے جیسے شہر کا لالچی نگاہوں کے لیے لقمۂ تر کا درجہ اختیار کر جانا کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ چنانچہ سنہ ۵۷۰ عیسوی میں موجودہ ایتھوپیا اور اس وقت کے حبشہ کی طرف سے یمن میں مقیم نائب حکومت یعنی وائسرائے ابرہہ نے اس پر بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ اِس سے قبل اس نے یمن کے دارالحکومت صنار)میں ایک عظیم کلیسا تعمیر کیا تھا قریش کو جب کعبے کے اس حریف کلیسا کا احوال معلوم ہوا تو انہوں نے اس میں گند پھیلانے اور اسے ناپاک کرنے کے لیے ایک آدمی وہاں خفیہ طور پر بھیجا۔ ابرہہ کو جب
اور اسے ناپاک کرنے کے لیے ایک آدمی وہاں خفیہ طور پر بھیجا۔ ابرہہ کو جب
اِس واقعہ کا علم ہوا تو اُسے کعبے پر یلغار کرنے کے لیے کسی دُوسرے جواز کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اِس نے قسم کھائی کہ وُہ کعبے کو مکمل طور پر مسمار کر دے گا۔ چنانچہ وُہ اپنے عظیم لشکر کے ساتھ جن میں سامنے کے رُخ ہاتھیوں کی قطار تھی، کعبہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اِن اطراف کے لوگوں نے اِس سے قبل کبھی ہاتھی نہیں دیکھے تھے۔ راہ میں کسی نے اُس کے لشکر کی مزاحمت کی جرأت نہ کی حتیٰ کہ وُہ کعبے کے بالکل ہی قریب جا پہنچا۔ قریش پہلے ہی اِس شہر سے کوچ کر گئے تھے۔ اِس یلغار میں ایک مقام پر آکر ابرہہ کے ہاتھیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے متعلق کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس لشکر کی رہبری ایک عرب کر رہا تھا اُس

Marfat.com

نے کسی طرح وُہ الفاظ سیکھ لیے تھے جن سے ہاتھیوں کو بڑھایا اور روکا جاتا ہے۔ اِس نے اِن کے کانوں میں رکنے کے الفاظ پھونکے تو ہاتھی اپنی جگہ میخ بن کر ٹھک گئے اور کسی طرح آگے نہ بڑھے۔ بہرحال امرِ واقعہ کچھ بھی ہو، صورتِ حال اس وقت یہ بنی تھی کہ ہاتھی اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہو رہے تھے اور ابرہہ کی ٹڈی دَل فوج جہاں تہاں اٹک کر رہ گئی تھی پھر اس موقع پر ایک معجزہ ظہور پذیر ہوا جس کا ذکر قرآن مبین میں ان الفاظ میں مرقوم ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ؕ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۙ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۙ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ࣖ (۱۰۵: ۱—۵)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا اُن کا داؤں غلط نہیں گیا؟ (کیا) اور اُن پر جھلڑ کے جھلڑ جانور بھیجے۔ جو اُن پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے۔ تو اُن کو ایسا کر دیا جیسے کھایا ہُوا بھُس۔

ابرہہ اپنے شکستہ اور چوُر لشکر کے ساتھ لوٹ گیا اور کعبہ اپنی جگہ اسی طرح بے گزند کھڑا رہا جیسے وُہ اپنے آغاز سے کھڑا تھا۔

اُس سال جسے اہلِ عرب عرفِ عام میں عام الفیل کہتے ہیں، ۲۰ اگست کو، جہاں تک کہ تحقیق سے تعین ہو سکا ہے، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت عبداللہ، بانیٔ شہر مکہ قصیٰ کے پڑپوتے تھے۔ ان کا تعلق قبیلۂ قریش کی ایک شاخ 'بنو ہاشم' سے تھا، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ قصیٰ کے ایک بھائی زہرا کی اولاد تھیں۔

حضرت عبداللہ قریش کے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ فلسطین و شام تشریف لے گئے تھے۔ قافلے کے ساتھ وطن لوٹتے ہوئے راہ میں آپ مکے کے شمال میں واقع ایک نخلستان 'یثرب' میں کچھ عزیز و اقارب سے ملنے کی خاطر رُک گئے۔ یہیں قیام کے دوران میں وُہ بیمار ہوئے اور آخر یہیں اپنے عظیم و جلیل فرزند

Marfat.com

علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت سے کئی ماہ قبل راہی مُلک بقا ہو گئے۔

اُس زمانے میں قریش کی ریت یہ تھی کہ وُہ اپنے نوعمر لڑکے بدّوی دایاؤں کے دُودھ سے پرورش پائے، اور بدّوؤں کے ساتھ ابتدائی زندگی بسر کرنے کے لیے ریگستان بھیج دیا کرتے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ عمل صحت کے لیے مفید تھا، اس کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ یہ اپنی اصل کی طرف لوٹنے کا ایک عملی اقدام بھی تھا۔ کردار اور شخصیّت کی تشکیل کے اِن ابتدائی ایام میں ایک عرب بچّہ آزاد خانہ بدوش زندگی سے شناسائی حاصل کر لیتا تھا اور اُسے یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ربِ ارض وسموٰت ہونے کا مفہوم کیا ہے۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کے ساتھ یہاں وہاں پھرتے رہنے کے دوران میں اُسے یہ بھی تجربہ ہو جاتا تھا کہ بدلتے موسموں اور رُتوں کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں؟ اور یوں ہر نئی نسل کے آنے پر ریگستان سے رشتے کی تجدید ہو جاتی تھی۔ شہری بچّوں کے صحرائی بدوؤں سے مضبوط دوستانہ رشتے قائم ہو جاتے تھے جو بعد میں دونوں کے لیے نہایت سود مند ثابت ہوتے تھے۔

ایک بے کس اور یتیم بچّہ بہر حال بدوی دایاؤں کے لیے موجبِ کشش نہیں ہوتا تھا مگر بنو سعد قبیلے کے ایک گڈریے کی بیوی حلیمہ اُس سال بچّے لینے آنے والیوں میں سب سے غریب تھیں۔ اُنھیں کوئی دُوسرا بچّہ مل بھی نہیں رہا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے ننھے محمّد کو باوجود اِن کی یتیمی کے اپنے ساتھ صحرا لے جانا قبول کر لیا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خانہ بدوش بدوی خاندان کے ساتھ چار پانچ سال کا عرصہ گزارا۔ جوں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلنے پھرنے کے قابل ہُوئے آپؐ نے اس بدوی خاندان کے بچّوں کے ساتھ بھیڑ بکریاں چرانا اور ان کی نگہداشت کے کاموں میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ اس طرح صحرائی زندگی کے چلن اور طریقوں سے آپؐ کو شناسائی حاصل ہوئی۔ حلیمہ سعدیہ کے ساتھ قیام کے دوران جو روایات آپؐ کے متعلق بیان کی جاتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دم قدم سے اس صحرا نورد خاندان کو بڑی برکت اور خوشحالی میسّر آئی۔

Marfat.com

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر چھ برس کی ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی والدہ ماجدہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ وہ آپؐ کو لے کر یثرب تشریف لے گئیں جہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والد گرامی حضرت عبداللہ نے انتقال فرمایا تھا۔ اس زمانے میں نخلستان میں بخار کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ واپسی کے سفر میں وہ اس وبا کا شکار ہو کر دارِ فانی سے کوچ فرما گئیں۔

عربوں کی بچوں سے اُنسیت اور خاندان سے پیار یتیموں کی پرورش اور تحفظ کی ایک مستحکم ضمانت تھی، چنانچہ اسی کے تحت حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پرورش آپؐ دادا حضرت عبدالمطلب نے اپنے ذمے لے لی جو کہ قبیلہ بنو ہاشم کے سردار تھے۔ اگرچہ اس وقت ان کے اپنے کچھ بچے کم سنی کی عمروں میں تھے خصوصاً ایک صاحبزادے سیدنا حمزہؓ تو تقریباً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر تھے تاہم بوڑھے دادا کو اپنے اس یتیم پوتے سے بے حد اُنس ہو گیا تھا۔ وہ آپؐ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ خاص طور پر شام کی خنکی میں جب وہ کعبے کے سائے تلے گدیلا بچھا کر بیٹھتے تو حضور اکرمؐ ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے۔ اس وقت قریش کے سردار اور معززین آپس میں شہر کے معاملات پر باتیں کرتے اُدھر سے گزرتے تو دادا ضعیفی کی بنا پر اور پوتا صغر سنی کے باعث اِن کی صحبت سے الگ تھلگ ہی رہتے۔

حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی عمر جب آٹھ سال کو پہنچی تو قضائے الٰہی سے آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب فوت ہو گئے۔ اِس طرح آپؐ کو بچپن اور آغازِ بلوغت کے کردار ساز ایام میں والدہ اور دادا کی مفارقت کے دوہرے صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد ان کے فرزند سیدنا ابوطالب بنو ہاشم کے سردار چنے گئے۔ اُنہوں نے حضورِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کفالت اپنے ذمے لے لی۔ جیسے ہی حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام طویل سفر کے قابل ہوئے حضرت ابُوطالب انہیں ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ شام لے گئے تاکہ وہ تجارت کے طور طریقوں

Marfat.com

سے واقف ہو جائیں۔ یہاں یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ اسی سفرِ شام میں وہ ایک عیسائی راہب سے ملاقی ہوئے جس نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرۂ انور دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا آگے چل کر اللہ کا رسول ہو گا۔

حضور اکرم علیہ السلام کو اس کم عمری میں زندگی کی سرد و گرم سے آشنائی ہو گئی تھی۔ وہ ہستیاں جن سے آپؐ کو نسبتِ خاص اور بے پناہ محبت تھی آپ کو داغِ مفارقت دے گئیں تھیں تاہم اس رنج و دلگیری میں بھی آپؐ کے گرد و پیش محبت کی آغوش میں سمیٹنے والے موجود تھے۔ اس صورتِ حال نے جہاں آپ کو یہ آگہی بخشی کہ انسانی زندگی سخت ناپائیدار اور کمزور ہے وہاں اس بات کا ایقان بھی بخشا کہ اس کمزوری اور ناپائیداری کی سہار اگر ہو سکتی ہے تو مہر و محبت ہی ہو سکتی ہے۔

جب آپؐ کی عمر شریف بیس برس میں داخل ہوئی تو ایک تاجر نے جو خود سفر کرنے سے معذور تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سامانِ تجارت باہر لے جا کر فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ اس تجارتی سفر کی کامیابی کے بعد اس قسم کے دیگر تجارتی سفروں کے لیے لوگوں نے آپ کو منتخب کیا اور یہی وہ زمانہ تھا جب اس دُرِّ یتیم نے کاروبار میں اپنی دیانت اور راست بازی کے سہارے اپنی ساکھ اور عزت بنانی شروع کی۔

مکے کی ایک مالدار خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں جو دو بار داغ بیوگی سہہ چکی تھیں۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی فقید مثال دیانت داری کے چرچے لوگوں سے سُن رکھے تھے۔ اس زمانے میں لوگ آپ کو "الامین" کے لقب سے پکارنے لگے تھے۔ خدیجۃ الکبریٰ نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنا مالِ تجارت شام لے جانے کی پیش کش کی۔ یہ سفر نہایت کامیاب رہا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے واپسی پر انہیں بہت معقول منافع دیا تو خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی خوش معاملگی سے بہت متاثر ہوئیں۔ انہیں آپ کی صورت اور شخصیت نے بھی بہت متاثر کیا، اور اسی کے تحت انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس اپنی ایک سہیلی کو رشتے

Marfat.com

کا عندیہ لینے کے لیے بھیجا۔ اس خاتون نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟" حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اُسے سمجھایا: "میں خاطر خواہ وسائلِ معاش نہیں رکھتا۔" اِس پر اس خاتون نے کہا: "فرض کیجیے کہ ایک ایسی خاتون جو دولت کے ساتھ حُسن میں بھی فرید و یگانہ ہو، اگر آپ کو شادی کی پیش کش کرے تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟" اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اِس سے استفسار کیا: "ایسی کوئی خاتون تمہاری نظر میں ہے؟" اِس خاتون نے کہا: "وہی خدیجہ جن کا سامانِ تجارت لے کر آپ شام تشریف لے گئے تھے۔" یہ سُن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کسی قدر گومگو کے عالم میں فرمایا: "بھلا ایسا کہاں ہو سکتا ہے!" اس پر اس خاتون نے کہا: "اس معاملے کو آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔" حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا: "جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس رشتے پر راضی ہوں۔"

اِس وقت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی عمر پچیس برس تھی جب کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ چالیس برس کی تھیں۔ اس عمر تک پہنچ جانے کے باوجود وُہ نہایت درجے قبول صورت خاتون تھیں۔ حضرت خدیجہ رض کے والد گرامی کو اس رشتے کے مناسب ہونے میں پس و پیش تھا۔ مگر جلد ہی انہیں راضی کر لیا گیا۔ نکاح خوانی کے موقع پر حضرت ابو طالب نے دلہن کو بیس اونٹ بطور حق مہر عطا کئے اور یہ ایسی دریا دلی کا مظاہرہ تھا جو اُن جیسی مالی حیثیت والے کے لیے بہت مشکل بات تھی۔ نکاح کے موقع پر حضرت ابو طالب نے بڑا فصیح و بلیغ خطبہ دیا جو زبان و لسان اور خطابت کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ اس خطبے میں سیّدنا ابو طالب رض نے اپنے عظیم المرتبت بھتیجے ؐ کے اوصافِ حمیدہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی اور ان کی نجابت اور اعلیٰ کردار کو سراہا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نکاح کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت کے لیے ایک نوعمر غلام لڑکے "زید" کو پیش کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اِس

Marfat.com

ننھے غلام کو آزاد کر دیا۔ مگر جب اِس لڑکے کے والدین فدیئے کی رقم لے کر اُسے آزاد کرانے آئے تو اُس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور حضورِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام ہی کے خاندان کے ساتھ رہنے کی ضد کی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شادی کے بعد حضرت ابو طالب کی کمزور مالی حالت کے پیشِ نظر اِن کے فرزند حضرت علی مرتضیٰ کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ حضرت خدیجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے چھ اولادیں ہوئیں جن میں ایک صاحبزادے قاسم بھی تھے جو دو سال کی عمر تک پہنچنے پر فوت ہو گئے۔ یہی وُہ وقت تھا جب ایک خاص انداز کی شخصیتیں تربیّتِ نبوی کے تحت ڈھل رہی تھیں۔ اِن شخصیّات کے اوصاف اور جوہر سالہا سال بعد عیاں ہُوئے، یہ ایک ایسا سانچہ تھا جس پر تاریخ گومگو کے عالم میں انگشت نمائی کرتی نظر آتی ہے۔

۶۰۵ عیسوی میں قریش کے اربابِ اختیار ملأ نے فیصلہ کیا کہ کعبے کی ازسرِ نو تعمیر کی جائے گی۔ اگرچہ یہ مسجدِ ابراہیمی بے اندازہ پُرانی تھی تاہم مختلف ادوار میں اس کے وجودِ ارضی پر شکست و ریخت کا عمل برابر ہوتا رہا اور یہ کئی بار ازسرِ نو تعمیر کی گئی۔ اُس سال ایک بازنطینی جہاز ساحلِ عرب پر تباہ ہو گیا تھا۔ تعمیر کے لیے اس کی لکڑی نہایت درجے موزوں تھی۔ اُسی زمانے میں ایک عیسائی ترکھان مکّے میں آباد تھا جو لکڑی کی پاڑہ باندھنے میں ماہر تھا۔ کعبے کی تعمیر کا کام مختلف قبائل میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جب یہ کام مکمل ہُوا تو حجرِ اسود کی تنصیب پر ایک جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہر قبیلہ اس کام کی انجام دہی کا اعزاز اور فخر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب اس جھگڑے نے خطرناک رُخ اختیار کیا تو یہ فیصلہ ہُوا کہ کل جو پہلا شخص علی الصبح ایک مخصوص دروازے سے خانہ کعبہ میں داخل ہو گا، اُسے حاکم مقرر کر لیا جائے گا۔ جو فیصلہ وُہ کرے گا، سب کو منظور ہو گا۔ اگلے دن حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام پہلے شخص تھے جو اس دروازے سے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی چادر لانے کو کہا۔ جب وُہ آ گئی تو حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حجرِ اسود اس کے

Marfat.com

بیچ میں رکھا اور چادر کے کونے قبائل کے سرداروں کو پکڑا کر اُسے اُوپر اٹھانے کا حکم دیا۔ چادر جُوں ہی مقامِ تنصیب پر آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کو اپنے دستِ مبارک میں اُٹھا کر صحیح مقام پر نصب کر دیا۔ اس عمل نے سب کو خوش کر دیا اور خوفناک محاربہ آرائی کا امکان ختم ہو گیا۔

حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا عزّ و وقار اس واقعہ کے بعد سے اور زیادہ بلند ہو گیا۔ ہر شخص آپ کی معاملہ فہمی، اثابتِ رائے، شفقت اور سخاوت کا قصیدہ خواں ہو گیا۔ اب بظاہر اِن کا مستقبل انتہائی روشن تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آنے والے وقت میں حضور اپنے قبیلے کی معیشت بہتر بنا کر شہر مکّہ کی ایک اہم مقتدر شخصیت بن جائیں گے، اور شاید اپنے دادا کی طرح دیوارِ کعبہ کے سائے تلے اپنے زندگی کے آخری لمحے بِتا دیں گے، مگر حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام عُمر کے وسطانی حصّے تک پہنچنے میں اندرونی طور پر خاصے مضطرب اور بے چین رہنے لگے۔

اُس زمانے میں اُنھیں کسی خاموش گوشے کی تلاش رہتی تھی جہاں بیٹھ کر وُہ حیات و کائنات کے مسائل پر غور کر سکیں۔ آخر آپ مکّے کی پر شور گلیوں سے نکل کر شہر کے نواحی سنگلاخ اور ویران پہاڑیوں میں وقت گزارنے لگے۔ یہاں کچھ حیران کُن مکاشفے اور انقار کی کیفیتیں آپ پر گزریں۔ بعض اوقات کچھ اشکال اور ہیولے بھی نظر آتے جن سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام ہراساں ہو جاتے، پھر کبھی صُبح کے تڑکے کی سی نور بار اور پر سکون فضا پیدا ہو جاتی۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو ان پہاڑیوں میں، جو تجربات پیش آئے اِن کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا؛ تاہم جو کچھ ہم تک روایات کے ذریعے پہنچا ہے اِس کا لبِ لباب یہ ہے کہ ایک انتہائی زبردست قوت، ایک طرح کی روشنی کا تلاطم بن کر آپ کے قریب تر آ رہی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مرغِ لاہوتی آپ کے جسدِ مبارک تک پہنچنے کے لیے کھڑکیوں کے شیشوں پر اپنے پَر مار رہا ہو تاکہ اس پتلے حریری حجاب کو جو ہمارے تجربات کی مختصر دُنیا کو حقیقتِ ازلی سے جدا کرتا ہے، چیر کر اندر داخل ہو جائے۔

Marfat.com

بہرحال کارخانۂ ارضی میں اس کی تجلیات اور پر دہشت عوامل و عواقب سامنے تھے۔ بعض وقت دورانِ مراقبہ آپؐ کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ سنگلاخ چٹانیں، یہ چٹیل میدان اور ان میں بکھرے پتھر زندگی کے ولولے اور خروش سے جاگ اُٹھے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر عجیب و غریب آوازیں بھی سنتے اور اکثر خوفزدہ ہو کر اپنی چادر میں لپٹ جاتے اور یہ گمان کرنے لگتے کہ کہیں اُنھیں جنون تو نہیں ہو رہا۔ بعض اوقات یہ آوازیں اِن کا غارِ حرا کے دہانے تک تعاقب کرتیں اور ایسا معلوم ہوتا گویا یہ شیاطین کا شور و غوغا ہو۔

حضورِ اقدس علیہ التحیۃ و الثناء کے اہلِ خاندان اور احباب نے اس تبدیلی کو بڑی بے چینی سے محسوس کیا جو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بہ سرعت وقوع پذیر ہو رہی تھی وُہ جب اس کے اسباب دریافت کرتے تو آپ انہیں کچھ نہ سمجھا پاتے۔ دراصل اس وقت انہیں یہ ادراک نہیں ہو پا رہا تھا کہ ان کی طبع حقیقی ایک نئے پیرہن میں ملبوس ہو رہی ہے اور اس نے انجذابِ حقیقتِ اصلی کے لیے خود کو تیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان تنہا اور خاموش مراقبوں میں آپ کا اشتیاق تیز ہو جاتا اور اس کے ساتھ ہی دہشت بڑھ جاتی۔ دن کی کٹیلی تیز روشنی اور ریگزار کی تاروں سے جھلملاتی راتوں میں آپ کا وجود عالمِ ملکوت کے اشاروں اور تجلیات کی آماجگاہ بنا رہتا۔ دراصل یہ وحیٔ الٰہی کے لیے حضور کے وجودِ اطہر کو تیار کرنے کا عمل تھا اور نزولِ وحی اُسی وقت ہوتا تھا جب جسم و روح اس کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔

آخر وُہ گھڑی آ ہی پہنچی جب رمضان المبارک کی ایک رات کے پچھلے پہر جبریلِ اَمین پہلی وحی لے کر حاضر ہوئے۔ یہ شب، شبِ قدر کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے اس رات مظاہرِ فطرت کی آنکھ جھپک جاتی ہے۔ بہتے چشمے رُک جاتے ہیں، چلتی ہوائیں ساکت ہو جاتی ہیں اور دُنیا کو شیاطین اور ارواحِ خبیثہ کی بدنظروں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس قدر والی رات میں دیکھنے والی آنکھیں گھاس کی پتیوں کو بڑھتے دیکھتی ہیں اور کان پیڑوں کو کلام کرتے سُنتے ہیں۔ اس رات صحرا کی ریت محوِ خواب ہو جاتی

Marfat.com

ہے اور وہ ہستیاں جو اس شب قدر کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں، پاک دامنترہ ہو کر درویش اور عارف باللہ بن جاتی ہیں کیونکہ یہ وہی رات ہے جس میں انسان دستِ قدرت کی انگلیوں کی حرکت محسوس کرتا ہے۔[1]

چونکہ لیلۃ القدر کے بارے میں کوئی شخص بھی تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہی وُہ رات ہے، اس لیے شبِ قدر کے متلاشی کو چاہیے کہ وہ ہمہ وقت اس کے لیے تیار رہے، اپنے شعور کے دریچوں کو وا کرے اور اپنے حواس کو اس رات کی تجلیات و فیوضات سے مستفیض ہونے کے لیے بیدار رکھے۔

سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام غارِ حرا میں محوِ خواب تھے کہ انہیں وحی لانے والے فرشتے نے بیدار کر دیا۔ یہ وہی فرشتہ جبرائیل تھا جو مسیح علیہ السلام کی والدہ ماجدہ مریم مقدس سلام اللہ علیہا کے پاس بشارتِ مسیح دینے کے لیے آیا تھا۔ اس رات جبرائیل ایک نورانی لباس میں ملبوس تھے جس سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے آپ کو پوری طاقت سے بھینچ کر سینے سے لگا لیا اور پھر صرف ایک لفظ پر مشتمل حکم دیا "اقراء" یعنی پڑھیے۔ سرکارِ ختمی مرتب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "میں پڑھنا نہیں جانتا"، مگر "اقراء" کا یہ حکم کئی مرتبہ دُھرایا گیا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے استفسار فرمایا "مجھے کیا پڑھنا ہے؟" اس پر جبرائیل نے انہیں اور زیادہ مضبوطی سے بھینچ لیا اور یوں پہلی وحی نازل ہوئی۔ جس کے الفاظ یہ تھے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ (العلق ۹۶: ۱-۵)

(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔

---

[1] ارشادِ حضور اقدس بحوالہ اسدبے Essadbey, London : Cobden-Sauderson, 1983

Marfat.com

جس نے قلم[1] کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وُہ باتیں سکھائیں جس کا اُس کو علم نہ تھا۔

پہلی وحی کے نزول کی کہانی دُنیا کی دیگر کہانیوں کی طرح اکثر سنائی جاتی ہے؛ تاہم اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کہ اس موقع پر کیا ہُوا، ہمیں تصوّراتی طور پر ایک زقند مار کر اس حصار کے پار جانا ہو گا جو ہمیں اپنے روزمرّہ کے مرئی تجربات اور کیفیات میں مقید رکھتا ہے اور اس حصار کو عبور کرنا کوئی آسان کام نہیں، کیونکہ ہر شخص کا مزاج مختلف ہوتا ہے اور یہ قید خانہ ہر شخص کے لیے ایک مختلف چابی سے ہی کھلتا ہے۔ جن لوگوں کو عالم طبیعی کے طوفانوں، آندھیوں اور آتش فشاں کے یکلخت پھٹ پڑنے جیسے حوادث کا سامنا ہوتا ہے۔ صرف وہی اِس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ انسان کے وجود کی دُوسری جہات سے آنے والی کسی عظیم قوّت کا سامنا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ہمارے دور کے افراد مشکل ہی سے معمول کی شخصیات کے خول کو حقیقتِ ازلی کے سامنے پراسرار ملکوتی قوت سے ٹوٹنے کے عمل کو قیاس میں لا سکتے ہیں۔ بلاشبہ اس تمام کیفیت کی ترجمانی کے لیے انگریزی زبان میں آء (awe) کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں رُعب اور جلال سے دہشت زدہ ہو جانا۔ مگر یہ لفظ روزمرّہ کی بول چال میں خاصا گھس پِٹ چُکا ہے اور کیفیتِ اصلی کے اظہار کی قدرت کھو چُکا ہے اور اُس جلال اور خشیتِ خداوندی کی ترجمانی نہیں کر سکتا جو مطلوب ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں اگر کسی شخص

---

[1] احادیث میں قلم، کی علامت کی بڑی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے تمام تخلیقات میں اللہ جل و علا نے سب سے پہلے لوح محفوظ کو پیدا کیا اور اس میں وُہ سب کچھ رقم کر دیا جو تمام زمانوں میں درپیش آنے والا تھا۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک واحد نگینے سے ایک مضبوط قلم پیدا فرمایا۔ اس قلم کی نوک دو حصوں میں ایک قط سے منقسم ہے جس میں روشنی اسی طرح چلتی ہے جیسے دُنیا کے قلموں میں روشنائی۔ پھر قلم کو حکم دیا گیا کہ "لکھ!" اس حکم سے قلم مارے دہشت اور رعب خداوندی سے لرزنے اور کپکپانے لگا۔ بالکل اسی طرح جیسے بجلی کے

بقی حاشیہ صفحہ ۲۲۲ پر

Marfat.com

کے بخت کی یاوری اسے روضۂ اطہر حبیب خُدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اندر داخلے کا شرف بخش دے تو وُہ اپنے تاثرات ماسوٰی پر جلال ماحول کی دہشت وخشیت کے اور کیا بیان کر سکتا ہے۔ اگر انسان اس مرقد عظیم میں جا کر جہاں صاحبِ مزار علیہ السلام کا جسدِ اطہر اتنی طویل مُدّت سے مدفون ہے اتنا لرزیدہ اور مرعوب ہو سکتا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حبیب اللہ کا برگزیدہ فرشتہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آیا ہوگا تو آپ علیہ التحیۃ والثناء کی کیفیات روحی و قلبی کیا ہوں گی!

اب چونکہ گزرے ہوئے واقعات کا اندازہ اُن کے اثرات اور نتائج کی بنا پر کیا جاتا ہے، اس لیے ہمیں چودہ سو سال پہلے کے ایک عرب کو تصوّر میں لانا چاہیے جس کی مڈبھیڑ پردہ سرائے عالم سے ماورٰی بلندیوں سے آنے والی ایک ہستی سے ہوئی تھی۔ یقیناً یہ ایک ایسا ساعقہ پاش تحیّر خیز واقعہ تھا جس نے دُنیا کے دُور دراز گوشوں تک کے انسانوں کو ہلا کر رکھ دیا، اور دُنیا کے لاکھوں کروڑوں مرد وزن کی زندگیوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اسی واقعہ نے عظیم تہذیبوں کو پروان چڑھایا، اسی کے زیرِ اثر ہنستے مسکراتے شہروں کی تعمیر ہوئی اور اسی سے تقویت پا کر آہن و آتش میں ڈوبے لشکروں کے مُنہ موڑ دیے گئے۔ اِسی واقعہ نے خاک کے ذرّوں کو اوجِ ثریا کی رفعت بخشی اور یہی واقعہ کروڑوں نفوس کو بہشت کے دروازوں تک پہنچانے کا موجب بنے گا جو ہماری نظروں سے مستور ہے۔

(بقیہ حاشیہ ۲۲۱ کا) کڑاکے سے بادل لرز اُٹھتے ہیں۔ اس کی چال میں ایک لرزش پیدا ہو گئی، پھر اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس نے لوحِ محفوظ پر وُہ کچھ لکھ دیا جو اسے اللہ نے بتایا تھا۔ اُس نے روزِ آخرت تک کے تمام واقعات ترتیب سے لکھ دیے۔ قلم کی تخلیقی رمزیت سے ہر شخص واقف ہے، تاہم یہ تو اس زبردست آلۂ تخلیق کے کردار کا ایک پہلو ہے۔ اسلامی حوالے سے صفتِ علم اور صفتِ خلق کا خاص تعلق ایک دُوسرے سے استوار ہے۔

(قصص الانبیاء)

Marfat.com

لفظ "اِقرأ" یعنی "پڑھ" کی صدائے بازگشت سے حجاز کی وادیاں گونجنے لگیں اور وحیٔ الٰہی نے آہنی حصار پاش پاش کر دیا جس میں اُس وقت کی دُنیا مقید اور محبوس تھی ۔ غور کا مقام ہے کہ مہیب پہاڑوں اور سنگلاخ چٹانوں کے درمیان ایک انسان ہی تھا جس نے اپنے کاندھے اور اپنا قلب مطہر اُس وحیٔ الٰہی کا بارِ گراں اُٹھانے کے لیے پیش کر دیے جو اگر پُرشکوہ پہاڑوں اور مضبوط چٹانوں پر نازل ہوتی تو وُہ ہیبتِ خداوندی سے ریزہ ریزہ ہو جاتے (صلوٰۃ اللہ تعالٰی وملائکتہٖ)

منصبِ نبوت پر سرفرازی کے وقت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر چالیس برس تھی اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے یہ ماہ و سال اِس دُنیا اور اس کے علائق کے درمیان رہ کر گزارے تھے۔ عالم ملکوت سے آنے والی اِس ہستی سے پہلی مڈبھیڑ کے بعد آپ کی شخصیّت ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہو گئی۔ اِس کے اثرات کچھ ایسے تھے جیسے ایک کھال پُرتمازت اور خیرہ کن روشنیوں سے جل جُھلس جائے۔ پھر اس وقوعۂ عظیم کے بعد جو انسان حرا کی بلندیوں سے اُتر کر خدیجۃ الکبریٰ کے انفاس وفا میں خود اپنے مضطرب من کا شکیب و قرار ڈھونڈنے لوٹا تھا وُہ اِس انسان سے جو کوہ حرا کی طرف منزلیں مارتا بڑھا تھا قطعی مختلف تھا۔

نزولِ وحیٔ اولیں کے بعد کے لمحات اُس کعبۂ عرفانؐ کو یوں معلوم ہوئے جیسے کوئی اِس کا تعاقب کر رہا ہو۔ اور جب وُہ فرازِ کوہ سے نشیب کی طرف چلا تو اُس نے یہ پکار واضح انداز میں سنی تھی "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ اللہ کے رسول بنائے گئے ہیں اور میں جبرائیل ہوں"۔ پھر رحمتِ عالمین علیہ التحیۃ والثناء نے آسمان کی طرف نگاہیں بلند کیں تو اُفق پر اس فرشتے کو تمام پر محیط پایا۔ جس طرف بھی رُخ پھیرا اُسی کی شبیہ نظر آئی۔

آپؐ تیز تیز قدموں سے گھر لوٹے اور وہاں پہنچتے ہی خدیجۃ الکبریٰ کو آواز دی کہ مجھے ڈھانپ دو ۔ مجھے ڈھانپ دو۔ وفاکیش زوجۂ مطہرہ نے آپؐ کو بستر پر لٹا کر کمبل سے ڈھانپ دیا۔ پھر جب ذرا ہوش و حواس بجا ہوئے تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام

Marfat.com

نے حرا میں پیش آنے والا ماجرا بیان فرمایا۔ خدیجۃ الکبریٰ نے اُنھیں اپنے جسم سے لپٹا کر زمینی اتصال کا احساس دِلایا جو ایسی روحانی واردات کے بعد کسی کے ہوش و حواس کی سلامتی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

سراپا ایثار زوجہ نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو یقین دلایا کہ جس وارداتِ غیبی سے آپ دوچار ہوئے ہیں اس کی صحت پر اُنہیں یقین کامل ہے۔ جب آپ کو ان تسلّی آمیز الفاظ سے کچھ ڈھارس ہوئی اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی آنکھ لگ گئی تو خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا اپنے برادرِ عم زاد ورقہ کے پاس دوڑی گئیں۔ ورقہ اُن 'حنفاء' میں سے تھے جنہوں نے بُت پرستی سے عاجز آکر خدائے واحد کا عرفانِ دینِ ابراہیمی یا دینِ عیسوی کے وسیلے سے حاصل کرنے کے لیے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی۔

جب خدیجۃ الکبریٰ نے اپنے شوہر نامدار کو پیش آنے والے واقعات ورقہ سے بیان کیے تو اُنھوں نے سارا ماجرا غور سے سن کر فرمایا: "اُس خدائے واحد کی قسم، جس کے ہاتھوں میں ورقہ کی جان ہے، اگر جو تم کہتی ہو، سچ ہے تو محمدّ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات بلند ہو گئے ہیں، اِن کے پاس وہی ناموسِ اکبر (جبرائیل) آئے ہیں جو موسیٰ علیہ السّلام کے پاس آئے تھے۔ یقیناً وُہ اس قوم پر نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اپنے شوہر کو تسلّی دو اور اپنے خدشات بھی رفع کر لو۔"

اِس کے بعد حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام پر کچھ اور وحیاں بھی نازل ہوئیں جن کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی مقدار اور تعداد کیا تھی، پھر کچھ ہفتوں یا شاید مہینوں تک ملائے اعلیٰ سے پیغامات کا سلسلہ منقطع رہا جس کے نتیجے میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو اپنے چاروں طرف ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے کا سا احساس ہونے لگا۔ فرشتے کی آمد خواہ کیسی ہی پُر خوف کیوں نہ ہو مگر اب یکلخت اس کا نہ آنا اُس سے کہیں زیادہ موجبِ اضطراب اور اذیت ہو گیا، کیونکہ اب آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی طبعی انسانی کمزوریوں کے ساتھ خود کو یکّہ و تنہا محسوس کرنے لگے۔ ان ایام میں آپ کا تاثر یہ تھا کہ جیسے وحیِ ربِ علا نے دُنیا کے گرد منڈھے خول میں ایک روزن کھول دیا تھا جس

Marfat.com

ہیں سے آپؐ کو طرح طرح کے منظر نظر آئے اور آپؐ کے کانوں نے عجیب و غریب آوازیں سنیں مگر جوں ہی سلسلۂ وحی منقطع ہوا تو یوں لگا جیسے اس تنگ و محدود مادی دنیا میں زندگی بسر کرنا انتہائی ناقابلِ برداشت ہو۔ اس عالم آب و گل کے حجابات دُور ہونے کے بعد جو حقائق آپ پر منکشف ہوئے اور جو کیفیات آپ پر گزریں انہوں نے آپ کو اپنے ہی لوگوں کے درمیان اجنبی بنا دیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود بابرکت ملائے اعلیٰ اور دنیا کے درمیان ایک غیر ملوکہ علاقہ ہو۔ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا کہ بھلا میری باتوں پر کون یقین کرے گا ؛ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ وُہ انہیں پیش آنے والے تمام واقعات پر یقین رکھتی ہیں مگر آپؐ سوچتے تھے کہ یہ تو انہوں نے بہ تقاضائے اُنس و محبت کہا ہے۔ بھلا دوسرے ان کی باتوں پر کیا یقین کر سکتے ہیں جب کہ خود انہیں اپنی وارداتِ روحانی پر یقین نہیں آ رہا ہے!!

ان واردات غیبی کے آغاز کے دوران میں کچھ عرصے تک آپ کے دل میں خود پر دورۂ جنوں کا گمان جاگزیں رہنے لگا تھا۔ اس موڑ پر آ کر اس میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظروں سے ایسے بہت سے مخبوط الحواس لوگ گزرے تھے جو غائب اور نامعلوم کے متعلق اوندھی سیدھی باتیں ہذیان کے انداز میں بکتے رہتے تھے۔ یہ لوگ شہری سماج کے مدمغ لوگوں کی نظروں میں انتہائی ناپسندیدہ قرار پائے تھے اور اُنہیں نشانۂ تضحیک بنایا جاتا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہمیشہ سے ایک عملی انسان تھے۔ کاروبار نہایت کامیابی سے چلاتے رہے تھے۔ علاوہ ازیں ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو ہر چیز کے عملی پہلو دیکھنے کی خُو رکھتی تھی اور مبہم روحانیات میں غلو کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے کی عادی تھی۔ اِن لوگوں کا یہ مزاج اس لیے بھی بن گیا تھا کہ ریگستانی زندگی میں خواب دیکھنے والے اور اپنے تصوّرات میں سرشار لوگوں کا پنپنا بہت مشکل تھا۔ اپنے متعلق حیرت زا افکار و تواحش میں گم آپ سکون اور عافیت تلاش کرنے مکّے کی نواحی پہاڑیوں میں گرمِ خرام ہو جاتے۔ ایک دن اُونچے ڈھلوان ٹیلے پر چڑھتے ہوئے آپ کے قدموں

Marfat.com

تلے سے ایک پتھر سرک کر گہرے کھڈ میں جا گرا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے بعد کی زندگی میں ایک موقع پر فرمایا کہ پتھر کو نیچے جاتے دیکھ کر میرے دل میں اچانک یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اپنی روح میں بپا تلاطم اور گرانباری کے مداوے کی خاطر میں بھی اس کے ساتھ ہی نیچے کی طرف جست لگا دُوں۔ کچھ راویوں کا بیان ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ عین اس وقت مجھے جبرئیل کی آواز سُنائی دی کہ اے محمد! (صلّی اللہ علیہ وسلّم) آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اور اس آواز کو سُن کر آپؐ گھر لوٹ آئے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ایک نئی وحی نازل ہوئی جو سورۃ والضحیٰ کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

وَالضُّحٰی ۝ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی ۝ وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی ۝ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ۝ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ (الضّحیٰ (۹۳): ۱-۱۱)

آفتاب کی روشنی کی قسم، اور رات (کی تاریکی) کی جب چھا جائے (اے محمدؐ) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ (تم سے) ناراض ہُوا۔ اور آخرت تمہارے لیے پہلی (حالت یعنی دُنیا) سے کہیں بہتر ہے، اور تمہیں پروردگار عنقریب وُہ کچھ عطا فرمائیگا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ بھلا اُس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی (بے شک دی) اور رستے سے ناواقف دیکھا تو سیدھا رستہ دکھایا اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا۔

اور اس سورۃ مبارکہ کے بعد سے وحیٔ الٰہی کا سلسلہ آپ کی زندگی میں تسلسل سے جاری ہو گیا۔ جب کوئی وحی نازل ہوتی تو آپؐ کے اصحاب بھیڑ بکریوں کی کھالوں، پارچات اور جو شے بھی اس وقت دستیاب ہوتی، پر وحی کے الفاظ لکھ لیتے یا پھر اُسے حفظ کر لیتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا ارشاد ہے بعض وقت گھنٹیوں کی تیز جھنجھناہٹ کی طرح

Marfat.com

وارد ہوتی تھی اور یہ وقت مجھ پر بہت کٹھن ہوتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فرشتہ انسانی روپ میں میرے پاس آکر پیغام الٰہی سنانے لگتا۔ وہ جو کچھ کہتا میری سمجھ میں آجاتا تھا۔ آپؐ پر سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ ایمان لائیں۔ اس کے بعد مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ جو ایک خاموش طبع حساس صحابیٔ رسول تھے ایمان لائے۔ مکے کی سماجی زندگی میں ان کی شہرت ایک ثالث بالخیر کی حیثیت سے تھی۔ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ایک موقع پر ان کے لیے فرمایا تھا کہ میں نے دعوتِ اسلام کے سلسلے میں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جسے میں نے دعوت دی ہو اور وہ طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا نہ ہو، ماسوی حضرت ابوبکرؓ کے۔

شیعہ فرقے کے لوگ اس مسئلے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شمار کرتے ہیں جن کی عمر اس وقت دس برس کی تھی اور وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس کے بعد اس گھر کے دوسرے فرد زیدؓ بن حارث تھے جو علیؓ کے بعد ایمان لائے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ رسالت کے پہلے دو تین برسوں میں ایمان لانے والوں کی تعداد بیس سے زائد نہیں رہی ہوگی۔ پھر حضرت رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اپنے قبیلے بنو ہاشم کے سربرآوردہ لوگوں کو ایک بہت بڑی دعوتِ طعام دی اور انہیں پیغام حق سنایا جس کے سنتے ہی یہ دعوت درہم برہم ہوگئی کیونکہ آپ کے چچا ابولہب نے انتہائی دریدہ دہنی سے کام لیتے ہوئے مغلظ گالیاں دینی شروع کر دیں اور دعوت سے اُٹھ کر چل دیا۔ ابولہب جلد ہی اس نئے دین کا بدترین دشمن بن گیا۔

تبلیغ اسلام میں ایک زبردست تبدیلی اُس وقت آئی جب اللہ عزوجل کا حکم آیا کہ اسلام کی تبلیغ اور بُت پرستی کی مذمت کھلے بندوں شروع کر دو۔ شروع شروع میں قریش کے سرداروں اور سربرآوردہ لوگوں نے اہلِ ایمان کے اس مختصر گروہ کو نظر انداز کیا اور رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو خود فریبی میں مبتلا اور ذاتی شہرت کا شوقین شخص سمجھا۔ مگر اب انہیں احساس ہوگیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا سب سے زیادہ

Marfat.com

اثر غریب، بے زر اور بے زمین لوگوں پر زیادہ ہو رہا ہے۔ اس لیے انہوں نے نہ صرف اس نئے دین کو اپنے مذہب کے لیے انتہائی خطرناک سمجھا بلکہ قریش کی مالداری اور سطوت کے لیے بھی اسے ایک چیلنج سمجھا۔ باوجود بغض اور کینہ رکھنے کے قریش اس وقت مومنین کے ساتھ کھلے تصادم کے حق میں نہیں تھے کیونکہ اس قبیلے کی قوت قبائل کے اتحاد میں مضمر تھی، خصوصاً جب کہ ان کے سامنے یثرب کی مثال بھی تھی، جسے آپس کے اختلافات اور کش مکش نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ پھوٹ پڑ جانے سے یہی کچھ یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے بامر مجبوری انہیں عملی جنگ سے اجتناب کرنا پڑا۔ ان پر ایک دباؤ قبیلہ بنو ہاشم کا بھی تھا جس کے فرد حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام بھی تھے۔ بنو ہاشم کے افراد نجی طور پر حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو نجی طور پر جو کچھ بھی اس وقت سمجھتے ہوں مگر رسول اکرم پر کسی حملے کی صورت میں قبائلی رسم و رواج کے مطابق ان پر حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی مدافعت فرض تھی۔ اس لیے وقتی طور پر قریش نے حضرت احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو ہدفِ تضحیک بنانے اور طرح طرح سے ایذا دینے ہی پر اکتفا کیا کہ بدتمیزی، استہزا اور زِک دینا ہی وہ حربے ہوتے ہیں جن کے ذریعے ایک عام آدمی کسی اجتماعی جنگ کا خطرہ مول لیے بغیر کسی سچائی کے خلاف صف آرا ہو سکتا ہے۔

حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے سابق ولی اور سرپرست سیدنا ابو طالب نے حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے بڑی دلداری سے کہا کہ وہ تبلیغ حق کے کام میں اتنی تیزی نہ دکھائیں، ذرا آہستہ کام کریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قبیلے کی کشتی ہی ڈوب جائے۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا: "خدا کی قسم! چچا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں، تب بھی میں پیغامِ حق کی تبلیغ سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اِس کام میں یا تو خدا مجھے کامیابی سے ہمکنار کرے گا یا پھر میں اسی جدوجہد میں اپنی زندگی ختم کر دوں گا۔"

اِس پر سیدنا ابو طالب نے ایک آہ بھری اور فرمایا: "میرے بھائی کے بیٹے! میں

Marfat.com

تیرا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

پھر جوں جوں حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے روحانی اثرات پھیلنا شروع ہوئے توں توں قریش سرداروں اور معززین کی قوت اور بالادستی کا سنگھاسن بھی ڈانواں ڈول ہونا شروع ہو گیا۔ ان کے اپنے خاندان اور کنبے قبول اسلام کے نتیجے میں منقسم ہو رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے مکّے کی فضا میں سخت کشیدگی پیدا کر دی۔ اسلام کا اثر و نفوذ اس کے باوجود برابر بڑھتا رہا۔ پھر جب رسول خُدا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہونے والی آیاتِ وحی میں قریشی امراء و اعیان کی لالچ، جلب زر، کینے اور بغض و حسد کی مذمت آئی تو مکّے کے حاکموں کے ٹولے کا غیظ و غضب اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس وقت مخالف قریش گروہ کی سربراہی ابوجہل اور ابولہب کے ہاتھوں میں تھی۔ ان میں ابوسفیان بھی شامل ہو گیا جو رشتے میں ابولہب کا بہنوئی ہوتا تھا۔ وُہ ان دونوں سے کہیں زیادہ ذہین اور تر دماغ تھا۔ ایک دن رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے چچا جو عُمر میں اِن کے ہم عمر بھی تھے اور ایک اعلیٰ درجے کے شکاری بھی، شکار سے لوٹے تو انہیں یہ اطلاع ملی کہ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ آج ابوجہل سخت بدسلوکی سے پیش آیا ہے۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مغلظ گالیاں دی ہیں اور ان کی سرعام بے عزتی کی ہے۔ حمزہ رضی اللہ عنہ یہ خبر سنتے ہی مشتعل ہو کر ابوجہل کے پاس پہنچے اور کمان کاندھے سے اتار کر اُس کے سر پر دے ماری اور وہیں اعلان کر دیا کہ آج سے وُہ بھی مسلمان ہیں۔

ایک اور اہم واقعہ اس دَور کے ایک مضبوط سرپھرے اور انتہائی بارعب اور پرجلال نوجوان (حضرت) عمر ابن الخطاب کا قبول اسلام تھا۔ انہوں نے جب اس نئے مذہب کی ہوش رُبا کامیابیاں دیکھیں تو تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وُہ حضرت محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کو قتل کر دیں گے اور اس کے بعد کے نتائج کی پرواہ نہ کریں گے۔ کسی نے ان سے کہا اُنہیں قتل کرنے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری اپنی بہن اور بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ وُہ غصّے میں اُبلتے جب بغیر اطلاع اپنی بہن کے گھر میں جا گھُسے تو انہوں نے بہن اور بہنوئی کو سورۃ طٰہٰ کی تلاوت کرتے پایا۔ جب اِن کی بہن نے اقرار کر لیا کہ ہاں

Marfat.com

ان کے شوہر اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے تو حضرت عمرؓ نے دونوں میاں بیوی کو بُری طرح زدوکوب کیا۔ بہن کے جسم سے خون نکلتا دیکھ کر وُہ قدرے شرمندہ ہوئے اور انہوں نے کہا؛ "اچھا مجھے دکھاؤ تم لوگ کیا تلاوت کر رہے تھے"۔ ان کی بہن نے پارۂ قرآن کریم ان کے حوالے کیا تو اس پر نظر پڑتے ہی ان کے دل و دماغ میں ایسی تبدیلی رُونما ہوئی کہ وُہ فوری طور پر چلتے ہوئے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ان کی تبدیلیٔ مذہب کا تقابل شاہراہ دمشق پر پال (پالوس) مبلغ عیسائیت کے قبول مذہب عیسوی سے کیا جا سکتا ہے۔ قریش کا بس اب لے دے کر ان غریب اور بے کس مسلمانوں پر چلنا تھا جو یا تو ان کے غلام تھے یا پھر انتہائی نادار اور غریب تھے۔ ان غریبوں اور غلاموں کو ہدف ظلم اور شقاوت بنایا جاتا اور انہیں طرح طرح کی جسمانی ایذائیں پہنچائی جاتیں اور زدوکوب کیا جاتا اور ان پر دباؤ ڈالا جاتا کہ وُہ اپنے نئے مذہب سے منحرف ہو جائیں۔ حضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس ماحول اور وقت میں ان بیکسوں کی کسی موثر مدد سے قاصر تھے۔

ایک سیاہ فام غلام بلال کو زدوکوب کرنے کے بعد صحرا کے تپتے ہوئے پتھروں پر لٹا کر ان کے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ کر انہیں مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ "احد، احد" ہی کے نعرے لگا رہے تھے کہ ناگاہ حضرت ابو بکر کا اُدھر سے گزر ہُوا تو انہوں نے بلالؓ کے مالک کو ایک گراں قدر فدیہ دے کر انہیں آزاد کرا لیا اور اُسی زخمی حالت میں اُنہیں لے کر حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس لے گئے۔ درِ رسولؐ پر بلال کا خاطر خواہ علاج اور تیمارداری ہوئی تو وُہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں رہے اور حضورؐ کے بہت قریبی اور عزیز ترین صحابہ میں شمار ہونے لگے۔

جب خاصے عرصے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو نماز کے لیے کس طرح بلایا جائے تو حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے یہ تجویز پیش کی کہ انسانی آواز منادیٔ صلوٰت کے لیے سب

Marfat.com

سے موزوں ہے تو یہ تجویز قبول کر لی گئی اور حضرت بلالؓ اسلام کے پہلے مؤذن مقرر ہوئے۔ وُہ انتہائی سیاہ فام اور دبلے پتلے، دراز قد انسان تھے۔ اُن کی آواز میں ایک وجد آفریں کیفیت تھی۔ کہاوت ہے کہ چلچلاتی دھوپ میں جبر و تشدّد کے لیے انھیں تپتی ریت پر لٹایا جاتا تھا جس کی وجہ سے سُورج کی حدت نے ان کا سب کچھ جلا ڈالا تھا۔ ماسویٰ اللہ واحد اور اس کے رسول واحد کی محبت کے جو اپنی جگہ مستحکم رہی۔

غریب اور نادار مسلمانوں پر جب ظلم و شقاوت کی انتہا ہو گئی تو حضور رحمۃ اللعالمین علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ان ستم زدہ مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وُہ اور کچھ نہیں تو عارضی طور پر ہی حبشہ یعنی موجودہ ایتھوپیا ہجرت کر جائیں جہاں کا عیسائی بادشاہ نجاشی ایک عادل اور صالح حاکم ہے۔ چنانچہ ۶۱۴ء میں تقریباً اسّی مسلمان جن میں حضرت عثمانؓ ابنِ عفان بھی شامل تھے ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی ایک صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی ابولہب کے ایک فرزند سے خاصا عرصہ پہلے ہو گئی تھی۔ اس دشمنِ اسلام نے، جس کے دہکتے ہوئے سُرخ چہرے کی نسبت سے ہی اسے ابو لہب یعنی "شعلے والا" کہا جاتا تھا، اپنے بیٹے کو مجبور کر دیا کہ وُہ حضرت علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی صاحبزادی کو طلاق دے دے۔ یہ طلاق جب عمل میں آگئی اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی خلاصی ہو گئی تو کچھ عرصے بعد حضور ختمی مرتبتؐ نے اِن کا نکاح حضرت عثمان ابنِ عفان رضی اللہ سے کر دیا۔

مسلمانوں کی ہجرت حبشہ کے بعد مکّے والوں کو احساس ہوا کہ اہلِ اسلام کے ایک بیرونی طاقت سے بھی روابط ہیں اور اس بات نے انہیں اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ اُنھوں نے مسلم مہاجرین کے پیچھے اپنا ایک سفیر بادشاہ نجاشی کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا کہ نجاشی کو راضی کرے کہ وُہ مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال کر قریش کے حوالے کر دے۔ قریش سفیر کی نجاشی کے دربار میں پیشی کے موقع پر مسلمانوں کو بھی بلوایا گیا اور اس موقع پر ایک عظیم مباحثہ ہوا جس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ پہلے تو اُنھوں نے نجاشی کے سامنے یہ ثابت کیا کہ وُہ اُسی خُدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں جس کو عیسائی اپنا خدا مانتے ہیں، پھر اُنھوں

Marfat.com

نے وُہ قرآنی آیات تلاوت کیں جو مریم مقدسہ کے متعلق وارد ہوئی تھیں۔ اِن آیات کو سُن کر نجاشی رو دیا اور اس نے کہا: "یقیناً یہ دین اِسی سرچشمۂ ازل سے آیا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام اپنا دین لائے تھے۔"

ہر طرف سے اپنی دشمنانہ کارروائیوں کے بے اثر اور بے سود ہو جانے پر مکے کے حکمران ٹولے نے ابوجہل کی سربراہی میں ایک باضابطہ عہد نامے کی صورت گری کی جس میں قبیلۂ بنو ہاشم کا بائیکاٹ کیا جانا طے پایا۔ اس محضر میں اِس بات کا عہد کیا گیا تھا کہ جب تک یہ قبیلہ حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے درمیان سے باہر نہیں نکال پھینکتا، اس وقت تک نہ ان کے ہاتھ کوئی سودا فروخت کیا جائے گا نہ ان سے کچھ لیا جائے گا اِن کی کسی بیٹی کا رشتہ بھی نہیں قبول کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں کوئی بیٹی دے گا۔ لکھے جانے کے بعد عہد نامہ کعبے کی دیوار پر ٹانگ دیا گیا تھا۔ یہ مقاطعہ تقریباً دو برس جاری رہا مگر قریش کے دُوسرے تمام اقدامات کی طرح یہ بھی موثر ثابت نہیں ہوا کیونکہ قریش کے سماجی ڈھانچے کی بُنت ایک دُوسرے کے ساتھ قرابت اور شادی بیاہ کے رشتوں سے ایسی گُھی ہوئی تھی کہ اِس میں سے مکمل طور پر کسی قبیلے کا مکمل انخلا قابلِ عمل نہ تھا۔

بہرحال اس مقاطعہ سے قریش کی تجارت پر بہت بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ دو سال کے اندر اندر اس محضر کے حروف دیمک نے چاٹ لیے اور اس پر صرف یہ مرقوم رہ گیا: "اے اللہ تیرے نام سے۔" یہ گویا قدرتِ الٰہی کا ایک تازیانۂ انتباہ تھا اُن لوگوں کے لیے جن کے دماغوں نے اس میثاقِ شر کو تیار کیا تھا۔

---

۶۲۰ سن عیسوی وُہ سال تھا جسے مسلم تاریخ میں "عام الحزن" (غم کا سال) کہا جاتا ہے۔ اسی سال کے دوران میں حضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ کے رفیق چچا اور قریش کے سردار سیدنا ابوطالب اسّی برس کے لگ بھگ عمر پا کر فوت ہو گئے۔ اس مشفق چچا کی رحلت کے بعد حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اب اپنے قبیلے بنو ہاشم کی طرف سے اپنے تحفظ کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام چاروں طرف سے دشمنوں اور بدخواہوں میں

Marfat.com

گھر گئے جن کے بغض اور کینے میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کا ہدف صرف آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ بابرکات تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس منارۂ رُشد و ہدایت کو ڈھا دیں گے تو پھر اِن کے دین کا بھی نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ دشمن اپنے پنجے تیز کر رہے تھے کہ ناگاہ ایک اور بجلی گری۔ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی صابرہ اور وفا کیش زوجۂ مطہّرہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا رحلت فرما گئیں اور یُوں اِس سالِ حزن و محن میں وُہ دو اہم ستون جن پر آپؐ کے تحفظ و پُشت پناہی کا سائبان تنا ہُوا تھا یکے بعد دیگرے ڈھے گئے۔ آپ تنہا رہ گئے اور دُنیا آپ کے لیے تاریک ہو گئی۔ اِس ابتلا انگیز مراحل سے ایک معجزہ ہی آپ کو نکال سکتا تھا: چنانچہ اِس سالِ محن کے اختتام پر معجزۂ مالک وفا در رُونما ہُوا اور وُہ معجزہ تھا آپ کی معراج جس کے متعلق اس جل وعلا نے آیاتِ وحی میں یہ فرمایا:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝ (بنی اسرائیل (۱۷) :۱)

"وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصٰی (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم اُسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وُہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

دوسری بات یہ ہے:

وَ لَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی ۙ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی ۝ عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی ؕ اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی ۙ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ۝ لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی (النجم (۵۳) : ۱۳-۱۸)

"اور انہوں نے اس کو ایک اور بار بھی دیکھا ہے۔ پرلی حد کی بیری کے پاس اُسی کے پاس رہنے کی بہشت ہے جبکہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔ اُن کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کی

Marfat.com

قدرت کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

اِن آیات مبارکہ میں یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہونے والے دو واقعات کا ذکر ہوا ہے۔ ایک واقعہ 'اسراء' ہے یعنی آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا شب میں سفر۔ دوسرا واقعہ معراج ہے۔ ان دونوں واقعات کی تفاصیل اور تصریحات حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمائیں جو بہ وسیلہ احادیث اور سینہ بہ سینہ روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ اس سلسلے میں جو مذہبی لٹریچر منصۂ شہود پر آیا وہ اتنا وسیع اور شاخ در شاخ ہے کہ بعض اوقات حقائق اور عناصر کی سرحد مٹ جاتی ہے۔

بہر حال اس صورتِ حال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تمام واقعات کو ظہور پذیر کرنے والے خالقِ حقیقی ہی اِن تصوّراتی و تمثیلی نوعیت کے واقعات کو تحریک دی ہے کہ اس واقعہ کی اصلی اہمیّت اجاگر ہو سکے۔

شبِ معراج وحیٔ الہامی کے پیام بردار فرشتے جبرائیل امین اُس حجرے میں تشریف لائے جو کعبۃ اللہ سے کچھ ہی دُور تھا اور جہاں آپ اِس شب محوِ خواب تھے۔ جبرائیل نے اپنے پاؤں سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو چھوا۔ آپؐ بیدار ہوئے مگر کسی کو نہ پا کر دوبارہ استراحت فرما ہو گئے۔ فرشتۂ عالم ملکوت دوبارہ اور پھر سہ بارہ آیا۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا بیان ہے کہ پھر اس نے مجھے بازو پکڑ کر اُٹھایا تو میں اُٹھ کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پھر وُہ مجھے لے کر مسجد الحرام کے دروازے باہر آیا تو وہاں میں نے ایک سفید جانور کو جو خچر اور گدھے کی درمیانی جسامت کا تھا کھڑا پایا۔ اُس کے پہلوؤں میں دو بازو تھے اور اسی کے نیچے سے وُہ اپنی ٹانگیں چلاتا تھا، اور اس کا ہر قدم وہاں تک کا فاصلہ طے کر لیتا تھا جہاں تک کہ آنکھ دیکھ سکتی ہے۔[1]

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے بیان کے مطابق آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام اس عجیب و غریب جانور پر جس کا نام 'براق' تھا جس کے معنی روشنی کے کوندے کے ہیں، سوار ہوئے

---

[1] اقتباس از سیرتِ رسول از ابن اسحٰق۔

Marfat.com

تو وُہ اِس سرعت اور تیز رفتاری سے چلا کہ جس کے آگے کسی رفتار کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وُہ پہاڑوں اور ریگستانوں پر سے اُڑا چلا جا رہا تھا کہ ایک مختصر وقفے کے لیے کوہ سینا پر رکا جہاں موسیٰ علیہ السّلام کو تورات عطا ہوئی تھی۔ پھر وہ سپاٹے بھرتا یروشلم میں اُترنے سے پہلے عیسیٰ علیہ السّلام کی جائے پیدائش بیت اللحم پر ایک ثانیے کیلئے رکا۔

یروشلم میں حضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے نبیوں اور رسولوں کے ایک اجتماع کی نماز میں امامت فرمائی۔حضرت ابراہیم علیہ السّلام، موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسٰی رُوح اللہ اس جماعت کی اگلی صف میں تھے۔

یہ مقام وہی تھا جہاں کبھی حضرت سلیمان علیہ السّلام کے ہیکل کی تعمیر ہوئی تھی اور آگے چل کر اسی مقام پر قبتہ الصّخرۃ؛ یعنی گنبد والی مسجد مسلمانوں نے تعمیر کی۔نماز کے بعد ایک بہت بڑی سیڑھی آپ کے سامنے لگا دی گئی۔حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا بیان ہے کہ اس سے بہتر اور خوبصورت میں نے اور کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔یہی وُہ سیڑھی تھی جس کی دید کی آرزو مرتے ہوئے لوگ کرتے ہیں کیونکہ یہ اس طرف لے جاتی ہے جس کی آرزو ہر مومن کے قلب میں جاگزیں ہوتی ہے بلکہ یہ تو اس سے بھی وارء الورائی نُورٌ علیٰ نُور تک لیجاتی ہے۔

فرشتہ کی رہبری میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اس سیڑھی کے ذریعے اوپر ملائے اعلیٰ کی منازل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا جہاں پہنچ کر آپ نے پھر اُن نبیوں اور رسولوں سے ملاقات کی جن سے یروشلم میں مل چکے تھے۔یہ حضرات یروشلم میں اپنی انسانی اشکال اور صورتوں میں بہ نظر آئے تھے مگر اس دُوسری ملاقات میں وُہ اپنے اصلی نورانی رُوپ میں تھے۔

بہشت کے طبقات کے درمیان باغوں کے متعلق رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا کہ ایک کمان کے برابر ان کا ٹکڑا دُنیا کی ہر شئے سے خوبصورت اور بہتر تھا۔حوران بہشتی کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اگر بہشت بریں میں موجود عورتوں میں سے کوئی اس دُنیا میں وارد ہو جائے تو زمین اور بہشت کے درمیان خلا نور اور خوشبو سے معمور ہو جائے۔

بہشت کے ہر طبقے میں سرکار ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسّلام عام فرشتوں اور اس فرشتے سے ملے جو اس طبقۂ جنّت کا داروغہ تھا۔ان میں سے ہر فرشتہ ہزاروں فرشتوں

Marfat.com

کے لشکر کا قائد تھا۔ معراجِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق جس قدر کثیر کتابیں اور تفسیریں ملتی ہیں وُہ سب محیرّ العقول واقعات عجیب و غریب تمثیلوں سے پُر ہیں۔ بعض اذکار اور بیان کردہ اشکال اور ہیولے ہمارے تصوّر میں چکا چوند پیدا کر دیتے ہیں اور بعض ہماری فکر کو مضطرب اور پریشان کر دیتے ہیں۔ اگر یہ خوشی اور پریشانی کی کیفیات پیدا نہ ہوں تو لوگ سمجھنے لگیں کہ انھوں نے بہشت کے حالات اور واقعات کا ادراک دنیاوی حوالے سے کر لیا ہے۔ ان محیر العقل حقائق کو جن کا ادراک عقلِ انسانی کے بس سے باہر ہے، بیان کرنے کی یہ تکنیک ابتدا میں مسیحی داعیوں اور مبلغوں نے فرشتوں کی شان و شوکت بیان کرنے کے لیے اختیار کی تھی۔

اہلِ اسلام بھی غیبی مخلوق اور فرشتوں کے متعلق اپنا ایک مخصوص تصوّر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کا تصوّر یہ ہے کہ جبرائیل علیہ السّلام کے چھ ہزار پنکھ ہیں اور ہر دو پنکھوں کا فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ان کے پَر سر سے پیروں تک ہیں جن کا رنگ زعفرانی ہے۔ ہر پر میں سے سُورج جیسی شعاعیں نکلتی ہیں۔ ہر روز وُہ بحرِ نور میں چھ سو۶۶ ساٹھ بار غوطہ زن ہوتے ہیں اور جب وُہ اس سمندرِ نور سے نکلتے ہیں تو روشنی قطرے بن کر اُن کے پروں سے جھڑتی ہے اور اللہ جل و علا ان قطرات سے جبرائیل کے ہم شکل فرشتے تخلیق فرماتا ہے جو یوم النشور تک کے لیے اس خالقِ اکبر کی حمد و ثنا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

اور پھر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس شان و عظمت کا فرشتہ بھی اللہ جل و علا کا ادنیٰ غلام ہے اور اس بارگاہِ نور میں اس کی حیثیت بھی بمشکل مٹّی کے ایک ذرّہ جتنی ہے۔ جب جبرائیل امین حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی رہبری فرماتے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو اس سے آگے جانے سے انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس سے آگے قدم رکھنے کی اُن میں سکت و مجال نہیں، گویا یہ مقام منتہائے تخلیق تھا یعنی یہ انسانی ہستیوں اور فرشتوں دونوں کی تخلیق کی آخری حد تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر جبرائیل امین نے اپنے پر پھیلائے اور عرض کی: اے محمدؐ! (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) آپ جس قدر قریب جا سکیں جائیں اور جھکتے ہی

Marfat.com

سجدہ ریز ہوتے جائیں۔" حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام زمان ومکان کے تعینات سے بلند تنِ تنہا حریم قدس کی طرف بڑھے اور عرش کبریا کے سامنے جا کر سجدہ ریز ہو گئے ۔ اس حالت میں آپ نے اپنے قلب کی آنکھ سے اپنے رب کا مشاہدہ کیا اور اپنے روح کی آواز سے ربِّ لایزال سے گفتگو فرمائی جب کہ اس مقام سے بہت نیچے فرشتے توحید و تشہد میں زمزمہ سنج تھے:

"ہم گواہی دیتے ہیں ساری عظمت اور بلندی اِس رب ہی کو سزاوار ہے، اور جز اِس کے کوئی معبود نہیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

معراج سے واپسی پر جب حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ میں نے نور دیکھا۔

ہم اِس پر کسی قسم کے تبصرے یا تشریح کو چھوڑ کر معراج کے عملی پہلوؤں پر آتے ہیں۔ حریم قدس تک جانے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ اپنی امّت سے کہو کہ دن میں پچاس نمازیں پڑھا کریں۔ پھر نمازوں کی یہ تعداد گھٹا کر چالیس کر دی گئی۔ پھر تیس اور آخر یہ کہا گیا کہ پانچ نمازیں پڑھا کریں اور مژدہ بھی سنا دیا گیا کہ جو کوئی باخلاصِ نیّت یہ پانچ نمازیں ادا کرے گا، ربِّ ارض وسمٰوٰت اُسے پچاس نمازوں کا ثواب عطا کرے گا۔ ان ہدایات اور لقائے باری تعالیٰ سبحانہٗ کے درمیان اب ایک تعلق سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی مرد و زن کا حقیقی وجود اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب وہ مسلسل اور متواتر انداز میں خود کو حالتِ عبادت میں رکھے اور اس بات کی فہم یکلخت نہیں ہوتی۔

بہر حال انسان اپنی کمزوریوں اور مادی علائق میں گرفتار ہونے کے نتیجے بہت کم اپنی روحانی یا شعوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے یہ پانچ نمازیں ہی بہت ہیں۔ ان پانچ نمازوں کے درمیان زندگی کے جو لمحات مکروہاتِ دُنیا

Marfat.com

میں بلوث ہو کر گزرتے ہیں نماز میں بڑی حد تک اِن کی کثافت دور کر دیتی ہیں۔ اگر ہم خُدا کے ساتھ اس تعلق کو جو نمازوں میں ہم نے قائم کیا تھا یاد رکھیں تو اس کی خوشبو ہمارے ہر عمل میں رچی اور بسی رہتی ہے۔

شبِ معراج جب حضورِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام حریم قدس سے لوٹے تو جبرائیلِ امین انہیں سدرۃ المنتہا کی حد پر ملے اور انہوں نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو جنّت کے مختلف باغوں اور بستیوں کی سیر کرائی، اور دُوزخ کی عقوبت اور عذاب کے مناظر دکھائے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ بدصورتی کے مقابل ہی حُسن کی لطافتیں اور خوبیاں ہویدا ہوتی ہیں۔ شور و غوغا کے مقابل سکون اور عافیت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ رنج کے مقابل راحت کی قدر ہوتی ہے۔ انسانی زبان عالمِ بالا کے اسرار اور جنّت و جہنّم کے تصوّرات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی تہی دامنی کا احساس معراج جیسے موضوع ہی کے بیان میں ہوتا ہے مگر چونکہ کارخانۂ قدرت میں ہر شے ایک دُوسرے کے ساتھ منسلک و مربوط ہے اس لیے ہمارا ایک تسمہ ہمیشہ حقیقتِ اصلی سے جڑا رہنا چاہیے تاکہ انسانی تجربات میں ہمیں حقیقتِ ازلی سے اپنی وابستگی سے آگہی رہے اور یہ جب ہی ممکن ہے جب ہم اپنی آگہی و شعور کو اس دُنیائے مادی کے تجربات اور احساسات کی روحِ اصلی تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ حقیقی مسرت اور سرورِ ابدی یعنی بہشت کے لذائذ کا ذائقہ دنیاوی مسرتوں کے تمثال اور تصوّراتی اشکال سے کیا جا سکتا ہے اور اس دُنیا کے دکھوں کے درمیان آخرت رنج والم کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

حضور خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ بہشت تمہارے نعلین کی چاپ سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے اور یہی بات دوزخ کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات قرآن کے اِس بیان سے مستفاد سمجھی جا سکتی ہے جس میں ارشادِ باری ہے:

وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ۝ (قٓ ۵۰: ۱۶)

"اور ہم اِس کی رگِ جان سے بھی اِس سے زیادہ قریب ہیں۔"

وجودِ انسانی کا تمام تر اسرار اِس حقیقت کے گرد گھومتا ہے کہ خُدا تعالیٰ اور وُہ تمام

Marfat.com

امور جو ہماری دُنیا سے ماورا ہیں انسان کے بے حد قریب ہیں جب کہ انسان اپنی روزمرّہ کی مصروفیات میں خدا تعالیٰ اور حقیقت کی دوسری جہات سے دُور ہے۔

عموماً وُہ تصوراتی یا تمثیلی انداز بیان جو واقعۂ معراج اور خاص طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی سیر بہشت اور دوزخ کے بیان میں اکثر مفسرین اور راویوں نے استعمال کیا ہے خواہ کتنا ہی مبالغہ آمیز کیوں نہ قرار دیا جائے، بہر حال اس کی حیثیت دنیا اور عقبیٰ کے درمیان ایک پُل کی سی ہے؛ تاہم عالم الوہی کو سمجھنے کے لیے اسے ایک کلید کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے بجائے اس کے کہ اس کی لفظی موشگافیاں کی جائیں

پھر بھی ایک سوال ایسا ہے جس پر اُس وقت سے لے کر آج تک دُنیائے اسلام میں زبردست اور گرما گرم بحث جاری ہے اور وُہ یہ ہے کہ کیا رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو جسمانی معراج ہوئی تھی یا روحانی! اس بات کی مخالفت یا موافقت میں دونوں فریق یہ بھول جاتے ہیں کہ جس دنیائے مادی کو ہم اپنے حواسِ خمسہ کے وسیلے سے محسوس کرتے ہیں اور اس کی ہیئت کا ادراک کرتے ہیں وُہ کارخانہ قدرت سے کٹی ہوئی کوئی جامد اور بے جان شے نہیں۔ وُہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس دُنیائے آب و گِل میں ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وُہ مستور اور انسانی آنکھ سے نہ نظر آنے والی حقیقت ازلی میں سرتاپا نہائی ہوئی ہے۔ یہ حقیقتِ ازلی اس کے ہر ایٹم یعنی جزوِ لایتجزیٰ میں سرایت کی ہوئی ہے۔

اجسام آتی جاتی ہیں، وُہ اپنی ہیئتیں اسی طرح بدلتے رہتے ہیں جیسے بادل اپنی اشکال بدلتے رہتے ہیں۔ اجسام دوبارہ زندہ ہونے کے درمیان بھی یکسر تغیّر پذیر رہتے ہیں اور ایک مسلمان یہ یقین واثق رکھتا ہے کہ خالق اعلیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے اگر خالق اکبر چاہے تو اسے دوبارہ اس تمام کو یہاں یا وہاں یا کہیں بھی مستقبل میں کسی وقت پیدا کر سکتا ہے۔ اب یہ سوال کہ کیا حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کو جسمانی طور پر اُوپر اُٹھایا گیا تھا یا رُوحانی؛ نیز یہ کہ ان کا یہ تجربہ معروضی تھا یا موضوعی، اس کا ایک ہی جواب کافی وشافی ہے کہ یہ تجربہ حقیقی تھا۔ یہ سوال یقیناً اس وقت بھی آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام

Marfat.com

کے صحابہ نے اٹھایا تھا جب ملائے اعلیٰ کا یہ مسافر اِس دُنیائے خاکی میں زمان و مکاں کی قیود میں لوٹ کر آیا تھا۔ معراج کی مکمل کہانی بساط تقرب کے چند ہی نفوس کو آپ کی زبان مبارک سے سُنائی گئی تھی۔ اس وقت بھی آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا پلک جھپکتے مکّے سے یروشلم اور وہاں سے واپس تشریف لے آنا بہت سوں کو مشکل ہی سے باور ہوا تھا۔ اصولاً اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ نظامِ قدرت کے اصول اللہ ہی نے وضع کیے ہیں اور اگر وُہ چاہے تو اِن کے برعکس بھی کر سکتا ہے' ایک بات ہے۔ مگر اس بات پر ایقان رکھنا کہ معراج میں یہ سب کچھ بالفعل ہوا' ایک جداگانہ بات ہے۔ اس واقعے میں کچھ متشکک حضرات نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ' سے رجوع بھی کیا تھا تو انہوں نے پُوچھا کہ کیا رسول خُدا علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے خود تم سے یہ واقعہ بیان کیا! متشککین نے کہا "جی ہاں" جسے سُنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ پھر تو یہ واقعہ بالکل سچّا ہے! اور اس دن سے ہی وُہ صدیق اکبر کے لقب سے سرفراز ہو گئے تھے۔

دورِ نبوت میں مسلمانوں کا امتحان خُدائے قدوس نے بارہا لیا۔ وُہ ثابت قدم رہے۔ پھر جلد ہی انہیں اِس شہر کی طرف ہجرت کرنا پڑی جہاں جا کر اسلام کو ایک آفاقی مذہب بننا تھا۔ حضورِ اکرم اور آپؐ کے برگزیدہ اصحاب اعوان و انصار کی حیثیت ایک نیوکلیس، یعنی مرکزہ جیسی تھی۔ اِن کے ایمانِ غیر متزلزل ہی پر ہر شے کا انحصار تھا۔

Marfat.com

باب ششم

مدینتہ النبیؐ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کی سالانہ زیارت اور عُرس آنے والے زائرین کے ساتھ گھُل مل کر تبلیغ کیا کرتے تھے۔ قریش کے لیے یہ بات انتہائی اشتعال کا موجب بن گئی، خصوصاً جب ان کے لیے یہ قیاس کرنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ ان ملاقاتوں کے دوران میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے بتوں اور مورتیوں کے متعلق کیا باتیں کرتے ہوں گے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اس موقع پر وہ اپنا دین بھی انہیں سکھاتے ہوں گے۔ یہ بیرونی زائرین جو اپنے ساتھ مال و دولت بھی لاتے تھے، قریش کے لیے کمائی کا بڑا ذریعہ تھے۔ قریش یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے "خاندانی جھگڑے" کی تشہیر پورے جزیرہ نمائے عرب میں ہو جائے۔ قریش کو کم سے کم اپنے شہر کی ساکھ اور عزت پر بڑا ناز تھا۔

غالباً یہ "عام الحزن" ہی کی بات تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یثرب سے آنے والے کچھ زائرین کو مشرف بہ اسلام کیا۔ یثرب کا شہر جو مکے سے دو سو ستر میل شمال میں واقع تھا، ان معنوں میں خوش قسمت تھا کہ یہ ایک زرخیز

Marfat.com

اور خوبصورت نخلستان سے گھرا ہُوا تھا۔ آج تک اس علاقے کی کھجوریں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ مگر کئی اور لحاظ سے انتہائی بدقسمت علاقہ تھا۔ ابتدا میں یہ شہر غالباً ایک یہودی بستی تھا جس میں وہ عرب آباد تھے جنہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا۔ ماضی میں کسی وقت یہاں یمن سے دو قبیلے اوس و خزرج بھی آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس نخلستان میں بسنے والے ایک دوسرے کے ساتھ ایک لامتناہی قبائلی جنگ میں مبتلا تھے۔ یہودی، یہودیوں سے برسرِ پیکار تھے اور عرب عربوں سے۔ بعض صورتوں میں کچھ عرب قبیلے یہودیوں کے حلیف تھے اور ان کے ساتھ مل کر دوسرے گروہ کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے۔ اس زمانے میں مکّہ برابر خوشحال ہو رہا تھا اور یثرب تیزی سے تباہی و بربادی سے دوچار تھا۔

ایسے وقت میں ہر شخص کی نظریں ایک ایسے قائد کی متلاشی تھیں جو ان لوگوں کو متحد کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یثرب میں جتنے دھڑے تھے ان میں سے کسی کا کوئی سردار مجموعی طور پر لوگوں کو قبول نہ تھا۔ اس کردار کے قائد کو، جو لوگوں کی شیرازہ بندی کا اہل ہو، باہر سے منتخب کرنے کے بارے میں سوچا جا رہا تھا اور یثرب کے کچھ لوگ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی عظیم و جلیل شخصیّت اور ان کے صالح اور مضبوط کردار سے بے حد متاثر تھے، اور ان لوگوں نے آپس میں حضور اقدس و اعلیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو یثرب کی قیادت سونپ دینے کے موضوع پر بات چیت بھی شروع کر دی تھی مگر حضورؐ کی ذات تو اپنے ہی شہر میں ہدفِ ظلم و ستم بنی ہُوئی تھی، اس لیے اُنھوں نے سوچا کیا حضورؐ کو یثرب آنے کی دعوت دینا دانش مندی ہو گی؟ بایں ہمہ، یہ بات قریش کے لیے، جن کی نخوت خود اہلِ یثرب کی برداشت سے باہر تھی اور جن کی ثروت حسد انگیز تھی، توہین آمیز ہو سکتی تھی۔

۶۲۱ عیسوی کے موسمِ گرما میں اوس و خزرج کے بارہ تیرہ افراد خفیہ طور پر مکّے کے مضافات میں وادیِ منیٰ کے ایک مقام عقبہ میں آ کر حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے ملے اور اُنھوں نے اپنے اہل و عیال کی طرف سے حضورِ اکرمؐ کے

Marfat.com

دستِ مبارک پر اس بات پر بیعت کی کہ وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ چوری چکاری اور زنا کے مرتکب نہیں ہوں گے؛ نیز غربت کے ڈر سے اپنے بچوں کو ہلاک نہیں کریں گے۔ انھوں نے اس بات کا بھی عہد کیا کہ وہ راست معاملے میں رسولِ مقبولؐ کی اطاعت اور فرماں برداری کریں گے۔ اور تاریخ میں اس میثاق کو پہلی "بیعت عقبہ" یا "بیعت النساء" کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر نہیں کہ اس میں کچھ عورتیں شریک تھیں بلکہ اس میں جنگ وجدل کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی تھی۔ جب یہ لوگ اپنے وطن کو لوٹنے لگے تو حضورؐ نے حضرت مصعبؓ (ابن عُمیر) کو تعلیم اسلام کے لیے اُن کے ساتھ کر دیا۔ یہ صحابی اپنی سیاسی فہم و دانش کے لیے شہرت رکھتے تھے اور بہترین معلمِ اسلام ہونے کے ساتھ نخلستانِ یثرب کے قبائلی سرداروں سے گفت و شنید کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔

اگلے سال زیارتِ کعبہ کے اختتام پر بہتر مرد اور تین عورتوں نے انتہائی خاموشی اور راز داری سے وادیِ منیٰ کا رُخ کیا جہاں وہ عقبہ کی پہاڑیوں کے قریب بیٹھ کر سیدالعربؐ کا انتظار کرنے لگے۔ کوئی نصف شب کے قریب اندھیرے کی اوٹ سے سفید لبادوں میں ملبوس حضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسّلام اور آپؐ کے کچھ رفقاء نمودار ہُوئے۔ اس جماعت کے ساتھ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے جو جناب عبدالمطلب کے فرزندوں میں سے تھے۔ اس وقت وہ مسلمان نہیں ہُوئے تھے؛ تاہم قبیلہ بنو ہاشم کے "سرکاری" نمائندے کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ اس محفل کا آغاز حضرت عباس کے خطاب سے ہُوا جنھوں نے کسی عرب سردار کی شایانِ شان روایات کے تحت ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا اور اپنے بھتیجے کی دشمنوں سے حفاظت کے سلسلے میں اپنی ناچیز خدمات کا ذکر کرتے ہُوئے انتہائی مؤثر اور وزنی لب و لہجہ اختیار کیا۔ حضرت عباس نے حضورؐ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا:

"انھوں نے تمہارے پاس چلے جانے اور تمہارے درمیان زندگی

Marfat.com

گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر تم عہد نبھا سکو اور ان کے مخالفین سے
ان کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہو تو یہ بوجھ تمہیں خود ہی اُٹھانا ہو گا؛
لیکن اگر تم یہاں سے لے جانے کے بعد ان سے بدعہدی کرتے
ہو تو بہتر ہے کہ انہیں یہیں چھوڑ دو۔"[1]

اہلِ یثرب کے ایک نمائندے نے حضور اقدسؐ سے وفاداری کی بیعت کی
لیکن اوس کے ایک شخص نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان
کچھ رابطے اور بندھن ہیں (اس کی مراد یہودیوں سے تھی) لیکن ہم انہیں
توڑنے کو تیار ہیں؛ تاہم کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ ہم تو اپنے عہد پورے
کریں لیکن بعد میں جب اللہ آپ کو فتح اور غلبہ عطا فرمائے تو
آپ ہمیں چھوڑ کر چل دیں!"

حضورؐ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا:

"میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو، جس سے تم جنگ کرو گے، اس
میں جنگ کروں گا اور جس سے تم صلح کرو گے، اس سے میں صلح
کروں گا۔"

اس محفل کے برخاست ہونے سے پہلے، قبیلہ خزرج کے ایک شخص
نے اپنے ساتھیوں کو وہ کچھ یاد دلایا جو حضرت عباسؓ نے کہا تھا اور اس میں
یہ اضافہ کر دیا:

---

[1] یہ دیکھتے ہوئے کہ ساتویں صدی عیسوی میں پوری تاریخ کے نقوش انتہائی دھندلے
تھے، یہ بات حیرت زا ہے کہ حیاتِ محمدؐ کے حالات اور واقعات خاص طور پر اس بیعت
عقبہ کے بعد سے انتہائی تواتر اور انضباط سے رقم ہوئے ہیں۔ ابنِ کثیر نے بیعت کرنے
کا نام تک دیا ہے۔

Marfat.com

"اے اہلِ یثرب! اگر تم سمجھتے ہو کہ اگر تمہیں بعض صورتوں میں اپنے مال اور جائداد کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا اور تمہارے کچھ معززین اور چیدہ افراد کو قتل کیا جائے گا تو تم ان کا ساتھ چھوڑ دو گے تو بہتر ہے ابھی انہیں چھوڑ دو لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ اپنا عہد پورا کر سکو گے تو انہیں اپنا لو کہ واللہ اسی میں دنیا اور آخرت کی بہتری مضمر ہے۔"

اس کے بعد لوگوں نے یکے بعد دیگرے رسول کریمؐ کی بیعت کی اور عہد کیا کہ وہ آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہیں۔ اسے "بیعتِ حرب" بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں ضرورت پڑنے پر مسلح حفاظت کا بھی عہد کیا گیا تھا۔ قرآنِ مبین کی آیات میں جہاد کی فرضیت آئی ہے۔ ان کے وقتِ نزول کے متعلق کچھ اشتباہ ہے؛ تاہم اس میں کلام نہیں کہ یہ آیات مبارکہ تاریخِ اسلام میں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ (۲۲: ۳۹-۴۰)

"جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے، ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا) وہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے، اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے ہٹاتا نہ رہتا تو (راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں، جن میں خدا کا بہت ذکر کیا جاتا ہے، گرائی جا چکی ہوتیں۔ ..."

حضور اکرمؐ کے اولین سیرت نگار، ابن اسحٰق، کے مطابق یہ اجازتِ جہاد

Marfat.com

دوسری بیعت عقبہ سے پہلے دی گئی جب کہ دوسرے تمام سیرت نگار اس کا وقت ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد بتاتے ہیں۔

بہرحال کچھ بھی ہو ان آیات کے بعد حضورؐ اور تمام دنیا کے مسلمانوں کی زندگیوں میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا۔ رسالت مآبؐ کی بعثت کا ایک مقصد یہ تھا کہ آپؐ ستم رسیدہ اور مظلوم انسانوں کو عملی طور پر نئی راہ دکھائیں۔ ایک طرف عیسائیت ہے کہ وہاں انتہائی عاجزی اور تحمل ہے اور اگر کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو اُسے دوسرا پیش کرنے کا حکم ہے۔ دوسری طرف اسلام میں خود عیسائیوں کے اپنے الفاظ میں ایک "مبنی بر انصاف جنگ" کے لیے ہمیشہ تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو، قرآن کریم کے الفاظ میں:

لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (بقرہ (۲): ۲۵۱)

"تو دنیا میں فساد پیدا ہو جاتا"

حضورؐ اور مسلمانوں نے تقریباً تیرہ سال کا عرصہ انتہائی مظالم، گالیاں اور ایذائیں برداشت کرتے کرتے گزارا اور اپنی مدافعت کے لیے ہاتھ بھی نہیں اُٹھایا۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ برداشت انسانی اختیار میں ہے مگر اب حالات بدل رہے تھے اور اگر اسلام کو دنیا میں زندہ رہنا تھا تو اُس کے لیے ظالموں اور جابروں کے سامنے مختلف رویہ اختیار کرنا انتہائی ناگزیر ہو چکا تھا۔ صلح اور امن کا وقت ہوتا ہے ـــ اور اسی طرح جنگ کا بھی، اور مسلمان کبھی یہ فراموش نہیں کر سکتا کہ جو بھی انسان پیدا ہوتا ہے اُسے کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی سطح پر جہاد کرنا ہوتا ہے۔ اگر جسمانی جنگ نہیں ہوتی تو روحانی سطح پر ایک جنگ اس کے لیے تیار ہوتی ہے لیکن جو لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ زود یا بہ دیر اپنے نفس کی غلامی میں جکڑ کر رہ جاتے ہیں۔

کچھ ہی عرصے میں مسلمانوں نے ایک ایک دو دو کی تعداد میں خاموشی سے یثرب پہنچنا شروع کر دیا۔ یہ آغاز تھا ہجرت کا ـــ اس لفظ کا بالکل غلط ترجمہ انگریزی زبان میں فرار یا نقلِ مکانی کر لیا گیا ہے جب کہ اس کے حقیقی اور واضح معنی میں ایک نئی زندگی ـــ

Marfat.com

تعلق استوار کرنے کے لیے پرانے تمام روابط اور وابستگیوں سے دامن کش ہونا تھا۔ یہ ماضی سے ناتا توڑ کر مستقبل کی تعمیر تھی۔ ہجرت کے اس جذبے نے لوگوں سے رستے بستے گھر خالی اور سنسان کرا دیے۔ مکّے کے خوشحال اور خوش باش شہر میں گزشتہ دس سال سے زندگی کا چلن ہی بدل کر رہ گیا تھا؛ عین اسی طرح جیسے کسی انسان کی شخصیت روحانیت کے نور سے جگمگا اُٹھے۔

اسلام جس انداز سے اُبھر رہا تھا اس نے قریش کے لیے صورت حال برداشت سے باہر کر دی۔ اب تک انہیں اپنے ہی شہر میں مسلمانوں سے مقابلہ درپیش تھا۔ اب یہ "دشمن" شمال میں یثرب کے شہر میں نیا محاذ کھول رہے تھے۔ قریش نے اُن بدوی روایات کی بدولت جو اُنہیں ورثے میں ملی تھیں اور علانیہ جدال و قتال سے بچنے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قتل کر دیا جائے۔ ابُوجہل نے اس کام کو انجام دینے کے لیے ایک سادہ سا منصوبہ پیش کیا اور وہ یہ تھا کہ ہر قبیلے سے کچھ تنومند جوان منتخب کر لیے جائیں جو مل کر بیک وقت حضورؐ کا کام تمام کر دیں۔ اس طرح سے حضورؐ کا خون کسی ایک قبیلے کے سر ہونے کے بجائے تمام قبیلوں کے سر ہو گا اور بنو ہاشم کا مختصر سا قبیلہ تمام سے بدلہ لینے کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔

اُدھر یہ منصوبے بن رہے تھے، اِدھر محبوبِ خدا پیغمبر آخر الزماںؐ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ ہجرت کے لیے حکمِ خداوندی کے منتظر تھے۔ آپؐ اس حکم کے بغیر ہجرت کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے؛ تاہم اس درمیانی عرصے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ نے دو تیز رفتار اونٹنیاں مستقبل کے سفر کے لیے تیار کرنا شروع کر دی تھیں اور عرصے سے انہیں ببول کی پتّیوں کی خوراک دے رہے تھے تاکہ ان میں برداشت کی طاقت پیدا ہو — آخر حکمِ خداوندی آ ہی گیا۔ قریش کے منتخب قاتلوں نے پہلے ہی آپؐ کے گھر کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا مگر حضورؐ اُن کی نظروں میں آئے بغیر نکل گئے۔ قاتل آپؐ کے گھر میں دراندازی نہیں گھس سکتے تھے کہ اس سے خواتین کی پردہ دری ہوتی اور تخلیے پر ضرب پڑتی تھی جس کا قبائلی رسم و رواج کے تحت وہ احترام کرنے پر

Marfat.com

مجبور تھے کیونکہ بہرحال اُن میں شرافت تھی۔ ان میں سے ایک جوان نے حضورؐ کے گھر کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو آپؐ کے بستر پر کسی کو گٹھڑی بنے ہُوئے سوتے پایا۔ اُسے خبر نہ تھی کہ یہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہٗ ہیں جو آپؐ کے بستر پر محوِ خواب ہیں۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ حضورؐ سو رہے ہیں، اس لیے صبح دیر تک حضورؐ کے گھر سے برآمد ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

حضور اقدسؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قریش کے تعاقب سے بچنے کے لیے شمال کی بجائے جنوب کی طرف سفر شروع کر دیا۔ ایک ہمدرد چرواہے نے اپنا ریوڑ پیچھے لگا کر اُن کی اونٹنیوں کے قدموں کے نشان مٹانے کے فرائض انجام دیے۔ کچھ دُور یمن کی شاہراہ پر سفر کرنے کے بعد آپ نے ایک پہاڑی غار ثور میں پناہ لی۔ یہاں حضرت ابوبکرؓ کے فرزند عبداللہؓ نے آکر اطلاع دی کہ قریش نے آپؐ کی گرفتاری پر سَو اونٹوں کے انعام کا اعلان کیا ہے۔ یہیں اسماءؓ بنت ابوبکرؓ نے حضور اقدسؐ اور اپنے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ کو رسد پہنچائی۔ حضورؐ کو یہیں رسّی کی ضرورت پڑی تو حضرت اسماءؓ نے جھٹ اپنی اوڑھنی پھاڑ کر آدھا حضورؐ کی نذر کر دیا۔ اسی لیے حضورؐ نے حضرت اسماءؓ کو "ذات النطاقین" کا لقب عطا فرمایا۔

جب حضور اقدسؐ کا تعاقب کرنے والے کو آپؐ کا سُراغ شمال کی طرف جانے والی شاہراہ پر کہیں نہ ملا تو اُنھوں نے چاروں طرف تلاش شروع کر دی۔ اور ایک شام غارِ ثور کے دہانے پر کچھ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کوئی پانچ چھ آدمی تھے جو اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ غار کے اندر جا کر تلاش کرنا چاہیے یا نہیں۔ اُس وقت حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر یہ سمجھا کہ اب ہم پکڑے جائیں گے لیکن رسولِ خداؐ نے کہا:
"ہم دو کو کس بات کا ڈر ہے جب تیسرا اللہ ہمارے ساتھ ہے؟" کچھ دیر کے بعد باہر سے آنے والی آوازیں دُور کہیں ڈوب گئیں اور پھر جب حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ غار سے نکلے تو انہیں احساس ہُوا کہ آخر کفار نے غار کے اندر جا کر تلاش کیوں بے سُود سمجھی تھی۔ اُس غار کے دہانے پر ایک جھاڑی، جو پہلے وہاں نہیں تھی، اُگ آئی تھی،

Marfat.com

اور مکڑی نے اُس پر جالا تن دیا تھا اور ایک فاختہ نے وہاں اپنا گھونسلہ بنا کر انڈے دے دیئے تھے، اور یُوں خدا کی قدرت سے رسول آخرالزمان صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تحفظ کا سامان پیدا ہو گیا۔ ورِنگھم کا کہنا ہے کہ مستند مسلم تاریخ میں صرف یہی تین معجزات بیان ہُوئے ہیں:

مکڑی کا جالا تننا، فاختہ کا انڈے دینا اور جھاڑی کا اُگ آنا۔ یہ تین معجزات خدا کی زمین پر روزانہ رُونما ہوتے ہیں۔[1]

آپؐ کے لیے خاص طور پر تیار کی ہُوئی اونٹنیاں لائی گئیں اور حضورِ اقدسؐ اور حضرت ابوبکرؓ مغرب کی طرف سے مکّے کا چکر کاٹ کر یثرب کی راہ ہو لیے، اور آخر بارہ دن کی مسافت کے بعد نخلستان میں داخل ہو گئے۔ یہاں مضافات یثرب کے ایک گاؤں میں آپؐ نے قیام فرمایا۔ اسی مقام پر حضرت علی مرتضیٰ آپؐ سے آملے جنہوں نے مکّے سے یہاں تک کا سفر پیادہ طے کیا تھا۔ یُوں "ہجرت" انجام کو پہنچی۔ عیسوی تقویم کے مطابق یہ ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کی تاریخ تھی۔ مسلمانوں نے اس شمسی سال میں شروع ہونے والے قمری سال کے پہلے دن سے (جو ۱۶ جولائی بنتا ہے) ہجری سال شمار کرنا شروع کیا۔ جُوں ہی حضورِ اقدس یثرب میں داخل ہُوئے اس شہر کا نیا نام مدینۃ النبیؐ قرار پاگیا جسے عرفِ عام میں مدینہ کہا جاتا ہے۔

حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام بہترین پوشاک میں ملبوس ستّر سواروں کی جلو میں اس شہر مین سواد میں داخل ہُوئے جن کے ہراول میں ایک سوار نیزے پر سبز عمامہ بلند کیے چل رہا تھا۔

اور پھر دُنیا نے دیکھا کہ ایک ستم کشیدہ صاحبِ نظر، اس شہر میں داخل ہوتے ہی یہاں کا حاکم تسلیم کر لیا گیا تاکہ انسانی معاشرے کی پراگندگی اور انتشار کو اللہ کے نازل کردہ قانونِ امن اور آشتی کے مطابق دُور کرے۔ اس شہر کی حدود میں داخل ہوتے

---

[1] 1. Life of Mahomet, Emile Dermengham; p.149

Marfat.com

ہی ایک سیاسی مسئلہ درپیش ہو گیا اور وہ یہ تھا کہ آپؐ کہاں قیام فرمائیں ؟ کس قبیلے کے علاقے میں ٹھہریں ؟ اُدھر عالم یہ تھا کہ قدم قدم پر مختلف قبائل کے لوگ حضورؐ کی اُونٹنی "قصویٰ" کی مہار پکڑ کر آپ کو اپنا مہمان بنانے پر اصرار کر رہے تھے ۔ حضورؐ نے فرمایا :

"اسے اپنی راہ جانے دو کیونکہ یہ اللہ کے حکم کے تابع ہے ۔"

"قصویٰ" کچھ دُور چل کر ٹھہر جاتی : گویا بیٹھنا چاہتی ہو ، مگر پھر چلنے لگتی ۔ آخر ایک مقام پر پہنچ کر وہ رُکی اور پھر بیٹھ گئی ۔ اسی مقام پر عین مسجدِ نبوی تعمیر کی گئی اور اس کے پہلو میں آپؐ کی جائے رہائش اور ازواجِ مطہرات کے حجرے تعمیر ہُوئے ۔

مکّہ کے پاس تو قدیم ، شہرہ آفاق اور مقدس حرم تھا مگر زہے قسمت کہ مدینہ کے پاس ایک زندہ نبی تھا ، جو کہیں بہتر تھا ۔

مدینہ کے لوگوں میں اتفاق و اتحاد بہرحال ایک رات میں پیدا ہونا تو ممکن نہیں تھا ؛ تاہم ایک منظم اور مرتب معاشرے کے اوّلین خطوط بہت جلد طے پا گئے ۔ حضورؐ نے مدینے میں آتے ہی مسلمانوں اور مدینے کے یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ طے کرا دیا جس کی رُو سے قرار پایا کہ یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ برابری کے حقوق حاصل ہوں گے ، اور اگر اس شہر پر حملہ کیا گیا تو دونوں مل کر حملہ آور کا مُقابلہ کریں گے ۔ مدینے کے وہ عرب بھی جنہیں پیغمبرِ اسلام کا شہر میں آنا ناگوار گزرا تھا ، وقتی طور پر چُپ ہو رہے ۔ قبیلہ خزرج کے انتہائی بااثر شخص ، عبداللہ بن اُبی نے محض دکھاوے کے لیے اسلام قبول کر لیا ۔ بعد کے طرزِ عمل سے اس نے خود کو منافقوں کا سرغنہ ثابت کر دیا ۔ مدینے کی زندگی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے آنے سے رفتہ رفتہ ترتیب پیدا ہو گئی ؛ تاہم باہمی مناقشت کی مخالف ہوائیں اب "بادِ شُرط" یا موافق ہوائیں بن چکی تھیں ۔ حضرت رحمتِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے عظیم تدبّر ، معاملہ فہمی اور زورِ کردار سے ان جھگڑوں کو طے کیا اور باہم متحارب گروہوں میں صلح و امن کی فضا قائم کر دی ۔

مکّے سے آنے والے مہاجرین اور مقامی مسلمانوں میں ، جنہیں انصار یعنی مددگار کا لقب دیا گیا تھا ، اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے آپؐ نے مؤاخات قائم فرمائی

Marfat.com

جس میں ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی قرار دے دیا، اور دنیا کے تمام معاملات میں اُن کا یہی رشتہ طے پا گیا۔ مہاجرین میں ماسوئی چند کے جن میں حضرت عثمان ابنِ عفّان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جنہوں نے اپنی ساری دولت ملّت کی نذر کر دی تھی، کسی کے پاس کچھ دنیوی مال و اسباب نہ تھا۔ وہ سب کچھ مکّے میں کفّار کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے تھے اور اب ان کا مکمل انحصار اپنے انصار بھائیوں پر تھا۔ عربوں کی قبیلہ پرستی کو دیکھتے ہوئے یہ مواخات اور بھائی چارہ کسی معجزے سے کم نہ تھا؛ خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اجنبیوں کو یک لخت اپنا بھائی قرار دیے جانے کے فیصلے پر انصارِ مدینہ نے کسی قسم کے تکدّر کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ نئے آنے والوں کو اپنا ہی خاندان سمجھا۔ ایمان کی قوّت انسانوں کو کس طرح بدل دیتی ہے، اس کی واضح مثال اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔

مدینے پہنچ کر مکّے کے مہاجر مسلمان اپنے ہنر اور کاروباری سُوجھ بُوجھ سے عاری نہیں ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہیں کہ جب ایک انصاری نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا: "اے میرے غریب بھائی! بتائیں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں؛ میرا گھر اور میرا مال تیرے لیے حاضر ہے"، تو مہاجر نے کہا: "تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان میرے دوست! بس مجھے بازار کا راستہ دکھا دو، پھر سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ اُس شخص نے مکھن اور پنیر بیچنا شروع کر دیا اور جلد ہی ایک مقامی دوشیزہ سے نکاح کرنے کے لیے حق مہر ادا کرنے کے قابل ہو گیا اور کچھ عرصے بعد تو اسی شخص کا اسبابِ تجارت سات سو اونٹوں پر بار ہو کر باہر جانے لگا۔

ایک اور شخص کے متعلق حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ارشاد فرمایا:

"اُس کا کیا پوچھتے ہو! وہ تو ریت بیچ کر بھی مالا مال ہو سکتا ہے!"

اس قسم کے کاروباری معاملات میں طاق لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی؛ تاہم کچھ ایسے خلوت پسند لوگ بھی تھے جنہیں دولت کمانے کے گُر آتے تھے نہ ان کا میلان

Marfat.com

دنیاوی امور کی طرف تھا اس لیے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مسلم معاشرے میں صرف فعال اور دولت کمانے کے لیے جد وجہد کرنے والوں ہی کے لیے جگہ نہیں، اہل وعیال کی دردسری سے بے نیاز دینی مشاغل میں مستغرق لوگوں کے لیے بھی جگہ ہے۔ مسجدِ نبوی کے چھتے ہوئے صحن میں ان لوگوں کے لیے سونے کا بندوبست کر دیا گیا۔ چونکہ یہ جگہ مٹی کے ایک چبوترے پر بنی ہوئی تھی، اس لیے یہاں قیام کرنے والوں کو "اصحابِ صفّہ" کہا جانے لگا۔ انہیں حضورؐ کے دسترخوان سے کھانا ملتا؛ بشرطیکہ کچھ بچ جاتا؛ تاہم بنیادی طور پر ان کی خوراک کا اہتمام بیت المال سے بھُنے ہوئے جَو کے دانوں سے کیا جاتا تھا۔ ان "اصحابِ صُفّہ" میں حضرت ابوہریرہؓ سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ یہ صحابی حضورؐ کے ساتھ سائے کی طرح لگے پھرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اللہ نے بڑی قوی یادداشت عطا کر رکھی تھی۔ بے شمار احادیثِ نبویؐ اُنہی کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ شاید انہی جیسے انسانوں کے لیے یہ ارشادِ نبوی ہے کہ: "عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے افضل ہے"۔

حضورِ اقدسؐ اپنے اصحاب سے کم درویشانہ زندگی نہیں بسر کرتے تھے۔ آپؐ کی عمومی غذا موٹے اناج سے بنے "سویق"، کھجوروں اور دودھ پر مشتمل تھی جب کہ دن کے دوسرے کھانے میں پانی کے ساتھ صرف کھجوریں استعمال فرماتے تھے۔ اکثر فاقہ سہنا پڑتا تو آپؐ معدے اور آنتوں کی بے چینی دُور کرنے کے لیے ایک چوکور پتھر پیٹ پر باندھ لیتے تھے۔ حضورؐ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ آپؐ کبھی کسی کا تحفہ رد نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک خاتون نے آپؐ کو ایک جبہ تحفتہً پیش کیا جس کی آپؐ کو شدید ضرورت بھی تھی مگر اسی شام کو کسی نے اُسے کفن میں استعمال کرنے کے لیے مانگا تو آپؐ نے فوراً دے دیا۔ آپؐ کے پاس لوگ اکثر کھانا لے آتے جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتا لیکن آپؐ کو اُسے کھانے کی مہلت ہی نہ ملتی۔ کوئی نہ کوئی فرد ایسا موجود ہوتا جسے اس کی شدید ضرورت لاحق ہوتی۔ باون سال کی عمر میں گرتی ہوئی جسمانی قوت

Marfat.com

کے باوجود آپؐ نے مختلف النوع انسانوں کے جمِ غفیر سے، جو خدائے لایزال نے بطورِ خام مال آپؐ کو مہیا کیے تھے، مذہب کی بنیاد پر ملّتِ واحد بنانے کی انتہائی جدوجہد کی۔

یہ ظاہر تھا کہ مہاجرین، جن کی جائدادیں مکّے میں ضبط کر لی گئی تھیں، لامحدود مدّت تک ان غریب انصار کے، جن کا خود گزارہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا مہمان نہیں بنے رہ سکتے تھے۔ اہلِ قریش کو اب صرف اس بات کا انتظار تھا کہ اسلام کب بھوکوں مرتا ہے!

عربوں کی قدیم روایات کے تحت غربت اور فلاکت کے مارے قبائل کو ان قبیلوں پر حملے کی اجازت تھی جو اُن سے زیادہ مرفہ الحال تھے، اور یقیناً اگر یہ روایات زندہ نہ ہوتیں تو صحرا کے خانہ بدوش کبھی صدیوں زندہ نہ رہ سکتے۔ قرآن نے بھی مسلمانوں کو اُن لوگوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کی اجازت دے دی تھی جنھوں نے انتہائی ناانصافی سے انہیں گھروں سے نکال دیا تھا۔ غربت اور افلاس دور کرنے کا یہی ایک حل تھا؛ تاہم ابتدا میں مکّے والوں کے تجارتی قافلوں پر حملوں میں بہت کم کامیابیاں میسر آئیں، اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ شام سے آنے والے قریش کے بڑے قافلے پر حملہ کیا جائے جو ابوسفیان کی ذاتی قیادت میں سفر کرنے والا تھا۔ مخبروں نے خبر دی کہ یہ قافلہ بدر کے کنوؤں کے قریب ٹھہرے گا، اس لیے مسلمانوں نے ان سے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ابوسفیان نے، جو شام سے جنوب کی طرف چل پڑا تھا، مسلمانوں کی جنگی تیاریوں کا حال سُنا۔ وہ خود مسلمانوں کا احوال معلوم کرنے کے لیے اپنے مخبروں کے ساتھ بدر کے مقام پر پہنچا۔ اور اُسے اونٹوں کی مینگنیوں سے جن میں مدینے کی کھجوروں کی گٹھلیاں تھیں، مسلمانوں کی تیاریوں کا حال ٹھیک معلوم ہُوا۔ اُس نے تیز رفتار قاصد کے ذریعے مکّے کے لوگوں کو پیغام بھیجا کہ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے فوراً ایک لشکر روانہ کیا جائے اور اُس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے قافلے کا رُخ ساحل کی طرف

Marfat.com

موڑ دیا۔ ابوسفیان کے تجارتی قافلے میں اسباب و سامان کی قیمت کا تخمینہ عہدِ حاضر کے سکّے کی مالیت کی نسبت سے تیس لاکھ ڈالر بنتا تھا۔

ابوسفیان کی طلب پر مکّے سے ایک لشکر جس کی نفری ایک ہزار تھی، شمال میں واقع مدینے کی طرف بڑھا۔ مہاجرین اور انصار کی مجموعی تعداد تین سو پانچ تھی اور ان کے پاس صرف ستّر اونٹ اور تین گھوڑے تھے۔ اس لیے لوگوں نے ان پر باری باری بیٹھ کر یا پھر ایک ایک جانور پر کئی کئی نے سواری کر کے مدینے سے بدر تک کا سفر طے کیا۔ وہ ابھی راستے ہی میں تھے کہ ابوسفیان کے قافلے کی راہ بدل دینے کی خبر پہنچی۔

رسولِ مقبولؐ نے فوری طور پر مسلمانوں سے مشاورت کی کہ اب کیا کیا جائے! قریش کے اس قافلے کا پیچھا کرنا چاہیے جس کی قیادت ابوسفیان کر رہا تھا یا اُس لشکر کا مقابلہ کرنا چاہیے جو مکّے سے پہنچا چاہتا ہے۔ اب تذبذب کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ مکّے سے آنے والی فوج کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ تاریخ میں یہ دن "یوم الفرقان" کے نام سے موسوم ہے، یعنی جب نُور اور ظلمت، خیر و شر، صحیح اور غلط میں امتیاز کیا گیا۔

ہجرت کے دوسرے سال، سترہ رمضان المبارک کو جُمعے کے دن بمطابق سن ۱۲ مارچ ۶۲۴ء اسلام کی پہلی جنگ بدر کے مقام پر لڑی گئی۔ قدیم روایات کے مطابق اس جنگ کا آغاز مبارزت طلبی سے ہُوا جس میں دونوں طرف سے تین تین شہہ زور میدان میں اُترے۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت حمزہؓ اور عبیدہؓ میدان میں اترے اور انھوں نے تیزی سے اپنے حریفوں کو ہرا دیا جس کے بعد عام جنگ شروع ہو گئی جس میں اہلِ مکّہ نے کوئی خاص زور نہ دکھایا جب کہ دُبلے پتلے فاقہ زدہ مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے ان زیادتیوں کا بدلہ چکانا چاہا جو ان کے ساتھ مکّے میں روا رکھی گئی تھیں۔ اس موقع پر حضورؐ نے ایک ایسا جنگی حربہ اپنایا جو اس سے پہلے عربوں کی کسی جنگ میں نہیں برتا گیا تھا۔ آپؐ نے مسلمانوں کے جیش کو بڑے

Marfat.com

نظم وضبط سے ایک جگہ مجتمع کیے رکھا اور اپنے مخالفین کو مسلسل یلغاریں کرنے کا موقع دیا تاکہ ان کی قوت ضائع ہو جائے اور ان کے دم خم ٹوٹ جائیں۔ پھر جب مناسب موقع آیا تو اشارے کے طور پر آپؐ نے مٹھی بھر کنکریاں دشمن کی طرف پھینک کر یلغار کا حکم دے دیا۔ اس اذنِ رسولؐ پر مسلمان بجلی بن کر دشمن پر گرے تو ان میں سے کچھ نے اپنے اوپر فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی۔ انہیں یہ یقینِ واثق ہو گیا کہ ملائکہ کا لشکر ان کی مدد کو آن پہنچا ہے۔ قریش کی زبردست فوج میدان چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ مسلمان اب میدان میں تنہا رہ گئے اور فتح کے باوجود انہیں چپ سی لگ گئی۔ شاید انہیں اتنی بڑی کامیابی کی امید نہ تھی۔

تاریخِ انسانی کی اس فیصلہ کن جنگ میں فریقین کے ستر، اسّی کے قریب افراد مارے گئے۔

جنگ کے بعد ایک موقع پر رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابہ کرام سے پوچھا:

"تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے اصحابِ بدر کی طرف دیکھے بغیر کہہ دیا ہے کہ تمہارا جو جی چاہے کرو کیوں کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے!"

شرکائے بدر میں سے جو جب تک زندہ رہا مسلمانوں میں بڑی عزت اور وقار سے دیکھا جاتا رہا، اور ان میں سے سب سے زیادہ تعریف علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی بہادری کی کی گئی۔ اس جنگ کے بعد ہی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو حضرت علی کے نکاح میں دے دیا گیا۔

مکہ اس شکستِ فاش سے ہل کر رہ گیا۔ اسی جنگ میں ابوجہل مارا گیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد ابولہب بھی مر گیا۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اس کی موت بدر کی شکست کے غم اور صدمے کے باعث ہوئی اور کچھ کا خیال ہے اسے موت اس شرم کے باعث آئی جب کسی عورت نے اس کے سر پر پے بہ پے اس وقت ضرب لگائی جب اس نے اپنے ایک غلام کو کوڑے مارے تھے ـــــــ بہرحال جو بھی ہو ہال،

Marfat.com

یہ ضرور ہے کہ اس کی موت سے قرآن کی یہ پیشگوئی ثابت ہوگئی:

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ ط مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا کَسَبَ ط سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ وَّ امْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (لہب (۱۱۱): ۱-۵)

ترجمہ: "ابُولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔

نہ تو اُس کا مال ہی اُس کے کچھ کام آیا اور نہ جو اُس نے کمایا۔

وہ جلد بھڑکتی ہُوئی آگ میں داخل ہو گا۔

اور اُس کی جورو بھی جو ایندھن سر پہ اُٹھائے پھرتی ہے۔

اُس کے گلے میں مُونجھ کی رسّی ہو گی۔"

ان دو جید سرداروں کے یکے بعد دیگرے اُٹھ جانے سے ابوسفیان شہر مکّہ کا سب سے بڑا چودھری بن گیا۔ اُسے یہ پُوری طرح معلوم تھا کہ اب یہ معاملہ یہیں نہیں رکے گا، ایک کامیابی کے بعد دوسری کامیابی مسلمانوں کے قدم چومے گی اور اب بدو قبائل طاقت کے توازن کا اندازہ کر کے فوراً مسلمانوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ جب تک بدر کی شکست کا بدلہ نہ لے لے گا، اپنی ڈاڑھی میں خوشبو نہیں لگائے گا۔

حضرت عباس (عمِ رسولؐ) نے جو ابھی تک ایک ثالث کا کردار ادا کر رہے تھے، یہ اطلاع مدینے بھیجی کہ اہلِ مکّہ کی تین ہزار فوج، جس میں سات سو زرہ پوش بہادر اور دو سو گھوڑوں کا ایک رسالہ ہے، ابوسفیان کی قیادت میں مدینے پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے اور ان کا ارادہ اپنے ساتھ اپنی عورتوں کو لانے کا بھی ہے۔ یہ ایک انتہائی سنگین بات تھی کیونکہ عرب جنگجو عموماً اس بات سے آگاہ ہوتا ہے کہ کچھ مواقع ایسے ہوتے ہیں جب شجاعت کے جوہر دکھانے کے بجائے صوابدید اور تدبّر زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ بقول ایک جیمیکائی کہاوت "جسمانی غیر حاضری دماغی حاضری سے بہتر ہوتی ہے۔" جب عرب عورتیں میدانِ جنگ میں ہوتی ہیں تو عرب سُورما اپنی لاف زنیوں کو

Marfat.com

سچ ثابت کرنے پر اُتر آتے ؛ خواہ انہیں یہ یقین ہی کیوں نہ ہو کہ عورتیں ان کی شیخیوں کی حقیقت خوب سمجھتی ہیں۔

ابوسفیان اپنی زوجہ ہندہ کو میدانِ جنگ میں لے جانے کا قصد رکھتا تھا جو تاریخ کی ایک انتہائی بدطینت اور شوریدہ سر عورت تھی۔ جنگ کے موقع پر ہندہ نے دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر یہ رزمیہ گیت اپنے جنگجوؤں کے کانوں میں پھونکنے شروع کر دیئے کہ اگر وہ دلیری سے لڑے تو اُن کی بیویاں انہیں سینوں سے لگالیں گی اور اگر میدان سے بھاگے تو انہیں کبھی اپنے بستر کے قریب نہ آنے دیں گی۔

اہلِ مکہ،کوہِ اُحد کے نیچے ایک مزروعہ قطعۂ زمین پر خیمہ زن ہوئے۔ کوہِ اُحد کے شمال میں مدینہ واقع تھا بلکہ یہ پہاڑ شہر پر سایہ فگن تھے۔ حضورؐ نے جنگ کے لیے مسلمانوں سے مشاورت کی۔ آپؐ کا میلان اس طرف تھا کہ مسلمانوں کو مدینے ہی میں رہ کر کفار کو محاصرہ کر لینے دینا چاہیے اور صرف دفاعی جنگ لڑنا چاہیے؛ تاہم آپؐ نے اکثریت کی رائے منظور فرمائی کہ مسلمانوں کو باہر نکل کر لڑنا چاہیے۔ مشاورت کے موقع پر ایک شخص نے کہا:

> "اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے سامنے اس وقت دو راستے ہیں:
> یا تو اللہ ہمیں ان پر غلبہ عطا فرما دے گا، جس کی ہمیں بڑی شدت سے طلب ہے یا پھر وہ ہماری شہادتیں قبول کر لے گا۔ مجھے پروا نہیں ان میں سے ہمارا مقدر کیا ٹھہرا ہے۔ ہمارے لیے دونوں میں بہتری ہے۔"

اب اہلِ مکہ نے میدان سنبھال لیا۔ قلبِ لشکر کی سربراہی ابوسفیان کر رہا تھا اور خالد بن ولید میمنے پر اپنے رسالے کی کمان کر رہے تھے۔ اس جنگی نقشے کے پیچھے نظر ڈالی جائے تو عجیب نقشہ نظر آتا ہے کہ خالد اور کفار کے جنگی سورما آئندہ چل کر اسلام کے زبردست حامی و ناصر اور عالمی حیثیت کے فاتح بنے۔ یہ صورت اُس وقت کم حیرت انگیز نظر آتی ہے جب ہم ان مذہبی جنگوں کی علامتی حیثیت پر غور کرتے ہوئے قریش کے ان شریفانہ اوصاف کو دیکھیں جو گنا ہوں، کفر اور دیگر آلائشوں کے نیچے دبے

Marfat.com

ہُوئے تھے۔ اُن کے ضمیر جس روحانی کشمکش میں مبتلا تھے، اُس سے اُن کی باطنی نیکی ضرور جھلکتی ہے۔ وہ مثبت اندازِ فکر رکھتے تھے، مگر وقت، ماحول اور حالات نے اُنہیں گمراہ کر دیا تھا اور وہ اس گمراہی سے ہدایت کے نور کی طرف آنے کے منتظر تھے۔ پیش آمدہ جنگوں کے یہ واقعات اگر مقدس تاریخ میں واقعات اور تصورات باہم مدغم ہو جاتے ہیں، اور پھر جو کچھ میدانِ جنگ کے غبار سے نمودار ہوتا ہے، وہ درحقیقت بیرونی علامات ہوتی ہیں جو ہمیں تاریخ کے اندرونی حالات کی یاددہانی کراتی ہیں جن سے خدا تک پہنچنے کے سفر میں انسان گزرتا ہے۔

اسلام میں رحمت و رافت اور غضب و جلال کے دو منطقوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی نظر آتی ہے۔ اس دیوار میں بھی کوئی نہ کوئی روزن بنایا جا سکتا ہے؛ تاہم اس میں علیحدہ علیحدہ مُہر بند خانے نہیں بنے ہُوئے جیسا کہ یورپی دماغ انہیں آسانی سے فرض کر لیتے ہیں۔ جو کچھ ایک سطح پر ہوتا ہے، خواہ وہ ارضی، نفسی یا روحانی سطح پر ہو، ایک دوسرے سے جگہ بدلتا رہتا ہے اور نئی جہت اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی چیز بھی متعین مقام نہیں رکھتی نہ دوسروں سے کٹ کر رہ سکتی ہے جو "یہاں" ہوتا ہے، "وہاں" بھی ہوتا ہے، اور اس کے برعکس بھی۔ تاریخِ مقدسہ کی پرچھائیوں کے پیچھے اصل پیکر ہوتے ہیں جو ایک عالمگیر کشمکش میں ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔

جنگِ اُحد میں مسلمان سات سو کی نفری کے ساتھ میدان میں اُترے۔ حالات بدر کے مقابلے میں کم سازگار تھے۔ وہ اس بات سے بالکل بے پروا ہو کر کہ بچتے ہیں یا لقمۂ اجل بن جاتے ہیں، اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی زبردست یلغار سے مکے والوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور پھر دست بہ دست جنگ میں قریش کی خیمہ گاہ کو جانے والا راستہ دشمنوں سے صاف ہو گیا۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اپنی بائیں جانب پچاس چیدہ تیر اندازوں کا ایک دستہ پہاڑ کے درّے پر تعینات فرما دیا تھا اور سخت احکامات دے دیے تھے کہ وہ کسی حالت میں اپنی جگہ سے

Marfat.com

نہ ہٹیں۔ اُن کے دلوں میں یہ لالچ عود کر آئی کہ کہیں وہ مالِ غنیمت کے موقع سے محروم نہ ہو جائیں۔ وہ سوچے سمجھے بغیر، جلدی سے میدان کی طرف دوڑے۔ خالد بن ولید اپنے سواروں کا دستہ لیے ایسے موقع کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ ایک دَم درّے کی طرف بڑھے اور عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔

اس دن بہت سے لوگ میدانِ جنگ سے سیدھے بہشتِ بریں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان شہداء میں سے ایک کے متعلق حضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"وہ بہشت کے باغوں میں یُوں اہلا گھلا پھر رہا ہے جیسے کوئی پانی میں تیرتا ہے۔"

ہمیں بتایا گیا ہے کہ شہادت سے گناہ دُھل جاتے ہیں اور رُوح جسم سے نکل کر ایسی پاک و صاف ہو جاتی ہے جیسے ابھی وجود میں آئی ہو۔ یُوں ہنسی خوشی جان دے دینا اور شہادت پانا، روحانی زندگی کی معراج ہے اور ایسی قربانی ہستی کے بوجھ سے خود کو آزاد کرانے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ انسان کا وجود اور اس کا نفس جو کارنامے سرانجام دیتا ہے، وہ تو میدانِ جنگ ہی میں رہ جاتے ہیں اور جو کچھ زندہ رہتا ہے وہ ہر قید و بند سے آزاد ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قولِ مبارک ہے کہ "جنت تیغوں کے سائے میں ہے" لیکن چونکہ اسلام جدال و قتال اور رافت و رحمت میں ایک توازن چاہتا ہے اس لیے حضور اقدسؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "بہشت ماں کے قدموں تلے ہے۔"

جبلِ اُحد کے دامن میں حضور انورؐ کے قریبی اصحاب نے آپؐ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ جنگ کا ریلا آپؐ کی طرف کئی بار بڑھا اور دشمن کی ٹکڑیوں کے کئی حملے زبردست مدافعت سے پسپا کر دیے گئے تھے مگر تلوار کی ایک ضرب کا ہدف آپ کو بنایا گیا، آپؐ کے ایک صحابی نے بیچ میں آ کر اُسے روکا مگر اُچٹتا ہُوا وار آپؐ کے خود پر پڑا جس سے خود کی دو کڑیاں آپؐ کے رخسارِ مبارک میں جا گُھسیں۔ بنی مخزوم کے

Marfat.com

شماس آپؐ کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے اور جب وہ شہید ہو گئے تو اُن کی جگہ ایک اور جاں نثار نے لے لی۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے تو بڑھ کر ایک تیسرے شخص نے یہ جگہ لے لی۔

جُوں ہی لڑائی کا ریلا موجِ آب کی طرح دوسری جانب گیا، ایک صحابی نے اپنے دانتوں سے خود کی کڑیاں رخسارِ مبارک سے کھینچ لیں جس سے ان صحابی کے دو دانت ٹُوٹ گئے اور خون بہنے لگا۔ حضورِ اقدسؐ نے فرمایا:

"جس کا خُون میرے خُون سے مل گیا، آگ اُسے چھو نہیں سکتی۔"

اس دوران میں یہ غلغلہ بلند ہُوا کہ پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام شہید کر دیے گئے ہیں۔ یہ سُنتے ہی کچھ لوگ دل چھوڑ بیٹھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے پہلے سے بھی زیادہ جوش سے لڑنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک نے کہا: "بھلا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد ہم جی کے کریں بھی کیا؟" تو دوسرے نے کہا: "اُٹھو اور اسی طرح نذرانۂ جاں مالکِ حقیقی کے آگے پیش کر دو جیسے اللہ کے رسولؐ نے کیا ہے۔" اہلِ مکّہ کو یقین ہو گیا کہ ان کا مقصد پورا ہو گیا ہے، اب میدانِ جنگ میں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں۔ اب اُن میں ایسے لوگوں سے مقابلے کی سکت باقی نہیں رہی تھی جو نہ صرف یہ کہ موت کو خوش آمدید کہہ رہے تھے بلکہ بڑے جوش سے اس کے متلاشی تھے۔ اہلِ مکّہ نے سمجھا کہ اُنہوں نے میدان مار لیا ہے۔ پھر قریش کی عورتیں میدانِ جنگ میں وارد ہوئیں۔ وہ اپنے مقتولوں پر نوحہ کناں تھیں اور اس کے ساتھ ہی مسلمان شہداء کی لاشوں کا مُثلہ بھی کرتی جا رہی تھیں۔ اس جنگ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چچا اور بچپن کے ساتھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے ساتھ بھی یہی ہُوا۔ بدبخت ہندہ جو ابوسفیان کی بیوی تھی اس شیرِ اسلام سے سخت بُغض اور کینہ رکھتی تھی اور جس نے ان کے قتل پر انعام مقرر کر رکھا تھا، اُس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبانے کی کوشش کی۔

ابوسفیان کو اگرچہ یہ پتہ چل گیا تھا کہ حضورؐ زندہ ہیں؛ تاہم اُس نے جلد اپنی فوجیں

Marfat.com

میدانِ جنگ سے واپس بلالیں اور جاتے ہُوئے اُن مسلمانوں سے جو جبلِ اُحد کی چوٹی پر چڑھے ہُوئے تھے چیخ کر کہا:

"کل تمہاری آج ہماری باری تھی۔ ہم نے اس دن کا بدلہ چکا دیا ہے۔
آئندہ سال پھر تم سے بدر کے کنوؤں پر دو دو ہاتھ کر لیں گے۔"

مگر یہ دن ختم نہیں ہُوا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زخمی اور جریانِ خون کے سبب کمزور ہونے کے باوجود لشکرِ قریش کے تعاقب کی قیادت کی اور مکّے کے قریب ایک گاؤں میں کئی روز ڈیرا ڈالے رکھا۔ اس دوران میں ہر شب آپؐ کے حکم سے لکڑیاں جمع کر کے پانچ سو مشعلیں روشن کی جاتیں، جنہیں دیکھ دیکھ کر اہلِ مکہ سہم رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ شاید مدینے کی پوری آبادی یک لخت جوابی حملے کے لیے دوڑ آئی ہے۔ دراصل حضورؐ مکّے والوں کی نفسیات سے خوب واقف تھے۔ مشعلیں روشن کروا کر آپؐ نے کفارِ مکّہ کی فتح کا خمار زائل کر دیا اور مسلمانوں کی شکست کا احساس کم کر دیا۔

اب صورتِ حال یہ آلگی کہ اُحد میں ناکامی کا سُن کر، مخالفینِ اسلام اور منافقین نے مسلمانوں کا تمسخر اُڑانا شروع کر دیا اور باتیں بنانے لگے کہ اگر بدر کی فتح مسلمانوں کے حق پر ہونے کا ثبوت تھی، تو آخر اُحد میں کیا ہوا؟ اور اس ہوا اکھڑنے سے صحرائے نجد کے بدوؤں نے بھی پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے تو حضورِ اقدسؐ نے اپنے تھکے ہُوئے خستہ حال ساتھیوں کے ساتھ کمال استقامت اور دلیری سے ان پر چڑھائی کی۔ صحرائے نجد تک کا سفر انتہائی پُرصعوبت تھا۔ تپتی ہوئی ریت سے پاؤں جھلس رہے تھے جس سے بچنے کے لیے مسلمانوں نے پاؤں پر چیتھڑے باندھ رکھے تھے مگر کسی نے آگے بڑھنے سے پیٹھ نہیں موڑی۔

ڈرمنگھم کہتے ہیں:

"(مسلمانوں نے) یوں اپنے قائد کو خراج پیش کیا، حالانکہ موت اُن کے سر پر منڈلا رہی تھی، مگر اپنے قائد کی اولوالعزمی اور ثابت قدمی دیکھ کر

Marfat.com

اُن کے حوصلے بلند رہے۔ محمد (ص) کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ جنگوں،
دو حملوں اور دو سرایا کے باوجود، وہ دُنیا کے اس ویران خطّے میں پہنچ کر
دُنیا کا نقشہ بدل دینا چاہتے تھے۔[۱]

کوئی انسان یہ بات تصور میں لا ہی نہیں سکتا کہ پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دورانِ قیامِ مدینہ کس عظیم سرگرمی اور جدوجہد کا نمونہ پیش کیا۔ مدینہ میں دس سال کے دورانِ قیام میں آپؐ نے چوہتر غزوات وسرایا کے لیے لشکر ترتیب دیے۔ ان میں سے چوبیس میں بہ نفسِ نفیس عساکرِ اسلام کی قیادت فرمائی۔ ان معرکوں کے نتیجے میں پورا عرب آپؐ کا زیرِ نگیں ہوگیا مگر حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ آرائی تو آپؐ کی زندگی کا محض ایک پہلو تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تابناک آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا وہ رُخ ہے جس میں آپؐ بیک وقت انسانوں کے معلّم اور ان کے تنازعات کے منصف کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے آئے۔ گراں بار فرائض اور لامحدود مصروفیات میں وقفے وقفے سے نزولِ وحی بھی ہوتا رہتا تھا۔ حیرت ہے پھر بھی آپؐ اپنے خاندان اور دوستوں کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔[۲]

حضورِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم بھی یہی تھی کہ وہ زندگی کے روزمرہ وظائف میں بھی روحانی حقائق سے پہلوتہی نہ کریں۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا:

---

[۱] Dermenghem, "Life of Mahomet," P-235

[۲] مدینے کے لوگوں میں ایک پست قد اور بدشکل انسان ظاہر بھی تھے، جن سے حضورؐ انس رکھتے تھے۔ ایک دن انہیں بازار میں دیکھ کر آپؐ نے پیچھے سے آکر انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ظاہر نے پکار کر کہا "کون ہے"؟ پھر جب حضورؐ کو دیکھا تو اُن کے سینے سے لپٹ گئے۔ حضورؐ نے بہ آوازِ بلند فرمایا "کوئی ہے جو اس غلام کو مجھ سے خرید لے"۔ اس پر ظاہر نے کہا: "اللہ کی قسم اے رسولِ خدا! آپ مجھے جنسِ کاسد پائیں گے"۔ جس پر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: "مگر خدا کی نظروں میں تم بے وقعت نہیں ہو"۔

Marfat.com

"قسم ہے اللہ عزّ وجل کی جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے کہ اگر تم ہمیشہ اسی حالت میں رہو جیسے میرے ساتھ رہتے ہو یا جس طرح تم ذکرِ الٰہی کے وقت ہوتے ہو تو اللہ کے فرشتے تمہارے بستروں سے تمہیں ہاتھ پکڑ کر اُٹھائیں اور جب راہوں میں گرمِ سفر ہو تو تمہارے ساتھ چلیں۔"

حضورِ اقدسؐ کی عادت تھی کہ سادہ لوگوں کے سوالات کے جوابات نہایت سادہ اور ان کی فہم کے مطابق دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے پوچھا: "اے اللہ کے رسولؐ! اسلام کی بنیاد کن باتوں پر ہے؟" تو جواب میں آپؐ نے کہا:

"کہو! میں اللہ پر ایمان لاتا ہوں۔ پھر سیدھے راستے پر چلتے رہو۔"

ایک اور شخص نے دریافت کیا کہ تقویٰ کی بنیاد کن امور پر ہے؟ آپؐ نے سیدھا سا جواب دیا: "کسی کی بُرائی نہ کرو۔" ایک اور موقع پر جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ "بدی کیا ہے؟" تو حضورؐ نے فرمایا: "مجھ سے بدی کے متعلق بات نہ کرو، نیکی کی بابت پوچھو۔" اور جب حضورؐ سے استفسار کیا گیا کہ اللہ کی نظروں میں نیکی کیا ہے تو حضورؐ نے فرمایا: "نماز صحیح وقت پر ادا کرنا، والدین کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنا اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔" اسی طرح ایک مرتبہ کسی شخص نے حضورؐ سے پوچھا کہ وہ اپنی مرحومہ ماں کی کس طرح خدمت کرسکتا ہے تو آپؐ نے اُسے مشورہ دیا کہ اپنی ماں کے نام پر کنواں کھدوا کر پیاسوں کو اس سے سیراب کرو۔

حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا: "تم اُس وقت تک بہشت میں داخل نہ ہوسکو گے جب تک ایمان نہ لاؤ اور تمہارا ایمان اس وقت تک پختہ نہیں ہوسکتا جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔" اور ایک مرتبہ ایک مسلمان سے تنبیہہ کے لہجے میں فرمایا: "کسی کام کو چھوٹا نہ سمجھو۔" اور اس پر مزید زور دیتے ہوئے فرمایا کہ "کسی مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی ہے۔" اور اسی سلسلے میں ایک مرتبہ فرمایا کہ:

"اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی دنیا کی ایک پریشانی رفع کردے گا تو اللہ اُسے روزِ حشر کی ایک پریشانی سے نجات دے گا۔"

Marfat.com

بعض قریبی اصحاب کے لیے آپؐ کی تعلیمات بڑی گہری اور دُور رس نوعیت کی ہُوا کرتی تھیں۔ بہ ایں ہمہ آپؐ اُن لوگوں پر جو گہرائیوں میں جانا نہیں چاہتے تھے، درون پردہ اسرار و رموز منکشف نہیں فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے تھے کہ میری یادداشت میں حضوؐر کے دو ارشاد محفوظ ہیں۔ ایک کو تو میں نے لوگوں پر ظاہر کر دیا ہے لیکن اگر دوسرا ظاہر کر دوں تو میرا گلا کٹ جائے گا۔" اور حضرت ابوہریرہؓ نے یہ روش حضوؐر کی سُنّت پر عمل کرتے ہُوئے اختیار کی۔

حضوؐر کا خانوادہ "اہلِ بیت" جس پر مسلمان دن رات درود سلام بھیجتے ہیں، رفتہ رفتہ وسیع ہُوا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دختر حضرت عائشہؓ کے متعلق (جو ابھی بچّی تھیں) خواب میں دیکھا تھا کہ ایک فرشتے نے انہیں آپؐ کی خدمت میں پیش کیا اور اسی لیے آپؐ نے ان سے ہجرت سے قبل ہی عقد کر لیا تھا اور رخصتی مدینے میں ہُوئی جب وہ بلوغ کو پہنچیں۔ حضور اکرمؐ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد ایک بیوہ خاتون حضرت سودہؓ سے نکاح فرما لیا تھا۔ پھر حضرت عمر بن الخطابؓ کی دختر حضرت حفصہؓ سے نکاح کیا۔ وہ بھی بیوہ ہی تھیں۔ حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ میں سے ایک صحابی کی بیوہ اُمّ سلمہؓ تھیں۔ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو انکار کر چکی تھیں مگر انہوں نے بطیبِ خاطر حضوؐر کے حرم میں داخل ہونا پسند کیا، مگر حضوؐر پر واضح کر دیا کہ "مجھ میں حسد کا مادّہ بہت ہے"۔ جس کے جواب میں نبی کریمؐ نے فرمایا "میں اللہ سے دُعا کروں گا کہ اسے تمہارے دل سے نکال دے"۔ دوسری ازواجِ مطہرات کی طرح انہیں بھی بطورِ اثاث البیت ایک مختصر رقم، ایک تھیلہ جَو، ایک چکّی اور کھانا پکانے کی ایک دیگچی اور کھجور کی چھال سے بھرا ایک گدّا ملا۔ اس کے بعد آپؐ نے زینب بنت جحش جو پہلے حضرت زیدؓ کے نکاح میں تھیں، عقد فرمایا۔ وہ اپنے قبیلے کی سب سے حسین خاتون تھیں۔ ان کے بعد بھی حرم میں اضافے ہوتے رہے۔

صرف اسی معاملے میں نہیں، اہلِ مغرب بالعموم تعدّدِ ازدواج کو اچھی نظر سے نہیں

Marfat.com

دیکھتے؛ بہر حال یہ اُن کا معاملہ ہے۔ اس سے مسلمانوں کو سروکار نہیں ہونا چاہیے تاوقتیکہ کسی کمزوری یا نادانی کے باعث وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ان پر رسولِ مقبولؐ کے تعددِ ازدواج میں کے معاملے کو مختلف تہذیبی تقاضوں اور مذہبی حالات کے حوالے سے مدافعت کرنا لازم آتا ہے۔ تعددِ ازدواج میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی، جیسے صرف ایک بیوی رکھنے میں ہے۔ اب یہ حضورِ اقدسؐ کے نصیب کہ وہ ان دونوں طریقوں کی بہترین مثال پیش کریں۔

یہ حقیقت، کہ خود قرآن مجید حضورِ اکرمؐ کی متاہل زندگی کی کئی مشکلات حل کی ہیں بعض مستشرقین کے نزدیک خود قرآن کی حیثیت بطور وحی کو مشکوک بنا دیتی ہے (بشرطیکہ وہ وحی کو مستند مانتے ہوں)۔ اُن کا مؤقف یہ ہے کہ بھلا خدا زینبؓ سے آپؐ کی خواہش نکاح کے معاملے میں کیسے مداخلت کرسکتا تھا؟ اس اعتراض پر فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تہہ میں عیسائیت کا "اولین گناہ" کا نظریہ جاگزیں ہے، جس نے انہیں روحانی اور فطری دوائر کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ عیسائی عقائد کے سیاق وسباق میں اس قسم کا خیال شاید درست ہو، لیکن اسلام میں، جو توحیدِ الٰہی کا دین ہے، اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمانوں کو سماوی اور ارضی معاملات میں کوئی تضاد محسوس نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس اُن کا ایمان ہے کہ دونوں میں یک رنگی ہے۔ حضورؐ کی بشری ضروریات خدا ہی کی طرف سے تھیں اور اُنہیں پورا کرنا بھی ابدی حقیقتوں میں سے تھا، اور یہ ضرورتیں اور حقیقتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ یہ کہنا لاحاصل ہے کہ جن باتوں کا اطلاق خیر البشر پر ہوتا ہے یا جو آپؐ کے لیے جائز ہیں، وہ تمام انسانوں کے لیے نہیں ہوسکتیں۔

یہ بات پہلے ہی واضح کی جاچکی ہے کہ تعددِ ازدواج میں کوئی عجیب بات نہیں تاہم؛ یہ بات ضرور ہے کہ ہر خاندان کے اپنے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں اور نبیؐ کا گھرانا اس سے مستثنٰی نہیں۔ قرآنِ مبین کے حکم کے مطابق حضور اکرمؐ نے اپنی تمام ازواجِ مطہرات کے ساتھ یکساں سلوک کیا اور ان سے ہمیشہ عدل وانصاف سے پیش آئے۔ آپؐ

Marfat.com

بڑے منصفانہ طور پر اپنی تمام ازواجِ مطہرات کے پاس باری باری شب بسری فرماتے، اور غزوات میں ساتھ جانے کے لیے ازواجِ مطہرات میں قرعہ اندازی کرتے تھے، تاہم جیسا کہ آپؐ نے خود بھی فرمایا کہ انسان کے جذبات اس کے اختیار میں نہیں ہوتے۔

آپؐ کو حضرت عائشہؓ سے جو تعلقِ خاص تھا اس کا علم ہر کسی کو تھا اور اس بنا پر ازواج میں رشک و رقابت کا ابھر آنا قدرتی بات تھی، تاہم آپؐ پوری کوشش فرماتے تھے کہ اس کو ہنسی میں ٹال دیں۔ ایک مرتبہ آپؐ ایک کمرے میں تشریف لائے جہاں ازواجِ مطہرات تشریف فرما تھیں۔ آپؐ کے ہاتھوں میں سنگِ سلیمان کا ایک ہار تھا جو کسی نے اسی وقت آپؐ کو تحفتہً پیش کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: "یہ ہار میں اُسے دُوں گا جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔" آپؐ نے یہ کہہ کر تھوڑا سا توقف فرمایا جس کے دوران میں ازواجِ مطہرات آپس میں مشورے کرتی رہیں۔ سب کو یقین تھا کہ یہ عائشہؓ کے حصّے میں آئے گا۔ جب وہ سب گومگو کے عالم میں رہیں تو آپؐ نے اچانک اپنی ننّھی نواسی کو آواز دی اور وہ ہار اس کے گلے میں پہنا دیا۔

ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: "جب مَیں اپنی کسی حرم کے پاس ہوتا ہُوں اور وحی آتی ہے تو وہ اکثر عائشہ ہی ہوتی ہے۔" خود عائشہؓ بھی اکثر رشک و حسد میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضورِ اقدسؐ نے ازراہِ مزاح حضرت عائشہؓ سے پوچھا: "کیا تم میرے سامنے مرنا نہیں چاہتیں کہ مَیں تمہیں دفن کرنے کے بعد تمہارے لیے دعا کر سکوں؟" انھوں نے جواب دیا: "مجھے یقیناً اس کی آرزو ہوتی بشرطیکہ مجھے یہ یقین ہو کہ آپؐ میرے بعد کسی اور خاتون سے دل نہ بہلائیں گے۔"

حضورِ اقدسؐ کے صحابی اکثر آپؐ کے گھر میں گفتگو کی آزادی دیکھ کر حیران ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کی زوجۂ محترمہ نے انھیں کسی بات پر جواب دیا تو وہ اُن پر گرم ہو گئے جس پر انھوں نے کہا: "آپ ہمیں تو اپنے آگے بولنے نہیں دیتے مگر آپ کی بیٹی تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جواب دے دیتی ہیں۔" یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے برہم ہو کر فرمایا: "اُسے سزا ملے گی۔" پھر نہایت غصّے کے عالم میں

Marfat.com

حضرت حفصہؓ کے حجرے تک گئے اور انہیں سرزنش کی تو انہوں نے کہا: "خدا کی قسم! ہم تو رسولِ خدا کو جواب دیتے ہیں"۔ جس پر حضرت عمرؓ متحیر رہ گئے اور صرف یہی کہہ کر رہ گئے: "میں تمہیں اللہ کے عذاب اور نبی کریمؐ کی ناراضگی سے متنبہ کرتا ہوں۔"[1]

حضرت پیغمبرِ اسلامؐ نے نبوت کی رفعت، اللہ تعالیٰ کے قرب اور رویا کی صفت میں عزمِ صمیم سے توازن پیدا کیا جو محیر العقول کارنامے اس دنیا میں انجام دیے اور اس عرصے میں بھی آپؐ کے اہلِ بیت میں محبت کی گرمی اور زندگی کا ہمہمہ قائم رہا، کسی بھی مسلمان کی زندگی کا حاصل ہے۔ اگر اس بات کو سمجھ لیا جائے تو گویا اسلام کو جان لیا گیا۔

جنگِ اُحد کے بعد، ابوسفیان مکّے میں مسائل میں الجھ گیا جن کے باعث اگلے سال بدر کے کنوؤں پر دوبارہ لشکرکشی کا اپنا عہد ایفا نہ کر سکا؛ تاہم وہ اس تمام عرصے کے دوران میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہا۔ تجربے نے اُسے بتا دیا تھا کہ اب اینٹ کا جواب پتھّر سے دینے کا وقت نہیں رہا۔ یا تو مسلمانوں کو مکمل طور پر ختم کرنا ہوگا یا بازی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ اُس نے بڑے تدبّر سے بدو قبائل اور قریش کا ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا۔ بدّوؤں میں سے کچھ تو واقعی مسلمانوں کے خلاف تھے اور کچھ محض لوٹ مار کے مواقع کی تاک میں تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے مدینے

---

[1] حضورؐ کے قریب ترین اصحاب بھی آپؐ کے گھر کی آزاد فضا کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ کے گھر میں حضرت ابوبکرؓ داخل ہوئے تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کو حضورؐ سے کسی بات پر بحث کرتے سُنا تو سختی سے کہا: "خبردار! آئندہ کبھی اللہ کے رسولؐ کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کرنا۔" حضورؐ نے انہیں تھپڑ مارنے سے روکا۔ وہ اپنی بیٹی کے اس طرزِ عمل پر پیچ و تاب کھاتے باہر چلے گئے۔ دوسرے دن جب وہ حضورؐ کے گھر تشریف لے گئے تو انہوں نے زن و شوہر میں کامل انس پایا، تو کہا: "کیا حضورؐ مجھے اپنی صلح میں بھی اُسی طرح شریک کریں گے جس طرح مَیں جنگ میں شریک تھا؟" حضورؐ نے کہا: "ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔"

Marfat.com

کے یہودیوں سے اتحاد کے امکانات بھی ٹٹولنے شروع کر دیے۔ ہجرت کے پانچویں سال یعنی ۶۲۷ء میں ابوسفیان دس ہزار کی نفری کا ٹھاٹھیں مارتا لشکر لے کر مدینے کی طرف بڑھا۔ سرزمینِ حجاز نے کبھی اس سے پہلے ایسی زبردست فوج نہیں دیکھی تھی۔ اس لشکر کے مقابلے کے لیے مسلمان زیادہ سے زیادہ تین ہزار نفوس پر مشتمل ایک فوج کھڑی کر سکتے تھے۔

حضورِ اکرمؐ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر فوراً ایک جنگی مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ اس مرتبہ کسی نے مدینے سے باہر نکل کر مقابلے کا مشورہ نہ دیا۔ اس وقت ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ مدینے کا تحفظ کس طرح کیا جائے۔ اس موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے، جو غلام رہ چکے تھے اور اب حضورِ اقدسؐ کے قریبی صحابیوں میں سے تھے، یہ مشورہ دیا کہ مدینے کے گرد ایک خندق کھودی جائے جسے مختلف مقامات پر لاوے سے بنی ہوئی برجیوں سے بند کر کے مضبوط حصار قائم کر لیا جائے۔ عرب میں اس قسم کا طرزِ جنگ کبھی برتا نہیں گیا تھا۔ حضورؐ نے فوراً اس تجویز سے اتفاق کیا اور خندق پر فوری کام شروع کر دیا گیا۔

حضورِ اکرمؐ عام مسلمانوں کے ساتھ مل کر کھدائی کے مقام سے مٹی اپنی برہنہ پیٹھ پر اٹھا کر باہر پھینکتے رہے۔ سر پر منڈلانے والے خطرے کے باوجود، لوگ کھدائی کا کام میں ذوق و شوق سے جٹ گئے اور کام کے دوران میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق بھی کرتے جاتے تھے اور زیرِ لب گیت بھی گنگناتے جاتے تھے۔

یہ کام ختم ہوا ہی تھا کہ قریش اور ان کے اتحادیوں کا لشکر دل بادل کی طرح نمودار ہو گیا۔ حضورؐ جنگ کے قابل ہر انسان کو خندق پر جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آپؐ نے مدینے کا انتظام ایک نابینا صحابی کے سپرد کر دیا۔ کفارِ مکہ نے پیش قدمی کی تو تیروں کی بوچھاڑ نے ان کا استقبال کیا۔ وہ اس غیر متوقع مزاحمت سے پریشان ہو گئے۔ دشمن کی فوج خندق تو پار نہ کر سکی تاہم وہ اس کے آس پاس

Marfat.com

تین چار ہفتے تک موقع سنبھالے پڑی رہی۔ موقع موقع پر تیروں کا تبادلہ ہوتا اور دشمن دشنام طرازی بھی کرتا رہا۔ پھر موسم میں اچانک تبدیلی پیدا ہوئی۔ سردی بڑھ گئی، یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ اس اتحاد میں شریک بدوی قبائل کے لیے یہ موسم ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ وہ تو اس لشکر میں لوٹ مار کرنے کے لیے شریک ہوئے تھے جب کہ یہاں حالت یہ تھی کہ وہ ایک بے رحم موسم میں کیچڑ سے بھری خندق کے پاس بھیگے چوہوں کی طرح بیٹھے، اپنے جانوروں کو چارے کی کمی سے مرتا دیکھ رہے تھے، چنانچہ وہ ابوسفیان کو الوداع کہے بغیر اس غولِ بے سروسامان سے سرک گئے۔ ابوسفیان اب ایک دوسرے ہی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں منہمک ہو گیا جو اس کے خیال میں زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ بنو قریظہ نامی یہودی قبیلہ مدینے کے اندر سے غداری پر کمربستہ بیٹھا تھا اور یہی امر ابوسفیان کے لیے فتح کی آخری امید بن گیا۔ اس سلسلے میں یہودیوں سے مذاکرات طول پکڑ رہے تھے اور کفار کا لشکر دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر ابوسفیان نے مدینے کا محاصرہ اُٹھا لیا۔ وہ بازی ہار چکا تھا۔

عربوں کی نگاہ میں کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے اور وعدہ خلافی سے زیادہ خوفناک دوسرا کوئی جرم نہیں ہوتا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ بنو قریظہ سے اس بدعہدی کا حساب لیا جائے جو انہوں نے مسلمانوں سے کی تھی۔ ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ اپنا کوئی ثالث چن لیں۔ اُنہوں نے قبیلۂ اوس کے ایک معزز سردار سعد بن معاذ کو ثالث منتخب کیا۔ بنو قریظہ کے اس قبیلے سے اُن کے اچھے تعلقات رہے تھے۔ سعد، اُحد میں لگنے والے زخموں سے بسترِ مرگ پر پڑے تھے۔ انہیں بغلوں میں اُٹھا کر فیصلہ کرنے کے لیے لایا گیا۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سعد نے بنو قریظہ کے جوانوں کے قتل کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اور اس سزا پر عمل درآمد ہوا۔

پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کا یہ واقعہ مغرب کے رہنے والے افراد کے لیے خاصا تکلیف دہ ہے۔ وہ لوگ اپنی روایات سے متعارض کئی باتیں تو برداشت کر جاتے ہیں مگر یہ معاملہ اُن کے ذہن سے نہیں نکلتا۔ اس واقعے سے جدید مغربی ذہن کی دانش کا

Marfat.com

بھی کھل جاتا ہے۔ ہم اس صدی میں سانس لے رہے ہیں جس میں تاریخ کی تمام گزشتہ صدیوں سے زیادہ انسانوں کا قتلِ عام ہُوا ہے۔ ہمیں یہ تو قابلِ قبول ہے کہ انگنت انسان جن میں عورتیں اور بچّے شامل ہیں، تہہ تیغ کر دیے جائیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ نظروں سے بہت دُور ہوں اور دست بدست جنگ میں کام نہ آئیں لیکن مقامِ حیرت ہے کہ معصوم انسانوں کے یہی قاتل اُن غداروں کے قتل پر مضطرب ہو جاتے ہیں جو کسی معاشرے کی پوری عمارت ڈھا دینے پر تُلے ہُوئے تھے اور جن کے جرائم اتنے خوفناک تھے کہ ان کا وجود برقرار رہنا انسانیت کے لیے ایک جُرمِ عظیم تھا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمارا یہ طرزِ عمل اور ہمارے نام نہاد اصول ساتویں صدی کے کسی عرب کی نظروں میں کیا قرار پاتے۔

بہرحال اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ پیغمبرِ اسلام کا سخت طرزِ عمل (جس کے بغیر شاید اسلام پنپ نہیں سکتا تھا) اسرائیلی پیغمبروں اور عیسائیت کے بعض زبردست داعیوں کے اس طرزِ عمل سے کچھ مختلف نہیں تھا، جب وہ اپنے عروج پر تھے۔ شوآن (Schuon) لکھتے ہیں کہ جب مغرب کے لوگ محمدؐ پر اس فعل کے لیے طعن زنی کرتے ہیں تو وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس سزا کے ہدف بننے والے یا تو قطعی معصوم تھے یا پھر غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی خوفناک سزا کا مستحق کوئی نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کا انہیں جواب یہ ہے کہ بنو قریظہ سے جو سلوک ہُوا وہ ان کے اخلاقی اور جسمانی جرائم کے تناسب سے تھا۔ یہ دلیل ناقابلِ تردید ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ واقعی ان سے جُرم سرزد ہُوا تھا...[۱]"

مکّہ اب کمزور ہو چکا تھا۔ حضورؐ نے ایک بار عالمِ رویا میں خود کو کعبے میں داخل ہوتے دیکھ کر بیت اللہ کے "حجِ اصغر" یا عمرے کا فیصلہ کر لیا۔ حضورؐ اپنی

ا۔ Frithjof Schuon, Islam and the Perennial Philosophy, (World of Islam Festival Publishing Co., 1976), p. 28

Marfat.com

اونٹنی "قصویٰ" پر سوار ہو کر ایک ہزار مسلمانوں کی معیت میں عمرے کی نیت سے روانہ ہوئے۔ یہ وہی اونٹنی تھی جس نے مدینے میں مسجد نبویؐ کے لیے جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ قافلہ منزلیں مارتا حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ کے لیے رُکا۔ جب وہ آرام سے فارغ ہوئے تو "قصویٰ" نے وہاں سے ایک قدم بھی آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے مسلمانوں کو مجبوراً وہاں قیام کرنا پڑا، اور اُن کے ایلچی قریش کے سرداروں کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف ہو گئے۔ حضور اکرمؐ سفیروں کی واپسی کا انتظار ببول کے ایک خوشگفتہ پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کر رہے تھے کہ اچانک وحیِ الٰہی نازل ہوئی جس میں آپؐ سے کہا گیا تھا کہ اپنے متبعین سے متحد رہنے کی بیعت کر لیں۔ چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو بلوایا اور انہوں نے اسی پیڑ کے نیچے باری باری آ کر حضورؐ سے وفاداری کی بیعت کی۔ قرآن نے اس واقعے کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (الفتح (۴۸): ۱۰)

ترجمہ: "جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے پھر جو عہد توڑے تو عہد توڑنے کا نقصان اُسی کو ہے۔ اور جو اس بات کو جس کا اُس نے عہد کیا ہے پورا کرے تو وہ اسے عنقریب اجرِ عظیم دے گا۔"

اسلام میں بالعموم روحانی اور عملی پہلو ایک ہی عمل کا حصہ ہوتے ہیں اور یہی الفاظ اس وقت دُہرائے جاتے ہیں جب کوئی صوفی مرشد اپنے مرید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے بیعت لیتا ہے ـــ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ایک انسان، انسانی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر یہ سمجھے کہ اس کے ہاتھ پر خُدا کا ہاتھ ہے، جو اس کے قریب اور اہم ہے۔ صلح حدیبیہ نے اس حقیقت کو مستحکم کر دیا کہ مسلمان ہر قسم کی آزمائش میں پورے اتریں گے اور جو بات مزاجاً ان کے لیے قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے (بالخصوص کسی عرب

Marfat.com

کے نقطۂ نظر سے) کہ کسی دُوررس نتائج کے حامل سمجھوتے کو جس میں وقتی فائدے قربان کر دیے جائیں، تسلیم کر لیا جائے۔

بہر حال قریش کے نمائندوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے پا گیا تو صحابہ اور تمام مسلمان اس وقت تصویر حیرت بن گئے جب حضورؐ نے قریش کے نمائندوں کے کہنے پر اس دستاویز کی سُرخی سے بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم کے الفاظ حذف کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے اس بات کی بھی ہامی بھر لی کہ مسلمان اس وقت واپس چلے جائیں گے اور اگلے سال قریش مکّہ کو خالی کر دیں گے تاکہ مسلمان عمرہ کر سکیں۔ آپؐ نے یہ شرط بھی مان لی کہ اگر مکّہ سے کوئی مسلمان مدینے بھاگ آئے گا تو اُسے لوٹا دیا جائے گا۔ اس وقت مسلمانوں نے اسے کفّار کے حق میں بہت بڑی رعایت شمار کیا ہو گا؛ تاہم کچھ ہی عرصے بعد خود اہلِ مکّہ نے معاہدے سے اس شرط کی تنسیخ کی درخواست کی کیونکہ وہ تمام مسلمان جو مکّے سے نکل جانا چاہتے تھے، اب وہاں سے بھاگ کر مغربی ساحل پر جمع ہونے لگے اور قریش کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے لگے۔

حضورِ اقدسؐ جانتے تھے کہ اہلِ قریش سے برابری کی سطح پر مذاکرات ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے اور اگر فی الوقت آپؐ کے اُمّتی اُس صُلح نامے کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں تو یہ کافی ہے کہ اُنھوں نے آپؐ کے فیصلے کو قطعی طور پر قبول کر لیا ہے۔ صلح حدیبیہ کے بہت بعد جب اسلام کا پودا تناور درخت بن گیا اور ایک ناقابلِ تسخیر سلطنت وجود میں آئی تو جن لوگوں نے حدیبیہ میں آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی ان کا احترام ایسا ہی کیا جانے لگا جیسے اصحابِ بدر کا۔

حدیبیہ کی صلح کے تھوڑے ہی عرصے بعد نبی کریمؐ نے ابوسفیان کی ایک بیٹی حضرت اُمّ حبیبہ سے نکاح کر لیا جو کچھ عرصہ پہلے مسلمان ہو گئی تھیں، اور یوں آپؐ نے "دشمن" سے ایک اہم خونی رشتہ قائم فرما لیا۔ تقریباً اُسی زمانے میں وہ وحی نازل ہوئی جس میں

Marfat.com

کہا گیا تھا کہ اللہ جلد تمہارے ، اور تمہارے دشمنوں کے درمیان محبت کے رشتے قائم کروا دے گا۔ اس صلحنامے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ پیغمبرِ اسلام کو خیبر کے دیرینہ مسئلے کو سلجھانے کا موقع مل گیا جو دشمنِ اسلام یہود کا مشہور قلعہ تھا۔ پہلے ان سے کہا گیا کہ اگر وہ جان کی امان چاہتے ہیں تو اپنی جائداد اور مال و اسباب چھوڑ کر قلعہ خالی کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کی جانب سے ہم ہی اس جائداد کی دیکھ بھال بہتر طریق پر کر سکتے ہیں ؛ چنانچہ وہ وہیں رہے اور مدینے کو محض کرایہ ادا کرتے رہے۔ ان یہودیوں میں سے ایک عورت نے رسولِ خدا کی دعوت کی اور بکری کا ایک دست بھون کر پیش کیا جو آپؐ کو بہت پسند تھا۔ اس مکّار عورت نے اس میں زہر ملا دیا۔ جوں ہی اس کا ایک لقمہ آپؐ نے منہ میں رکھا، زہر کی تلخی سے فوراً تھوک دیا۔ کچھ راویوں کا خیال ہے کہ اس زہر کا کچھ حصّہ ضرور آپؐ کے شکم مبارک میں چلا گیا تھا۔ اس عورت کو گرفتار کر لیا گیا تو اس نے یہ عذر پیش کیا کہ میں نے تو آپؐ کی نبوت کا امتحان لیا تھا۔

خیبر سے واپسی پر ایک پڑاؤ پر آپؐ نے ایک شکیل و جمیل یہودی خاتون صفیہؓ سے، جو ایمان لے آئی تھیں، نکاح فرما لیا۔

اگلے سال قریش حسبِ وعدہ مکّے سے نکل کر نواح کی پہاڑیوں میں چلے گئے تو حضورؐ نے تقریباً دو ہزار مسلمانوں کی معیت میں عمرہ ادا کیا۔ اس موقع پر حضرت بلالؓ نے جنہیں سابقہ دورِ غلامی میں سخت ایذائیں دی گئی تھیں، کعبے کی چھت پر چڑھ کر اذان دی۔ مکّے کی ساری وادی ان کی اذان سے گونج اٹھی۔ اس کے بعد تو گویا کفّار اور مسلمانوں کے درمیان صلح و صفائی کا دروازہ کھل گیا اور اس دوران میں جب اہلِ قریش مکّے کی نواحی پہاڑیوں میں بیٹھے مسلمانوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، بدوی قبائل دھڑا دھڑ اسلام قبول کر رہے تھے، اور بات چل نکلی تھی۔

پھر کچھ عرصے بعد پیغمبرِ اسلام کے ایک سفیر کو جسے بصرے کے گورنر کے پاس بھیجا گیا تھا، شمالی علاقے کے ایک قبیلے نے قتل کر دیا جو بازنطینیوں کا حلیف تھا۔ اس پر آپؐ نے سابقہ غلام زید کو جنہیں خدیجۃ الکبریٰؓ نے شادی کے بعد آپؐ کی

Marfat.com

خدمت کے لیے پیش کیا تھا، ایک بڑا لشکر دے کر اُن لوگوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اس قبیلے سے جنگ میں زیدؓ شہید ہو گئے تو خالدؓ بن ولیدؓ نے (جو حال ہی میں اسلام لائے تھے) آگے بڑھ کر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ لڑائی کی شدت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خالدؓ بن ولید کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں، تب جا کر دشمن پسپا ہوا۔ زیدؓ کی موت کو نبی مرتبتؐ نے ایک ذاتی نقصان سمجھا اور جب ان کی ننھی بچی آپؐ سے راہ میں آکر لپٹ گئی تو حضورؐ اقدس پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ اس پر ایک راہ گیر نے غیر ضروری طور پر پوچھا: "اے اللہ کے رسولؐ! یہ کیا ہوا آپ کو؟" تو حضورِ اقدسؐ نے فرمایا:

"یہ ایک دوست کی موت پر ایک دوست کے آنسو تھے۔"

صلح حدیبیہ کے کچھ عرصے بعد ایک کافر سے کسی بات پر جھگڑے میں ایک مسلمان اتفاقیہ طور پر ہلاک ہو گیا۔ یہ گویا صلح نامے کی خلاف ورزی تھی، اس لیے پورا مکہ اس واقع سے دہل گیا۔ ابوسفیان کو فوری طور پر مدینے بھیجا گیا کہ حادثے سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو کسی طرح درست کر دے۔ مدینہ پہنچنے پر اس نے چاہا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ سے سفارش کروائے۔ ان دونوں حضرات نے اس کی سفارش کرنے سے قطعی انکار کر دیا تو وہ مایوس ہو کر اپنی بیٹی اُمِّ حبیبہ کے گھر گیا جن سے حضور اکرمؐ نے صلح کے بعد نکاح فرما لیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک گدے پر بیٹھنا چاہا تو حضرت اُمِّ حبیبہ نے وہ گدیلا اس کے نیچے سے گھسیٹ لیا۔ اس طرح قریش کا محترم سردار اور عربوں کا انتہائی مغرور انسان اُس جگہ بیٹھنے کے قابل نہ سمجھا گیا جہاں رسول مقبولؐ نشست فرمایا کرتے تھے۔ آخر پریشانی کے عالم میں وہ حضرت فاطمہؓ کے گھر گیا جن کی گود میں اس وقت اُن کے صاحبزادے حضرت حسنؓ تھے۔ اُس نے چاپلوسی کو سیاست بازی کے ساتھ شامل کرتے ہوئے کہا: "تم اس ننھے سے بچے کو ہدایت کر سکتی ہو کہ وہ مجھے امان دے تو یہ بات سارے عرب میں شہرت پا لے گی۔" حضرت فاطمہ زہراؓ نے، جو ہمیشہ کی کم سخن تھیں فرمایا: "یہ ابھی بہت

Marfat.com

چھوٹا ہے"!

ابوسفیان کو رسولِ مقبولؐ کے حضور باریابی نصیب ہوئی یا نہیں اس سلسلے میں روایات میں اختلاف ہے؛ تاہم یہ واضح ہو گیا کہ ابوسفیان کے دماغ میں اب مکّے کو حضورؐ کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔

آٹھویں سال ہجرت کے اواخر یعنی ۶۲۹ عیسوی کے اختتام پر دس ہزار مسلمان حضورِ اکرمؐ کی قیادت میں مکّے کی طرف بڑھے۔ اُنہوں نے مکّے کے قریب نواحی پہاڑی پر اپنے خیمے نصب کیے۔ یہاں سے مکّے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس جگہ آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے ملاقات کی جنہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب اسلام لانے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ حضورؐ نے اُنہیں دیکھ کر فرمایا: "جس طرح میں اللہ کا آخری رسول ہوں۔ اسی طرح آپ آخری مہاجر ہیں"! تاہم اس طنزِ لطیف کو شاید وہ نہ سمجھ پائے۔ اس عظیم ڈرامے کا آخری سین خالی از لطف نہیں۔ حضرت عباسؓ نے ابوسفیان کو سمجھایا کہ صرف میں ہی تمہارا سر کٹنے سے بچا سکتا ہوں، چلو میرے ساتھ حضرت محمدؐ کے پاس۔ یوں وہ ابوسفیان کو اپنے پیچھے خچر پر سوار کرا کے لے آئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب دُنیاوی جاہ و حشم سے مزین شخصیات راہ خدا کی طرف آتی تو عموماً اپنا وقار اور تمکنت برقرار نہیں رکھ سکتیں۔

حضرت عمرؓ بن خطاب نے ان دونوں کو آتا دیکھ کر اپنی تلوار نیام سے نکال لی مگر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اُسے واپس نیام میں ڈال لیں۔

پھر رسولِ خدا نے ابوسفیان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے ابوسفیان! کیا اب وقت نہیں آگیا ہے کہ تم محسوس کرو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟"

ابوسفیان نے جواب دیا:

"مجھے پہلے ہی علم ہے، کیونکہ اگر کوئی دوسرا خدا ہوتا تو وہ ضرور میری مدد کرتا۔"

Marfat.com

وہ کلمہ پڑھنے کے لیے تیار تھا اور "لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ" کہنے میں اُسے تذبذب نہ تھا مگر "محمّدٌ رسول اللّٰہ" کہتے ہوئے وہ جھجکا، اور عزّ و وقار کا کوئی تسمہ برقرار رکھنے کے لیے اُس نے کچھ اجتناب برتا اور یہ درخواست کی کہ امشب اسے اس پر غور کرنے کا موقع دیا جائے ـــ اگلی صبح اُس نے پوری طرح اسلام قبول کر لیا۔ اس موقع پر اس کے قبولِ اسلام کے سلسلے میں عدمِ اخلاص کا لیبل لگانا آسان ہے مگر کسی سچے مسلمان کو یہ کہنے کی اجازت نہیں کیونکہ دلوں کا حال تو بہر حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ابوسفیان قوت اور شان وشکوہ کا انسان تھا جو سچائی کو اُسی وقت پہچان سکتا تھا جب وہ پوری قوّت وہیبت سے خود اپنا وجود تسلیم کرائے۔ اس نے ایک دوست سے چپکے سے کہا تھا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی دبدبے اور جلال کا ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ ابوسفیان طبعی موت مرے۔ ۹۲ سال عمر پائی۔ اسلام کے جھنڈے تلے لڑنے میں ان کی بصارت زائل ہو گئی تھی اور وہ ایک پیر کہنہ سال ہو کر رہ گئے تھے انہوں نے دنیا کے بدلتے رنگ دیکھے اور تاریخ میں بہر حال نام چھوڑ گئے۔

ان کی بیوی ہندہ نے بھی اطاعت اختیار کی تو اس سے کہا گیا کہ وہ اپنی چوری کی عادت چھوڑ دے۔ اس پر اس نے کہا: "کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے شوہر کی بھی چوری چھوڑ دوں جو ایک انتہائی کنجوس آدمی ہے؟" حضورؐ نے مسکرا کر کہا: "خیر، یہ تو چوری نہیں!" واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی اس کی بدلہ لینے کی عادت نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بعد میں ابوسفیان نے اُسے طلاق دے دی تھی۔ پھر جب اُس کے بیٹے امیر معاویہ خلیفہ بنے تو ہندہ نے ان سے عہد لیا کہ وہ کبھی اپنے باپ سے نہ ملیں اور نہ ان کی کوئی مدد کریں۔

اب قدرت کو حضورؐ کے صبر وضبط کا سب سے بڑا امتحان لینا تھا کہ کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ سابق میں ایسا سلوک روا رکھا گیا تھا جس کا بدلہ انہیں بہت بھاری چکانا تھا۔ جب خالد بن ولید کے رسالے پر حملہ کیا گیا تو جنگ شروع ہونے میں کوئی کسر نہ رہی تھی مگر حضورؐ نے اس پر قابو پا لیا۔ ڈرمنگھم فتحِ مکّہ کے حالات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

Marfat.com

"اگلا دن طلوع ہوا تو حالات اس طرح بدل گئے کہ انسانیت ان پر فخر کرسکتی ہے۔"

حضرت محمدؐ اپنی اونٹنی "قصویٰ" پر سوار، اپنی مرزبوم مکّہ میں بغیر کسی مزاحمت کے داخل ہو گئے اور آپؐ نے فوراً ہی عام معافی کا اعلان کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"آج کا دن صلۂ رحمی اور معافی کا دن ہے۔ آج کے دن اللہ نے قریش کا درجہ اور مرتبہ بلند کر دیا ہے۔"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ میں تباہ و برباد کرنے نہیں ایک مصلح کی حیثیت سے آیا ہوں۔ اس طرح آج کے دن ایک عظیم قوم نے نئی زندگی حاصل کی۔ اس عام معافی کے اثرات تاریخ پر حد سے سوا ہوئے۔ اس دن کے بعد سے کوئی مسلمان جنرل کسی علاقے یا شہر میں داخل ہوتے وقت اس سبق کو نہیں بھولا جو فتح مکّہ کے دن اس کی ملت کو رسولِ کریمؐ نے دیا تھا۔ اور اس رواداری اور حیرت انگیز برداشت کے مظاہرں نے بے شمار لوگوں کو ملتِ اسلام میں داخل کر دیا۔

باہمی اتحاد اور تلافیٔ مافات کے عمل کو مہمیز دینے کے لیے آئندہ چند ماہ میں قریش کے ساتھ انتہائی فراخدلی کا سلوک کیا گیا۔ ابوسفیان کا سر قلم کرنے کے بجائے اُسے دو سو اُونٹوں کا تحفہ پیش کیا گیا۔ انصار کے دلوں میں قدرتاً اس سے کدورت کے آثار پیدا ہوئے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اے گروہ انصار! کیا تمہارے دل اس مال و منال کو دیکھ کر جس سے میں نے دوسرے لوگوں کی تالیف قلب اس لیے کی ہے کہ وہ اللہ کے مطیع ہو جائیں، میلے ہو رہے ہیں جبکہ میں نے تمہاری جھولی میں اسلام رکھ دیا ہے۔ کیا تم لوگ اس بات پر قانع نہیں ہو کہ یہ لوگ اپنے گھروں کو مال و اسباب لے کر جائیں گے اور تم اپنے ساتھ خدا کا رسول لے کر جاؤ گے۔"

Marfat.com

وہ لوگ مطمئن ہو گئے؛ تاہم دلوں میں تفرقہ ضرور پیدا ہو گیا جو بعد کے زمانوں میں اور زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ اور یہ فرق تھا ان لوگوں میں جنہیں صرف بہشت مطلوب تھی اور اُس گروہ میں جو دنیا کا خواہاں تھا۔

حضور رسالت مآبؐ کے لیے باوجود جسمانی انحطاط آرام کا وقت اب بھی نہیں آیا تھا۔ اگلے ہی سال موسم گرما میں ایک لشکرِ جرار آپؐ کی قیادت میں سرحد شام پر روانہ ہوا۔ اس سفر میں ریگستان کو عبور کرنے کا مرحلہ سخت صبر آزما اور دشوار تھا۔ جس وقت آپ لق و دق صحرا سے گزر رہے تھے توریت کے ایک سخت طوفان نے آ لیا۔ اُس شب تمام لشکر نے بے آب و دانہ اپنے اونٹوں کے پیچھے پناہ لے کر وقت گزارا۔ آخر بے شمار سختیاں جھیلنے کے بعد آپؐ نخلستانِ تبوک جا پہنچے اور وہاں کے قبیلوں کو مشرف بہ اسلام کرنے کے بعد مکّہ لوٹے۔ تبوک کا راستہ انتہائی پُرصعوبت تھا شاید اسی نے آپؐ کی زندگی مختصر کر دی — لیکن بہر طور آپؐ کا طریق اور اسوہ حسنہ یہی تھا — ویسے ایک ایسے انسان کے لیے، جو یہ بصیرت رکھتا ہو کہ اس کی زندگی کے بعد کی زندگی زیادہ حقیقی ہے، اس دُنیا کی سختیاں اور صعوبتیں کیا حیثیّت رکھتی ہیں۔

اب حضورؐ کا دُنیا سے رخصت کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ہجرت کے دسویں سال آپؐ جزیرہ نمائے عرب کے گوشے گوشے سے آئے ہُوئے نوّے ہزار مسلمانوں کے ہمراہ حجِ بیت اللہ کے لیے روانہ ہُوئے۔ آپؐ کے ہمراہ نو ازواج مطہرات بھی تھیں جن کے ہودے ہاروں میں لدے پھندے اونٹوں پر رکھے ہُوئے تھے۔ ضعیف العمری کی طرف قدم رنجہ، شدید جد و جہد سے چُور اور سابقہ زندگی میں ظلم و ستم کا ہدف بننے والے رسولِ رؤف الرّحیم کا یہ سفرِ مکّہ انتہائی پُروقار تھا اور اس میں صبحِ صادق کی سی تجلیات تھیں۔ دیکھنے والوں کو یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے نور کا ایک ہالہ آپؐ کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے جس کی خنک روشنی سے سارا ماحول منوّر تھا۔ پھر جب حجِ بیت اللہ کے بنیادی مناسک ادا ہو گئے تو آپؐ جبلِ عرفات پر چڑھ

Marfat.com

گئے اور اہلِ ایمان کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اجتماع سے اونٹنی پر چڑھ کر خطاب فرمایا۔ اللہ کی حمد و ثنا کے بعد حضورِ اقدسؐ نے فرمایا:

"لوگو! میری بات غور سے سنو! کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ اب اس کے بعد میں تم سے دوبارہ اس جگہ پر کبھی مل سکوں گا۔"

پھر آپؐ نے لوگوں کو پُر زور الفاظ میں ہدایت کی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کا سلوک کریں۔ اس کے بعد آپؐ نے لوگوں کو یاد دلایا کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔ اس کے بعد لوگوں سے کہا:

"مَیں دو چیزیں تم میں چھوڑ چلا ہوں اگر انہیں مضبوطی سے پکڑ لو گے تو کبھی گمراہی میں نہ پڑو گے۔ ایک ہے قرآنِ مبین اور دوسری میری سنّت۔

اے لوگو! میرے الفاظ پر کان دھرو اور سمجھو۔"

پھر آپؐ نے یہ آخری وحیٔ مبارک پڑھ کر سنائی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (المائدہ (۵) : ۳)

ترجمہ: "آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا۔"

اور اس عظیم خطبے کے خاتمے پر آپؐ نے دو بار لوگوں سے پوچھا:

"اے لوگو! شہادت دو، کیا مَیں نے اپنا فریضہ پورا کر دیا ہے؟"

ہزاروں انسانوں کے جمِ غفیر نے اس کے اقرار میں نعرے بلند کیے۔ پھر جب آپؐ جبلِ عرفات سے نیچے اُترے تو ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں آپؐ کے چہرہ مبارک اور کاندھوں پر پڑیں اور پھر تاریکی چھا گئی۔ حضورِ اقدس امام و معلمِ انسانیت کا کام پورا ہو چکا تھا۔ شاید آپؐ خود اس بات کے متمنی تھے کہ اپنا بوجھ اتار کر جلد اپنے خالق و مالک سے جا ملیں۔

اس آخری حجِ بیت اللہ کے بعد آپؐ مدینے تشریف لائے اور کیوں نہ آتے

Marfat.com

آپؐ تو انصارِ مدینہ سے وعدہ فرما چکے تھے کہ کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ اب بھی بہت کام باقی تھا۔ جس دن اسامہ بن زید کی قیادت میں لشکرِ اسلام شام کی طرف روانہ ہونے والا تھا اُس دن یک لخت ایک پُراذیت بیماری نے آپؐ کو آ لیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بیماری اُس زہر کے سبب واقع ہوئی جو آپؐ کو خیبر میں دیا گیا تھا۔ حضورؐ کمبل میں لپٹے ہوئے مسجدِ نبوی میں تشریف لائے۔ وہاں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے آپؐ کی پیشانی پر موت کے آثار صاف دیکھ لیے تھے۔ حضورؐ معلّمِ انسانیت نے فرمایا:

"یہاں اگر کوئی ایسا شخص موجود ہے جس کی پشت پر میں نے بے انصافی سے دُرّے لگوائے ہوں تو آج میری پیٹھ حاضر ہے۔ وہ آئے اور اپنا بدلہ چکا لے۔"

پھر فرمایا:

"اگر میں نے تم میں سے کسی کو بے عزّت کیا ہو تو وہ ایسا ہی میرے ساتھ کر سکتا ہے۔ اگر میں نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو میرا اثاثہ حاضر ہے۔ آخرت میں ندامت سمیٹنے سے یہ بہتر ہے کہ انسان اس دنیا میں شرمسار ہو جائے۔"

ایک شخص نے تین دینار کا مطالبہ کیا جو اُسے ادا کر دیے گئے۔

اس کے بعد آپؐ اُن زوجۂ مطہرہ کے پاس پہنچے جن کی اُس دن باری تھی (حضورِ اقدسؐ اپنے اوقات ازواجِ مطہرات کے مابین بڑے عدل و احتیاط سے تقسیم فرمایا کرتے تھے) آپؐ نے ان سے پوچھا: "کل میری باری کس کے ہاں ہے؟" تو اُن زوجۂ مطہرہ نے آپؐ کو اُن بانوئے محترم کی نشاندہی کر دی۔ پھر استفسار فرمایا: "پرسوں کس کی باری ہے؟" تو حرمِ محترم سمجھ گئیں کہ آپؐ کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہنے کا خیال ہے۔ انہوں نے دوسری ازواج کو مطلع کیا تو وہ سب مل کر حاضر ہوئیں اور عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! ہم سب اپنی بہن عائشہ کو اپنی باریاں بخوشی بخشتی ہیں۔" حضورؐ نے یہ عطیہ قبول فرما

Marfat.com

لیا۔ اس وقت حضرت عائشہؓ دردِ سر میں مبتلا تھیں۔ اُن کے منہ سے نکلا: "اوہ میرا سر" حضور اقدسؐ نے مسکرا کر فرمایا: "نہیں، تمہارا سر نہیں بلکہ میرا سر!"

ایک موقع پر نبی کریمؐ نے فرمایا:

"مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میرا اور دنیا کا معاملہ تو سوار اور پیڑ کا سا ہے جس کے نیچے سوار استراحت کرتا ہے اور پھر اُسے چھوڑ کر چل دیتا ہے۔"

پھر فرمایا:

"اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کے سامنے اس دنیا اور اُس دنیا کا انتخاب رکھا گیا اور اُس نے اُس دنیا کو چن لیا جو اللہ کی ہے۔"

۱۲ ربیع الاول کو ہجرت کے گیارہویں سال، جو عیسوی تقویم کے مطابق ۸ جون ۶۳۲ء کی تاریخ بنتی ہے، حضور ختمی مرتبتؐ آخری بار مسجدِ نبوی تشریف لائے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آپؐ نے اشارے سے انہیں تاکید کی کہ نماز جاری رکھیں۔ حضورؐ نے نمازیوں کا جائزہ لیا تو چہرۂ مبارک خوشی سے تمتما اُٹھا۔ آپؐ کے صحابی حضرت انسؓ فرماتے ہیں: "میں نے اس سے قبل حضور ختم المرسلینؐ کا چہرۂ انور کبھی اتنا تابناک نہیں دیکھا تھا۔" حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرۂ مبارک میں تشریف لاکر آپؐ ان کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ آپؐ نے اُس وقت اپنی آخری قوت مسجدِ نبوی تک جانے میں صرف کر دی تھی۔ جلد ہی آپؐ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ وہ سمجھیں کہ آپؐ کا آخری وقت آگیا ہے، مگر کوئی ایک گھنٹے بعد آپؐ نے آنکھیں کھول دیں۔ حضرت عائشہؓ نے دھیرے دھیرے آپؐ کو دہراتے سُنا: "بالرّفیق الاعلےٰ" یہ آپؐ کے آخری الفاظ تھے۔ پھر سر مبارک حضرت عائشہؓ کے سینے پر بھاری ہوتا گیا، اور پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ آپؐ کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے تو انہوں نے آہستہ سے آپؐ کا سرِ مبارک بستر پر رکھ دیا، اور اُٹھ کر شدتِ غم میں چیخ ماری اور وہی کیا جس طرح دنیا میں تمام غموں پر کیا جاتا ہے اور موت کے سکوت کو اپنے گریہ سے توڑ دیا، جس

Marfat.com

سے ارض وسما اور شش جہاتِ عالم لرز اُٹھے۔

ایک خاتون حجرۂ مبارک سے یہ کہتی ہوئی نکلیں کہ میں آپؐ کے لیے نہیں روتی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ وہاں چلے گئے ہیں جو اس دنیا سے بہتر ہے۔ میں تو اس لیے روتی ہوں کہ اب ملائے اعلیٰ کی خبروں اور پیغاموں کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے۔

Marfat.com

باب ہفتم

خلفائے راشدین

کہاجاتا ہے کہ عربوں کے دلوں میں جس انسان کی محبت و توقیر ہو اُس کے لیے وہ دنیا کے آخری سروں تک چلے جاتے ہیں جب کہ ایک کم تر درجے اور مرتبے کے انسان کے لیے ان میں کوئی گرم جوشی نہیں ہوتی اور تجریدی خیالات اور تصورات سے عام طور پر انہیں محدود ہی سی دلچسپی ہوتی ہے ۔ اسی لیے عربوں کی تاریخ افراد کی داستان ہے ۔ اپنے اس مزاج کے باعث ان کی تاریخ کو شیکسپیری تاریخ کہا جاسکتا ہے جس کے نشیب و فراز دونوں میں شدت ہے اور یہی بات اسلام کی داخلی تاریخ کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے جس میں ہوش رُبا رفعتیں بھی ہیں اور پستیاں بھی ۔ اس میں ایک طرف تو وہ شخصیات ہیں جنہوں نے دین کو نئی زندگی بخشی اور مجدد کہلائے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ بڑے جید علما، ولی اللہ اور زبردست مجاہدین بھی ہیں تو دوسری طرف چوٹی کے منافق اور نہایت درجہ متعصب لوگ نظر آتے ہیں ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دین اسلام کے پیامبر تھے مگر اپنے کچھ متبعین کے لیے آپؐ کی ذات ہی اسلام تھی ۔ پھر جب آپؐ نے رحلت فرمائی تو کچھ لوگ سکتے

Marfat.com

میں آ گئے ۔ حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے زندگی میں پہلی اور آخری بار اسی موقع پر کچھ دیر کو اپنا ذہنی توازن کھو دیا۔ انہوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کی موت کی خبر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جس کسی نے بھی اس پر گفتگو کی جسارت کی اُسے سختی سے پھٹکار دیا۔

اس اثنا میں حضور اکرمؐ کی زوجۂ محترمہ نے جن کے حجرۂ مبارک میں آپؐ کا وصال ہُوا تھا، اپنے والد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلوایا جو یہ سمجھ کر اپنے گھر چلے گئے تھے کہ اب پیغمبرِ خداؐ کی حالت کچھ بہتر ہو رہی ہے۔ وہ دوڑتے ہُوئے وہاں پہنچے۔ حجرۂ مبارک میں داخل ہو کر انہوں نے اپنے رفیقِ مکرّم کی پیشانی جھک کر چُومی ۔ اور وہاں سے نکل کر بھیڑ عوام کے سامنے گئے اور بلند آواز سے فرمایا:

"اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت اور پرستش کرتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ فوت ہو گئے ہیں لیکن اگر تم اللہ کی عبادت اور پرستش کرتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے اور موت اُسے نہیں آ سکتی۔"

پھر اُنہوں نے قرآنِ مبین کی یہ آیت بطور حوالے کے پڑھی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ط وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آلِ عمران (۳): ۱۴۴)

"اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں۔ بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ؟ (یعنی مُرتد ہو جاؤ) اور جو اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو خدا کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا اور خدا شکر گزاروں کو (بڑا) ثواب دے گا۔

حضورؐ کے کچھ قریبی عزیز جن میں حضرت علیؓ بھی تھے، جسدِ اطہر کے پاس بیٹھے رہے۔ باقی صحابہؓ قریب ہی ایک مکان کی چھت تلے (سقیفہ بنی ساعدہ میں) جمع ہُوئے اور وہاں یہ تُند و تیز بحث چل نکلی کہ اب کیا کیا جائے؟ ۔ بحث کی گرما گرمی میں ایک

Marfat.com

ذرا توقف آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ رسم و روایت کے مطابق یہ وفاداری کے عہد کی علامت تھی ۔۔۔ اور یُوں اس مردِ آہن نے ایک رقیق القلب انسان کی اطاعت قبول کرلی اور ان دو قریبی دوستوں نے جو طبائع میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے، ایک نازک صورتِ حال کو خوبی سے سنبھال لیا۔ دوسرے صحابہؓ نے اس بات کو پوری طرح سمجھ کر کہ اب انہیں کسی رہبر یا سہارے کے بغیر اس دنیائے خاکی میں اپنی راہ بنانی ہے، اس بیعت کی تقلید کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضورؐ کو دیگر تمام صحابہؓ سے زیادہ شدت سے جانتے تھے۔ یقیناً وہ آپؐ سے کسی سے کم محبت نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت کسی انسان کو نہیں، "پیغامِ الٰہی" کو اہمیت حاصل ہے۔ اُن کا سکون و اطمینان دیکھ کر حضرت علیؓ کو کہنا پڑا : "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہیں پیغمبرِ اسلامؐ کی موت کا کچھ زیادہ ملال نہیں"!

درحقیقت اس لمحے انہیں جو چیز پریشان کر رہی تھی وہ اسلام کو درپیش خطرات تھے؛ گو یا وہ طبعاً بہت زیادہ خطرات مول لینے کا مزاج نہیں رکھتے تھے مگر وقت پر جرأت اقدام کا متقاضی تھا ۔۔۔ اُنہوں نے فوراً اسامہ بن زیدؓ کو حکم دیا کہ وہ رسول اللہؐ کی وفات سے قبل کی ہدایت کے مطابق فوراً لشکرِ اسلام کی قیادت کرتے ہوئے سرحدِ شام کی طرف روانہ ہو جائیں۔ یُوں گویا حضرت ابوبکرؓ نے قبائل کی بغاوت کے امکانات کے ہوتے ہُوئے شہر کو فوجی تحفظ سے تہی کر دینے کا زبردست خطرہ مول لے لیا ۔۔۔ انہوں نے اُسامہ سے کہا: "اگر شہر چاروں طرف سے خون آشام بھیڑیوں سے بھی گھر جائے اور مَیں تنہا رہ جاؤں تو بھی فوج جائے گی"۔ وہ کچھ دُور تک برہنہ پا لشکرِ اسلام کے ساتھ گئے۔ حضرت اُسامہؓ نے ان سے درخواست کی کہ وہ سوار ہو جائیں مگر انہوں نے جواب دیا : "نہیں، مَیں سوار نہیں ہُوں گا۔ اللہ کی راہ میں کچھ لمحات کے لیے اپنے پیر خاک آلودہ کرنا چاہتا ہُوں"۔ فوجِ اسلام کو الوداع کہتے ہُوئے اُنہوں نے اسامہؓ کو ہدایات دیں کہ ہر قسم کی غداری اور دھوکہ دہی سے

Marfat.com

دامن بچائیں، کسی عورت کے بچے یا ضعیف کو قتل نہ کیا جائے، نہ کھجوروں کے کسی درخت کو نقصان پہنچایا جائے، نہ انسانوں اور جانوروں کو خوراک مہیا کرنے والے کسی درخت کو کاٹا جائے۔ خوراک کی واجبی ضروریات کے بغیر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ بے تحاشا نہ کاٹے جائیں، نیز کسی حالت میں بھی راہبوں اور تارک الدنیا لوگوں کی بے عزتی نہ کی جائے۔

جزیرہ نمائے عرب میں جوں ہی پیغمبرِ خدا کی وفات کی خبر پھیلی، بہت سے قبائل نے اسلام ترک کر دینے کا اعلان کر دیا اور زکوٰۃ دینے سے منحرف ہو گئے۔ انہیں بہت جلد، اُن جنگوں کے ذریعے جنہیں تاریخ میں "حروبِ ردّۃ" کہا جاتا ہے، راہِ راست پر لے آیا گیا۔ چھوٹے پیمانے پر ان لشکرکشیوں کے لیے جنگ کا لفظ بہت ثقیل معلوم ہوتا ہے؛ تاہم ان عسکری یلغاروں نے صحرا کے بدوؤں کو یہ سبق سکھا دیا کہ اقتدار اور حکومت اب بھی مدینے ہی کے قبضے میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ کے اندر ہی اندر ضبط و نظم پوری طرح دوبارہ بحال ہو گیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ فکر عامۃ الناس کی تھی جن کے وہ امیر منتخب کیے گئے تھے — ایک مرتبہ انہوں نے کہا: "کاش! میں کھجور کا ایک درخت ہوتا اور پھل دینے کے بعد کاٹ دیا جاتا۔" خلیفہ بننے کے بعد پہلی ہی صبح وہ منڈی کی طرف کاروبار کے لیے روانہ ہونے لگے تو انہیں ایسا کرنے سے حضرت عمرؓ نے روکا۔ اس پر انہوں نے کہا: "اگر بازار نہ جاؤں تو میرا گھرانہ کھائے گا کیا؟" وہ قوت اور اقتدار کو قطعاً اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ تو اسے صرف رسول اللہؐ کی سیرتِ مقدسہ کو رائج اور مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ خود انہوں نے عدل و دیانت کی ایسی مثال قائم کی جسے بعد کی اسلامی تاریخ میں جب بھی کوئی قانونی مسئلہ درپیش ہوا، بطور نمونہ اپنایا گیا۔ ان کا طریق یہ تھا کہ درپیش مسئلے کے لیے پہلے قرآنِ کریم سے رہبری کی جستجو کرتے۔ اگر اس میں متعلقہ مسئلے کے لیے کوئی فیصلہ کن آیت نہ ملتی تو پھر وہ اس سلسلے میں سنتِ رسولؐ سے رجوع کرتے اور اگر ضرورت محسوس کرتے تو شہر میں جا کر دیگر صحابۂ کرامؓ کی رائے پوچھتے کہ وہ متعلقہ امر کے بارے میں کسی حدیثِ نبویؐ سے

Marfat.com

واقف ہیں ؟ اگر اس پر بھی کوئی حتمی جواب نہ ملتا تو مشاورت کے لیے اجلاس طلب فرما لیتے۔

دنیوی فرائض کا ان کے کاندھوں پر بہت زیادہ بوجھ تھا۔ ایک مرتبہ یمن کے کچھ سیدھے سادے لوگ مدینے آئے۔ جب انہوں نے مسجدِ نبویؐ میں کسی قاری کو کلامِ پاک کی آیات تلاوت کرتے سنا تو ان کی آنکھوں سے اشک ٹپک پڑے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے کہا: "کبھی ہم لوگ بھی ایسے ہی تھے مگر ہمارے دل اب سخت ہو گئے ہیں" مگر حضرت ابو بکرؓ کا دل سخت نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ رات کے وقت شہر میں جا کر مساکین اور پریشان حال لوگوں کا حال احوال لیتے اور ان کی مشکلات اور مصائب کو بڑے صبر و سکون سے سنتے۔ ایک موقع پر کسی غریب نابینا بیوہ کے جھونپڑے میں ان کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی جو اسی خدمت کے جذبے سے اپنے طور پر وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ یہ دو عظیم انسان جو نظم و ضبط اور اللہ کے ساتھ رابطے کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے والے تھے، اس غریب بیوہ کے جھونپڑے میں آلتی پالتی مار کر فرشِ خاکی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت وہ یہ سوچ رہے تھے کہ اسلام میں حاکمیت کا تصور یہی ہے — بھلا اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟

حضرت ابو بکرؓ کو کھجور کے ایک درخت کی طرح جلد ہی موت نے کاٹ پھینکا۔ ایک سرد صبح انہوں نے خنک پانی سے غسل کیا اور بخار میں مبتلا ہو گئے۔ لوگوں نے کسی معالج کو بلانا چاہا مگر انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا وقت آ گیا ہے، اس لیے انہوں نے کہا: "معالج تو میرے پاس آ چکا ہے۔" ان کی مراد "معالجِ حقیقی" سے تھی۔ بسترِ مرگ پر انہیں سرحدِ ایران پر متعین سپہ سالار خالدؓ بن ولید کا پیغام ملا جس میں کمک روانہ کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: "اس میں دیر نہ کرنا۔ اگر میں، جیسا کہ میرا خیال ہے، آج موت سے ہمکنار ہو جاؤں، تو شام تک کا انتظار نہ کرنا اور اگر میں رات تک بچ جاؤں تو صبح کا راستہ نہ دیکھنا۔ دیکھو! کہیں میرا غم تمہیں اسلام اور اپنے رب کے فرائض سے غافل نہ کر دے۔"

Marfat.com

اس کے بعد وہ جلد ہی اگست ۶۳۴ء میں ترسیٹھ برس کی عمر میں وفات پا گئے اور حضرت عمرؓ کو ان کا جانشین چن لیا گیا۔ اب خلافت کا ادارہ مسلمانوں کی اکثریت کو قابلِ قبول معلوم ہونے لگا۔ بہت کم لوگ اس بات میں کوئی شک وشبہہ رکھتے تھے کہ ملّت کا ایک رہنما ہونا چاہیے۔ کوئی بھی ملّت ہو اس کے لیے ایک قائد ناگزیر ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسے کسی قبیلے کے لیے ایک سردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام کے سیاسی فلسفیوں نے بہرحال بہت بعد میں ملّتِ اسلامیہ میں اقتدار کا نظریہ قائم کیا۔ دراصل منصبِ نبوّت، حضرت پیغمبرِ اسلام کے بعد ختم ہو گیا تھا اور آپؐ کے جانشینوں کو صرف آپؐ کے سیاسی فرائض، اور قرآن وسُنّت کی روشنی میں شریعت کا نفاذ ورثے میں ملا تھا۔ خلیفہ کے ذمّہ اس وقت اور بعد میں بھی تین بنیادی فرائض ہوتے تھے۔ اوّل یہ کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے نائب اور اُمّتِ مُسلمہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے انسانوں کے درمیان انصاف قائم کرے، دوم یہ کہ وہ اُمّت کا امام اور شریعت کا محافظ ہو اور سوم یہ کہ وہ امیر المومنین کی حیثیّت میں ہر اخلاقی اور جسمانی خطرے کا سدِّباب کرنے والا تھا۔ اب چونکہ اللہ کے نازل کردہ قوانین پر کوئی اور قانون فوقیت نہیں رکھتا، اس لیے حکومت کے ادارے محض قانونِ الٰہی کے اُمّتِ مُسلمہ میں نفاذ اور بیرونی خطرات سے اس کے تحفّظ اور مدافعت کے لیے قائم تھے۔ خلیفۂ وقت جو کچھ بھی کرتا تھا اس میں وہ حکمِ قرآنی کے تحت "شوریٰ" کا اخلاقی طور پر پابند تھا؛ تاہم لوگوں سے مشورہ کرنے اور ان کی اجتماعی رائے معلوم کرنے کے بعد آخری فیصلہ کرنا صرف اسی کی ذمہ داری تھی۔

حضرت عمرؓ کو اپنے پیش رو سے ایک پُرامن مُلک ورثے میں ملا تھا۔ اس وقت عرب آپس میں اسی طرح متحد تھے جیسے حضرت پیغمبرِ اسلامؐ کی حیاتِ طیّبہ کے آخری ایّام میں تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حضرت عمرؓ اسی وقت "دارالاسلام" کی حدود کو جزیرہ نمائے عرب سے پرے بڑھانا چاہتے تھے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ بعد کے مورخین انہیں "عمرؓ فاتح" کا لقب دیں گے تو یقیناً وہ حیران اور ششدر رہ جاتے۔ جس طرح کسی زمانے میں مدینے کے مسلمان، کافر عربوں کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے تھے اسی طرح

Marfat.com

اب جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایران اور بازنطینی سلطنتوں کے ساتھ رہ سکے۔ اُمتِ مسلمہ جو اس وقت مقامِ نزولِ وحیِ الٰہی کے گرد و پیش میں بس رہی تھی، خود کو ایک زوال آمادہ اور ابتر دنیا میں گھرا محسوس کرتی تھی۔ اسلام نے اسے اس طرح دولخت کر دیا تھا جس طرح چھری مکھن کو کاٹ دیتی ہے۔ اس وقت مقصد لوگوں کو مسلمان بنانا نہیں تھا، (یہ عمل تو بعد میں ہُوا) بلکہ دُنیا میں نظم و ضبط، اور عدل و توازن پیدا کرنا ضروری تھا۔ بقول لارا ویگلیری (Laura Vagliere)

"پیغمبرِ اسلامؐ کی وفات سے قبل اُسلامؐ دنیا کی تاریخ کا ایک معمولی سا واقعہ تھا لیکن اگر اسے ایک عالمگیر نوعیت اور اہمیت حاصل ہو گئی اور ایک مسلم سلطنت کی بنیادیں استوار ہو گئیں، جسے خانہ جنگیوں، عدم اتحاد اور بیرونی حملوں نے ہلا تو دیا مگر اُسے کُلّی طور پر تباہ نہ کر سکے تو اس بات کا سہرا (حضرت) عمرؓ کی سیاسی بصیرتوں اور صلاحیتوں کے سر جانا چاہیے[1]"

حضرت عمرؓ کو نظم و ضبط کی خصوصی صلاحیت حاصل تھی، اسی طرح وہ فوجی قائدین کی جلد بازانہ کارروائیوں کی اصلاح بھی کرتے تھے اور اب اُنھوں نے حیرت انگیز سیاسی سوجھ بوجھ اور بصیرت کا ثبوت دیا۔ جھگڑوں کو ختم کرنے اور بعض سخت مزاج صحابہؓ کی ضدوں سے نمٹنے میں بھی انھوں نے تدبّر کا مظاہرہ کیا۔

اگرچہ وہ ایک فاتح کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں؛ تاہم انھوں نے "معمارِ امن" ہونے کا بھی کردار ادا کیا ــــ اگر اس سرکش نوجوان کو تصور میں لائیں جس نے کبھی پیغمبرِؐ خدا کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی اور جس کا قبولِ اسلام اتنا بے ساختہ اور چونکا دینے والا تھا تو ہمارے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ کس طرح حضرت محمدؐ نے اس خام کو کندن بنا دیا اور اُس جوہر کو آب دی جو عمرؓ کے اندر پہلے سے موجود تھا۔ حضرت عمرؓ کی فطری خوبیاں ختم نہیں ہوئی تھیں، (خدا اور اُس کا رسولؐ مٹاتے نہیں) بلکہ ہُوا یہ کہ ان کی

---

[1] Cambridge History of Islam, Vol. I, p. 64

Marfat.com

قلبِ ماہیت ہو گئی۔ انہیں کثافت سے پاک و صاف کر کے صحیح سمت پر ڈال دیا گیا۔ اور انہیں یک رنگ بنا کر روحانی اور انسانی معراج پر پہنچا دیا گیا۔

ایک ذرا کم درجے پر یہی بات خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو کسی زمانے میں کفارِ مکہ کے بڑے سرفروش سورما سمجھے جاتے تھے اور بعد میں رسولؐ اللہ کے جاں نثار سپاہی اور عمرؓ ابن خطاب کے زمانے کے عظیم سپہ سالار بن گئے تھے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب دنیا پر تسلّط کی جنگ شروع ہوئی جسے ایک طرح کی "گوریلا جنگ" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں عرب نہایت تیز رفتاری سے ریگستان کی پہنائیوں سے نکل کر سرحدوں پر یہاں وہاں چھاپے مارتے اور جب اس وقت کی بڑی طاقتوں کی بھاری بھر کم اور جملہ لوازم حرب سے لیس فوج تیار ہو کر اٹھتی تو یہ بادیہ نشینِ عرب وسیع و عریض صحرا کی وسعتوں میں چھلاوہ بن کر غائب ہو جاتے جہاں ایرانی اور بازنطینی لشکران کا تعاقب نہیں کر سکتے تھے۔ بعینہٖ اسی طرح صوفی بھی خلا کی بے کراں وسعتوں کا پشتارہ اٹھائے، دنیا میں آتے ہیں۔

مذہبی معاملات میں شام، فلسطین اور مصر کی بازنطینی قلمرو بے حد بودی تھی۔ بازنطین میں یونانی قدیم چرچ ریاست پر چھایا ہوا تھا جس کے اثر کے تحت بازنطینی حکومت ان علاقوں کے عیسائیوں کو ملحد گردانتی تھی اور اسی کے مطابق ان سے سلوک بھی روا رکھتی تھی۔ سلطنت کو متحد کرنے کے بجائے عیسائیت اُسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے درپے تھی۔ جب خالدؓ بن ولید نے ایک مختصر فوج کے ساتھ دمشق میں داخل ہو کر شہر کا محاصرہ کر لیا تو ایک اُسقف نے جو کسی دوسرے فرقے سے تعلق رکھتا تھا، خفیہ طور پر خالد کی فوج کو بڑی بڑی سیڑھیاں فراہم کیں جن کی مدد سے بہت سے مسلمانوں نے شہر پناہ کی دیواریں عبور کر کے شہر کے دروازے کھول دیے جس کے نتیجے میں اس شہر کے بازنطینی گورنر نے بغیر لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دیے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد کوئی قتلِ عام یا لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم نہیں ہوا (جبکہ پچھلی ہی صدی کے اوائل تک یورپ کی ریت یہ تھی کہ جوں ہی

Marfat.com

کوئی شہر فتح ہوتا تو لازمی طور پر اُسے تباہ و برباد کر دیا جاتا)۔ عیسائیوں کے بڑے گرجے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ ایک حصے میں عیسائی اور دوسرے میں مسلمان عبادت کر سکیں۔ دمشق سے خالد نے شمال کی طرف چڑھائی کی مگر اُسے عارضی طور پر پسپا ہونا پڑا لیکن پسپائی سے قبل خالد نے شہروں اور قریوں سے وصول کی ہوئی جزیے کی وہ رقم واپس کر دی جو غیر مسلموں کے تحفظ کے لیے بطور ٹیکس وصول کی گئی تھی۔ یہ اس بنا پر تھا کہ اب وہ اِن لوگوں کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اس کارروائی کے بعد انہوں نے اپنی فوجیں گرد و غبار کے طوفان میں دشمن کے لشکرِ جرار کے سامنے لا کھڑی کیں۔ دشمن کی سپاہ کی قیادت خود شہنشاہ ہرقل کر رہا تھا۔ خالد پھر یہ کہتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے کہ "بہشت تمہارے سامنے ہے، شیطان اور جہنم تمہارے پیچھے ہیں"۔ آخر شہنشاہ ہرقل میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا — اور یوں شام پر سے ایک ہزار سالہ رُومی اور یونانی تسلّط ختم ہو گیا۔

اس عرصے میں خالد کے ساتھی جرنیل عمرو بن العاص فلسطین میں مصروفِ پیکار تھے۔ آخر یہاں بھی ۶۳۷ء میں یروشلم نے ہتھیار ڈال دیے — مگر اسقفِ اعظم بضد ہوا کہ وہ شہر کی کنجیاں ذاتی طور پر صرف (حضرت) عمرؓ ہی کے حوالے کرے گا۔ آخر اس شہر کے تقدس کی خاطر خلیفہ خود تشریف لائے۔ عیسائی عساکر کے کمانڈر اور بڑے بڑے پادری، پُرشوکت زرق برق لباس پہنے شہر کے دروازوں پر ان کا استقبال کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ حضرت عمرؓ پیوند زدہ لباس پہنے، خچر پر سوار وہاں پہنچے اور اپنی موجودگی میں ہتھیار ڈلوانے کی کارروائی میں حصہ لیا۔ اس موقع پر انہوں نے مفتوحین کی جانوں اُن کے گھروں، عبادت گاہوں اور اُن کی مقدس صلیبوں کے تحفّظ کی مستحکم ضمانت دی — پھر پادریوں کی معیت میں انہوں نے قسطنطین کے گرجا کا معائنہ کیا اور رواداری اور لحاظ کی خاطر نماز اس گرجا کو جانے والی سیڑھیوں پر ادا کی تاکہ عیسائی یہ نہ سمجھیں کہ ان کی نیت اس گرجا کو مسجد میں تبدیل کرنے کی ہے۔[1]

---

[1] اب اس کا تقابل ذرا عیسائیوں کے قبضۂ فلسطین سے کیجیے۔ خود عیسائی اور مسلم مصنفین (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اب اس پورے علاقے میں بازنطینی حکومت پسپائی اختیار کر رہی تھی۔ شام اور فلسطین کی آبادی اس وقت تقریباً ۵۰ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جس میں چند افراد کے سوا سب کے سب عیسائی تھے۔ اب ان سب کو امن کی نوید مل چکی تھی۔ مسلمانوں کو ان پر اسلام ٹھونسنے یا ایک سا قانونی اور سیاسی نظام نافذ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی ــــ عیسائیوں اور یہودیوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے اپنے قوانین کے مطابق زندگیاں گزاریں۔ فاتحین اپنی فوجی چھاؤنیوں میں امن و آشتی کے محافظ بن کر رہے مگر مسلمانوں کے لیے ایران کی خود پرست اور قدیم سلطنت لوہے کا چنا ثابت ہو رہی تھی۔ چند مسلمان نوجوان بادشاہ یزدگرد کے دربار میں پہنچے اور اُسے قبولِ اسلام کی دعوت دی۔ اُن کی اس جسارت سے کسی قدر محظوظ ہوتے ہُوئے یزدگرد نے ایرانی مٹی کی ٹوکریاں بطور تحفہ ان کے سروں پر رکھوا کر انہیں اپنے گھروں کو لوٹ جانے کا حکم دیا؛ گویا اُس نے واضح کر دیا کہ نئی نئی حکومت پانے والے ان "احمقوں" کو وہ اپنی سرزمین کا اتنا ہی "رقبہ" دے سکتا ہے۔

سرحدوں پر عربوں کے حملے اب ایرانیوں کے لیے مسلسل دردِ سر بنتے جا رہے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ان حملوں کی حیثیت چند جھڑپوں سے آگے نہ بڑھتی کیونکہ حضرت عمرؓ ضرورت سے زیادہ توسیع کے حق میں نہ تھے۔ انہوںؓ نے اپنی فوج کو کوہستانِ زاغروس عبور کر کے ایرانی علاقے میں گھُسنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مگر یزدگرد ایک جذباتی نوجوان تھا، گو اُس کی شعلہ خُوئی بے سبب نہ تھی۔ اس کے خیال میں یہ ایک لغو بات تھی کہ مٹھی بھر عرب بیک وقت دو بڑی طاقتوں کو تسخیر کرنے کا حوصلہ کر سکتے ہوں۔ اس لیے اس نے اپنے سپہ سالار رستم کو حکم دیا کہ دریائے فرات عبور کر کے ان صحرائی چُوہوں کو وہاں سے

(گزشتہ سے پیوستہ) اس بات پر متفق ہیں کہ جب ۱۰۹۹ء میں صلیبی جنگجوؤں نے یروشلم پر قبضہ کیا تو انہوں نے ہر اُس مرد عورت اور بچے کو قتل کر دیا جس تک اُن کا ہاتھ پہنچ سکا۔ کہا جاتا ہے کہ خون ان کے گھوڑوں کی لگاموں تک جا پہنچا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ ملحدوں اور کافروں کو تہہ تیغ کرنے اور ان کا صفایا کرنے کی اجازت عیسائیت کا "جزوِ ایمان" ہے۔

Marfat.com

نکال کر عرب کے ریگزار کی طرف واپس ہانک دے جوان کا اصلی مقام تھا۔

رستم اور مسلم سالار "سعدؓ" کے مابین سفیر پیغامات لے کر آتے جاتے رہے۔ یہ دو بالکل ہی مختلف دنیاؤں بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ دو مختلف سیاروں کی ٹکر تھی۔ وہ اپنے گھوڑے اس مقام سے قریب تر لے جاتے جہاں رستم اپنے خدم و حشم کے ساتھ، جواہرات میں غرق اپنے سالاروں کے درمیان گھرا بیٹھا ہوتا۔ یہ لوگ بڑے وقار سے سر اٹھائے ایرانی جرنیل تک جا پہنچتے۔ ایک موقع پر رستم نے ایک عرب سفیر کے پتلے نیزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "یہ کیا کھلونا تمہارے ہاتھوں میں ہے؟"

"یہ ایک جلتا ہوا انگارہ ہے۔ چھوٹا ہوتے ہوئے بھی یہ ٹھنڈا تو نہیں"۔ عرب کے سفیر نے جواب دیا۔ دوسرے سفیر کے بدزیب ہتھیاروں کی طرف جب رستم نے توجہ دلائی تو اس نے کہا:

"نیام شکستہ و حقیر سہی اس کے اندر تلوار کی دھار تو تیز ہے"۔

۶۳۷ء کے موسم گرما میں ایرانیوں سے جنگ شروع ہوئی جو تین دن جاری رہی۔ اس وقت شدید آندھی چل رہی تھی ——— تیسرے دن رستم کو قتل کر دیا گیا۔ ایرانی بڑی افراتفری اور پریشانی کے عالم میں عراق کا بڑا حصّہ مسلمانوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس جنگ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا وہ کبھی مسلمانوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ کسی سپاہی نے اپنے حصّے کا مال، جو بے حد قیمتی تھا، صرف ایک ہزار دینار میں فروخت کر دیا تو اس کا مذاق اُڑایا گیا۔ اس نے کہا: "بھئی، دراصل مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ دس سو سے اوپر بھی گنتی ہوتی ہے"۔ لیکن یہ اُن خزائن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا جو ایران کے پایۂ تخت مدائن سے حاصل ہوئے جسے چند ہی دن بعد فتح کر لیا گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر، باغوں اور شاندار محلات کو دیکھ کر، فاتحین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دنیا کے ایک عظیم ترین دربار کی شان و شوکت تھی۔ سونے چاندی کے برتن، جواہرات سے مزین پوشاکیں اور تاجِ شاہی ——— وہ انہیں حیرت سے ہاتھوں میں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ یہاں چاندی سے بنا ہوا، پورے قد کا ایک اونٹ بھی رکھا تھا۔ اس پر سونے کا بنا سوار

Marfat.com

بیٹھا تھا اور ایک سونے کا بنا ہُوا گھوڑا بھی تھا۔ گھوڑے کے دانت یاقوت کے تھے اور اس کے گلے میں جو ہار پڑے تھے ان میں لعل جڑے ہُوئے تھے۔ اس میں سب سے زیادہ شاندار چیز وہ شاہی قالین تھا جو ایک باغ کا منظر پیش کرتا تھا جس کی زمین پگھلے ہُوئے سونے سے بنی ہُوئی تھی، اس کی روشیں چاندی کی تھیں اور سبزے اور گھاس کی جگہ یاقوت کے گچھے ٹکے ہُوئے تھے۔ اس میں جو نہر بنی ہُوئی تھی اس میں پانی کے بہاؤ کو ظاہر کرنے کے لیے موتی جڑے گئے تھے اور پیڑوں پر جواہرات اور دوسرے قیمتی پتھروں کے پھل اور پھول لگے ہُوئے تھے۔

حضرت عمرؓ اس قالین کو بطور یادگار فتح مکمل صُورت میں رکھنے کے قائل تھے مگر حضرت علیؓ نے ان کی توجہ دُنیوی چیزوں کی ناپائداری کی طرف دلائی تو قالین کو ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا اور یہ ٹکڑے لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ ایران سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت دیکھ کر حضرت عمرؓ رو دیے تھے۔ اُنھوں نے کہا:

"مَیں دیکھ رہا ہُوں جو مال و دولت اللہ نے ہمیں عطا کیا ہے وہ ایک دن دنیاداری اور حسد کا سرچشمہ بن جائے گا جو بالآخر لوگوں کے لیے عذاب بن جائے گا!"

دراصل اُن کے حسّاس نتھنوں نے، مستقبل کی ہواؤں میں ابھی سے بدعنوانیوں کی بُو محسوس کرنی شروع کر دی تھی۔

۶۳۹ء کے اواخر میں عمرو بن العاص کو، جو فلسطین اور صحرائے سینا کے درمیان سرحد کے قریب ٹھہرے ہُوئے تھے، خلیفہ کا ایک مکتوب ملا۔ وہ پہلے سے اپنی توسیعی مہمات کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کے خیالات سے آگاہ تھے۔ انھوں نے پہلے اپنی سپاہ کو سرحد کے اُس طرف پہنچا دیا اور پھر مُہر توڑ کر خلیفہ کا خط کھولا۔ اس میں لکھا تھا:

"اگر تمہیں یہ خط اس وقت ملے جب تم ابھی فلسطین ہی میں ہو تو پیش قدمی کا منصوبہ ترک کر دو۔ اور اگر تم پہلے ہی مصری سرحد میں داخل ہو چکے ہو تو بے شک پیش قدمی جاری رکھو!"

Marfat.com

اس کے بعد عمرو بن العاص نے نہایت معصومیت سے اپنے گرد جمع لوگوں سے پوچھا آیا وہ فلسطین میں ہیں یا مصر میں ؟

اگلے سال عمرو بن العاص نے بازنطینی فوج کو شکست دی اور ۶۴۱ء میں دریائے نیل عبور کر کے مصر میں داخل ہو گئے اور پھر جلد ہی انہوں نے خلیفہ کو یہ رپورٹ بھیجی :

"میں نے جس شہر پر قبضہ کیا ہے اس کی تفصیل میں یہاں بیان کرنے سے احتراز کروں گا۔ مختصر یہ ہے کہ میں نے یہاں چار ہزار عالی شان مکانات چار ہزار حماموں اور چالیس ہزار ایسے یہودیوں کو پکڑا ہے جن پر محاصل واجب الادا ہیں۔ ان کے علاوہ چار سو ایسے محلوں پر قبضہ کیا ہے جو بادشاہوں کی رہائش ہی کے لیے موزوں قرار دیے جا سکتے ہیں۔"

یہ احوال اسکندریہ کا تھا جو اس وقت کا عظیم ترین شہر تھا۔ اس وقت اس کی آبادی دس لاکھ سے زائد نفوس پر مشتمل تھی مگر خلیفہ ایسے شیخی خور جرنیلوں کو ناپسند کرتے تھے جو فتوحات کا سہرا اپنی دانشمندی اور جرأت کے سر باندھنے کے عادی تھے جب کہ خدا کی نظر میں کسی شخص کی عقل و دانش کی کوئی حقیقت تھی نہ جرأت کی۔ بجائے مبارکباد اور تہنیت کے پیغام کے اس رپورٹ کا جواب خلیفہ کی طرف سے نہایت برہمی سے دیا گیا جس میں عمرو بن العاص پر امیر بن جانے کا الزام عائد کیا گیا تھا — جلد ہی خلیفہ کا ایک خاص ایلچی ان کی نصف جائداد ضبط کرنے کے احکامات لے کر پہنچ گیا۔ عمرو بن العاص نے اس "خراب زمانے" کو برا بھلا جس میں کسی معزز انسان سے ایسا سلوک روا رکھا جا رہا تھا۔ ایلچی نے اس کے جواب میں کہا :

"اگر یہ دور نہ ہوتا جس سے تمہیں اتنی نفرت ہے تو تم اپنے گھر کے آنگن میں اپنی بکری کے پاؤں کے پاس اکڑوں بیٹھے ہوتے، جس کا دودھ اگر بہتات سے ہوتا تو تم خوش ہو جاتے اور اگر قلیل ہوتا تو تمہیں فکر مندی دبوچ لیتی۔"

اور اس بات کا واقعی کوئی جواب نہ تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ مصر کے فوجی گورنر تھے

Marfat.com

مگر ان کے ہاتھوں میں اس صوبے کی مالیات کا کنٹرول نہیں تھا۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ میری حالت تو اُس شخص کی سی ہے جو گائے کے سینگ پکڑے کھڑا ہو مگر اس کے دُودھ سے کوئی اور ہی مستفیض ہو رہا ہو۔"

یہی ایلچی فاتح عراق سعد کے پاس کُوفہ پہنچا اور حضرت عمرؓ کا خط ان کے حوالے کیا جس میں لکھا تھا:

"میں نے سنا ہے کہ تم نے ایک شاندار محل تعمیر کر لیا ہے اور اس میں لوگوں اور اپنے درمیان دروازہ بنا لیا ہے۔ اس میں سے نکل آؤ، اور آئندہ کبھی دروازہ لگا کر لوگوں کو نہ روکنا، نہ ان کے حقوق پامال کرنا۔ دروازہ لگانے سے تمہارا مقصد یہ ہے کہ لوگ تم سے ملنے کے لیے اُس وقت کا انتظار کریں جب تک کہ تم اُن سے ملنے کے لیے تیار نہ ہو جاؤ۔"

پُوری تاریخِ اسلام پر اولین خلفاء کا اثر اس حد تک پڑا کہ آج بھی عرب دنیا میں اگر کوئی اعلیٰ سرکاری افسر اپنے دفتر سے باہر لوگوں کو انتظار کرنے پر مجبور کرے تو اس پر شدید اعتراضات وارد کیے جاتے ہیں۔ خالدؓ بن ولید کے ساتھ جن کے متعلق عظیم مستشرق سر ولیم میور کہتے ہیں کہ میدانِ جنگ میں اُن کا کردار ایسا تھا کہ انہیں دنیا کے عظیم ترین سپہ سالاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے[1]، ان دونوں سالاروں سے زیادہ درشت سلوک روا رکھا گیا۔ انہیں باعزت طور پر مگر جبراً سپہ سالاری سے سبکدوش کر دیا گیا اور غربت اور افلاس کی حالت میں ان کا انتقال ہُوا۔

اپنے پورے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ کے کردار سے صاف طور پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اللہ کی منتخب اُمت مسلمہ میں فخر و غرور اور دنیوی دولت کے در آنے کے خلاف کمربستہ ہوں۔ مگر ان کی خواہش اور کوشش کے باوجود مکروہاتِ دُنیا

---

1. Annals of the Early Caliphate, Sir W. Muir, London, Smith Elder & Co., 1883, p. 21

Marfat.com

ملت کی زندگی میں داخل ہونے سے نہ رُک سکیں۔ ہوسکتا ہے کہ اُنہیں اس بات کا علم ہو کہ یہی وہ ایک جنگ ہے جس میں انہیں کامیابی نہیں ہوسکتی لیکن اُنہیں تو جنگ بہرحال کرنا تھی اور اس کے نتیجے میں اگر اپنے عہد کے سپہ سالاروں، مثلاً خالدؓ بن ولید، عمروؓ بن عاص اور سعدؓ بن ابی وقاص جیسی اہم شخصیات کو معزول کرنا پڑا تو خلیفہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ یہ کارروائی بہرحال اُن کی روحانی فلاح کے لیے کی گئی تھی۔ خود اپنی زندگی میں حضرت عمرؓ انتہائی سخت نظم وضبط اور زُہد کے قائل تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدا کی نعمتیں میرے لیے نہیں ہیں۔ مجھے تو بس گرمی سردی کا ایک لباس اور حج کی ضروریات اور اپنے اور اپنے خاندان کے لیے ایک عام اوسط آدمی معیار کے مطابق نفقہ درکار ہے۔ کسی بھی عام مسلمان کی ضروریات سے زیادہ لینے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔[1]

حقیقت تو یہ ہے کہ عمرؓ اوسط معیارِ زندگی کو بھی اپنے لیے روا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی صاحبزادی حفصہؓ نے ان سے التجا کی کہ وہ اور کسی کے لیے نہیں تو کم از کم مسلمانوں ہی کی خاطر اپنا خیال کر لیا کریں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا:

"میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں مگر کیا کروں، میں نے جس راستے پر اپنے دو ساتھیوں کو خیرباد کہا ہے (ان کی مراد حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ سے تھی) اُس سے مُنہ موڑ لوں تو میں زندگی کے سفر کے اختتام پر انہیں کبھی نہ پا سکوں گا۔"

وہ جو اپنے انتہائی دراز قد ہونے کے باعث لوگوں کے درمیان یوں نظر آتے تھے گویا گھوڑے پر سوار ہوں، وقت سے بہت پہلے بوڑھے ہو گئے اور رنگت میلی پڑ گئی۔ وہ اپنی پیوند زدہ چادر لپیٹے، شہر کی گلیوں میں ننگے پاؤں پیدل چلا کرتے تھے۔ اپنے

---

1. Quoted from Muhammad's People by Fric shroeder Portland. U.S.A, P. 167 ؎ا

Marfat.com

فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں اُنہیں ہمیشہ یہ ڈر رہا کہ کہیں ان میں کوتاہی نہ ہوئی ہو۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ سال بھر تک مسلم آبادیوں میں سفر کریں گے کیونکہ انہیں علم تھا کہ بہت سے مطالبات اُن کے علم میں آنے سے قبل ہی مسترد کردیے گئے ہوں گے۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا:

"خدا کی قسم! مجھے نہیں معلوم کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ! اگر میں بادشاہ ہوں تو یہ ایک خوفناک بات ہے۔"

یہ بات انہوں نے ٹیکسوں کی وصولیابی کے سلسلے میں کہی تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عام حکمرانوں کے برعکس، اس بات سے باخبر تھے کہ ریاست کے امور کے لیے محاصل جمع کرنے کی خاطر لوگوں کے مال و اسباب یا آمدنیوں پر تصرف سے کیا اخلاقی مسائل درپیش ہوا کرتے ہیں۔

جب ممتاز جنگی قیدی مدینے میں لائے جاتے تو انہیں یہ توقع ہوتی کہ وہ بازنطینیوں اور ایرانیوں جیسے شان و شوکت کے مظاہر دیکھیں گے مگر جب وہ اینٹ گارے سے تعمیر کردہ شہر کے خاک آلود چوک میں داخل ہوتے تو وہ دیکھتے کہ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے عربوں کے حلقے میں ایک انتہائی دراز قامت شخص موجود ہے جسے دوسروں پر کوئی فوقیت حاصل نہیں تو انہیں اس بات کا مشکل ہی سے یقین آتا کہ یہی شخص ایک ایسی سلطنت کا حکمران ہے جس میں روز بروز توسیع ہو رہی تھی۔

بنوغسّان کا ایک شہزادہ جو پہلے بازنطینیوں کا حلیف تھا، بازنطینی شہنشاہ کے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کے بعد مسلمان ہوگیا۔ وہ بڑی شان اور تجمّل سے ایک لاؤلشکر کے ساتھ مدینے آیا۔ ایک بدّو کا پیر اس کی پُرتکلف عبا پر جا پڑا تو لڑکھڑا گیا۔ اس گستاخی پر اُس نے طیش میں آکر بدّوی کے مُنہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ یہ معاملہ جب حضرت عمرؓ کے روبرو پیش کیا گیا تو بدّو کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اس تھپڑ کا جواب دے سکتا ہے۔ شہزادہ دوبارہ عیسائی ہوگیا کیونکہ اُس مذہب میں اس کے مرتبے کا پُورا پُورا لحاظ رکھا گیا تھا۔

Marfat.com

اب اسلامی بیت المال میں دولت کی ریل پیل تھی۔ مگر حضرت عمرؓ کو دولت کو "بند" کر کے رکھنے سے سخت نفرت تھی اور وہ اس کی فوری تقسیم پر زور دیتے تھے۔ اُن کے زمانے میں وظائف کا ایک رجسٹر بنایا گیا تھا جس میں سرفہرست حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن امہات المومنین کے نام تھے جو اس وقت حیات تھیں۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزا و اقارب اور ان لوگوں کے نام تھے جو اسلام کے بہترین سلوک کے مستحق تھے۔ (جیسے معرکہ بدر کے وہ مجاہدین جو ہنوز زندہ تھے) پھر ان لوگوں کے نام تھے جنہوں نے قرآنِ کریم حفظ کیا تھا اور آخر میں اُن سپاہیوں کے نام تھے جنہوں نے اسلام کی جنگوں میں جگر داری سے حصہ لیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے سلطنتِ اسلامی کے انصرام کے لیے ایک انتظامی ڈھانچہ تعمیر کیا مگر عربوں کو انتظامی امور کا بہت تجربہ تھا۔ اس لیے اب مسئلہ مناسب اداروں کی تشکیل کا تھا جن کے خدوخال وقت کے ساتھ نمایاں ہوتے رہے۔

مدینے میں اپنی بیکراں مصروفیات کے باوصف خلیفہ نے مملکتِ اسلامی کے طویل دوروں کے لیے وقت نکالا اور ان سفروں کے دوران میں اُنہوں نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے لیے نمونہ اور مثال قائم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ قحط سالی کے ایام میں اپنے ایک دورے میں اُنہوں نے ایک غریب عورت کو سڑک کے کنارے اپنے بچوں کے ساتھ ایک چولہے کے پاس بیٹھے دیکھا۔ چُولہے پر ایک خالی دیگچی چڑھی ہُوئی تھی۔ وہ دوڑ کر قریبی گاؤں میں گئے اور روٹی اور گوشت لے کر لوٹے اور خود اس کنبے کے لیے کھانا تیار کیا۔

ایک موقع پر انہوں نے صوبہ شام کا دورہ کیا جہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے تمام مسلمانوں کے دلوں کو تڑپا دیا۔ اسلام کے پہلے مؤذن، حضرت بلالؓ حبشی، یہاں خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ حضرت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے اذان دینے سے کنارہ کر لیا تھا۔ اب خلیفہ کے دورۂ شام کے موقع پر مسلم زعماء اور عمائدین نے خاص طور پر ان سے درخواست کی کہ وہ اذان دیں۔ یہ بُوڑھے افریقی اس بات پر راضی ہو گئے۔ جُوں ہی ان کی بلند اور واضح آواز گونجی، جو

Marfat.com

حضورؐ کے زمانے میں مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتی تھی تو پورا مجمع اشکبار ہو گیا۔ حضرت عمرؓ زور زور سے سسکیاں لینے لگے۔

حضرت عمرؓ کی خلافت کو دس سال کی مدت گزری تھی کہ نومبر ۶۴۴ء میں ایک (عجمی) نوجوان نے جس کا خیال تھا کہ اُسے اپنے کام کی تنخواہ انصاف سے ادا نہیں کی جا رہی، اُن پر مدینے میں مسجد سے نکلتے ہوئے تین بار خنجر سے وار کیا اور اس کے بعد خودکشی کر لی۔ یہ جان کر کہ اب وہ زندہ نہ رہ سکیں گے اُنھوں نے اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے قریش کی ایک چھ رکنی کمیٹی قائم کی کہ ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیا۔ انھوں نے کہا:

"وہ شخص جو میرے بعد ملّت کا نظم و نسق سنبھالے اُسے میری وصیت ہے کہ اس شہر پر مہربان رہے جس نے ہمیں اور ہمارے دین کو مسکن و مامن مہیا کیا ہے۔ اُسے چاہیے کہ وہ لوگوں کی خوبیوں پر نظر کرے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرے۔ میں اس پر زور دیتا ہوں کہ وہ عرب قبائل سے اچھا سلوک کرے کیونکہ وہ اسلام کی قوت ہیں۔" پھر فرمایا: "اے میرے اللہ! میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے۔"

لوگ ان کے جسدِ خاکی کو حجرۂ عائشہؓ میں لے گئے جہاں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ دفن تھے۔ متوفی کے صاحبزادے نے حضرت عائشہؓ کو سلام کر کے عرض کیا: "عمرؓ اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔" انھوں نے کہا: "انہیں اندر لے آؤ۔"

اس قسم کی دردناک موت کسی مغربی انسان کو بنیادی طور پر "غلط" معلوم ہوتی ہے جو اپنے کوزۂ حیات کا آخری قطرہ بھی نوشِ جان کرنے کو ترجیح دیتا ہے؛ خواہ وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ خنجر یا چمکدار تلوار کے مقابل آئے اس بات کو مناسب سمجھتا ہے کہ ہوش و حواس کھو کر ایک شکستہ جسم میں مُرغِ جاں کو اسیر کیے بستر پر ایڑیاں رگڑ کر مر جائے اور زندگی کی آخری سانسوں میں بھولا بھٹکا سا خیالِ خدا

Marfat.com

دل میں لائے۔ حضرت عمرؓ اس انجام کو پہنچنا ہرگز گوارا نہ کرتے ــــ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک (جس سے اُن کے خیالات میں تبدیلی آئی) وہ طبعی موت مرنے سے متنفر رہے۔ ان کا خیال تھا کہ "شریفانہ" زندگی کا انجام بھی "شریفانہ" ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک میدانِ جنگ یا اپنی عزّت و ناموس کے تحفّظ کے لیے مرنا خوش بختی کی بات تھی۔ اب ان کی موت ایک دیوانے کے ہاتھوں واقع ہوئی جس نے اپنے ذہن میں ایک خیالی ناانصافی بسا رکھی تھی لیکن انہیں تو یہ موت بھی قبول تھی ــــ آخر دیوانے بھی تو باشعور لوگوں ہی کی طرح خدا کے "کارندے" ہوتے ہیں جنہیں اپنا کردار خدا کے کارخانے میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے کوئی بھی شے جگہ سے ہٹی ہوئی نہیں ہوتی؛ خواہ بظاہر ایسا نظر آتا ہو۔ ہر شخص کی تقدیر کسی حمائل کی طرح اُس کے گلے میں لٹکی ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ اپنا فریضہ بہرحال پُورا کر چکے تھے۔

خلیفہ کے انتخاب کے لیے مقررہ کمیٹی کا اجلاس ہُوا۔ حضرت علیؓ کا نام اس کمیٹی میں نہیں تھا[1]۔ یہ کیوں نہ شامل کیا گیا اس کا علم تو خُدا ہی کو ہے۔ باقی تو صرف قیاس ہی کیا جاسکتا ہے۔ شیعہ مسلمان تو یہی کہیں گے کہ یہ کینے اور بغض کی بنا پر ہُوا تھا۔ آج بھی ان میں سے بہت سے لوگ حضرت عمرؓ کو اچھی طرح یاد نہیں کرتے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان میں بڑی خوبیاں اور نیکیاں ہو سکتی ہیں، مگر ہو سکتا ہے کہ وہ منصبِ حکمرانی کے لیے موزوں نہ ہو۔ شاید حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ کے بارے میں یہی رائے ہو۔

بہرحال خلافت کے لیے حضرت عثمانؓ بن عفّان کا انتخاب عمل آیا۔ اُس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔ اس کبرسنی میں بھی وہ نہایت سلجھے ہُوئے، نرم خُو، وجیہہ اور خوبصورت انسان تھے۔ حضور اکرمؐ کی دختر رقیہؓ اُن سے منسوب تھیں جن کا انتقال ان کے والد ہی کے

---

[1] مصنف کو سہو ہُوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس میں یہ چھ اصحاب شامل تھے: حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ بروایت "اسد الغابہ"

Marfat.com

سامنے ہو گیا تھا(اس کے بعد حضورؐ کی دوسری بیٹی اُمِ کلثومؓ عثمانؓ کے عقد میں آئیں جس کی وجہ سے انہیں "ذوالنورین" کہا جاتا ہے) حضرت عثمانؓ حبشہ کی پہلی ہجرت میں بھی شریک تھے۔ وہ ان چند امیر و کبیر انسانوں میں سے تھے جو ابتدا ئے اسلام میں ایمان لائے تھے اور مدینہ ہجرت کرنے کے بعد بھی وہ صاحبِ ثروت رہے۔ وہ نہایت متقی، حیادار اور شریف انسان تھے۔ اُن میں روایتی عرب رُوسا کی بہت سی صفات پائی جاتی تھیں مگر بہت سے صحابہؓ کو اس منصبِ جلیلہ کے لیے ان کی صلاحیتوں پر شک وشبہہ تھا۔

اسلامی سلطنت کی وسعت اب خود بخود ہو رہی تھی اور کچھ اعلیٰ عہدیداروں اور سالاروں کے جوش و جذبے کی بنا پر پھیل رہی تھی۔ ابوسفیان کے صاحبزادے امیر معاویہؓ اب شام کے گورنر تھے۔ وہ کچھ عرصے سے قبرص پر خروج کرنے کی آرزو دل میں لیے بیٹھے تھے۔ اکثر مذاقاً کہا کرتے تھے: "کیا کروں، قبرص کے کُتوں کا شور وغوغا مجھے رات میں سونے نہیں دیتا!"۔ مگر حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں یہ کارروائی اُس وقت ممنوع قرار دے دی تھی جب عمرؓو بن العاص نے انہیں سمندر کے سفر کے خطرات سے آگاہ کیا تھا۔ اُنہوں نے کہا تھا: "اس پر بھروسہ کم کرنا چاہیے، اس سے ڈرنا زیادہ چاہیے کیونکہ سمندر میں انسان کی حالت اس کیڑے کی سی ہوتی ہے جو کسی لکڑی کے تختے سے چمٹا ہوا ہو"۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں پہلی بازنطینی جنگی بیڑے کے خلاف چڑھائی کی گئی تو قبرص نے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر جلد ہی جزیرہ رہوڈز (Rhodes) پر قبضہ ہو گیا۔ ادھر مشرق میں افغانستان، ترکستان اور خراسان فتح ہو گئے اور مسلمان سپاہی بحیرۂ اسود کے کناروں پر چہل قدمی کرنے لگے۔ شمالی افریقہ میں اسلام کا سیلِ رواں مزید آگے بڑھا اور بربر قبائل مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

یہ سب کچھ جاری تھا، مگر مدینے میں حالات ٹھیک نہیں تھے حضرت عثمانؓ کے سن وسال میں اضافہ ہوا تو اُنہوں نے باصلاحیت اور معتبر افراد کے مقابلے میں اپنے بے وقعت اقارب کی سرپرستی شروع کر دی۔ ان کے یہ رشتہ دار بالعموم قبیلہ بنی اُمیہ کے لوگ تھے جو ابوسفیان کا قبیلہ بھی تھا۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو کبھی

Marfat.com

کبھی حضورؐ کے سخت مخالف رہ چکے تھے۔ کوفے کی گورنری سے اس شخص کے بیٹے کو ہٹا دیا گیا جو جنگِ اُحد میں پیغمبرِ اسلام کی ڈھال بن گیا تھا۔ اس کی جگہ ایک بدکردار شرابی کا تقرر کر دیا گیا اور جب وہ اپنے اعمال کے باعث لوگوں کی نظروں میں ذلیل اور رسوا ہُوا تو اُس کی جگہ ایک ناتجربہ کار نوجوان کا تقرر کر دیا گیا جس کے ہاتھوں سے شہر کا کنٹرول نکل گیا۔ اسی طرح عمروؓ بن العاص فاتحِ مصر، مصر کی گورنری سے برطرف کر دیا گیا اور اُن کی جگہ خلیفہ کے رضاعی بھائی نے لے لی۔ پھر کچھ ہی مدت میں ریاست کے تمام اداروں پر جس میں خزانہ بھی شامل تھا، اُمویوں کا کنٹرول ہو گیا ۔۔۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب حضورِ اکرمؐ کے بزرگ صحابہ نے خلیفہ کے گھر قدم رکھنا بھی چھوڑ دیا حضرت علیؓ نے ان سے ان امور پر احتجاج کرتے ہُوئے کہا:

"تمہارے سامنے صاف اور واضح راستہ موجود ہے مگر تمہاری آنکھیں بصارت کھو چکی ہیں کہ اُسے دیکھ نہیں سکتیں۔ اگر ایک مرتبہ خون خرابہ شروع ہو گیا تو پھر وہ قیامت تک نہیں رُکے گا۔ حق مٹ جائے گا اور دجل و فریب سمندر کی موجوں کی طرح سر اُٹھائیں گے۔"

مگر حضرت عثمانؓ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور جواب دیا:

"جہاں تک میرا تعلق ہے مَیں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔"

مسئلہ صاف اور سادہ تھا؛ تاہم حل نہ ہو سکا۔ عرب روایات کے مطابق قبائل ہمیشہ اس سردار کو مستعفی ہونے پر مجبور کرنے کے عادی تھے جو اپنی ذمہ داریاں پوری طرح بجا لانے کے لائق نہیں ہوتے تھے مگر اب خلیفہ کو ہٹانا جُدا معاملہ تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ تیز دھار تلوار کے سوا یہ معاملہ کیسے حل ہو گا۔ حالات جس طرح بگڑ رہے تھے، انہیں دیکھتے ہُوئے حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ سے التجا کی کہ وہ اپنی حفاظت اور سلامتی کی خاطر شام چلے آئیں۔ انہیں اپنی جگہ سے ہلنے پر تیار نہ دیکھ کر، اُنہوں نے صحابہؓ سے کہا: "اس ضعیف انسان کو تمہارے ہاتھوں میں دے رہا ہُوں۔ اس کی حفاظت کرنا۔" کچھ دنوں تک وہ خلیفہ کے جواب کا انتظار کرتے

Marfat.com

رہے، مگر خلیفہ کی طرف سے مکمل خاموشی رہی۔ آخر اپنے صدر مقام دمشق لوٹنے سے پہلے انہوں نے حضرت عثمانؓ کو یہ تجویز پیش کی وہ کچھ قابلِ اعتماد دستے ان کی حفاظت کے لیے بھیج دیں گے۔ خلیفہ نے جواب دیا: "نہیں، میں دیارِ رسولؐ میں رہنے والوں کو طاقت سے دبانا نہیں چاہتا۔"

اب قبائل کو ظلم و تشدد کا خوف لاحق ہو گیا۔ ان کی روایات جمہوری تھیں بلکہ بعض کے نزدیک نراجی تھیں اور، ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے خلفاء کے باوجود کسی مرکزی حکومت کے زیرِ نگین رہنا ان کے لیے مشکل ہی سے قابلِ قبول تھا۔ اور اب تو یہ بات مزید ناپسندیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ مدینے کے لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ان طوفانی بادلوں کو اُمڈتے ہوئے دیکھ رہے تھے جنہیں روکنا اب کسی کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اب اگرچہ حضرت عثمانؓ اُن کی بیعت مسترد کر چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لوگ ان کے خلاف سرکشی نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنی تمام خامیوں کے باوصف ایک نیک دل پیر مرد ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کی آنکھیں حضرت علیؓ کی طرف رہنمائی کے لیے لگی ہوئی تھیں لیکن انہوں نے ایک ناخوشگوار اور مذبذب غیر جانبداری کا انداز اپنائے رکھا۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص جو سیاست کے گنجلک فن کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت کا حامل بھی ہوتا تو خلیفہ کو ہٹائے بغیر، اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے سکتا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ اس قسم کے انسان نہیں تھے۔ حضرت عثمانؓ نہایت صبر و سکون سے اپنے انجام کے منتظر رہے۔ اگر وہ صورتِ حال کی اصلاح کی کوشش کرتے بھی تو بیاسی برس کی عمر میں کر بھی کیا سکتے تھے۔ جو چند دوست ان کے گرد باقی رہ گئے تھے وہ برابر زور دیتے رہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف مثبت اور مستحکم قدم اٹھائیں مگر وہ اپنے تحفظ کے لیے کوئی سخت اقدام کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

اُدھر عراق میں سازشی بغاوت کی منصوبہ سازی کر رہے تھے۔ اُدھر خلیفۂ اول حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے محمد بن ابو بکر، پانچ سو نفوس کا ایک لشکر لے کر مصر

Marfat.com

سے یہ بہانہ کر کے روانہ ہو گئے کہ وہ حج پر جا رہے ہیں۔ مدینے پہنچ کر ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے استعفٰے کا مطالبہ کیا جس کا جواب انہوں نے یہ دیا: "میں اس چادر کو کس طرح اُتار کر پھینک سکتا ہوں جو اللہ نے میرے کاندھوں پر ڈال رکھی ہے"۔ آخر ان لوگوں نے مسجد میں اُن پر پتھراؤ کیا اور انہیں بے ہوشی کے عالم میں ان کے گھر پہنچایا گیا جہاں وہ جون ۶۵۶ء تک محصوری کی حالت میں رہے۔ کچھ باغی ان کے گھر میں جا گھسے جہاں ایک کمرے میں وہ بیٹھے تلاوتِ قرآن کریم کر رہے تھے۔ ان کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہؓ ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ اُن کے پُرسکون اور باوقار انداز سے باغی ایسے سراسیمہ ہوئے کہ گھبراہٹ کے عالم میں ان کے مکان سے لوٹ گئے۔ حضرت عثمانؓ مسلسل قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف رہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد سازش کے سرغنے پھر اُن کے گھر میں زبردستی داخل ہو گئے، اُن کی ڈاڑھی پکڑ لی اور انہیں قتل کر دیا۔ ان کی بیوی نے ان کی پشت پناہی کرنی چاہی تو تلوار کے ایک وار سے ان کے ایک ہاتھ کی اُنگلیاں کاٹ دی گئیں۔ ان کے خون سے قرآنِ پاک کے صفحات تر ہو گئے۔ ان کا جسم ابھی گرم ہی تھا کہ ایک شخص ان کے کمرے میں داخل ہُوا اور اُس نے ان کے بدن پر سے خون آلود کُرتا اُتارا، اور تیز رفتاری سے دمشق جانے والی شاہراہ پر چل دیا۔

مدینے کے لوگ حضرت علیؓ کو اسلام کی آخری امید سمجھ کر اُن کے پاس گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہی مگر انہوں نے کہا:

> "یہ بات میرے ہاتھ میں نہیں، یہ اصحابِ بدر کے اختیار میں ہے وہ جسے منتخب کریں وہی خلیفہ ہو گا۔"

حضرت علیؓ اقتدار کے بھوکے انسان نہیں تھے۔ پھر یہ تو انتہائی بحران کا وقت تھا۔ کچھ عرصے تک وہ اس خیال سے متفق نہ ہوئے۔ آخر انہیں بڑی منت سے سمجھایا گیا کہ جب تک وہ اپنی آمادگی ظاہر نہ کریں گے یہ فتنہ ختم نہ ہو گا۔ اس اثناء میں دمشق میں عوام کے سامنے حضرت عثمانؓ کے خون آلود کُرتے کی نمائش و تشہیر کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ:

Marfat.com

کم از کم ساٹھ ہزار افراد اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے ۔ اور انہوں نے قاتلانِ عثمانؓ کو کوستے ہوئے انتقام کے نعرے بلند کیے ۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے نقش و نگار تو آئینۂ تاریخ میں بالکل واضح ہیں، تاہم حضرت علیؓ کا معاملہ کسی قدر الجھا ہوا ہے ۔ ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا اس لیے بھی مشکل ہے کہ اُن کے نام کے گرد جذبات کا ہالہ ہے جس کی وجہ سے گزشتہ تیرہ سو برس سے "شیعہ اسلام" "سُنّی اسلام" سے الگ ہو چکا ہے ۔

حضرت علیؓ کئی وجوہ سے ایک مثالی مسلمان تھے ۔ ایک زبردست مجاہد، انتہائی دلیر اور باوقار شخص ہونے کے ساتھ ساتھ وہ غور و فکر کے بھی عادی تھے ۔ اب جہاں تک دُنیاداری کا تعلق ہے تو وہ اس دنیا کے انسان نہیں لگتے تھے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اپنے اقتدار کے دوران میں بھی کچھ لوگ ان سے مطمئن نہیں تھے ۔ اہم بات یہ تھی کہ اُن میں مسلمانوں کی وہ "خاص" بات مفقود تھی (جس کی مثال خود نبی کریمؐ تھے) جسے قوتِ فیصلہ کہتے ہیں ۔ دنیاوی معاملات میں وہ زیادہ "تیز فہم" نہ تھے ۔ وہ بروقت یہ اندازہ نہ لگا سکتے تھے کہ کس وقت پیش قدمی کرنی چاہیے اور کب پسپائی اختیار کرنی چاہیے ۔

حد تو یہ ہے کہ حضورؐ کے اہلِ بیت اور وہ لوگ بھی، جو آپؐ سے قریب تر تھے، آغاز ہی سے مختلف الرائے تھے ۔ ایک طرف اہلِ خانہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور ان کی صاحبزادیاں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ تھیں جو گہری سہیلیاں بھی تھیں اور رسول اللہؐ کی ازواج کی حیثیت سے ایک دوسرے کی بہنیں بھی کہی جا سکتی ہیں ۔ یہ لوگ ایک فریق تھے جو عقلِ سلیم رکھتے تھے، مصلحت و حکمت کے مفہوم سے واقف تھے اور شرع کی جزئیات تک کا خیال رکھنے والے تھے ۔ دوسری طرف حضورؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں جو ایک درویشانہ مزاج کی مالک، کم آمیز اور خاموش طبع شخصیت تھیں جو غم سہنے کا حوصلہ رکھتی تھیں ۔ تجربے نے انہیں افسردہ سا بنا دیا تھا ۔ وہ خدا کے بعد اپنے والد نبی کریمؐ سے سب سے زیادہ محبت رکھتی تھیں ۔ ان کے ساتھ ان کے شوہر حضرت علیؓ تھے جنہیں حضرت پیغمبرِ اسلامؐ، حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد اس لیے اپنے گھر میں لے آئے

Marfat.com

تھے کہ ان کے والد ابوطالب کثیر العیال شخص تھے اور اُن کے لیے اپنی تمام اولاد کی کفالت مشکل ہو رہی تھی۔ حضرت علیؓ نے نبیِ اکرمؐ کے گھرانے میں نزولِ وحی کے بعد تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ وہ ابھی لڑکپن ہی کی عمر میں تھے کہ کفار کے بدترین ظلم و ستم کا آغاز ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان مظالم نے ان کی طبیعت پر گہرے نقوش چھوڑے ہوں۔

اس میں کلام نہیں کہ جناب فاطمہؓ نے اندر ہی اندر حضرت عائشہؓ کے اختیارات کو کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ نوعمر خاتون نے ان کی مرحومہ والدہ خدیجۃ الکبریٰ کی جگہ حضور اکرمؐ کے دل سے لے لی تھی۔ یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ حضرت علیؓ نے ہار کے گم ہو جانے کے واقعے کے بعد حضرت عائشہؓ کی عفت و عصمت کے تحفظ میں کچھ نہیں کیا تھا۔ (جس نے انہیں ان کا خطرناک دشمن بنا دیا) حضرت علیؓ اب تک اسلام کی تاریخ کی اہم شخصیت رہے تھے اور مناصب جلیلہ پر بھی فائز رہے۔ انہیں بہت سے خطابات اور القابات بھی دیے گئے تھے تاہم وہ اُسی عرفیت، یعنی ابُوتراب سے پکارا جانا پسند کرتے تھے جو انہیں رسول اللہؐ نے اُس وقت دیا تھا جب وہ مسجد کے فرشِ خاکی پر استراحت فرما تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہ اس دنیا کو خاک دُھول ہی سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر اُنھوں نے کہا تھا:

"یہ دُنیا ایک لاش ہے۔ جو شخص اس میں سے کوئی حصہ چاہتا ہو اُسے چاہیے کہ کُتّوں کی صحبت اختیار کرے۔"

خود انہیں "کُتّوں" سے نفرت تھی، اور اسی وجہ سے وہ اقتدار سے بچتے رہے اگرچہ بعد میں وہ اُن پر ٹھونسا گیا۔

اُنھوں نے خلافت کو بھی بادلِ نخواستہ ایک ناپسندیدہ فریضہ سمجھ کر قبول کیا تھا مگر ایسا کرنے میں وہ نادانستہ ایک مقتول شخص کے جانشین بن گئے۔ "وہ شخص ایک زندہ داستان تھا مگر ان کی جنگ حضرت عثمانؓ کی روح سے تھی جن کا خُون آلود کُرتا اُن کی بیوی کی تین بریدہ انگلیوں کے ساتھ دمشق کی مسجد میں ٹنگا ہُوا تھا جس کے نیچے قرآن کے خون آلود اوراق رکھے تھے۔ چونکہ وہ قاتلانِ عثمانؓ سے بدلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے یا اس سے انکاری تھی، اس لیے زندگی کے آخری ایام تک حضرت عثمانؓ کی

Marfat.com

روح نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا![1]

یہ ایسا مسئلہ تھا جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا تھا اس کے باوجود وہ کوئی عملی قدم نہ اُٹھا سکے۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے دارالحکومت، دمشق، سے اعلان کر دیا کہ وہ اُس وقت انہیں خلیفہ تسلیم نہیں کریں گے جب تک قاتلانِ عثمانؓ کو سزائیں نہیں دی جاتیں۔ اس پر حضرت علیؓ نے صرف یہ کہا کہ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ اللہ ہماری رہنمائی کرے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی قیادت کا محل اُن لوگوں کی لاشوں پر استوار نہیں کرنا چاہتے تھے جو واقعی سزائے موت کے مستحق تھے۔ اُن کے خیال میں سچّی اور مخلص قیادت ان اقدامات پر قائم نہیں کی جا سکتی۔ وہ افہام و تفہیم میں یقین رکھتے تھے اور اس کی انہوں نے کوشش بھی کی مگر بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ شریکِ جُرم ہونے کے مترادف تھا۔ حضرت علیؓ درمیانے قد کے مضبوط انسان تھے۔ ان کی عمُر اب چھپن سال کی ہو گئی تھی۔ سر کے بال غائب ہو گئے تھے۔ ان کی ریش کے بال سفید ہو گئے تھے جو دونوں کاندھوں کو چُھوتے تھے۔ جنگ آزمائی کا طویل عرصہ اب دُور رہ گیا تھا اور اب وہ بہ صمیمِ قلب امن کے خواہاں تھے۔

اس عرصے میں مکہ میں بغاوت کی کھچڑی پک رہی تھی یہاں دو بزرگ صحابہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ حضرت عائشہؓ سے ملے۔ یہ دونوں وہ اصحاب تھے کہ حضرت علیؓ خلافت قبول نہ کرتے، تو اس عہدے کے امیدوار تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ نے حضرت عائشہؓ کو حضرت علیؓ کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا یا جیسا کہ کہا جاتا ہے حضرت عائشہؓ نے ان پر دباؤ ڈالا، یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ بہر حال اس ملاقات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ تینوں ایک بڑا لشکر لے کر خلیفہ سے جنگ کرنے روانہ ہو گئے اور انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے خُون کا بدلہ لیں گے۔ یہ ایک عجیب و غریب سفر تھا۔ راستے میں وہ "وادی حَوَب"

---

1. The Sword of Islam, Robert Payne, London, Robert, Hole Ltd., 1959, p. 107

سے گزرے جس کے معنی جرائم کی وادی ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی اونٹنی سب سے آگے تھی۔ اس مقام پر کتوں کی ایک ٹولی نے انہیں گھیر لیا اور بھونکنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عائشہؓ چیخیں:

"مجھے یہاں سے لے چلو۔ اب مجھے یاد آیا کہ اللہ کے رسولؐ ایک مرتبہ جب اپنی ازواج کے درمیان بیٹھے تھے تو فرمایا تھا: کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ تم میں سے کس پر حوب کے کتے بھونکیں گے"۔ کیا میں ہی حوب والی عورت ہوں؟"

کتوں کا بھونکنا موقع محل کے مطابق تھا کیونکہ پہلی بار مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں سے جنگ کرنے جا رہے تھے اور اُن کی قیادت وہ خاتون کر رہی تھیں جو رسولؐ اللہ کو بہت عزیز تھیں، اور اب آسمان جو کبھی روشن اور منور تھا، سیاہ ہو گیا تھا اور اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا اور اخوت کے رشتے ٹوٹ گئے تھے۔

یہ لوگ بصرے کے قریب خلیفہ کی فوجوں کے مقابل آئے اور دونوں طرف کے سفیر آنے جانے لگے جنہوں نے حق اور ناحق پر طویل بحثیں کیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تصادم ختم کیا جا سکتا تھا، مگر یہ بات قاتلانِ عثمانؓ کے حق میں نہیں جاتی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اگر صلح ہو گئی تو پھر حضرت علیؓ انہیں سزا دینے پر بھی راضی ہو جائیں گے۔ انہوں نے ایسی ترکیب لڑائی کہ دونوں فریق یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ ان سے دھوکا کیا گیا ہے اور دوسرے فریق نے بدعہدی کر کے حملہ کر دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے سے جنگ میں گتھ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ستر آدمی حضرت عائشہؓ کے اونٹنی کے کجاوے کا تحفظ کرتے ہوئے مارے گئے۔ اسی لیے اسے "جنگِ جمل" کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں حضرت عائشہؓ کی اونٹنی کے پالان میں اور آزو بازو اتنے تیر لگے کہ تل دھرنے کی جگہ نظر نہ آتی تھی، تاہم وہ محفوظ رہیں۔ اس جنگ میں جو قتلِ عام ہوا اُسے دیکھ کر زبیرؓ مکے کی طرف چل دیے مگر انہیں راہ میں پکڑ کر قتل کر دیا گیا جب کہ طلحہؓ جنگ میں زخم آنے کی وجہ سے جلد ہی انتقال کر گئے۔ حضرت عائشہؓ نے ہتھیار ڈال دیے۔ حضرت علیؓ نے ان کے

Marfat.com

خیمے میں جا کر انہیں گزند نہ پہنچنے پر مبارک باد دی اور تلافیٔ مافات کی خاطر کہا: "جو کچھ ہو گزرا ہے اس کے لیے رب العزّت آپ کو معاف فرمائے"۔ جس کے جواب میں انہوں نے کہا: "اور آپ کو بھی!"

انہیں حضرت علیؓ کے صاحبزادوں، حسنؓ اور حسینؓ، کی معیت میں گھر واپس بھجوا دیا گیا۔ ان کے رخصت ہونے کے وقت حضرت علیؓ کا خاندان ان کے گرد تعظیماً ایستادہ ہو گیا کیونکہ بہر حال وہ اُمّ المومنین تھیں۔ یہاں اس موقع پر ایک عجب منظر دیکھنے میں آیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا:

"ہمیں ایک دوسرے کے متعلق نازیبا خیالات نہیں رکھنا چاہییں کیونکہ جہاں تک میرا اور علی کا تعلّق ہے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں"۔

ہار والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا:

"یہ ایک عام سی بات تھی جو کسی بیوی اور اس کے شوہر کے خاندان میں ہو جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے مجھ پر شُبہہ کیا ان میں علی سب سے بہتر شخص ہیں"۔

حضرت علیؓ نے جواب میں کہا: "آپ سچ فرما رہی ہیں" اور یہ کہہ کر پھر کبھی نہ ملنے کے لیے جُدا ہو گئے۔

یہ معاملہ یُوں تو بڑی بھاری قیمت پر طے پایا مگر اس سے بھی بڑا معاملہ وہ تھا جو معاویہؓ نے پیش کیا۔ ۶۵۷ء کے موسمِ بہار میں حضرت علیؓ نے شام کی طرف پیش قدمی کی اور دریائے فرات کے قریب صِفّین کے مقام پر حضرت معاویہؓ کی افواج کے مقابل خیمہ زن ہوئے۔ دونوں فریق تقریباً برابر کی قوّت رکھتے تھے۔ کئی دن باہمی مذاکرات میں گزر گئے۔ حضرت علیؓ خلافتِ اسلامیہ کے اتحاد پر زور دیتے رہے جبکہ معاویہؓ قاتلانِ عثمانؓ کے لیے سزا کا مطالبہ دہراتے رہے۔ آخر جنگ شروع ہو گئی اور یہ صاف عیاں تھا کہ حضرت علیؓ کا پانسہ بھاری رہے۔ معاویہؓ شکست قبول کر لیتے لیکن عمروؓ بن العاص نے (جو اب معاویہؓ کی ملازمت میں تھے) یہ تجویز پیش کی کہ سپاہیوں سے

Marfat.com

کہا جائے کہ وہ اوراقِ قرآنی نیزوں پر بلند کریں۔ اس پر عمل کیا گیا اور ساتھ ہی یہ نعرے بھی لگائے گئے کہ "کتاب اللہ تمہارے اور ہمارے درمیان حکم ہے۔" حضرت علیؓ اس کو نظر انداز کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ واضح طور پر شکست سے بچنے کی ایک چال تھی لیکن انہیں "تحکیم" قبول کرنے پر مجبور کیا گیا اور وہ اس تمام عمل سے بیزار ہو کر میدانِ جنگ سے چلے گئے۔ اس وقت اس پُر خار دنیا میں ان کے دل بہلا دینے کا ایک ہی سامان تھا اور وہ تھی ان کی چھوٹی بیٹی جس سے پل بھر کی جدائی بھی انہیں شاق تھی۔

اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے پیشِ نظر اسلام کے اعلیٰ مقاصد تھے اور انہیں یقین تھا کہ اب بھی یہ اصول ملت کی زندگی میں سموئے جا سکتے ہیں اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے قابلِ عمل ہیں "تحکیم" کے بطن سے ایک تحریک چلی جسے تاریخِ اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ تحریک "خارجی" تحریک کہلائی۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس وقت کی اسلامی حکومت کے اعمال کو درست نہیں سمجھتے تھے (خارجی 'خروج' کے مصدر سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں باہر نکل آنا، بغاوت کرنا) ان کا کہنا تھا کہ تحکیم کا حق صرف خدا کو ہے اور خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ وہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو برا کہتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ حکومت لوگوں کی منتخب کردہ شوریٰ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کو بدوؤں کی حمایت و تائید حاصل ہو گئی کیونکہ خود بدو یہ سمجھتے تھے کہ ریاست ان کا استحصال کر رہی ہے۔ بہت سے ایسے مسلمان بھی ان کے ساتھ شامل تھے جو بھائی کو بھائی کا گلا کاٹتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو شریعت کے معاملے میں بے حد محتاط اور کٹّر تھے، اور انہوں نے ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جو تاریخِ اسلام میں بار بار سامنے آتی رہی۔ وقفے وقفے سے مسلمانوں میں ایسے افراد اور گروہ پیدا ہوتے رہے ہیں جو اپنے عہد میں رائج "بدعتوں" کی مذمت کرتے رہے ہیں اور یہ مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ اسلام کی صحیح اقدار پر عمل کیا جائے جن کا چلن پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں مدینے میں تھا۔ آج بھی بیسویں صدی کے بہت سے مصلحین کو "نئے خارجی" کہا جا سکتا ہے۔ آج اگرچہ یہ تحریک

Marfat.com

ایک علیحدہ فرقے کی حیثیت سے ختم ہوگئی (شمالی افریقہ میں ایک مختصر گروہ آج بھی اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کرتا ہے) مگر اس کی روح برابر مصروف خرام ہے۔

بعد کے زمانے میں حضرت علیؓ مختلف قسم کی سازشوں میں گھر گئے۔ زندگی ان کے لیے بہت تلخ ہوگئی تھی؛ تاہم اس دورِ ابتلا میں بھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی عام آدمی کی طرح وہ بھی اس وقت ہر ایک پر شک کرتے ہوں۔ چونکہ انہوں نے اس دنیا سے کوئی توقع وابستہ نہیں کی تھی، اس لیے ان کی کوئی امید ٹوٹی بھی نہیں اور وہ انتشارِ ذہنی کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ دشمنوں میں گھر کر بھی وہ اپنے قول و فعل میں نہایت سچے رہے۔ ان کا رویہ مصالحانہ رہا اور ان میں نرم خوئی اور برداشت کمال درجے کی تھی۔ کچھ لوگ انہیں اسی مزاج اور روش کے لیے مطعون کرتے ہیں اور کچھ اسی کی بنا پر ان سے ازحد محبت کرتے ہیں۔ خود معاویہؓ جو اب انہیں تباہ کرنے کے اہل ہو گئے تھے، ان کی شخصیت کو، جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھے، مجبوراً احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے جنگ بندی کا ایک معاہدہ کر لیا تھا اور اب حضرت علیؓ کو خارجیوں سے نپٹنے کی فرصت مل گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے یہ فریضہ اگرچہ بے دلی سے سرانجام دیا مگر اس میں سرخرو رہے۔ خارجیوں نے اپنا مرکز کوفے میں باہر قائم کر لیا تھا۔ یہاں سے نکل کر انہوں نے ایران کے شہر مدائن پر حملہ کیا اور وہاں بے حد کشت و خون کیا۔ ان کے کٹرپن کی وجہ سے، رحم کا لفظ، جو اسلام کی روح ہے، ان کی لغات سے خارج تھا۔ حضرت علیؓ نے خوارج کو ایک غیر معروف گاؤں بغداد کے پاس جا لیا اور ان کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا۔

حضرت علیؓ کو جنگ میں مات دینے سے مایوس ہو کر اور اس بات سے ناامید ہو کر کہ علیؓ اور معاویہؓ ایک دوسرے سے لڑ کر تباہ ہو جائیں گے، ان لوگوں نے اب علیؓ اور معاویہؓ دونوں کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ ایک نوجوان جس کا نام ستم ظریفی سے عبدالرحمان تھا کسی خارجی لڑکی کو دل دے بیٹھا۔ اس لڑکی کا باپ اور بھائی جنگِ بغداد میں مارے گئے تھے۔ اس نوجوان نے اس سے کہا: "اگر تم مجھ سے شادی کرنا قبول

Marfat.com

کردو تو میں تمہیں خلیفہ کا سر بطور تحفۂ عروسی پیش کروں گا۔ اس نوجوان نے رمضان کے مہینے میں کوفے کا سفر کیا جو سب مہینوں سے زیادہ مقدس مہینہ ہے جس میں انسان اور قدرت دونوں کی حدود نہیں توڑی جاتیں۔ یہ کوفے پہنچا اور ۲۴ جنوری ۶۶۱ء میں مسجد میں جاکر اس دروازے کے قریب جا بیٹھا جہاں سے خلیفہ مسجد میں داخل ہوتے تھے۔

حضرت علیؓ فجر کی نماز کے لیے اپنے گھر سے نکلے تو بطخوں کو زور زور سے چیختا دیکھ کر حیران ہو گئے۔ ایک خادم نے انہیں ہنکانا چاہا تو آپ نے فرمایا: "انہیں چیخنے دو۔ یہ میرے جنازے پر آہ و بکا کر رہی ہیں۔" پھر جُوں ہی وہ مسجد میں داخل ہوئے عبدالرحمان نے زہر میں بُجھی تلوار ان کے سر پر ماری۔ بڑے درد و کرب کے عالم میں انہیں گھر پہنچایا گیا۔ وہ تین دن زخمی حالت میں پڑے رہے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے لوگوں سے استدعا کی کہ وہ ان کے قاتل کے ساتھ رحم و کرم کا سلوک کریں (مگر اس معاملے میں لوگوں نے ان کی خواہشات کا احترام نہیں کیا)۔

جو آنسو صدیوں سے ان کی موت کے لیے بہائے جاتے ہیں ان میں کئی پُرشکوہ سفینے رواں ہو سکتے ہیں۔ ان کی یادِ محبت کا ایسا طوفان بپا کر دیتی ہے جو آسمانوں سے بھی وَرائے عرشِ علا تک جا پہنچتا ہے۔

اور یوں خلفائے راشدین یعنی چار برحق خلفا میں سے آخری خلیفہ حضرت پیغمبرِ اسلامؐ کے وصال سے صرف انتیس برس بعد وفات پا گئے۔ ان خلفا کی مثالی زندگیوں نے (شیعہ حضرات کے لیے صرف حضرت علیؓ کی زندگی نے) مذہب کی صورت گری میں انتہائی فیصلہ کُن کردار ادا کیا۔ ان کی مشکلات اور مصائب کی بازگشت امتِ محمدیہ کی آج کی زندگیوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔

اس حقیقت نے کہ خلفائے راشدین میں سے تین خلفا اپنے بھائی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے، اسلامی معاشرے میں ایسا حزن و یاس شامل کر دیا ہے جس کے سائے آئینے کی طرح روشن دین کی مسرتوں پر آج بھی پڑ رہے ہیں۔ بعض وقت یہ رنج غُصّے میں بدل جاتا ہے جو مزید قتل و غارتگری تک لے جاتا ہے اور اس دنیا کے خلاف

Marfat.com

تشدد پر اکساتا ہے جس نے ایسے جلیل القدر صحابہ کے ساتھ یہ بدسلوکی روا رکھی تھی۔
حقیقت اصلی یعنی صداقت کی شہادت کی چول اس دنیا کی جغرافیائی حدود کے چوکھٹے میں صحیح نہیں بیٹھتی اس لیے اس سے تکلیف دہ تضادات مخالف آراء کی آویزش پیدا ہوتی ہے۔ اگر مذہب کی بنیاد "حق" پر ہے (جس کے بغیر تمام ادیان محض جذباتیت اور خوش فہمی رہ جاتے ہیں) تو پھر مذہب تضادات اور اخلاقیات کی الگنی پر ٹنگا نظر آئے گا اور ایمان سے عاری لوگ اپنی مختصر زندگی اور اس چھوٹی سی دنیا میں امن و امان سے رہ پائیں گے۔

Marfat.com

باب ہشتم

کارِ جہاں

امیر معاویہؓ کو قتل کرنے کے لیے جس خارجی کو بھیجا گیا تھا اس کے حملے سے وہ زخمی ہو گئے مگر زخم ٹھیک ہو گیا اور وہ بچ گئے۔ اب یہ اموی جو ابوسفیانؓ اور ہندہ کا بیٹا تھا، خلیفۃ المسلمین بن گیا تھا اب بھلا اس کے اس حق پر اعتراض کرنے والا کون تھا! تاہم اس کے بعد سے اب تک امیر معاویہؓ کی خلافت پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ آج بھی بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو ان کا ذکر اسی طریقے سے کرتے ہیں جس انداز سے مغرب میں ایڈولف ہٹلر کا ذکر ہوتا ہے اور یہ بات قرینِ انصاف نہیں۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم انسان تھے اور اس لفظ "عظیم" کے مفہوم پر پورے اترتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر ان کا تقابل اُن کے بعد آنے والوں سے کیا جائے تو وہ کسی پہلو سے برے آدمی نہیں کہے جا سکتے۔ وہ ایک قابلِ ستائش حکمران تھے اور اُن معدودے چند انسانوں میں سے تھے جو جبلّی طور پر قوت اور اقتدار کا استعمال بڑی ذہانت اور فطانت سے کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے انہیں کسی جابر کا کردار ادا کرنے کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی۔

بہرحال، مسئلہ یہ نہیں۔ وہ ایک ایسے شخص کے فرزند تھے جو کسی زمانے میں اسلام

Marfat.com

کا سب سے خطرناک دشمن رہ چکا تھا لیکن جہاں تک دُنیاوی اختیار اور اُمتِ مسلمہ کی نگہداری کا تعلق ہے وہ پیغمبرِ اسلام کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔

پہلے چار خلفاء کو "خلفائے راشدین" کہا جاتا ہے۔ یہ لقب انہیں اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ ان کے باقی جانشین راہِ حق سے ہٹے ہوئے تھے بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ چاروں رسولِ خداؐ کے رنگ میں حضورؐ کی شخصیت ہی کا پرتو نظر آتے تھے۔ وہ ڈگمگا تو ضرور سکتے تھے مگر ان کے قدم اُس راہ پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے جس پر رسولِ خداؐ نے ان کی راہ نمائی کی تھی۔ معاویہؓ اس دُنیا کے آدمی تھے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے اپنے بارے میں کہا تھا:

"ابوبکرؓ نے کبھی دنیا کی طلب نہ کی اور نہ دُنیا کو ان کی طلب تھی لیکن دنیا کو یقیناً عمرؓ کی جستجو تھی اگرچہ خود اُنہوں نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی مگر ہم لوگ تو کمر کمر دُنیا میں دھنسے ہوئے ہیں۔"

امیر معاویہؓ گورے رنگ کے دراز قامت خوب رُو انسان تھے اور اُن میں عربوں کا خصوصی وصف "حلم" کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے مخالفین کے ساتھ نرمی اور گستاخی کو مسکرا کر برداشت کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ ان باتوں کے باوجود وہ ایک بارعب انسان تھے۔ لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی خوش اخلاقی اور مصالحت آمیز رویہ رقتِ قلب کے سبب نہیں بلکہ سوچی سمجھی تدبیر ہوتی تھی۔ اپنے حریفوں اور دشمنوں کو جود وسخا سے بے ہتھیار کرنا ان کی حکمتِ عملی تھی۔ ایک مرتبہ جب کسی نے ان کی سخاوت پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا تھا: "یہ جنگ سے تو بہت کم مہنگی پڑتی ہے۔ جہاں کوڑے سے کام نکلتا ہو وہاں مَیں نے کبھی تلوار استعمال نہیں کی اور جہاں زبان سے کام چل رہا ہو وہاں کوڑا استعمال نہیں کرتا۔ اگر مَیں عوام سے ایک بال سے بھی بندھا رہوں تو بھی میں کبھی اُسے نہیں توڑوں گا۔ جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو مَیں پُورا کھینچ لیتا ہُوں اور جب وہ کھینچ لیتے ہیں تو مَیں ڈھیل دیتا ہُوں۔"

تدبر اور سیاست کی یہ بڑی مناسب تعریف معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات عرب حکمرانوں

Marfat.com

کے فرائض میں شامل رہی ہے اور آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے) کہ ان کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں۔ معاویہؓ اگر عرب نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتے۔ اگر کوئی غرض مند کھانا کھانے کے دوران میں ان سے عرض معروض کرتا تو وہ فوراً اُسے دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھانے کو کہتے اور اس عرصے میں کوئی سیکرٹری اُس شخص کی درخواست انہیں پڑھ کر سُناتا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کی شبینہ دعوتوں میں بہت سے لوگ شریک ہوتے تھے۔

تاہم ایک معاملے میں انہوں نے عرب روایات توڑ دی تھیں اور وہ تھا حکومت کے لیے ملازمین کے انتخاب کا معاملہ۔ وہ ملازمین کی بھرتی میں نہ ان کا خاندانی پسِ منظر دیکھتے نہ حسب ونسب حتّٰی کہ مذہب کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے (ان کے بہت سے اعلیٰ عہدیدار خاص طور پر خزانہ کی کلیدی وزارت میں عیسائی تھے جنہیں روپے پیسے کے معاملات میں خاصی سوجھ بوجھ تھی)۔ نئے ملازمین کا انتخاب صلاحیت کی بنا پر ہوتا تھا۔ عام طور پر ایک عرب کے نام کے ساتھ فلاں ابنِ فلاں لگتا ہے مگر جو کسی ایک ایسی لونڈی کا بیٹا ہو جس کی "نوازشات" ہر خاص و عام پر تھیں اور جسے خود اپنے بیٹے کی ولدیت کا اندازہ نہ تھا۔ جواب بالکل صاف ہے۔ سوائے حضرت عیسیٰؑ کے ہر کسی کا ایک باپ تو ضرور ہوتا ہے!

اسلامی مملکت اب مضبوط اور وسیع ہو رہی تھی۔ اسی زیادؔ نے، جب وہ عراق اور ایران کا وائسرائے تھا، دریائے آمو (یا جیحوں) پار کر کے بخارا پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ شہر وسطی ایشیا کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح ایک درخشاں تہذیب کا گہوارہ بنا ہُوا تھا تاآنکہ مغرب سے رُوسیوں کے غولِ بیابانی یہاں داخل ہُوئے اور ہر قابلِ قدر اور خوبصورت چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ۶۷۰ء میں ایک سپہ سالار نے قیروان سے جو آج کا تیونس ہے، نکل کر پہاڑوں کو عبور کیا اور مراکش جا نکلا۔ پھر وہاں سے ساحلِ اوقیانوس پر اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال کر اس نے کہا:

"اے اللہ! گواہ رہیو! میں نے اسلام کو دنیا کی دُور دراز حدوں تک پہنچا دیا ہے"۔

Marfat.com

زبردست فتوحات، داخلی امن اور بہترین انتظام و انصرام کو دیکھتے ہوئے امیر معاویہؓ کا بیس سالہ دورِ حکمرانی، کامیابی اور کامرانی کا بے داغ ریکارڈ کہا جاسکتا ہے لیکن مسلمان ماضی کی تاریخ کے جھروکوں میں سے اس منظر کو اس طرح نہیں دیکھتے۔

مہبطِ وحی ہونے کی حیثیت سے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے لیے نہ صرف ایک روحانی عقیدہ لائے جو خدا تک پہنچنے کا ایک وسیلہ تھا بلکہ وہ کچھ بھی لائے جو اپنی جگہ ایک معاشرتی ضابطۂ اخلاق بھی تھا اور عملاً ایک مکمل معاشرتی نظام بھی جس نے اُن تمام عناصر کو، جنہیں عام طور پر ایک انسان کو ایک "حیوانِ سیاسی" سمجھتے ہُوئے قدرتی اور فطری کہا جاتا ہے، بے اثر بنا دیا۔ مدینے میں آپؐ نے معاشرے کو ایک مقدس سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ یہ مومنین کی ایک ایسی برادری تھی جو اگرچہ دُنیا میں تھی مگر دُنیا کی نہیں تھی۔ پہلے چار خلفاء نے اس مثالی صورت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ــ مگر بنی اُمیہ کے برسرِ اقتدار آتے ہی اس میں کثافت شامل ہو گئی یا یُوں کہیے کہ مسلم مورخین کو وہ اس طرح نظر آنے لگی۔ پھر دہریت اور دنیاداری کا عمل شروع ہو گیا جس کو آج تک بدلا نہیں جاسکا۔ امیر معاویہؓ کے کارہائے نمایاں کی اس میزان پر کوئی حقیقت نہیں کیونکہ وہ کسی "قیصر" کے کارنامے تھے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہیں بعض اوقات "مسلمان قیصر" ہی کہا جاتا ہے۔

دارالخلافہ کا مدینے سے، جو شہرِ رسولؐ تھا، دمشق منتقل کیا جانا، جو دنیاوی جاہ و حشم کا مرکز تھا، کافی معنی خیز ہے کیونکہ بہرحال پرہیزگاری اور تقویٰ نے تو مدینے سے دمشق ہجرت نہیں کی تھی۔ دنیا پرستی کے عمل نے روحانی طاقتوں کو سیاسی میدان سے خارج کر دیا اور پیغمبرِ اسلامؐ کے ان آخری برگزیدہ صحابہؓ نے جو ہنوز زندہ تھے دنیاوی معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اُن کے روحانی ورثا نے بھی اس طرف مڑ کر نہیں دیکھا، تاہم اُن کی ذات کا اثر صحرا کے بادیہ نشینوں، دہقانوں اور شہریوں پر ضرور پڑا۔ چونکہ یہ اثرات خاموشی سے مترتب ہو رہے تھے، اس لیے انہوں نے ایمان اور روحانیت کی ترقی و ترویج کو مہمیز دی جو اسلام کی حقیقی شان ہے۔

Marfat.com

بنی اُمیہ کی تاریخ پر ایک دھبّا ایسا لگا جو کبھی مٹایا نہ جا سکا نہ مٹایا جا سکے گا۔ اور یہ کلنک کا ٹیکا پیغمبر اسلامؐ کے نواسے حضرت حسینؓ کا قتل تھا۔

فاطمہ الزہراؓ سے حضرت علیؓ کے دو صاحبزادے تھے، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد حضرت حسنؓ مختصر وقفے کے لیے خلافت کے دعویدار ہُوئے؛ تاہم انہوں نے امیر معاویہؓ کی جانب سے ایک معقول وظیفے اور پُر عافیت زندگی کی یقین دہانی کے عوض اس دعوے سے دستبردار ہونا قبول کر لیا۔ انہوں نے کہا محض سلطنت کے لیے میں جدال و قتال کرنے سے تو رہا۔ بہر حال ان کی کچھ دوسری دلچسپیاں بھی تھیں۔ ان کے انتہائی قریبی دوست بھی یہ شمار نہ کر سکے کہ اُنہوں نے کتنی عورتوں سے نکاح کیا اور کتنوں کو طلاقیں دیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ان کی تعداد نوّے تھی۔ دوسرے اس سے کہیں زیادہ بتاتے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت علیؓ نے اپنے واقف کار کو خبردار کیا تھا کہ کبھی میرے بیٹے حسنؓ کے ساتھ اپنی کسی بیٹی کی شادی نہ کرنا وہ اُسے چکھ کر ایک طرف ڈال دے گا۔ اس کے باوصف، بتایا جاتا ہے کہ جو عورت بھی ان کی مناکحت میں آئی وہ اُن سے بے حد محبت کرنے پر مجبور ہوگئی؛ گویا یہ عالم ان کی شیریں طبعی کا تھا۔ یہاں بھی اگر اسلامی سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو ایک قدرتی میلان ایک روحانی مقصد کی آبیاری کرتا نظر آتا ہے، اور جن لوگوں کی پرورش ایک جُدا ماحول اور پس منظر میں ہوئی ہو، ان کے لیے یہ بات باعثِ صدمہ ہے۔ حضرت حسنؓ چونکہ کثرتِ ازدواج کے باعث کثیر العیال بھی تھے اس لیے آج بے شمار مسلمانوں کی رگوں میں حضرت پیغمبرِ خداؐ کا خُون دوڑتا نظر آتا ہے اور یہ ورثہ بیک وقت شرافت اور عظمت کا آئینہ دار ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب حضرت حسنؓ اپنے دعوائے خلافت سے دستبردار ہُوئے تو ان میں اور معاویہؓ میں یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ معاویہؓ کی وفات کے بعد خلافت اولادِ علیؓ کی طرف لوٹ جائے گی۔ پھر جب حسنؓ فوت ہو گئے (کچھ کا کہنا ہے کہ انہیں امیر معاویہؓ کے ایک گماشتے کے ذریعے زہر دلوایا گیا تھا جو بدا چھا بدنام بُرا"

Marfat.com

والا معاملہ ہے) تو خلیفہ نے اپنے فرزند یزید کو اپنا جانشین نامزد کر دیا ، اور یوں انہوں نے خلافت کو انتخابی ادارے کی بجائے موروثی ادارہ بنا دیا ۔

بستر مرگ پر معاویہؓ نے یزید کو ، جو عیش و سرمستی کا خوگر ایک نوجوان تھا اور جس کی ماں عیسائی تھی ، متنبہ کیا کہ عراق کے لوگ حضرت حسینؓ کو دعوائے خلافت کے لیے ابھاریں گے ۔ تم انہیں بے شک شکست دے دینا مگر ان کے ساتھ ملائمت کا کرم کا سلوک کرنا کیونکہ ان کی رگوں میں رسولِ خدا کا خون دوڑ رہا ہے ۔ معاویہؓ نے سچ کہا تھا کیونکہ جوں ہی اُن کی وفات کی خبر پھیلی اہلِ کوفہ نے حضرت حسینؓ کو ایک پیغام بھیجا جس میں ان پر زور دیا گیا تھا کہ وہ منصبِ خلافت قبول کر لیں جس پر وہ اپنے اٹھارہ افراد خاندان اور ساٹھ دیگر لوگوں کے ہمراہ عراق روانہ ہو گئے ۔

عراق کے گورنر نے ان کے مقابلے کے لیے ایک بہت بڑی فوج روانہ کی ۔ کوفے کے لوگوں نے ڈر سہم کر حضرت حسینؓ کو ان کی تقدیر پر چھوڑ دیا ۔ ایک پیغام رساں نے انہیں مطلع کیا کہ کوفے کا دل آپ کے ساتھ ہے مگر اس کی تلوار آپ کے خلاف ہے ۔

ساحل فرات کے کنارے کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ نے اپنی مختصر فوج کو جنگ کے لیے صف آرا کیا ۔ ان کے مقابل چار ہزار کی فوج تھی ۔ یزید کے گورنر نے اُن سے ہتھیار ڈالنے کو کہا مگر ساتھیوں نے مر مٹنے کا فیصلہ کیا ۔

وہ ایک شیر دل انسان تھے اور اسی طرح لڑے جیسے کبھی ان کے والد عالم جوانی میں لڑا کرتے تھے ۔ اس جنگ میں ان کی آنکھیں ایک دوسرے ہی جلوے سے خیرہ ہو رہی تھیں جس سے بہرہ یاب ہونے کی کوئی بھی تمنا کر سکتا ہے ۔ شجاعت اُن پر ناز کر سکتی ہے ۔ جنگ کے آغاز ہی میں ان کے ایک دس سالہ بھانجے کے تیر لگا ۔ اور وہ ان کے بازوؤں میں دم توڑ گیا ۔ اس کے کچھ ہی وقفے کے بعد ان کے دو صاحبزادے ، چار سوتیلے بھائی ، پانچ بھتیجے ، بھانجے اور چار رشتے کے بھائی مارے گئے ۔ وہ خود بُری طرح زخمی تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے دشمن پر اس قدر جوش سے حملہ کیا کہ ان کے دونوں طرف دشمن کی صفیں

Marfat.com

تتر بتر ہوگئیں، یہاں تک کہ وہ گر گئے جس کے بعد اُن کی پشت میں نیزہ اتار دیا گیا اور ان کا سر تن سے جُدا کر دیا گیا۔

پیغمبرِ اسلام کے پیارے نواسے کی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہادت کے اثرات آج بھی اس زلزلے کی طرح محسوس کیے جاتے ہیں جو فرشِ سمندر میں تلاطم برپا کر دیتا ہے۔ یہ قتل اسی طرح کا تھا جیسے قابیل کے ہاتھوں ہابیل قتل ہُوا تھا۔ شہادت کے اس واقعے نے انسانیت کے بہت بڑے طبقے کے ضمیر پہ گہرا اثر ڈالا ہے۔ وہ یورپی لوگ جو شاذ ہی اپنی سابقہ تاریخ میں جذباتی نوعیت سے ملوث ہونا پسند کرتے ہیں اور وہ امریکی بھی جن کی تاریخ ہی اتنی مختصر ہے جس میں ملوث ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، مسلمانوں کے لیے اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کا وقت کی قید سے آزاد ہونا سمجھ نہیں پاتے۔ آج بھی ہزاروں لاکھوں نوجوان محض اس لیے مرنے کو تیار رہتے ہیں (اور بے شمار مر بھی چکے ہیں) کہ حضرت حسینؓ کو یہ انجام دیکھنا پڑا تھا اور ایسا کرتے ہُوئے وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اس انسانیت کی، جس کا دامن حسینؓ کے خون سے آلودہ ہے، تلافیٔ مافات کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۹۸۰ء میں ایک نوجوان ایرانی سپاہی سے کسی مغربی صحافی نے جب یہ معلوم کرنا چاہا کہ جنگ میں موت سے متعلق اس کے نظریات کیسے ہیں، تو اُس نے فوری طور پر شہادت حضرت حسینؓ کو یاد کیا اور کہا:

> "تم اہلِ مغرب کے لیے یہ بات سمجھنا محال ہے۔ ہم موت کے متلاشی نہیں۔ دراصل ہم موت کو ایک زندگی سے دوسری زندگی میں منتقل ہونا سمجھتے ہیں۔ اگر ہم اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہُوئے شہید ہو جائیں تو یہ سمجھو کہ ہم اللہ کے قریب تر ہو جائیں گے۔ شہادت کی دو منزلیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اللہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اللہ اور اس کے بندے کے درمیان حائل حجابات کو بھی دُور کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ شہید ہو جانا کوئی مجہول عمل نہیں کہ ہم کھڑے قتل ہونے کا انتظار

Marfat.com

کرتے رہیں۔ یہ ایک نہایت سرگرم عمل ہے۔ امام حسینؓ نے اپنی شہادت سے قبل جس حد تک ان سے ممکن ہو سکا اپنے دشمنوں کو قتل کیا۔[1]

اور آج تک حضرت حسینؓ کی شہادت کی یاد ہر سال ایران، عراق کے کچھ حصوں اور ہندوستان، پاکستان میں منائی جاتی ہے مگر کہیں بھی اس میں کربلا جیسا جوش و جذبہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس میں رنج و ماتم گساری کے وہ مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں جنہیں دیکھ کر مغربی مبصر ششدر رہ جاتے ہیں اور سنّی مسلمان (جو اسے اسلام کی باطنی بردباری کے منافی سمجھتے ہیں) بے حد تکلیف دہ پاتے ہیں؛ تاہم یہ غم آفاقی نوعیت کا ہے شیعہ صرف اُس دلیر، شجیع اور مظلوم کی موت پر نہیں روتے بلکہ اس دنیا پر بھی روتے ہیں جس میں ایسے واقعات وقوع پذیر ہو سکتے ہیں جن میں نیکو کار لوگوں کو تو ختم کر دیا جاتا ہے جبکہ شر خصلت لوگ عیش کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس ظالم دُنیا پر نوحہ کناں ہوتے ہیں جو ہر خوبصورت، شریف اور گراں بہا چیز کو مٹا دیتی ہے۔ وہ برہنہ قوّت کی جہت اور روشن امیدوں کی شکست پر روتے ہیں۔

یہاں اسلام میں ایلیے کا وہ احساس نمودار ہوتا ہے جو عیسائی روایات کے لیے نامانوس نہیں، مگر یہ مجموعی طور پر سُنّی اسلام کے لیے جو ٹھوس حقیقتوں پر یقین رکھتا ہے، اجنبی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ اور ایسے دیگر امور منشائے ایزدی گردانے جاتے ہوں کیونکہ اگر کسی مذہب کو حقیقی معنوں میں عالمگیر ہونا ہے اور ہر انداز کے انسانی مزاج کو سایۂ عاطفت فراہم کرنا ہے تو اس میں دوسرے مذاہب کا (جو مختلف رُوپ ہیں) انعکاس اُن مثالوں سے ہونا چاہیے کہ مذہب کے بنیادی عقائد سے متعارض نہ ہوں۔

لفظ "شیعہ" کے معنی پارٹی یعنی فریق یا جماعت کے ہیں۔ یہاں مراد علیؓ اور ان کے اخلاف کے دوستداروں سے ہے۔ سُنّی مسلمان اکثر یہ کہتے ہیں کہ سُنّتِ رسولؐ کی پیروی

۱؎ 1. The Times, (London), 7 April, 1982

Marfat.com

کرنے والے امتِ مسلمہ کے نوّے فیصد افراد ہیں۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ شیعوں نے اسلام میں عیسائی عناصر شامل کر دیے ہیں۔ (یہ ایک ایسا عجیب موقف ہے جو عیسائی کو چکنم میں ڈال دیتا ہے جو امام خمینی میں "عیسائی نما" کوئی علامت نہیں دیکھتے) وہ شیعوں پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ وہ حضرت علیؓ کو غلو کے عقیدت میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فوقیت دیتے ہیں اور انہیں نیم الوہی شخصیت سمجھتے ہیں۔ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے اور اسے ضرورت سے زیادہ آسان نہیں بنا دینا چاہیے۔ یہاں ہمیں جس چیز سے سروکار ہے وہ سنیت اور شیعیت کے مابین روحانی اور جذباتی 'ماحول' کا فرق اور اس سے پیدا ہونے والے سیاسی نتائج ہیں جو اس اختلاف کے برگ و بار ہیں۔

بنی امیہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ایک سیاسی نظام اور ایک شاہی انتظامیہ معرضِ وجود میں آ گئی جو اس نظام اور انتظامیہ سے بالکل مختلف تھی جس کا آغاز مدینے میں پیغمبرِ اسلامؐ نے کیا تھا۔ فرتھجوف شوآن کہتے ہیں:

"سنی تو ان باتوں کو تقدیرِ الٰہی قرار دے کر علیحدہ ہو جاتے ہیں جبکہ شیعہ اس گم گشتہ پرہیزگاری کی اندوہناک یاد کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں جو کربلا کے سانحے کو تازہ کر دیتی ہے۔ متصوفانہ نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اس میں وہ پُرتقدس جلال اور اُداسی بھی شامل ہے جو انسان کو بہشتِ بریں سے حکمِ سفر ملنے پر ہوا۔ اس ہبوطِ آدم سے پاکیزگی اور خدا کے عطا کردہ حقوق یاد آ کر ناانصافی، ظلم اور ناامیدی کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں[1]"

خدا کے عطا کردہ حقوق وہ ہیں جو اہلِ بیتِ رسولؐ کو حاصل ہیں اور آپؐ کے وسیلے سے حضرت علیؓ کے اخلاف کو ملے ہیں۔ اور اس ظلم اور ناانصافی کو دنیوی زندگی کا حصہ سمجھنے سے انکار نے شیعہ حضرات کو، حسینؓ کی موت سے لے کر آج تک، سیاسی مخالفین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

---

1. Islam & the Perennial Philosophy, Frithjof Schuon, p. 9.

Marfat.com

وہ ہلاکت خیز قدم جو کسی قوم، خاندان یا فرد کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے، عمداً اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس بات کو ماننے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یزید نے اپنے باپ کی نصیحت کو فراموش کرتے ہوئے حسینؓ کو قتل کروانے کا ارادہ کیا تھا عین ممکن ہے کہ اُس نے اس بات کو خاطر خواہ توجہ کا مستحق سمجھا ہی نہ ہو، کیونکہ اس کی واحد دلچسپی شکار میں تھی (اُس نے پہلی مرتبہ عرب میں چیتے کا شکار کیا) اموی اقتدار گو ستر برس کے لگ بھگ رہا؛ تاہم جس دن حضرت حسینؓ شہید ہوئے اُسی دن سے یہ خاندان نحوست کا شکار ہونا شروع ہو گیا۔

شیعہ انتقام کی کوششوں میں ان تھک تھے ایک کے بعد ایک سازش مسلسل انداز میں ہوتی رہی اور وہ اس زرخیز زمین پر طبع آزمائی کرتے رہے۔

ایران اگرچہ کہ فتح ہو گیا تھا اور وہاں کے لوگوں نے اسلام اس طرح قبول کر لیا تھا جیسے وہ ازل سے اس بات کے انتظار میں تھے؛ تاہم انہیں اپنے عرب حکمرانوں سے کوئی محبت تھی نہ وہ ان "ریگستانی چوہوں" کے مقابلے میں اپنی قومیت کے احساس سے دستبردار ہونے کو آمادہ تھے۔ دوسری طرف عرب اب بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ اسلام تنہا اُن کی میراث ہے۔ انہوں نے مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ اسلام میں بہت کم دلچسپی ظاہر کی مگر اس کے باوجود بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا اور اس وقت یہ بھی ایک مسئلہ بن گیا۔ اموی اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ بھلا کسی "عجمی" کو مراعت یافتہ ملتِ اسلامیہ میں کیسے داخل کیا جا سکتا ہے؟ آخر انہیں ایک ترکیب سوجھی جو منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ عمل بھی تھی۔ اسلام قبول کرنے پر آمادہ شخص کو کسی خاص قبیلے سے اعزازی طور پر منسلک کر دیا جاتا تھا اور اُسے "مولیٰ" (جمع موالی) کہا جاتا تھا۔ اس سے اُس شخص کی ایک پہچان بن جاتی تھی اور وہ حالات کے مطابق ڈھل جاتا تھا جس کے بعد اُسے مسلمان بننے کے لائق قرار دے دیا جاتا تھا۔ پھر جب ان موالیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو انہوں نے ایک مذہبی ملت میں اپنے دوسرے درجے کی شہری حیثیت پر خاصی ناگواری محسوس کی۔ ان میں سے کم از کم کچھ تو ضرور یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے آقاؤں کے مقابلے میں

Marfat.com

کہیں بہتر مسلمان ہیں۔ یہاں بھی شیعہ اور دیگر برگشتہ خاطر لوگوں کو صورتِ حال کے بگاڑنے کا اچھا موقع اور میدان میسر آ گیا۔

اپنی مکمل تباہی سے پہلے بنی اُمیہ نے تین بہترین حکمران پیدا کیے اور اتنی مختصر مدت میں یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ان میں سے دو تقریباً نپولین کے طرز کی شخصیات تھیں اور ایک درویش تھا۔

خلیفہ عبدالملک جس نے ۶۸۵ء سے ۷۰۵ء تک حکمرانی کی انتہائی کنجوس شخص تھا اور اسی سبب سے لوگ اسے "پتھر کا پسینہ" کہا کرتے تھے، اگرچہ اس کے منہ پر کبھی کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب اُسے اپنے خلیفہ بننے کی خبر ملی تو وہ قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے قرآن کو بند کر کے سرگوشی میں کہا: "یہ ہماری آخری ملاقات ہے" یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس دن کے بعد سے اُسے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا گیا۔ حالات کے سبب، وہ مسکرا بھی نہیں سکتا تھا مسلم علاقوں میں بغاوتیں سر اُٹھا رہی تھیں، تقریباً آدھے ملک نے خلیفہ کے ایک مخالف کا دم بھرنا شروع کر دیا تھا اور بازنطینیوں نے اس صورتِ حال کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھرپور فوجی حملہ کر دیا۔ عبدالملک نے انہیں مار بھگایا اس کے بعد اُس نے اپنے مخالف کو شکست دی پھر شام میں ایک بغاوت کو کچلا اور شمالی افریقہ میں نظم و ضبط بحال کیا۔ اُس کے تمام کارناموں میں جرأت اور شدت تھی جو اس کے عہد کا امتیازی نشان تھا۔ ان کارروائیوں میں وہ اپنے عہد کا انسان نظر آتا ہے جسے اسلام کی ابدی روایات سے غرض نہ تھی کیونکہ اسلامی روایات کو تو اُن لوگوں نے پروان چڑھایا تھا جو انتہائی متین اور خاموش مزاج تھے، اور جو اس قسم کی کارروائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے اور جن کے نام تاریخ میں درج نہ ہو سکے۔ مگر ان میں ایک نام ایسا ہے جسے شاید کبھی تاریخ سے مٹایا نہ جا سکے۔ یہ خلیفہ کا نائب حجاج تھا۔ یہ شخص طائف کے ایک مدرسے کا سابق معلم تھا اور ایک ایسے حادثے کا "نمائندہ" تھا جو کبھی کبھی عیسائیت اور اور اسلام دونوں میں دیکھنے میں آتا ہے؛ یعنی ایک ایسا شخص جو دنیا پر ایک بلا بن کر ٹوٹ پڑتا ہے، جو مجسمِ عذاب تھا۔ شاید ہمیں یہ یاد دلانے کے لیے تھا کہ اگرچہ مذہب

Marfat.com

رحمت ورافت سے عبارت ہے؛ تاہم اس میں ایک تیز دھار تلوار کی سی کاٹ بھی ہے۔ جب خلیفہ نے عراق کی گورنری کے لیے کچھ رضا کار طلب کیے جواب بھی بغاوت پر تلا ہوا تھا تو حجاج نے اُٹھ کر کہا:"میں اس کے لیے صحیح آدمی ہوں"۔ خلیفہ نے اُسے دیکھ کہا: "تم ہی اُسے سیدھا کر سکتے ہو"۔

عراق کے صوبائی دارالحکومت کوفے میں لوگ بڑبڑائے: "اگر انہیں اس سے بدتر کوئی آدمی مل جاتا تو وہ اُسے بھیج دیتے"۔ مگر شاید اُس سے بدتر آدمی انہیں ملا نہیں۔ پھر اُس نے کوفیوں کو واقعی سیدھا کر دیا۔ حجّاج کی مشہور تقریر، جو اُس نے کوفے کی مسجد جامع میں کی، ان گنت بار دہرائی جا چکی ہے کیونکہ کسی بھی شخص نے حجّاج سے پہلے اتنی خوفناک دھمکیاں نہیں دی تھیں لیکن اس عجیب وغریب شخص کے وہ الفاظ اُس کی شخصیت کی کنجی ہیں جو اُس نے شدید بیماری سے شفایاب ہونے پر کہے تھے، جس سے اُس کا بچنا محال نظر آتا تھا۔

"اللہ نے کبھی کسی مخلوق کو حیاتِ جاوداں عطا نہیں کی ماسوئی ایک کے؛ یعنی شیطانِ لعین و رجیم کے۔ مَیں ہر ذی حیات کو موت سے ہم آغوش ہوتا دیکھتا ہوں۔ ہر شے بالآخر خشک ہو کر مُرجھا جاتی ہے۔ ہر شخص ایک نہ ایک دن اپنی قبر کو سونپ دیا جائے گا اور زمین اس کا گوشت کھا جائے گی اور اس کا خون اور عرق چوس جائے گی اور وہ دو چیزیں جو اُسے سب سے زیادہ عزیز تھیں یعنی اولاد اور دولت، وہ دونوں اُس سے جُدا ہو جائیں گی"۔

اسلام رحمت ورافت کا دین ہے؛ تاہم یہ سب سے بڑھ کر حقانیت اور صداقت کا مذہب بھی ہے ــــ اور سچّائی بے رحم ہوتی ہے کیونکہ وہ سچ کے سوا کچھ اور ہو بھی نہیں سکتی۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں جس کے تحت کسی کبیدہ خاطر انسان کی خوشی کے لیے سیاہ کو سفید بنایا جا سکے۔ نعوذ باللہ خدا بھی اپنی تمام قدرت کے باوصف، باطل کو حق بنانا پسند نہیں کرے گا۔ تمام پردہ سرائے تخلیق اور اس سے بھی ماورئی رحمت اور حقیقت کی

Marfat.com

ایک دوسرے سے نسبت، ان اصولوں کی بنا پر جن کا اطلاق ان پر ہوتا ہے، بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس میں اگر کوئی توازن ممکن ہو سکتا ہے تو وہ رسولوں، ولیوں اور اہل اللہ ہی سے ممکن ہے۔ باقی تمام لوگ افراط و تفریط ہی میں ڈولتے رہتے ہیں۔

عیسائیت اور اسلام کی تاریخ میں کچھ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جن کے لیے سچائی ہی سب کچھ تھی اور جو یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ جب یہ حقیقت دنیاوی ضابطوں اور عقائد میں ڈھل جاتی ہے تو اس کی حیثیت اضافی بھی ہو سکتی ہے اور بنابریں دانشِ اعلےٰ یا قوانینِ محبت و رحمت کے زیرِ نگین آسکتی ہے۔ عیسائیوں کی "شرعی" عدالتیں "مرتدین" کو جلواتی رہیں اور حجاج اپنے باغیوں کو ذبح کرتا رہا؛ تاہم اس مستبد ماحول میں ایسے لوگ بھی تھے، (اس عصر کے عیسوی حلقوں میں ان کی بڑی تعداد تھی) جو ہمہ وقت محبت و رحمت میں سرشار رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ امتیازات کی تیغ جو حق و باطل کو الگ الگ کر دیتی ہے، مذہب سے دُور کر دی جائے۔ مگر پھر ہُوا یہ کہ سچائی کے معاملے میں مصلحت آمیزی غالب آگئی جس کے نتیجے میں رحمت و رافت کھوکھلی اور بنجر ہو گئی۔ یہ ایسی جذباتیت ہے جس کی جڑیں صمیمِ قلب میں، جو حقیقتِ ازلیہ کا مسکن ہوتا ہے قطعاً نہیں ہوتیں۔

حجاج کی آواز کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا؛ تاہم ہم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہم اُسے اور اس جیسوں کو پسند کریں۔ ہم سے تو صرف یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ بے شک ایسے لوگ بھی تاریخ میں ایک مقام رکھتے ہیں اور یہ ہمیں وہ کچھ یاد دلانا چاہتے ہیں جسے ہم بھول جانا پسند کریں گے۔ تاریخ سے یہ جان کر ایک طمانیت سی ہوتی ہے کہ ایسے خوفناک شخص کو ایک نیک دل عورت نے نیچا دکھایا۔ حجاج، خلیفہ عبدالملک کے فرزند ولید کے عہدِ خلافت میں بھی گورنری کے عہدے پر فائز تھا مگر خلیفہ کی بیوی اس شخص سے سخت نفرت کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنے شوہر سے کہا تھا:

"مَیں تمہیں انسانوں کے اس قاتل کے ساتھ تنہا نہیں دیکھنا چاہتی۔"

Marfat.com

ایک دن اُس نے حجاج کو اپنے رُوبرُو طلب کیا۔ تاریخ نے یہ تو رقم نہیں کیا کہ اس موقع پر کیا کہا گیا۔ مگر بہرحال جب وہ اس کی بارگاہ سے باہر آیا تو اس کا رنگ اُڑا ہُوا تھا اور وہ بُری طرح ہل گیا تھا۔ اس موقع پر اُس نے خلیفہ سے کہا:

"وہ جو مجھ پر برسا شروع ہُوئیں تو خُدا کی قسم زمین پر رہنے کے بجائے مَیں اس میں گڑ جانے کو ترجیح دینے لگا۔"

ولید اپنے باپ کے مقابلے میں نرم دل شخص تھا۔ اس کے باپ نے بسترِ مرگ پر اس کو آنسو گراتے دیکھ کر ڈانٹا اور درشت لہجے میں کہا تھا: "کسی لونڈی کی طرح آنسو بہانا بند کرو۔" یہ نیا خلیفہ ایک لائق منتظم تھا۔ اُس نے یتیمی کی تعلیم و تربیت کے انتظامات کے علاوہ معذوروں کی خدمت کے لیے مددگار اور نابیناؤں کی رہبری کے لیے لوگ مقرر کیے۔ مدینے کے علماء اور فضلاء کے لیے جو فقہ دین میں لائق اور قابل تھے، باقاعدگی سے وظیفے جاری کیے، مدرسے اور ہسپتال قائم کیے، سڑکیں اور نہریں تعمیر کیں اور پاگل اور فاتر العقل لوگوں کے لیے پہلا دارالامان قائم کیا؛ تاہم اس کی عظیم یادگار دمشق کی جامع مسجد ہے جس کا شمار دنیا کے تعمیری عجائبات میں ہوتا ہے۔ ان تمام مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کی آخری توسیعی فتوحات کا سربراہ اور نگران بھی تھا۔ ایک مُسلم فوج فرغانہ فتح کر کے سرحد چین تک جا پہنچی۔ دوسری نے، جس کا سالار حجاج کا بھتیجا تھا، آج کے پاکستان کا بیشتر حصّہ فتح کر ڈالا تھا۔ ادھر مغرب میں طارق بن زیاد تنگ خلیج عبور کر کے ایک پہاڑی چٹان پر جا اُترا جو اس کے نام پر اب تک جبل الطارق کہلاتی ہے (یعنی عرفِ عام کا جبرالٹر)۔ پھر اُس نے اسپین کے بادشاہ راڈریک کی پچیس ہزار فوج کو شکست دی۔ شمالی افریقہ کے گورنر نے اس کی اطلاع دیتے ہُوئے خلیفہ ولید کو لکھا تھا:

"یہ معمولی فتوحات نہیں۔ یہ گویا یومِ حساب کو اقوامِ عالم کا اجتماع ہے۔"

اور حقیقتاً دو عظیم قومیں یعنی مسلمان اور مغربی عیسائی اب ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ تین سال کے اندر اندر مسلمانوں نے جبل البرانس (Pyrenees)

Marfat.com

کے سلسلہ ہائے کوہ کو عبور کر لیا اور ۷۲۵ء میں ایمز (Nimes) فتح کر لیا۔ پھر ۷۳۲ء میں بورڈو (Bordeaux) تسخیر کیا۔ اور اگرچہ انہیں چارلس مارٹیل کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی پھر بھی چھ برس تک وہ آرل (Arles) پر قابض رہے۔

ولید نے اپنی زندگی ہی میں ہسپانوی قیدیوں کو اپنے حضور پابندِ سلاسل دیکھ لیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان مسند آرائے خلافت ہُوا جو ایک مختصر مدت کی حکمرانی کے بعد طاعون کا شکار ہو گیا اور یُوں تختِ خلافت عبدالملک کے بھتیجے عمر ثانی عمر بن عبدالعزیز کے لیے خالی ہو گیا۔ ان کا ڈھائی سالہ مختصر عرصۂ حکومت اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن تھی۔

عمر ثانی کی تعلیم و تربیت مدینے کے اہلِ تقویٰ کے ہاتھوں ہُوئی تھی۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ یقیناً اپنے لیے ترکِ دنیا اور مراقبے اور اعمالِ حسنہ کا راستہ منتخب کر لیتے۔ انہوں نے خلیفہ بننے کے بعد اپنے ایک دوست سے پوچھا: "مجھے تختِ خلافت پر دیکھ کر تم خوش ہو یا غمگین؟" تو اس نے جواب دیا تھا: "یہ مسلمانوں کے لیے تو خوشی کی بات ہے مگر تمہارے اپنے لیے افسوس کی۔" جس پر خلیفہ نے کہا: "مجھے ڈر ہے کہیں مجھ پر لعنت نہ بھیجی جائے۔" ان کے دوست نے کہا: "سب کچھ ٹھیک رہے گا جب تک آپ میں خوف (خداوندی) رہے گا۔ تاہم مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں آپ کا یہ خوف ختم ہی نہ ہو جائے۔"

ایک اور دوست کی نصیحت یہ تھی:

"تمہیں ہر ضعیف آدمی کو اپنے باپ کی مانند سمجھنا چاہیے، ہر مسلمان نوجوان کو اپنا بھائی اور ہر بچے کو اپنا ہی بچہ سمجھنا چاہیے۔ باپ کی تعظیم کھڑے ہو کر کرو اور اس کے نیاز بھی حاصل کرو اور بھائی کے ساتھ عزت و توقیر سے پیش آؤ، اور ہر بچے سے محبت و شفقت کا برتاؤ کرو۔"

اس مشورے پر عمل کرنے میں انہوں نے اپنا تن من لگا دیا۔ ایک شخص نے بتایا: "جب میں پہلی بار اُن سے ملا تو کمر کا پٹکا ان کی بڑھی ہُوئی توند کے باعث

Marfat.com

نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے بعد جب میں اُن سے دورِ خلافت میں ملا تو اُن کی
پسلیاں صاف گنی جا سکتی تھیں"۔

عمر بن عبدالعزیز غیر متوقع طور پر ایک بہترین منتظم ثابت ہوئے۔ انہوں نے بڑی مناسب اور معقول مالی اصلاحات کیں اور کئی خرابیاں دُور کیں۔ اسلام کے مستقبل کو سنوارنے کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ انہوں نے علمائے دین اور فقہا کے ساتھ پہلے سے کہیں بڑھ کر عزت اور توقیر کا سلوک کیا جو اس بات کا مظہر تھا کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں رسول اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کی نگہداری سونپی تھی۔ اپنے پیشروؤں کے برعکس انہوں نے مفتوحین کے قبولِ اسلام کی ہمت افزائی کی اور پہلی مرتبہ انہوں نے اُن موالیوں کے وظائف جاری کیے جنہوں نے عرب فوجوں کے ساتھ خدمات انجام دی تھیں۔ اگر وہ کچھ اور جی گئے ہوتے تو یہ قرینِ قیاس ہے کہ اس صورت میں تاریخِ اسلام کا دھارا بدل جاتا۔ کیونکہ انہوں نے یہ دکھا دیا تھا کہ بعض حالات میں قوت اور اقتدار، تقویٰ اور دیانت کے ساتھ چل سکتے ہیں۔

خاندانِ بنی اُمیہ کے اقتدار کے آخری برسوں میں شورشوں اور بغاوتوں نے سر اُٹھایا کیونکہ شیعہ فرقہ زیادہ سرگرم ہو گیا تھا اور موالی پہلے سے بھی زیادہ شدت سے اپنے مرتبے پر ناراضی کا اظہار کر رہے تھے۔ شیعوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک کامیاب انقلاب کی کنجی طاقتور عباسی قبیلے کے ہاتھوں میں ہے جو پیغمبرِ خُدا کے ایک چچا عباسؓ کی اولاد تھے۔ اُنہوں نے ایک اتحاد قائم کیا اور عوام کا ایک انبوہِ کثیر ان کے ساتھ ہو گیا۔ ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جو عربوں کے مربیانہ انداز اور ٹیکسوں کی بھرمار سے تنگ تھے۔ اسی دوران میں خارجی جو ایک مکمل مذہبی جمہوریت کے خواب دیکھ رہے تھے جس میں ایسے "کامل" مرد وزن شامل تھے جو تمام گناہوں سے پاک تھے، برابر اموی خلافت کا قافیہ تنگ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

اب ان منتشر لوگوں نے امویوں کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ ان کے خونِ تقویٰ یا دعوائے تقویٰ، سے گرم ہو رہے تھے۔ ہر جگہ حتیٰ کہ مکے اور مدینے میں بھی، لوگ "جاہلیت"

Marfat.com

کی بے راہ روی کی طرف لوٹتے نظر آتے تھے، بالخصوص عشق و محبت کی اس حزنیہ شاعری میں جو بعد میں عہد بنی امیہ کا ایک ثقافتی کارنامہ قرار دی گئی اور جس نے کئی نسلوں اور تبدیلیوں کے بعد عیسائی علاقوں میں جڑ پکڑی اور یورپی رومانی شاعری میں بار آور ہوئی۔ ہر ایک گروہ اس بات پر متفق تھا کہ ان کے حکمرانوں نے اسلام سے روگردانی اور غداری کی ہے اور جُوں ہی پیغمبرِ اسلامؐ کے اخلاف اور آل کے ہاتھوں میں حکومت آئے گی، قیامت تک کے لیے آزادی اور انصاف کے ایک نئے دور کا آغاز ہو جائے گا۔ شیعوں نے منصبِ خلافت کے لیے اپنا نمائندہ اولادِ علیؓ میں سے ایک شخص محمد کو جنہیں "نفسِ زکیہ" کے لقب سے پکارا جاتا ہے منتخب کیا۔ ان پر بہت دیر بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ عباسیوں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

اُمویوں کے مخالفین اور منحرفین متحد تو ہو گئے تھے؛ تاہم یہ ایک حقیقت تھی کہ ۷۴۹ء میں رُونما ہونے والی بغاوت ——— اُس سے قبل کی دوسری بغاوتوں ہی کی طرح ناکام رہتی (کیونکہ خلیفہ مروان ثانی ـــ جسے عرفِ عام میں (الحمار الوحش) کہا جاتا ہے، ایک دلیر اور جی دار جرنیل تھا)، لیکن اس بغاوت کی پشت پر ایک انتہائی ذہین اور عیار شخص، ابو مسلم تھا جو اصل میں ایک ایرانی نژاد غلام تھا۔ اُس نے شہر مرو میں عباسیوں کا سیاہ علم بلند کیا۔ صوبے کے گورنر نے بارہا مروان کو بغاوت کی بخت وپز سے خبردار کیا۔ کبھی کبھی یہ تنبیہہ نامے اُس نے منظوم بھی تحریر کیے۔ اُس کے ایک منظوم عریضے کے الفاظ کچھ یُوں ہیں:

"مَیں راکھ کے ڈھیروں میں چنگاریاں سُلگتے دیکھ رہا ہُوں!
وہ شعلۂ جوالہ بننے کے لیے بے تاب ہیں
آگ لکڑی کو رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے
اور جنگ قینچی کی طرح چلنے والی زبانوں سے،
کاش! مجھے معلوم ہو سکے کہ اُموی سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں؟"[1]

---

1. Eric Shroeder, Muhammad's People, p. 256

Marfat.com

مگر مروان کو دوسری مصروفیتیں گھیرے ہُوئے تھیں۔ ایک طرف عراق میں خارجیوں سے نبرد آزمائی ہو رہی تھی تو دوسری طرف شام میں باغیوں سے جنگ جاری تھی۔ آخر جلد ہی پُورا ایران ابو مسلم کا مطیع ہو گیا اور اس کے بعد وہ عراق کی طرف بڑھا۔ مروان، دریائے زاب، جو دریائے دجلہ کا دھارا ہے، کے کنارے خیمہ زن تھا۔ اُس نے سیاہ پرچموں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا جنہیں بختری اونٹوں پر براجمان سوار تھامے ہُوئے تھے۔ اُس نے انہیں سیاہ طوفانی بادلوں کا نام دے رکھا تھا۔ اور آخر وہ طوفان اس پر ٹُوٹ پڑا، اس کی فوج تباہ ہو گئی اور وہ خود مصر بھاگ گیا جہاں جلد ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس دن بنو اُمیّہ کے تین سو افراد قتل کیے گئے۔ ان میں سے ایک نے دریائے زاب میں چھلانگ لگا دی اور اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اُسے تیر کر پار کرنا چاہا۔ اس بھائی کو کنارے سے امان پیش کی گئی جس پر اُس نے واپس تیرنا شروع کر دیا۔ کنارے پر پہنچتے ہی اُسے قتل کر دیا گیا۔ جو بچ گیا وہ ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گیا اور آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔

یہ عبدالرحمن تھا جو اُن منفرد اشخاص میں سے تھا جو انسانی تاریخ کی سفاکیوں اور خوں آشامیوں کو ہمارے لیے گواہ بنا دیتے ہیں۔ دریا کے پار پہنچ کر وہ ایک وفادار ملازم کی ہمراہی میں فلسطین کی طرف چلا گیا اور پھر وہاں سے گزرتا ہُوا شمالی افریقہ اس خیال سے نکل گیا کہ مراکش میں اپنی ماں کے بربر رشتہ داروں کے ہاں پناہ لے لے گا۔ اس سفر میں اسے پانچ سال کا طویل عرصہ لگ گیا۔ وہ افتاں و خیزاں پا پیادہ ایک قبائلی علاقے سے دوسرے قبائلی علاقے میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اس دوران میں کوئی ایک رات بھی اس نے اس یقین کے ساتھ بسر نہ کی کہ صبح تک زندہ بھی بچ سکے گا یا یہ کہ جاگتے رہنے پر اس دن صحیح و سالم بھی رہے گا۔ بڑی صعوبتیں برداشت کرتا آخر ایک دن وہ منزلِ مقصود پر پہنچ ہی گیا جہاں سے وہ اسپین جا پہنچا اور یہاں بنو اُمیّہ کے ایک حامی گروہ کی امداد سے ۷۵۶ء میں قرطبہ میں اسے امیرِ اندلس تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے طویل دورِ حکمرانی میں اور اس کے اخلاف کے تین صدیوں کے دورِ حکومت میں ایک خاص پوری اسلامی

Marfat.com

تہذیب نے نشوونما پائی جس کی بدولت مصوری، فلسفے اور تصوّف، اور ایک ایسے طرزِ زندگی نے جس میں نفاست اور خوش ذوقی کے ساتھ پرہیزگاری اور تقویٰ کی آمیزش تھی، خوب ترقی کی۔ مسیحی یورپ نے جو جہل کے تاریک دور سے گزر رہا تھا علم و عرفان کی مشعلیں اندلس کی عظیم جامعات و مدارس کے نور سے روشن کیں۔ اہلِ مغرب کو عالمِ اسلام خواہ کتنا ہی اجنبی اور دور محسوس ہوتا ہو، مسلم اسپین یورپی ورثے کا ایک لازمی عنصر ہی قرار پائے گا۔

عبدالرحمان ایک انتہائی انصاف پسند شخص تھا جو عرب جمہوری روایات پر ایمان رکھتا تھا۔ اُس نے اسپین کو ایک نہایت عادلانہ نظامِ حکومت اور ایک منصفانہ اور مساویانہ مجموعہ قوانین عطا کیا۔ اُس نے شہروں میں پاک و صاف پانی پہنچانے کے لیے زمین دوز نہریں تعمیر کیں اور جزیرہ نمائے اسپین میں شام کے پھلوں کے پودے لگوائے۔ عباسی گو مشرق میں فتحیاب ہو گئے تھے؛ تاہم وہ اتنے دور دراز علاقے میں مداخلت کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ دوسرے عباسی خلیفہ المنصورؒ نے (پہلا خلیفہ ابوالعباس السفاح، چار سال کے خون فشاں دورِ حکومت کے بعد فوت ہو گیا تھا) عباسیوں کی تلوار سے بچ جانے والے بنی اُمیّہ کے اس شخص کو "قریش کا شاہین" کہہ کر خراجِ تحسین کرتے ہوئے کہا تھا: "اس نے ایشیا اور افریقہ کے صحراؤں کی خاک چھان کر بڑی جرأت اور حوصلے سے سمندر پار ایک غیر معروف ملک میں تقدیر آزمائی کی۔"

بہر حال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ المنصور کے دماغ پر اس وقت زیادہ اہم مسائل مسلط تھے۔ اس نے اپنا مطمحِ نظر ایک اہم کام کی انجام دہی کو بنا رکھا تھا جو عموماً ہر کامیاب انقلابی کو درپیش ہوتا ہے کہ انقلاب کے بانیوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس کے سامنے اس سلسلے میں سب سے اہم شخصیت ابو مسلم کی تھی جس نے انتہائی زیرکی اور دانائی کے ساتھ انقلاب کی اس پوری مہم کا منصوبہ تیار کیا تھا اور اس پر کامیاب عمل درآمد بھی کروایا۔ المنصور نے اُسے ایک دعوت میں بلوا کر قتل کروا دیا۔ کیونکہ ایسے آدمی خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمارے عہد میں اسٹالین کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ ابو مسلم کی بریدہ لاش کا معائنہ

Marfat.com

کرتے ہُوئے المنصور نے ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یُوں تھا:

"مسافر نے آخر اپنا عصا پھینک ہی دیا۔"

اس کے بعد اُس نے اپنی توجہ شیعہ فرقے کی طرف مبذول کر دی جن کی نظریہ پرستی اس انقلاب کی روحِ محرکہ تھی اور اسی فرقے کی بدولت وہ مسندِ خلافت پر متمکن ہُوا تھا۔ شیعوں کے خیال کے مطابق دورِ بنی اُمیہ میں ان سے بدسلوکی کی گئی تھی؛ تاہم اب بدلے ہُوئے حالات میں وہ یقیناً اس گزرے وقت کو بڑی حسرت سے یاد کرتے ہوں گے۔ بنی اُمیہ ایک لحاظ سے شریف لوگ تھے مگر یہ نیا عباسی خلیفہ تو شریفانہ قدروں اور وضع داری کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا تھا۔

قتل و غارت کے شوقین لوگوں کے لیے یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ اُنقلاب پسند' تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے۔ اُن کی آنکھیں مستقبل کی موہوم خوشحالی کی آرزو سے تابناک ہوتی ہیں جس کی خاطر وہ ہنسی خوشی جان سے گزر جاتے ہیں۔ آٹھویں صدی ہو یا بیسویں، سب انقلابی ایک ہی انداز سے سوچتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ انقلاب نام ہی تباہی و بربادی کا ہے اور وہ اپنے ہی بانیوں کو سب سے پہلے فنا کرتا ہے۔ ایسا ضروتاً کرنا پڑتا ہے۔

بہت سی صورتوں میں تاریخ کے سبق تشریح کے طالب ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر معاملے میں یہ سبق اتنے واضح اور سادہ الفاظ میں خون سے لکھا گیا تھا کہ ایک بچّہ بھی اسے پڑھ سکتا تھا۔ عباسی انقلاب سے یہ توقع تھی کہ وہ قدیم، سچّے، صالح اور خالص اسلام کا احیا کرے گا مگر اس نے بڑی آب و تاب اور بے شمار کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اس کے بالکل برعکس عمل کیا۔ عمر بن عبدالعزیز کے سوا، ہو سکتا ہے اُموی اچھے مسلمان نہ ہوں، مگر وہ اصلاً اور نسلاً عرب حکمران تھے) جن کا مزاج جمہوری تھا اس کے برعکس اس نئے حکمران خاندان نے قدیم ایرانی ملوکیت کے انداز اپنانے شروع کر دیے۔ ان کے نزدیک عربوں اور اسلام کا قدیم مشاورتی طریقہ (شوریٰ) محض وقت کا زیاں تھا۔ درباروں میں اب جلاد اپنا کلہاڑا اور "حصیرہ" (چمڑے کا ٹکڑا جو مجرم کی گردن کے نیچے بچھایا جاتا تھا) لیے

Marfat.com

نئے خلیفہ کے بازو میں کھڑا ہوتا تھا تاکہ موقع ہی پر بدتمیز اور گستاخ عرض خواہوں سے نبٹ سکے۔

بنو امیہ نے شام کے بہت سے موالیوں کو ملازم رکھا ہوا تھا اور ان کے آخری ایام میں عرب اور غیر عرب مسلمانوں کا فرق تقریباً مٹ چکا تھا لیکن عباسیوں کے عہد میں نظم و نسقِ سلطنت ایرانیوں کے ہاتھوں میں آ گیا تھا اور ان کا اندازِ نظر ان شامیوں سے قطعاً مختلف تھا جو بالعموم مسیحیت سے نکل کر داخلِ اسلام ہوئے تھے۔ عربوں کی طرح ایرانیوں نے بھی اسلام ہی کے وسیلے سے عزت پائی تھی اور یہ عرب ذہانت اور ایرانی فطانت جو اپنی اپنی جگہ بے مثال، مگر بے حد مختلف تھیں، کا ملاپ تھا جس نے اسلام کو ذہنی اور تصوراتی اعتبار سے ایسی جلا بخشی کہ اسے نازشِ روزگار بنا دیا، اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے سابقہ صدیوں کے اقبال و زوال کے دوران یہ لوگ محوِ خواب تھے کہ اسلام نے اپنی طلسماتی چھڑی سے چھو کر یک لخت بیدار کر دیا تھا۔ عربوں اور ایرانیوں کا یہ ملاپ خوشگوار تھا نہ سہل، اور دونوں میں سیاسی لحاظ سے بُعدِ بعید تھا۔ سیاسی معاملات میں ایرانیوں کو ایک مرکزی حاکمیت کا طویل تجربہ تھا جبکہ عربوں کو آزاد زندگی کا۔ ان دونوں کے درمیان حائل خلیج اس قدر وسیع تھی کہ کوئی مصالحانہ رویہ بھی اسے پاٹنے سے قاصر تھا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ماحول میں تبدیلی لانے کے لیے خلیفہ المنصور نے ایک نئے دارالخلافے کی تعمیر کا فیصلہ کیا، اور اس کے لیے 'بغداد' نامی ایک گاؤں کا انتخاب کیا کیونکہ یہ جگہ فوجی نقطۂ نگاہ سے نہایت اہم تھی۔ دارالخلافے کی تعمیر میں سلطنت کے گوشے گوشے سے آئے تقریباً ایک لاکھ کاریگروں، معماروں اور مزدوروں نے حصہ لیا۔ اس کام کی تکمیل میں چار سال کی مدت لگی۔ انہوں نے گول دائرے میں ایک بہت بڑا شہر تعمیر کیا جس کے گرد دوہری شہر پناہ اُٹھائی گئی۔ حکمران کا محل شہر کے عین وسط میں تھا (گویا دنیاوی اقتدار کو مرکزیت کا دعویٰ تھا!) اپنے محافظین میں گھر کر اب خلیفہ اپنے عوام سے کٹ

Marfat.com

کر رہ گیا تھا۔ وہ زمانہ جس میں دروازہ تک تعمیر کرنا گناہ تصوّر ہوتا تھا، اب مدت ہُوئی لد گیا تھا۔ حکمران نے اب ایسا روپ دھار لیا تھا جسے اہلِ مغرب کسی روایتی مشرقی شہنشاہ کی حیثیت میں بڑی آسانی سے پہچان سکتے تھے۔ دمشق سے بغداد کی طرف نقل مکانی کرنے کے نتیجے میں اب اسلام کی توجہ مغرب کے بجائے مشرق کی طرف مبذول ہو گئی اور مغرب اور بحیرہ رُوم کے علاقوں یعنی قدیم سلطنتِ رُوما سے برائے نام تعلق رہ گیا۔

اپنے صحیح مفہوم میں عباسی ایک مختلف ہی نسل کے لوگ تھے۔ عموماً عرب شرفا، ماں اور باپ دونوں جانب سے عمدہ حسب و نسب کے قائل تھے (اور یقیناً جانوروں کی نسل کشی میں انتہائی ماہر لوگ اس حقیقت سے تو ناآشنا نہیں کہے جا سکتے) مگر اب اس نئے نظامِ حکومت میں تو عورت کی حیثیت محض "شرفا" کے بچے جننے کی مشین کی سی رہ گئی تھی۔ اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ لگ بھگ پانچ سو سال کے عرصۂ اقتدار میں صرف تین خلیفوں نے آزاد ماؤں کے بطن سے جنم لیا باقی تمام ایرانی، یورپی، بربر، حبشی، سلاوی، ترک اور ارمنی لونڈیوں کے بیٹے تھے۔ بنا بریں ان کی نظروں میں عرب روایات کی کوئی خاص قدر و قیمت نہ تھی۔ عباسی دور کے پہلے ۵۳ برس میں خلیفہ ایسے "بین الاقوامی" ملازمین میں گھرے ہُوئے تھے جن کے سربراہ برمک خاندان کے افراد یا "برامکہ" تھے۔ یہ لوگ ایک بُدھ بھکشو کی اولاد تھے۔ بے حد ذہین و فطین ہونے کے ساتھ یہ انتہائی جاہ طلب بھی تھے۔ ان لوگوں نے قوت اور اقتدار کا کھیل شاطروں کی سی مشاقی سے کھیلا۔ آخر ان کے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا اور اس مرحلہ پر نظر آتا تھا کہ وہ خلیفہ سے بھی زیادہ بااقتدار ہیں۔ شاید اسی بنا پر انہیں قتل کروا دیا گیا۔

خاندانِ عباسیہ نے انتہائی باعظمت حکمران بھی پیدا کیے اور کچھ بدترین بھی۔ دراصل اسلام کی پُوری تاریخ تضادات کے تصادم سے عبارت ہے جس میں شان و شوکت کے مقابل روحانی تہی مایگی، کبر و نخوت کے مقابل عجز و انکسار، اور

Marfat.com

ابلیسی بدطینتی کے مقابل بہادری اور شجاعت کے اوصاف نظر آتے ہیں۔ عجیب معاملہ تھا کہ یہ تمام تضادات تنہا ایک خلیفہ کی ذات میں مجتمع ہو گئے تھے جسے "الف لیلہ" جیسی مقبولِ عام کہانیوں کی کتاب کی نسبت سے اہلِ مغرب بھی آسانی سے جانتے پہچانتے ہیں۔ یہ خلیفہ ہارون الرشید ہے جس نے ۷۸۶ء سے لے کر ۸۰۹ء تک حکومت کی۔

ہارون الرشید تختِ خلافت پر برمکیوں کے جوڑ توڑ اور اعانت سے تئیس سال کی عمر میں متمکن ہوا تھا۔ وہ ایک انتہائی شائستہ، حسین وجمیل نوجوان تھا۔ بعض لوگ اُس کے حُسن و وجاہت کو دیکھ کر کہہ اُٹھتے: کاش! یہ عورت پیدا ہوتا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی ذات میں صنفِ نازک کے خصائص کے ساتھ ساتھ قوت و اقتدار سے ظالمانہ حد تک محبت یکجا ہو گئی تھی۔ یہ خُو اُسے اپنے اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ واللہ اعلم۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ اس عیش وتنعم کے درمیان (جس سے ہالی وڈ کے بنائے ہوئے سیٹ یاد آتے ہیں) وہ روزانہ نماز ول سمیت سو رکعت نوافل بھی پڑھتا تھا اور صدقہ و خیرات بھی کرتا تھا، گویا اپنے رب کی نافرمانی کرتے ہوئے بھی وہ اس سے ڈرتا ہے۔ اور کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ اسے انتہائی متلون اور گرم مزاج کہا جاتا تھا، کیونکہ وہ جہنم اور جنت کے درمیان تنگ خلیج پر معلق تھا۔ اسے ہر نادر اور خوبصورت شے سے عشق تھا! تاہم ایک کہانی یہ بھی سُنائی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ اپنے بھائی کی ضیافت میں جب اس کے سامنے ایک قاب میں قورمۂ ماہی پیش کیا گیا تو اُس میں تیرتے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیکھ کر اُس نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟" جب اُسے بتایا گیا کہ اس میں تمام تر مچھلی کی زبانیں استعمال ہوئی ہیں تو اس نے اس غذائے خاص پر اُٹھنے والی لاگت پوچھی۔ جب اُسے بتایا گیا کہ اس پر ہزار درہم سے زیادہ خرچ آیا ہے تو اس نے اسے کھانے سے انکار کرتے ہوئے اپنے بھائی سے اس کے متبادل رقم طلب کی جو اس نے اس فاش غلطی کے کفارے کے طور پر فوراً ہی خیرات کر دی پھر اس نے

Marfat.com

یہ انمول کتاب ایک خدمت گار کو دیتے ہوئے حکم دیا کہ وہ اسے گلی میں ملنے والے پہلے فقیر کو دے ڈالے[1]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہارون کو سب سے زیادہ دو افراد سے محبت تھی۔ ایک جعفر برمکی تھا جو اُس کے وزیرِ اعظم کا فرزند تھا۔ اس کے ساتھ وہ اکثر بھیس بدل کر تفریح کے لیے شہر کا چکر لگایا کرتا تھا۔ دوسری اس کی بہن عباسہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن ہارون نے جعفر سے کہا: "نہ میرا تمہارے بغیر گزارا ہے نہ عباسہ کے بغیر۔ جب مَیں عباسہ کے ساتھ ہوتا ہوں تو تم یاد آتے ہو اور جب تمہارے ساتھ ہوتا ہُوں تو عباسہ یاد آتی ہے۔ اب مَیں نے ایک طریقہ دونوں کی صحبت سے مستفیض ہونے کا سوچ لیا ہے۔" پھر اُس نے دونوں کی شادی کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی اُن دونوں سے یہ پختہ عہد لے لیا کہ وہ وظیفۂ زوجیت ادا نہیں کریں گے۔ بہر حال جعفر کی ماں کی بے انتہا خواہش پر ایک دن عباسہ، جعفر کے بستر پر چلی آئی جب وہ شراب کے نشے میں تھا اور خود کو ایک لونڈی ظاہر کیا۔ اس ملاپ کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی۔ اس بات کو اُس نے کسی طرح چھپائے رکھا، اور جب بچہ تولد ہو گیا تو اُسے رضاعی والدین کے پاس پرورش کے لیے مکہ بھیج دیا گیا۔ تاہم کسی نہ کسی طرح خلیفہ کو اس بات کا علم ہو گیا تو اُس نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے اپنی بہن کا گلا گھونٹ کر مروا دیا اور جعفر کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

یقیناً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جدید مورّخین اس کہانی کو بے سروپا ہی قرار دیں گے اور سیاسی اور اقتصادی عوامل کو برامکہ کے زوال کا باعث بتائیں گے؛ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ خاندان بہت طاقت ور ہو گیا تھا جس سے کسی بھی حکمران کو تشویش لاحق ہو سکتی تھی۔ بہ ایں ہمہ اس کہانی کے حقیقت ہونے کا خاصا

---

1. Shroeder, Mohammad's people, P: 298-99

Marfat.com

امکان ہے کیونکہ ہارون دُنیا کے اُن چند نفوس میں سے تھا جو اپنی دھن کے پکے ہوتے ہیں۔

بھلا کون ایسا ہے جس کے دل میں یہ خواہش نہ ہو کہ جن سے وہ محبت کرتا ہے وہ بھی آپس میں محبت کریں، گو یہ اُسے خطرہ بھی ہو کہ یہی محبت ان میں جدائی نہ ڈال دے۔ پھر وہ کون ایسا ہے جس کے دل میں اپنے محبوب کو کبھی نہ کبھی قتل کرنے کی خواہش نہ پیدا ہُوئی ہو؟ کسی عباسی خلیفہ کے لیے کسی مرد یا زن کے متعلق قتل کی خواہش رکھنا ہی موت کے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

اس معاملے کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہارون کی زندگی کے آخری ایّام مالیخولیا اور مراق کی نذر ہو گئے۔ پیٹ کے سرطان سے اس کی موت پر ہر حسّاس انسان کو دکھ ہو گا۔ کہا جاتا ہے ایک دن اُس نے اپنے طبیب کو طلب کیا اور اس کو بتایا کہ گزشتہ شب اُس نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جس کی ہتھیلی پر سُرخ مٹّی رکھی ہُوئی تھی۔ اس شخص نے کہا: "یہ اُس جگہ کی مٹّی ہے جہاں تمھیں دفن ہونا ہے"۔ جس پر ہارون نے پُوچھا: "وہ کون سی جگہ ہے؟" تو اُس نے جواب دیا: "طوس"۔ طبیب نے کہا: "یہ خواب ہاضمے کی خرابی کا نتیجہ ہے"۔ اور جھٹ ایک جلاب تجویز کر دیا۔

پھر ہُوا یہ کہ خراسان میں بغاوت ہو گئی اور ہارون باغیوں کو کچلنے کے لیے بغداد سے روانہ ہُوا۔ وہ ابھی شہر طوس کے مضافات ہی میں تھا کہ شدید بیمار ہو گیا۔ شہر کے ایک طبیب کو اس کے قارورے کا بے نام نمونہ بھیج دیا گیا، تو اس طبیب نے اُسے دیکھتے ہی کہا: "اُس آدمی سے جس کا یہ قارورہ ہے جا کر کہہ دو کہ اپنی وصیّت لکھ رکھے کیونکہ اس کا مرض لا علاج ہے"۔ یہ سُن کر ہارون نے ایک خادم سے کہا کہ اس علاقے کی مٹّی لے کر آئے۔ وہ آدمی کھلی ہتھیلی پر باغ کی کچھ مٹّی اُٹھا لایا۔ اُسے دیکھ کر ہارون چلّایا: "ہاں! یہی وہ ہاتھ ہے اور یہی وہ بازو ہے اور یہی وہ سُرخ مٹّی ہے"۔ اور کچھ عرصے تک وہ ایک بچّے کی طرح سسکیاں لے کر روتا رہا، پھر اپنے کفن

Marfat.com

کا انتخاب کیا اور یہ ابیات پڑھنے لگا جس کا مفہوم کچھ یُوں بنتا ہے :

"میری دولت میرے کام نہ آئی اور میرے اقتدار نے میرا ساتھ چھوڑ دیا"۔

لوگ ہارون کے کردار کا کوئی صحیح اندازہ قائم کرتے ہُوئے ہچکچاتے ہیں۔ اس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا ہے جو مطلق العنان قُوّت کے ساتھ عظیم ذہانت، جسمانی خوبصورتی، شخصی وجاہت اور لامتناہی خواہشات کے ساتھ ساتھ ایسے قلبِ سوزاں کا حامل ہو جو سراسر والہانہ عشق و محبت ہو جس میں پرہیزگاری اور سخاوت کے ساتھ ایسی ناآسودہ خواہشات بھی ہوں جو رُوح کو پراگندہ کر دیتی ہیں اور انسانی برداشت کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔ صرف وہی آدمی ہارون کو یا اس کی تقدیر میں رقم خوف و خواہش کو سمجھ سکتا ہے؛ تاہم اس پائے کے لوگ اپنے فیصلے عام نہیں کرتے۔

اس میں اور زوالِ برامکہ میں کسی مسلمان کو اس دُنیا سے متعلق بہت سے سبق ملتے ہیں اور بہت سی باتیں اُسے انسانی زندگی کی ناپائیداری کی یاد دلاتی ہیں: "دنیا چھُونے میں نرم ہے، جس طرح کوئی افعی اور اس کی طرح زہریلی" ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک دن مجھے کسی کام سے خزانے کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہُوا جہاں بہت سے رجسٹر کھُلے پڑے تھے۔ میری نظریں ناگاہ ایک رجسٹر پر پڑیں جس میں یہ درج تھا :

"گورنری کا ایک لباسِ فاخرہ اور سرپیش جعفر ابن یحیٰی کے لیے۔ قیمت چار لاکھ دینار" ۔۔ اس بات کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ پھر مجھے اُسی دفتر میں جانے کا اتفاق ہُوا جہاں رجسٹر کے ایک تازہ ورق پر یہ درج تھا: "نفت اور لکڑی کا برادہ، لاش جلانے کے لیے (جعفر بن یحیٰی کی)، خرچہ دس قیراط"۔ تو گویا بات یہاں آکر ٹھہری کہ جعفر کے جسمانی وجود کو فنا کرنے کے لیے چند ٹکے ہی کافی تھے!

کچھ وہ لوگ بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ ہارون کے بغداد میں زندگی کا ہر دن عید

1. Shroeder, Mohammad's People, p. 336

Marfat.com

اور ہر رات، شب برات کے مصداق تھی ___ سلطنت کی قوت اور دبدبہ اپنے انتہائے عروج پر پہنچا ہوا تھا __ اور بغداد نہیں تھا گویا ایک مقناطیس تھا جہاں دُنیا کے خزائن اور ذہن اور ہنرور اشخاص کھنچے چلے آتے تھے۔ بندرگاہ میں جہاز نفیس سمور، ہاتھی دانت کے سامان، نازک چینی کے برتنوں اور چین کے نفیس ریشم سے لدے کھڑے رہتے تھے۔ ان میں جواہرات اور عطریات بھی ہوتی تھیں جبکہ خشکی کے راستے سے خراسانی کا سونا، شام کا سنگِ مرمر، ماوراالنہر کے لاجورد اور نیشاپور کے فیروزے آتے تھے ___ گرمی کے دنوں میں امیر و کبیر لوگوں کے گھر در آمد کردہ برف سے ٹھنڈے کیے جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس شہر کی فصیلوں کے درمیان ستائیس ہزار عام حمام تھے۔ اس کا پہلا ہسپتال ہارون نے تعمیر کروایا تھا جس کے بعد مزید دارالشفاء وجود میں آنے شروع ہو گئے جن میں علمِ طب کی تدریس کے نہایت اعلیٰ انتظامات تھے اور غریبوں کو مفت علاج کی سہولت میسّر تھی۔ مدرسے اور مکاتیب ہر ایک کے لیے کھلے تھے اور بڑے بڑے علمی اداروں میں فلسفۂ یونان اور سائنس کا عربی زبان میں تراجم کا کام شروع ہو گیا تھا۔ عالم اور شاعر چین کی زندگی بسر کر سکتے تھے کیونکہ انہیں مُربیوں کی کمی نہیں تھی اور علم و عرفان کو دولت یا نجابت سے بڑھ کر سمجھا جاتا تھا۔

عورتیں وقت کے مطابق فیشن کرنے ساتھ ساتھ ریاست کے معاملات پر بھی اثر انداز تھیں۔ ان میں سے کچھ کے حُسن کا شہرہ چار دانگِ عالم میں تھا۔ ایسی سج دھج کے شہر میں غیر مہذب اور گنوار لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی ___ ان کا مقام مختلف ولائتوں اور صوبوں میں تھا۔ کسی لونڈی یا داشتہ کو اس چمک دمک والے معاشرے میں جگہ بنانے کے لیے آدابِ مجلس سیکھنے ضروری تھے اور اس کے لیے کسی درسگاہ میں تربیت حاصل کرنا لازمی تھا جہاں اسے عربی اور فارسی کلاسیکی ادب پڑھایا جاتا تھا۔ شعر گوئی اور سخن فہمی میں طاق بنایا جاتا تھا کوئی نہ کوئی ساز بجانے کی تربیت دی جاتی تھی اور شطرنج کے کھیل میں بھی مہارت پیدا کرائی جاتی تھی۔ زرق برق لباس پہنے ہوئے

Marfat.com

اور زیورات وجواہر سے لدی پھندی یہ عورتیں دوسرے کسی شہر کی معزز خواتین کو اپنے سامنے ہیچ سمجھتی تھیں۔

اس تمام کروفر میں بھی عرب روایات اور ورثے کا کچھ نہ کچھ عنصر موجود تھا جو اسلام کا جزوِ لاینفک ہے۔ سر جان گلب لکھتے ہیں:

"پوری سلطنت میں قدیم عرب فاتحین کے جذبے اور رُوح کا نفوذ دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ان کی شجاعت کا ضابطہ، شعروشاعری سے خاص لگاؤ، جنسی معاملات میں رومان پسندی اور شاہانہ انداز کی مہمان نوازی اور سخاوت کی روایات پوری قلمروئے اسلامی میں ہسپانیہ سے لے کر ہندوستان اور چین تک پھیلی ہُوئی تھیں۔"[1]

امرائے بغداد کی محلسراؤں میں پسِ دیوار بے شک بے راہ روی تھی؛ تاہم ایسے لوگ بھی تھے جو پرہیزگار تھے اور غریبوں اور ناداروں کی دست گیری اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وقائع نگار بتاتے ہیں کہ کوئی امیر کبیر تاجر ہر موسمِ بہار کے آغاز میں اپنے اُونی کپڑے، اپنے چُولھے اور اپنا فرنیچر فروخت کر کے روپیہ غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اسی طرح موسمِ خزاں میں زربفت کے قیمتی کپڑے، نفیس اطلس و کمخواب، گرمیوں کی سوزنیاں اور چادریں اور پانی ٹھنڈا کرنے کے ظروف بیچ کر خیرات کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے داروغہ نے اسے متنبہ کیا کہ اگر اس کی داد و دہش کا یہی عالم رہا تو ایک دن وہ دیوالیہ ہو جائے گا۔ اس کے لیے یہی بہتر ہو گا کہ وہ ان اشیاء اور ظروف کو اگلے موسم کے لیے رکھ چھوڑے۔ اس پر تاجر نے کہا: "نہیں! مَیں ایسا نہیں کروں گا۔ اللہ نے مجھے ان چیزوں کے استعمال کی گرمیوں یا جاڑوں میں توفیق بخشی اور اُس نے مجھے اس قابل کیا کہ مَیں ان کے بغیر بھی گزارہ کر سکتا ہُوں۔ ہو سکتا ہے

---

1. Sir John Glubb, A Short History of the Arab Peoples, Holder & Stoughton, 1969, p. 110

Marfat.com

ان اشیاء یا ظروف کو حاصل کرنے میں یا ان کے استعمال میں مجھ سے کوئی نافرمانی ہو گئی ہو۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ میں انہیں بیچ دوں اور ان سے حاصل ہونے والے پیسے کو خیرات کر دوں ...."

شوکت و عظمت کے نصف النہار پر پہنچ کر بغداد کا زوال بتدریج ہُوا (جبکہ خلافت کے ادارے کا تنزل اس سے بھی کہیں زیادہ سرعت سے ہُوا) حالانکہ ہارون کی موت کے فوراً بعد اس کے دو لڑکوں میں خانہ جنگی نے بڑے وسیع پیمانے پر نقصان پہنچایا اور لوگوں کو ناقابلِ برداشت اذیت میں مبتلا کر دیا۔ خلیفہ مامون، جو کامیاب ہُوا، عباسیوں میں سب سے مؤثر حکمران ثابت ہُوا۔ اسلام کے مستقبل کے لیے ان خانہ جنگیوں سے کہیں بڑھ کر اہم وہ روحانی اور فکری آویزش تھی جو اس دَور میں رونما ہو رہی تھی۔

مامون نے اپنے باپ کی پالیسی پر گامزن رہتے ہُوئے عربی زبان میں بیرونی کتب کے تراجم کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ اس نے ایک دارالحکمت قائم کیا جس میں علمِ ہیئت کی ایک رصدگاہ بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ اُس نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا، جس میں ملازم علماء اور دانشور نہ صرف یونانی زبان کے مسوّدات پر کام کرتے تھے بلکہ سنسکرت اور سُریانی کے مخطوطات کے تراجم میں بھی منہمک رہتے تھے۔ ایک مسیحی عالم کو، جس نے افلاطون کی "جمہوریہ" اور ارسطو کی "مقولات" کے تراجم عربی میں کیے تھے، ان کتابوں کے وزن کے برابر سونا دیا گیا (کاش! آج کی حکومتیں بھی اس روش کی تقلید کریں) یہاں مامون کے بغداد میں ذہنی سطح پر جوش و جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اُس نے یورپی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔

یونانی علوم نے جو اہلِ مغرب کے لیے اسلام کا ابہام سے لبریز تحفہ کہا جا سکتا ہے، یورپ پر بڑے گہرے اور دُور رس اثرات مترتب کیے۔ ایک وقت تھا کہ سات صدیاں بیشتر انہوں نے اسلام پر ایسے ہی فیصلہ کُن اثرات ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ہارون ہی کے زمانے میں "معتزلہ" کا فرقہ یا تحریک چلی تھی اور مامون کے عہد

Marfat.com

میں ان کے عقائد کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ معتزلہ عقلیت پسند لوگ تھے۔ ان کا بنیادی مقصد سامی توحید پرستی کو یونانی فلسفے میں شامل کرنا تھا۔ ان کے بہت سے دلائل ان مسیحی مباحث کے متوازی ہیں جو "اقنوم ثانی" (Logos) یا کلمۃ اللہ کے بارے میں ہیں۔ خلیفہ ان کی تعلیمات کے صرف ایک پہلو میں دلچسپی رکھتا تھا۔ سلف صالحین کے عقیدے کے برعکس، جو کہتے تھے کہ قرآن ابدی اور "غیر مخلوق" ہے، یہ لوگ قرآن کو اسی طرح "مخلوق" مانتے تھے جس طرح اس کائنات کی باقی سب اشیاء ہیں۔

جدید ذہن الٰہیات کے مباحث سے اُلجھ جاتا ہے جو درست رویہ نہیں کیونکہ خود جدید ذہن کی آبیاری قدیم الٰہیات ہی نے کی ہے۔ اس اور اس کی ہلکی سی بازگشت فلسفہ جدید میں بھی سننے میں آجاتی ہے۔ بہرحال اس نظریۂ "خلق قرآن" کے فوری اور عملی اثرات مترتب ہوئے۔ اس کے معنی یہ نکلتے تھے کہ کتاب اللہ کو وقت اور حالات کے مطابق اور سیاسی ضرورتوں سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں حکمران اور ریاست دونوں کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ ایک ہزار برس بعد آنے والے فرانسیسی انقلابیوں کی طرح مامون نے یہ محسوس کر لیا کہ عقلیت پسندی ہی مطلق العنان قوت فراہم کرنے اور لوگوں کا بے رحمانہ استحصال کرنے کی کلید ہے۔ اگر ایک مرتبہ "مذہبی تعصب" اور "اوہام پرستی" کا خاتمہ ہو جائے تو پھر کسی بات کو منوا لینے کی کوئی حد نہیں رہے گی۔ اور کسی خلیفۂ اسلام کے لیے، جس کے پیروں میں ہنوز دینِ اسلام کے سلاسل پڑے ہوئے تھے، تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی تھیں اور اُسے کھلی چھوٹ مل جاتی تھی۔ اسلام میں پہلی اور آخری بار ایک شرعی تحقیقاتی عدالت "محنۃ" قائم ہوئی جس کا مقصد یہ دکھانا تھا (اگر اس کا دکھایا جانا ضروری تھا) کہ عقلیت پسندی بھی مذہبی تعصب یا جنون کی سی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ جو لوگ خلق قرآن کے نظریے کو تسلیم نہیں کرتے تھے مستوجبِ سزا ٹھہرے۔ اور اُس زمانے کے عظیم ترین فقیہہ امام احمد بن حنبلؒ کو قید میں ڈال دیا گیا اور ان کو انتہائی وحشیانہ طریقے سے زدوکوب کیا گیا، اور دوسروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

Marfat.com

یہ "تحقیقی عدالت" صرف بیس برس تک قائم رہی اور آخر میں قرآن کے "غیر مخلوق" ہونے ہی کا نظریہ قائم رہا؛ تاہم معتزلی خیالات کو جڑ سے اکھاڑا نہ جا سکا۔ اسے اسلام میں جذب کر لیا گیا جس میں انجذاب کی لاجواب صلاحیت موجود ہے اور اس نے اسلامی فکر کے بڑے دھارے کو تقویت پہنچائی۔ مسلمان متکلمین میں ایک نہایت اثر انگیز شخصیت شیخ ابوالحسن الاشعری کی تھی جن کا مدرسۂ فکر سلف صالحین کے قدیم نظریات کا حامل تھا اگر اسلام میں "قدیم نظریات" کا کوئی وجود ہے۔ الاشعری نے اپنی عالمانہ زندگی کا آغاز ایک معتزلی کی حیثیت سے کیا تھا۔ اور جس طرح کوئی سابق اشتراکی خود مارکسیوں کے لتے لیتا ہو، اس طرح انہوں نے بھی یونانی منطق اور جدلیات کو یونانی فلسفے کے حامیوں کے خلاف استعمال کیا اور معتزلی نظریات میں جو کچھ بھی قابلِ استعمال تھا اُسے قدیم نظریاتِ اسلام کی تقویت اور آبیاری کے لیے برتا جس کے نتیجے میں باقی تمام نظریات خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ گئے۔

اسلام کے بنیادی اصولوں کو تقویت دینے کے لیے ان کی فراہم کردہ کمک بہت بروقت ثابت ہوئی کیونکہ اب مرکزی اقتدارِ اعلیٰ بتدریج زوال پذیر ہو رہا تھا اور ایک مضبوط اور متحد مملکت مختلف ٹکڑوں اور حصوں میں بٹ رہی تھی۔ خلافت جب نظریاتی سطح پر اپنی پوزیشن مضبوط بنانے میں ناکام ہو گئی تو اُس نے اعلیٰ درجے کے مسلح دستوں سے اپنا تحفظ کرنے کی ٹھان لی۔ مامون کا بھائی معتصم جب خلیفہ ہُوا تو اُس نے اپنے تحفظ کے لیے ترک سپاہیوں کے دستے اپنے چاروں طرف اکٹھا کر لیے جن کے بارے میں اُسے یقین تھا کہ وہ مقامی ریشہ دوانیوں میں ملوّث نہیں ہوں گے اور تنہا اس کے وفادار رہیں گے۔ یہ ترک سپاہی بہت جلد شہر میں غیر مقبول ہو گئے کیونکہ وہ بازاروں میں اندھا دھند گھوڑے دوڑاتے اور لوگوں کو روندتے ہُوئے گزر جاتے۔ یہ دیکھتے ہُوئے معتصم نے فیصلہ کیا کہ وہ بغداد کو اپنے "شاہی وجود" سے محروم کر دے اور کثیر لاگت سے بغداد سے تقریباً ستر میل دور، سامرہ میں، اپنے لیے نیا شہر آباد کرے۔ اور یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ یوں عباسی خلفاء نے اپنے ہی خلاف فیصلہ صادر کر

Marfat.com

دیا۔ جلد ہی خلفاء اپنے محافظوں کے اسیر بن گئے جو ان کے ساتھ اپنی مرضی کا کھیل کھیلتے رہتے اور جب وہ اس کھیل سے اُکتا جاتے تو انہیں قتل کر دیتے۔ اس وقت کچھ لوگوں کا خیال تھا۔ اور آج بھی کچھ لوگ یہی محسوس کرتے ہیں۔ کہ عباسیوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کی "آل" کو اس کے جائز ورثے یعنی امتِ محمدیہ کی دنیوی سربراہی ۔۔ سے محروم کر دیا تھا دنیا کا چلن دیکھتے ہوئے انسان یہی کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ "جیسے کو تیسا"! آخر ایک دن وہ بھی آیا جب کسی شریف یعنی سیّد نے، جو نبی کریمؐ کی آل میں سے تھا، کسی خرقہ پوش فقیر کو بغداد کی جامع مسجد کے پاس فرشِ خاک پر بیٹھے دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو خلیفۂ وقت تھا جو اپنے ترک محافظوں کے نرغے سے اُس وقت نکل بھاگا تھا جب انہوں نے اس کی آنکھیں نکال کر اُسے قید میں ڈال دیا تھا۔ یہ "شریف" اسے اپنے گھر لے گیا، کھانا کھلایا اور پناہ دی۔ وہ یقیناً یہ سوچ رہا ہو گا کہ حکمرانی ہمیشہ پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔ بہر حال اب اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا۔ خلفاء کی تقدیریں، سلطنت کے اندر بٹوارے اور بڑے بڑے اہم واقعات ہزاروں رومانی داستانوں کو تخلیق تو دے سکتے ہیں مگر ان کی حیثیت کفِ دریا سے زیادہ نہیں۔

مغربی مورخین پر اکثر یہ الزامات عائد کیے جاتے ہیں (اور صحیح طور پر کیے جاتے ہیں) کہ ۱۲۵۸ء میں منگول حملہ آوروں کے ہاتھوں بغداد کی تاخت و تاراج کے بعد انہوں نے یہ فرض کر لیا کہ تاریخِ اسلام اب لائقِ اعتناء نہیں رہی؛ حالانکہ تاریخ کے تسلسل میں یہ محض ایک قصّے کا انجام تھا۔ اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور امتِ مسلمہ ایک زندہ ملت۔ اس کی تاریخ کھلی تاریخ ہے اور آج کی خبریں بھی گزرے ہوئے کل ہی کی طرح کی ہیں۔ مگر یہاں ہمیں بذاتِ خود تاریخ سے تعلق نہیں۔ ہارون اور اُس کے بیٹوں کے دور تک خلافت کی تاریخ کسی حد تک اسلام کی تاریخ کہی جا سکتی ہے اور دین کی تشکیل پر اس کے اثرات تھے مگر اب ایسا موڑ آ گیا تھا جب شخصی اور سیاسی تاریخ، ملت کی زندگی سے بالکل جدا ہو گئی تھی۔ سنّی اسلام نے ایک واضح شکل اختیار کر لی تھی اور آنے والے ایک ہزار سال میں نسلاً بعد نسل اُس معاشرتی اور قانونی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی واقع

Marfat.com

نہ ہوئی جس کے مطابق اُمّتِ زندگی گزار رہی تھی۔ قرآن وحدیث کے معنی ومضمرات بیان کرنے کے لیے کئی علما خاموشی سے کام کرتے رہے اور وہ اس بات سے بے نیاز تھے کہ سرکاروں اور درباروں میں کیا ہوتا ہے۔ اب اُمّت نے اپنے انداز میں زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی اور روحانی اور معاشرتی سطح پر خود کفیل ہو گئی تھی[1]۔ اگر کسی مغربی ملک میں رات کی رات میں حکومت اور انتظامیہ غائب ہو جائے تو وہاں افراتفری اور انتشار پیدا ہونا یقینی ہے لیکن اگر یہی صورتِ حال کسی مسلم ملک میں پیش آئے تو ہم دیکھیں گے کہ اس سے لوگوں کی زندگیوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا، اور قدیم زمانے میں بھی لوگوں سے حکومت کا رابطہ صرف اسی وقت قائم ہوتا تھا جب کوئی محصّل ٹیکس وصول کرنے کو آ دھمکتا تھا۔ لوگ اپنی راہ چلتے رہتے تھے اور حکمران اپنی راہ پر۔

جب ہم اُن لوگوں کے متعلق پڑھتے ہیں جنھوں نے تاریخ کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کیا تو خیال آتا ہے کہ وہ دور زندگی کے لیے انتہائی پُرخطر اور مخدوش دور تھا، اور جب جلاد کا کلہاڑا یاد آتا ہے تو بے اختیار اپنے گلے تک ہاتھ پہنچ جاتا ہے؛ تاہم کسی شخص کو بھی اپنا کردار ادا کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی مرد یا عورت ایسا کرنا چاہتا تو اُس کے لیے بے حد و اندازہ مواقع تھے۔ اس کے فوائد بھی بے پناہ تھے اور خطرات بھی بے حساب۔ آج اگر کسی کو رفعت حاصل ہے تو

---

[1] "عرصۂ دراز تک بلکہ حقیقتاً یوں کہیے کہ نویں صدی سے، جابر اور مستبد حکمرانوں کی اطاعت تو کی جاتی رہی؛ تاہم ان کے قریب جانے سے گریز کیا گیا۔ جزوی طور پر اس لیے کہ مسلمانوں نے ایک آرام دہ معاشرتی نظام اپنا لیا تھا جس کی بنیاد ایک پیچ در پیچ شخصی اور جماعتی وفاداریوں اور ذمہ داریوں پر تھی۔ ہو سکتا ہے حکمران غاصب ہوں مگر جو بات قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ معاشرتی نظام مبنی برحق اور جائز تھا کیونکہ یہ خدا کے قانون کے تابع تھا۔"

P.J. Vatikiotis, Arab & Regional Politics in the Middle East,

Croom Helm, 1984

Marfat.com

کل جلّاد کا کلہاڑا اُس کا منتظر ہوتا تھا۔ بہر حال یہ اس کھیل کے قوانین تھے اور اس سلسلے میں اصول یہ تھا کہ ہمت ہو تو کھیلو۔ جب ہم اُس دور پر، جو تند و تیز اور تباہ کن تھا، نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ بعض مسلمان شاعر، فلسفی، صوفی یا ماہر تعمیرات کس طرح بادِ حوادث سے محفوظ رہے۔ درحقیقت، منتشر ہوتی ہُوئی سلطنت میں یہ لوگ خلیفہ یا سلطان کے لیے بہت بڑا اثاثہ تھے اور مُنہ مانگی قیمت پاتے تھے۔ کسی بھی حکمران کے لیے اس سے بڑھ کر فخر کی اور کوئی بات نہیں تھی کہ وہ سینہ تان کر کہہ سکے کہ میرا فیلسوف تمہارے فلسفی کو کسی دن نیچا دکھا دے گا یا میرے شاعر کے اشعار کے سامنے تمہارے شاعر کے اشعار ہیچ ہیں۔

عصرِ حاضر کے مسلمان اکثر اپنی تاریخ سے خاصی شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات کسی طرح باعثِ تسلّی نہیں ہوتی کہ دوسرے لوگوں اور دوسری تہذیبوں کی تاریخ یا کم از کم عیسائیت کی تاریخ، بھی اسی طرح خونریزی سے عبارت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کسی عام فرقے یا کسی عام تہذیب کا معاملہ نہیں۔ یہ امتِ مسلمہ کی بات ہے جس سے بہتر سے بہتر ہی کی توقع کی جاتی ہے۔ اب چونکہ کسی مسلمان کے نزدیک کوئی شے بے مقصد نہیں، اس لیے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر عباسی خلفا اور اُن جیسے دوسرے سلاطین کس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے؟ سب سے اوّل تو یہ کہ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ انسانی فطرت جب اپنی آخری حد کو پہنچ جائے تو پھر وہ ہمیں ہمارے متعلق بہت کچھ سکھا سکتی ہے اور اس طرح گویا یہ:

"ایک نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں۔"

پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث کے مطابق آدمؑ کی تخلیق اللہ کی صورت پر ہوئی تھی اور ہم اولادِ آدمؑ ہیں۔ بقول قرآنِ کریم آدم کا قبیلہ! چونکہ وہ لاشریک، وہ مُکتفی اور مقتدر ہستی انسان کی فطرت میں کسی نہ کسی انداز میں ضرور جھلکتی ہے، اس لیے انسانی فطرت میں کوئی ایسی بات ہے جو ویسی ہی آزادی چاہتی ہے جیسی کسی مطلق العنان حاکم میں ہوتی ہے، لیکن چونکہ انسان خُدا نہیں ہے، اس لیے انسانی ذات کی بے نہایت توسیع اس کی تباہی کا

Marfat.com

پیش خیمہ ہوتی ہے۔ بے اندازہ طاقت کی خواہش اور اس کے استعمال میں لالچ اور تکبر کا عنصر پایا جاتا ہے مگر اس میں ایک عنصر پاکیزگی اور شرافت کا بھی ہو سکتا ہے جو اظہارِ ذات کے لیے کسی اعلیٰ وسیلے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ہم جن انسانوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ ایسی "خالص" انسانی فطرت کے نمائندے تھے جس میں شان و شکوہ، عدم استحکام اور جبر و تشدد یک جا تھے۔ جو لوگ ان شخصیات کو قطعی اجنبی سمجھتے ہیں وہ خود اپنے ہی متعلق بہت کم جانتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ان سے مذہب اور سیاست، پرہیزگاری اور دنیا داری کے درمیان کشمکش کا احوال معلوم ہوتا ہے، اور یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں ارادے اور عمل کی آویزش جاری ہے ــ یعنی ہماری خواہشیں کیا ہیں اور اس دنیا کے آب و گل کے ہٹیلے مواد سے انہیں کہاں تک تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

متقی اور پرہیزگار لوگ ہمیشہ ایسے خلفاء کی ملامت کرتے رہے ہیں اور آج اُن کے دلوں میں اُن اربابِ اقتدار کے لیے رحم کی کوئی رمق نہیں جو ان سے بھی کم پاکباز ہیں مگر یہ کوئی آسان بات نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے:

"رکاوٹیں تو آتی رہیں گی مگر حیف ہے اُس پر جو ان کا آلۂ کار ہو۔"

یہ انجیلِ مقدس کے اقوال میں بہت اہم قول ہے کیونکہ کبھی کبھی ان "رکاوٹوں" ہی سے مذہب کا تحفظ ممکن ہوتا ہے۔ اگر یہ خوفناک حکمران اپنے ناپاک ہاتھوں سے اپنا کاروبار صرف اسی مؤثر طریقے پر نہ چلاتے تو آج دنیا میں متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی نہ وہ ادارے ہوتے جہاں وہ ارتقاء اور پرہیزگاری سیکھ سکتے۔ ایسے تضادات صرف اسلام ہی تک محدود نہیں۔ یہ عالمگیر ہیں اور ہر اس جگہ پر سر اُٹھاتے ہیں جہاں اہلِ روحانیت اور اہلِ دنیا کی ٹکر ہوتی ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ یہ دُنیا بہشت نہیں، نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ایک خاص نقطۂ نظر سے اُسے "بازی گاہ خرافات" ہی کہا جا سکتا ہے۔

ہر مذہب کی پیدائش اور ابتدائی ایام کی نازکی کو دیکھتے ہُوئے یُوں محسوس ہوتا

Marfat.com

ہے جیسے حقیقتاً صرف دو ہی سوال پوچھنے چاہییں: کیا اسلام زندہ رہا؟ اور کیا یہ دنیا میں پھیلا؟ ان دونوں سوالوں کا جواب "ہاں" میں ہے۔ اس جواب کے بعد کتبِ تاریخ بند کر دینی چاہییں۔

Marfat.com

باب نہم

قانون کی حکومت

۱۹۵۰ء سے اوائل ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصے میں جب نو آبادیاتی نظام کی بساط لپٹنی شروع ہوئی تو اس سوال پر سنجیدگی سے بحث و تمحیص شروع ہو گئی کہ کون کون سے علاقے حکومتِ خود اختیاری کی صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں اور کون کون سے نہیں۔ کسی نے بھی یہ بنیادی سوال نہیں اُٹھایا کہ روئے زمین پر کوئی قوم واقعی حکومتِ خود اختیاری کے لائق بھی ہے؟ اس وقت اور آج بھی اہلِ سوئٹزرلینڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وُہ اپنے معاملات کو بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں اور کوسٹاریکا (Costa Rica) کے متعلق بھی نیک گمان تھا تاہم دُوسری نوتشکیلی اقوام کے بارے میں کل بھی (اور آج بھی) یہ کہنا مشکل تھا کہ اُن کے لیے کوئی قابلِ عمل طرزِ حکومت تجویز کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ سوال کرنا جائز ہو گا کہ کہیں "حکومت" کے عام تصوّر ہی میں تو خرابی نہیں جو اسے بنیادی طور پر ناقابل بنا دیتی ہے؟

ہو سکتا ہے سابقہ زمانے کا کوئی قبائلی نظام، کسی وسیع کنبے کے طور پہ اس حد تک بے نقص ہو گیا ہو جس کی کسی انسانی معاشرے سے توقع کی جا سکتی ہے، خواہ وُہ قدیم عرب کا قبائلی نظام ہو، یا غلاموں کی تجارت سے قبل کے افریقہ کا یا سفید فاموں کی آمد سے پہلے کے شمالی امریکہ کا نظام یا وسطی ایشیا اور بحرالکاہل کے جزائر کے قبائل

Marfat.com

کا نظام؛ تاہم حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی اجتماعی حیثیت میں معاشرے ابھرے ہیں جن میں کسی منضبط اور منظم ادارے کی ضرورت تھی، وہاں ابھی تک "حکومت" کو بلاؤں، قحط اور ٹیکسوں جیسی ناگزیر برائیوں کا مترادف اور ہم معنی خیال کیا جاتا رہا ہے کہ زوال آمادہ انسانیت اِن کی زد میں رہتی ہے۔

بہر حال کسی "لابدی خرابی" کو قبول کرنے کے معنی یہ تو نہیں ہوتے کہ اِس خرابی کو پھولنے پھلنے اور نمو اور وسعت پانے کی بھی خوشدلی سے اجازت دے دی جائے۔ مقصد تو ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ اِس خرابی کو کم سے کم حد پر رکھا جائے لیکن کم سے کم حکومت بھی، ضمیمے کے طور پر، ایک ایسا معاشرہ چاہتی ہے جو اپنے تمام اعمال نظم و ضبط سے سرانجام دے سکے، کیونکہ کوئی شخص، مرد ہو یا عورت، لاقانونیّت اور نراج کی حالت میں بحُسن و خوبی زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایسا معاشرہ صرف طے شدہ یا منزّل من اللہ، قانون کے دائرے ہی میں کام کر سکتا اور زندہ رہ سکتا ہے۔ جانوروں میں جبلت اس قانون کے طور پر کام کرتی ہے۔

قرآن کریم جو ہر حقیقی اسلامی، معاشرے کا "آئین" ہے خود اس تقابل کی توثیق کرتا ہے کیونکہ وُہ اِس بات پر زور دیتا ہے کہ مخلوق کی ہر نوع اور ہر گروہ کے لیے خُدا نے ایک "شرعۃ" (قانون) اور "منہاج" (راستہ) مقرر کر دیا ہے لیکن جہاں یہ بے جان عالم اور اس میں بسنے والی تمام بے زبان اور عقل سے عاری مخلوق اپنے جبلّی قوانین پر عمل پیرا ہے، وہیں انسان کے لیے اپنے وجود کی خاطر، قانون و شریعت کی رضاکارانہ طور پر، اور عقل کی مدد سے تسلیم کرنا ضروری ہے کیونکہ صرف وہی ہے جسے عقل و شعور ودیعت کیا گیا ہے۔ پتھروں کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ وُہ گر کیوں جاتے ہیں نہ ہی پرندوں کو یہ شعور ہوتا ہے کہ وُہ کیوں نقل مکانی کرتے ہیں۔ انسان کی تعریف یہ ہے کہ وُہ جاننے کی خواہش رکھتا ہے اور مقدر کے اعتبار سے مختار ہے لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے وُہ معاشرے کے وظائف اعمال کے لیے قوانین بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

کوئی مسلمان جب "لا الٰہ الا اللہ" کہتا ہے تو وُہ صرف خُدا ہی کو "شارع" (قانون ساز) تسلیم کرتا ہے؛ گویا اس شہادت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شارع کے سوا کوئی شارع

Marfat.com

نہیں۔ قرآنِ مبین میں جو پیغام وارد ہوا ہے اور جو قوانین اُس سے اور سنّتِ نبوی سے مستنبط کیے گئے، وُہ شیرازۂ ملّت کو یکجا اور مجتمع رکھتے ہیں۔ اس وحدت کو مؤثر بنانے کیلئے کسی بیرونی دباؤ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اصلی اقتدارِ اعلیٰ کسی حکمران، حکومت یا لوگوں کی عددی اکثریت کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ حقیقی اقتدار اور حاکمیت صرف خدائے عزّ وجل ہی کی مِلک ہے؛ تاہم یہ اقتدارِ اعلیٰ ایک حد تک کسی "ہدایت یافتہ" ملّت کو تفویض کر دیتا ہے۔ "شریعت" دراصل اُن قوانین کی یاد دہانی ہے جو خود ہمارے وجود میں ہیں اور اس لیے اُسے مؤثر بنانے کے لیے اصولاً کسی ریاستی مشینری، سرکاری کارندوں یا پولیس والوں کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ عصرِ حاضر کا مغربی انسان مذہب کو اپنی زندگی میں خواہ کوئی بھی جگہ دے بہر حال وُہ محض "ایک جگہ" ہی ہے۔ وُہ پوری معاشرتی عمارت کا ایک حصّہ ہے اور اپنی ذات میں کُل نہیں۔ دُوسری طرف اسلام میں معاشرتی نظام بھی مذہب ہی کا ایک حصّہ ہے اور اسے مذہب سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔

اس نظام میں کسی حکمران کے (یا یوں کہئے کسی حکومت کے) فرائض بہت محدود ہو جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کو خدا کی حکومت کے بجائے "خدا محوری" معاشرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور اگر اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے تو پھر اس کے لیے ایسے "نیم خدائی" حاکم کی ضرورت ہوگی جو زمین پر اللہ کا نائب اور ارادۂ و منشائے الٰہی کا شارح ہو لیکن "خدا محوری" معاشرے میں حکمران کا کردار مرکزی نہیں بلکہ معاشرے کے حاشیوں تک محدود ہوتا ہے۔ خلفائے راشدین کے مثالی دورِ حکومت کی یادوں کے باعث حکمرانی کے بہت سے نظریات معرضِ وجود میں آئے؛ تاہم مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی حکمران کے فرائض کا ایک بہت عملی نظریہ اپنایا ہے۔ کسی حکمران سے یہ توقع وابستہ نہیں رکھی جاتی کہ وُہ کوئی ولی یا درویش ہو یا عقلِ کُل ہو یا عام فہم زبان میں نیک آدمی ہو۔ اُس کی ذاتی بُرائیاں نظر انداز کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ وُہ سختی سے نجی اور ذاتی دائرے تک محدود ہوں۔

اُس سے جس بات کی حقیقی توقع کی جاتی ہے وُہ یہ ہے کہ اس کے دست و بازو پوری طرح قوی ہوں جس سے وُہ ملّت کے دُشمنوں سے اس کا تحفظ اور شریعت

Marfat.com

کو نافذ کر سکے۔ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ مسلمان ایک مضبوط بلکہ ظالم حاکم کو شریف اور صُلح جُو طبیعت کے مالک حکمران پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کے معنی یہی نکلتے ہیں کہ مضبوط اور ظالم انسان، اسلامی نظام کی طرف سے عائد کردہ فرائض بہتر طریقے پر انجام دے سکتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بے شمار انسانی معاشرے انتہائی نازک حالات میں زندگی گزارتے تھے اور چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے رہتے تھے۔ (خود ہماری صورتِ حال آج اِن سے کسی طرح کم نازک نہیں) اور جب تک کوئی قوی محافظ نہ ہوتا وُہ نہ تو عبادتِ الٰہی پر توجہ مرکوز کر سکتے تھے، نہ زندگی کے دُوسرے اعمال کی بجا آوری ہی خاطر خواہ انداز میں کر سکتے تھے۔

آج بیسویں صدی کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وُہ ظالم حکمران کو برداشت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، جو اس وقت تک جائز ہے جب تک حکومت کوتاہ دست ہو اور وُہ لوگوں کی زندگیوں میں کم از کم مداخلت کرے مگر جب جدید تکنیک کی مدد سے سیاسی نظریات گلی گلی اور گھر گھر میں حکومت کا عمل دخل قائم کر دیتے ہیں تو یہ حکمران خطرے کی علامت بن جاتا ہے۔

پرہیزگار مسلمانوں نے ہمیشہ قوت اور اقتدار کو ایک ڈراؤنی شے سمجھا ہے، اس حد تک کہ وُہ اسے جہنم کا یکطرفہ ٹکٹ تصوّر کرتے ہیں۔ جب انہیں حکمران اور اس کے نظامِ حکومت کے تحت تحفظ اور عافیت فراہم ہو جاتی ہے تو وُہ خُدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وُہ نہیں، کوئی دُوسرا شخص یہ بوجھ اُٹھا رہا ہے اور تلوار کی دھار پر چل رہا ہے۔ اِن کے نزدیک اس شخص کے کردار میں کوئی بنیادی نقص ہوتا ہے جو دانستہ طور پر خود کو اقتدار میں مضمر خطرات کے حوالے کر دیتا ہے یا اس کا لالچ کرتا ہے۔

ایک بڑی نمایاں بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے بے شمار اُمور پر باتیں کی ہیں حتّٰی کہ وُہ روزمرّہ زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی تفصیل تک میں گئے ہیں مگر انہوں نے حکومت کے متعلق بہت ہی کم کہا اور سیاسی نظریات کی تشکیل میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا؛ تاہم اس ضمن میں ایک خاص حدیث ہے جس کا اس موضوع سے گہرا تعلق ہے۔ اُس زمانے

Marfat.com

ہیں جب مسلمانوں کی مملکت کی حدود میں نہایت تیزی سے توسیع ہو رہی تھی ایک صحابی حضورِ اقدسؐ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ انہیں حال ہی میں فتح کیے ہوئے علاقے کا گورنر بنا دیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا: "نہیں! اگر تمہارے دل میں حکومت کرنے کی خواہش ہے تو تم موزوں شخص نہیں ہو۔"[1] اگر کسی شخص کو زبردستی صاحبِ اقتدار بنا دیا جائے تو اُس کی بہت سی باتیں قابلِ معافی ہو سکتی ہیں لیکن اگر وُہ خود اپنی گردن کے گرد رسّی کا پھندا ڈال لے تو امکان ہے کہ وُہ اِس سے لٹک جائے گا۔ اگر آج ہم اپنے گردِ قائم دُنیا کے نظام ہائے حکومت کا جائزہ لیں تو ہم پر عیاں ہوگا کہ ماسویٰ ایک کے، ہر جگہ یہی نظام پایا جاتا ہے۔ حکمران خواہ جمہوری سیاست دان ہوں، جماعتی کارکن ہوں یا پھر فوجی آمر، وُہ سب اس لیے اقتدار پر قابض ہیں کہ انہیں خود اقتدار کی طلب اور جستجو تھی اور وُہ خود کو اس کا اہل سمجھتے تھے۔ اس میں صرف ایک استثنا جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ وہ ہے خاندانی بادشاہت۔ اس بات کے مضمرات ہمارے زمانے کے مسلمان دانش وروں کیلئے خواہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں خاصے معنی خیز ہیں۔

سُنّی اسلام نے ہمیشہ ہی سیاسی استحکام کو بہت اہمیت دی ہے؛ خواہ اس سے کسی فاسد اور بداطوار حکومت کو برداشت کرنا ہی لازم کیوں نہ آتا ہو، کیونکہ کسی حاکمِ مامور کے خلاف بغاوت سے اُمت میں فرقہ بندی پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے جب کہ اتحادِ اُمت ہی اولیّت کا درجہ رکھتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ مذہب پر پوری طرح کاربند ہونے کیلئے مثالی حکومت یا قابلِ ستائش نظم و نسق یا معاشرتی انصاف درکار نہیں بلکہ اس کے لیے محض مضبوط اور مستحکم ماحول کی ضرورت ہوتی ہے؛ یعنی ایک ایسا گھر جس کی دیواریں ٹھوس ہوں تاکہ اِس کے اندر رکھا ہُوا تمام ساز و سامان محفوظ رہے۔

---

[1] بخاری اور مسلم میں ایک روایت نقل ہوئی ہے جس میں آپ نے فرمایا: "حکمرانی طلب مت کرو کیونکہ اگر تمہاری طلب کے نتیجے میں تمہیں اقتدار دے دیا جائے تو پھر تم اسے استعمال کرنے کے لیے تنہا رہ جاؤ گے لیکن اگر تمہیں یہ تمہاری طلب کے بغیر دے دیا جائے تو اُس کے استعمال میں لوگ تمہاری مدد کریں گے۔"

Marfat.com

حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ پیغمبر خداؐ نے ایک موقع پر فرمایا: "اگر کوئی شخص اپنے حکمران میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھتا ہے تو اُسے صبر سے کام لینا چاہیے کیونکہ اگر کوئی شخص ملت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوگا تو وہ اس حالت میں مرے گا کہ اُسے جاہلیت کی موت کہا جائے گا"

کم از کم اسلام کے ابتدائی زمانے میں دو بالکل متضاد اسباب کی بنا پر بغاوت کو "جائز" قرار دیا گیا۔ شیعہ حضرات آلِ محمدؐ میں سے کسی ملکوتی صفات کے حکمران کی تقرری کے خواہش مند تھے (اِن کے نزدیک کوئی اور شخص اِس منصب کا اہل ہو ہی نہیں سکتا) جب کہ خارجی (اور ان کے سیاسی وارث) ایک ملکوتی معاشرے اور ایسے انتہائی صالح افراد کی آرزو رکھتے تھے جو کسی صورت بھی کسی دُنیا دار اور لادین حکومت کے آگے سرِتسلیم خم کرنے کو تیار نہ ہوں۔ یہ دونوں گروہ اپنے مخصوص نظریات کے تحت انقلاب کا جواز رکھتے تھے۔ شاید اِن کی اس روش ہی کے ردِّعمل میں سُنّی فقہاء اور علمائے دین نے حاکمِ وقت کی اطاعت پر اتنا زور دیا۔

اِن کے خیالات اٹھارھویں صدی کے برطانوی مورخ اور سیاسی مفکر ایڈمنڈ برک سے بہت حد تک مشابہ ہیں کیونکہ سُنّی فقہاء اور برک کے نزدیک بغاوت یا انقلاب کے ذریعے اجتماعی نظام کے تہہ و بالا ہو جانے کے اثرات و عواقب دوررس نتائج رکھتے ہیں اور وہ ان فوائد سے کہیں زیادہ تباہ کن ہوتے ہیں جو کسی بُری حکومت کی جگہ ایک نسبتاً بہتر حکومت کو برسرِ اقتدار لانے میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ یقیناً اِن کی یہ رائے انسانی معاملات اور صورتِ حالات کی ہوشمندانہ تشخیص پر مبنی ہے۔ اِن کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ ایسے انسان شاذ ہیں جو اپنی زندگی میں کسی بڑے یا چھوٹے فیصلہ کن موقعے پر اصل اصول کی میزان پر اخلاقی پہلوؤں کو تول سکیں۔ زیادہ تر لوگ صرف اپنی عادات، روایات اور معاشرتی تقاضوں کے دائرے میں سرگرمِ عمل ہوتے ہیں اور وہی کچھ کرتے ہیں جو اُنہیں آسان نظر آتا ہے اور جو فطری اور قدرتی معلوم ہوتا ہے۔

کسی بہترین مقصد کی خاطر ہی سہی، اس حصار کو تباہ و برباد کر دینے اور اجتماعی رشتوں

Marfat.com

کے نازک تانے بانے کو نوچ پھینکنے کے معنی یہ ہیں کہ رسم و رواج کی جڑیں کاٹ دی جائیں، روایات کو اوندھا کر دیا جائے اور عادات بگاڑ دی جائیں اور انسان کو مجبور کر دیا جائے کہ وُہ اپنی زندگی کے ہر دوراہے اور ہر موڑ پر اخلاقی اصولوں اور ضابطوں کو مدِّ نظر رکھے — اور ایسا وُہ کبھی نہیں کرے گا کیونکہ یہ بات واضح اور یقینی ہے کہ جوں ہی وُہ تمام رکاوٹیں اس کی راہ سے ہٹا دی جائیں گی تو کششِ ثقل کی مانند کوئی طاقت اُسے تیزی سے نیچے گرنے میں مدد دے گی اور ایسی حالت میں معاشرے کو صرف قوّت ہی کے بل پر درست حالت میں رکھا جا سکتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ ہر انقلاب کی جلو میں قدرتی طور پر استبداد بھی در آتا ہے، عین اسی طرح جیسے رات کے بعد دن آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی بددیانت اور بدطینت حکمران کی جگہ ایک با اصول اور نیک اطوار انسان لے یا ایک نااہل اور بُری حکومت کی جگہ ایک قابل، ماہر اور ذمّہ دار حکومت آ جائے لیکن اس عبوری عرصے میں افراتفری اور انتشار معاشرے کو بُری طرح چکنا چور کر کے رکھ دیتی ہے اور لوگ اپنا توازن کھو دیتے ہیں بلکہ اُن کا "قبلہ" ہی بدل جاتا ہے جس کے بعد پھر نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں زبردستی جمعیت بندی اِن پر مسلط کر دی جاتی ہے، اور ہر ایک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جانے لگتا ہے تاکہ معاشرتی فلاح و بہبود کے بڑے پُرشکوہ منصوبوں پر عمل درآمد شروع کیا جا سکے۔

تقریباً ایک ہزار برسوں کے دوران میں سیاسی سطح پر مسلسل بحرانوں اور کشاکش کے باوجود، اسلامی معاشرے کا استحکام ایک ایسے معاشرے کا استحکام ہے جو مِلّی اور انفرادی زندگی کے دائرے میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کے مخالف رہا ہے، اور اگر حالات سے مجبور ہو کر کوئی تھوڑا بہت ردّ و بدل کرنا بھی پڑا تو اُسے کم سے کم حد ہی پر رکھا۔ قرونِ وسطیٰ کے اسلام کے متعلق فان گرونے باؤم (Grunebaum) کہتے ہیں: "مسلمان ایسے وقار، اعتماد، ایقان اور توازن کا حامل ہوتا ہے جو صرف مثالی دنیا اور مثالی معاشرے کے پُرسکون تصور ہی سے پیدا ہو سکتا ہے جب کہ مغرب عصرِ حاضر کو مستقبل کے لیے قربان کر دینے کو ہر وقت تیار رہتا ہے.... ہم تغیّر کی زبردست اہمیّت کو اس لیے تسلیم کرتے ہیں کہ ہم عدم حرکت اور

Marfat.com

جمود سے ڈرتے ہیں۔ ۔ ۔ مسلمان کی دنیا سکون و اطمینان کی حامل ہے جس میں وہ خود بھی شکیب و قرار کی حالت میں رہتا ہے۔ خدا سے اس قرب اور الٰہیاتی نظام کو اس کا قبول کر لینا قرونِ وسطیٰ میں بھی درہم برہم نہ ہو سکا۔"[1] فان گرونے باؤم (Grunebaum) نے یہ باتیں چالیس سال پہلے لکھی تھیں۔ اب یہ بات خاصی مشکوک ہے کہ آیا واقعی مغرب اب بھی تبدیلی کو زبردست اہمیت دیتا ہے، مگر یہ حقیقت آج بھی موجود ہے کہ مسلم معاشرے کے طرزِ زندگی کا صدیوں تک کسی تبدیلی سے ہمکنار نہ ہونا ایک ایسے طرزِ معاشرت کی عکاس ہے جو کسی مغربی انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔ جو ایک صدی قبل کے انسانوں کی زندگی کو بھی یوں دیکھتا ہے جیسے وہ قدیم اٹرویا (Etruscans) کے باشندے ہوں! مسلمانوں کے لیے نویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کا وقت ساکت و صامت کھڑا رہا ہے جب کہ دنیا اپنی مرکز گریز راہ پر گامزن رہی۔ اس کا صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ پورے کا پورا معاشرہ (یا معاشروں کا ایک سلسلہ) شریعت پر کاربند رہا۔

لفظ شریعۃ کے لغوی معنی "راستہ" یا "طریق" کے ہیں؛ تاہم اس سے مشتق جو لفظ ہے اس کے معنی وہ پگڈنڈی یا ڈگر ہے جس پر چل کر جنگلی جانور کسی گھاٹ پر پانی پینے آتے ہیں اور یہی طریق اُس ساحل کی طرف لے جاتا ہے جہاں کبھی نہ ختم ہونے والا آبِ حیات رواں ہے۔

عیسائی حضرات کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ دینیات نہیں، فقہ، اسلام کی بنیادی سائنس ہے اور مسلمان "عالم" بنیادی طور پر فقیہ ہوتا ہے جو لوگوں کو یہ بتانے کی بجائے کہ انہیں کن باتوں پر اطمینان رکھنا چاہیے یہ بتاتا ہے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ مسلمان کے لیے یہ جاننا کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ اسے کن کن چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔ اُسے تو صرف اس بات سے غرض ہے کہ مختلف

---

1. Grunebaum G.V., Medieval Islam; University of Chicago Press; P. 346.

Marfat.com

حالات میں وہ فرمانِ الٰہی کی پیروی کس طرح کر سکتا ہے اور کس طرح لغزش کھائے بغیر اس راستے پر چل سکتا ہے جو سیدھا جنت کو لے جاتا ہے۔ لفظ "فقہہ" کے عام فہم معنی "اصولِ قانون" ہے۔ "فقہہ" کا مصدر "ف ق ہ" ہے جس کے معنی کم و بیش "وہ سمجھا" ہیں۔ پس اس بنا پر فقہہ کا تعلق دین کے ان اصول و فروغ سے ہے جو روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی مغربی انسان کے لیے علم فقہہ، ایک خشک اور غیر دلچسپ موضوع ہے (اس وقت تک کہ جب تک کسی معاملے میں پولیس سے سابقہ نہ پڑے) اور یہ بات قطعاً تعجب خیز نہیں کیونکہ (مغرب میں) دُنیوی قانون انسان کی بنائی ہوئی پیچیدگیوں کا ایک گورکھ دھندا سا ہے۔ اس لیے کسی مُشیرِ قانونی یا وکیل کا دفتر کسی عیسائی کے لیے روح کی نجات کی جگہ نہیں ہو سکتا۔

مگر کسی مسلمان کے لیے کتاب و سنّت کے احکام عملِ تقطیر سے گزر کر زندہ قانون بن جاتے ہیں۔ یا ایسے قوانین جن کے مطابق زندگی گزاری جا سکے۔ مسلمان کے لیے یہ عظیم کارنامہ ہے۔ اسلام نام ہے خود کو رضائے الٰہی کے تابع کر دینے کا اور معجزانہ انداز میں بصورتِ وحی نازل ہونے والی مرضئ الٰہی کا مطالعہ، انسان کے لیے جسے فہم و عقل ودیعت کی گئی ہے، سب سے اہم مطالعہ قرار پاتا ہے۔ اس کے علاوہ قانون کا تعلق معاشرت یا مل جل کر زندگی گزارنے سے بھی ہے۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں یہ (فقہہ) انسانی رشتوں اور تعلقات کا علم ہے۔ دینِ اسلام کی وحی عرب کی تاریخ میں اس وقت نازل ہوئی جب انسان اپنی سمت گم کر چکا تھا۔ مکّے، مدینے اور دُوسرے عرب شہروں میں حضارت یا تمدن کے ارتقاء کے سبب قبائلی نظام بکھر رہا تھا اور وُہ اخلاقی اُصول جو قبیلے کی اجتماعی وحدت کے طور پر زندہ رہنے کے ضامن ہوتے ہیں تحلیل ہو رہے تھے۔ اس موقع پر یہ سادا سا سوال اُٹھتا تھا کہ لوگ ایک وحدت کے طور پر کس طرح زندگی گزاریں گے؟ مسلمان کی نظر میں اس کا جواب خُدا نے خود قرآن اور رسولؐ کی سنّت میں پیش کر دیا ہے تاہم اس نے ان دونوں کی توضیح اور تشریح کا کام ایمان والوں پر چھوڑ دیا جنہوں نے نزولِ قرآن مجید کے بعد اگلی دو صدیوں تک خُدا اور اس کے رسولِ برحق کے فراہم کردہ بنیادی اصولوں سے

Marfat.com

ٹھوس، قابلِ فہم اور پائدار قانونی نظام تیار کرنے میں شب و روز محنت کی۔

پس معلوم ہوا کہ "شریعت" کو وحیٔ الٰہی سمجھنا صحیح نہیں۔ اس کی تشکیل و تدوین میں انسانی کوشش اور عقل بھی شامل ہے لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ یہ محنت اور فہم و بصیرت بھی عطیۂ خداوندی ہے۔ قرآن میں قانونی معاملات (اوامر و نواہی) نسبتاً زیادہ جگہ نہیں گھیرتے، اور اگر اس میں رسول کریمؐ کی سنّت و احادیث کا اضافہ نہ ہو تو یہ انسانی ضروریات کے لیے کافی نہیں۔ ان احادیث کے مستند یا غیر مستند، صحیح و ضعیف ہونے میں بھی انسانی فہم و بصیرت کو دخل ہے۔ اس پر قانون یعنی شریعتِ اسلامی کے اوّلین معمار محدثین یعنی علمائے حدیث قرار پاتے ہیں۔ وہ طریقہ جس سے کوئی حدیث "مستند" قرار پاتی ہے، مغربی عالموں کے طریقِ تحقیق علمی سے بالکل مختلف ہے لیکن اس سے کسی طرح گھٹیا نہیں۔ بہرحال اُس وقت کے حالات کے اعتبار سے یہی ایک عملی طریقہ ان لوگوں کو دستیاب تھا۔ اگر کوئی راوی ہمیں یہ بتائے کہ اس کے ایک دوست نے اسے بتایا کہ اُس کے چچا نے کہا کہ اس کے ایک چچیرے بھائی نے اُسے بتایا کہ اس کے دادا کو کسی دوست نے یہ اطلاع دی کہ اُس کے دادا نے کسی کو فلاں فلاں بات کہتے سُنا تو یہ فرض کرتے ہوئے کہ یہ کوئی بے حد اہم مسئلہ ہے، ہماری اوّلین توجہ اس امر پر مرکوز ہو گی کہ اس میں راویوں کا سلسلہ کہاں تک معتبر ہے کیونکہ ہر نوع مسلمانوں کے نزدیک اس نوزائیدہ اُمت کی ہدایت و تربیت کے لیے اہم ترین بات یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے کیا ارشاد کیا۔ دُوسری اور تیسری صدی ہجری کے علمائے دین کے نزدیک کسی حدیث کی صحت اور سند کا انحصار اس بات پر تھا کہ راویوں کے سلسلے کا ہر فرد کسی حد تک قابلِ اعتبار ہے۔ اگر اس سلسلے کی کوئی ایک کڑی کمزور ہو، یعنی کسی راوی کی اخلاقی حالت مشکوک ہو یا اس میں دروغ یا مبالغہ کا کوئی شائبہ ہو تو یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک ایسے گندھے ہوئے معاشرے میں جہاں ہر شخص دوسرے کے اشغال (اور نیک و بد) سے واقف تھا، تمام راویوں کے کردار کو پرکھنا جرح و تعدیل ناممکن نہ تھا اور اسی بنا پر علماء کی "متفق علیہ" رائے سے احادیث کو (مثلاً) صحیح، حسن، ضعیف، مرفوع وغیرہ میں تقسیم کر دیا گیا، اور اسناد کے لحاظ

Marfat.com

سے اُنہیں متواتر، مشہور، احاد یا غریب کہا گیا۔

جن لوگوں نے اس کارِ عظیم کا بیڑا اُٹھایا وُہ گویا کسی کان سے لعل و جواہر یا کسی دریا کی ریت سے سونا تلاش کر رہے تھے مگر وُہ ماہر لوگ تھے اور لعل و جواہر کھودنے یا سونا تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ پاک ضمیر تھے اور نقد و نظر کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔

نام نہاد مغربی "پروفیسروں" نے جن کی تعلیم و تربیت "تاریخی تنقید" کے اصولوں کے مطابق ہوئی ہے اور جسے وُہ انجیلِ مقدس کے مطالعے میں بھی استعمال کرتے ہیں، حدیث کے تمام سرمائے کو کلیتہً مشکوک قرار دینے میں بڑی کدوکاوش کی ہے۔ بہرحال اُن کے حربے اُنہی کو مبارک ہوں۔ آج پیغمبرِ اسلامؐ کی وفات کے چودہ سو سال کے بعد ایسے سوالات اُٹھانا بہت بعد از وقت ہے۔ ہم کسی سائنسی تیقن سے یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ کوئی حدیث بلا شک و شبہ صحیح ہے۔ ہمیں اس قسم کی یقین دہانی کا حق اس زندگی میں حاصل نہیں۔ اگر کسی خاص حدیث کو اہلِ تقویٰ صدیوں سے صحیح مانتے آئے ہیں اور اسے خُدا کی رضا کے مطابق تعمیر کردہ اسلام کی عمارت کی بنیادی اینٹ تصوّر کرتے ہیں تو پھر انسان کو حق حاصل نہیں کہ اس پر نکتہ چینی کرے۔ خُدا جس طرح چاہے حقائق میں ردّ و بدل کر سکتا ہے مگر وُہ اُنہیں ہماری روحانی فلاح کے لیے استعمال کرنا پسند کرتا ہے۔ جب سچ کہا جائے تو یہ سوال کہ کس نے کہا، ثانوی اہمیت رکھتا ہے۔ جب کہ آخر الامر بات یہاں ہی آکر ٹھہرتی ہے کہ کلمہ حق بولنے والی وُہ ذاتِ واحد ہی ہے۔ اگرچہ اُسے بیان کرنے کے لیے کئی ترجمان ہو سکتے ہیں ہمارے زمانے کے لوگ خود اپنے متعلق اتنا غیر یقینی رویّہ رکھتے ہیں کہ وہ ہر بات کی سند مانگتے ہیں۔ یہ رویّہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی تصویر پر رائے دینے سے قبل اس کے مصوّر کا نام جاننا ضروری سمجھتے ہیں۔ شکوک و شبہات کی یہ فضا اور صحتِ سند کی اس درجہ جستجو، مسلمانوں کی دُنیا اور خود ان کی ذہنیت کے لیے قطعی اجنبی اور غیر مانوس ہے۔

احادیث کی جرح و تعدیل کا اصول ایک طویل اور پیچیدہ عمل کا حصّہ ہے۔ ہر معاملے میں قرآن و سنّت سے قانونی استنباط نہیں ہو سکتا، اور نہ مدینے کی سادہ زندگی کی رعایت

Marfat.com

سے بنائے گئے قوانین کسی عظیم سلطنت کے آباد شہروں کی زندگی میں انضباط اور نظم پیدا کرنے کے لیے کام آسکتے ہیں۔ اس لیے وُہ ذرائع تلاش کرنا ضروری تھے جن کے تحت قوانین کا ایک جامع مجموعہ تیار کیا جا سکے جو اپنے مقدّس اور بے داغ مصادر سے ناتا توڑے بغیر ہر ممکنہ صورت حال کا احاطہ کر سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تین طریقے وضع کیے گئے:

۱۔ اجماع

۲۔ قیاس

۳۔ اجتہاد

نبی کریم ؐ نے ایک موقعے پر فرمایا تھا: "میری اُمّت کبھی کسی غلط بات پر اتفاق نہیں کر سکتی"۔ یہ قول مبارک اِس بات کی ضمانت تھا کہ جس مسئلہ پر پوری امّت کا اجماع ہو گا وُہ درست ہی ہو گا؛ تاہم یہ بات یقیناً معقول نہیں کہ کسی چمڑولے یا اہل حرفہ کی رائے کو، جنہیں قرآن یا حدیث کی تعلیم و تربیت میسّر نہیں ہوئی ہے، علمائے دین کی صائب رائے کے ہم پلّہ سمجھ لیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ علماء پوری ملّت کے رُکن تھے۔ اس لیے عامۃ النّاس کی اجتماعی آراء سے کلیتاً صرف نظر کر لینا بھی ممکن نہ تھا۔ بہت سے مواقع پر ایسی صورتِ حال بھی درپیش ہوئی جہاں علماء کی رائے کو نظر انداز کیا گیا اگرچہ ایسا چند معمولی مسائل کے ہی سلسلے میں ہوا۔ مثلاً جب عرب میں پہلی بار کافی متعارف ہوئی تو علمائے کرام نے اس مشروب کو ممنوع قرار دیا مگر لوگوں کی اکثریت نے اِس سے اتّفاق نہیں کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ عامتہ النّاس ہی کی رائے قبول کی گئی۔ بہرحال اسلامی نظام کا استحکام، سختی اور لچک، دونوں کے درمیان نازک توازن ہی پر منحصر ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اجماع، نصوص (قرآن و سنّت) کی جگہ نہیں لے سکتا تھا؛ تاہم علماء نے نصوص کی بنیاد پر جو نتائج اور مفہوم، قیاس یا اجتہاد کے ذریعے حاصل کیے اجماع نے اِن کو مباح قرار دینے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اجماع بہرحال محض آراء کی اکثریت کے شمار کا نام نہیں تھا۔ اس پر اس حد تک اتفاق رائے ہونا چاہیے کہ افراد کی گنتی کی ضرورت ہی

Marfat.com

پیش نہ آئے۔ کینتھ کریگ (Kenneth Cragg) کہتے ہیں: "خدا اور رسول کے بعد اُمّت ہی آتی ہے۔ اسے ایک طرح کا دارالاستفتا اور عدالتِ مرافعہ ہی سمجھنا چاہیئے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ حقیقی طور پر اسلامی کیا ہے اور کیا نہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ یہ عرفِ عام میں جمہوریت نہیں۔ اس میں کسی مسئلے پر ہم خیالی مقصود ہوتی ہے یا کسی موجود صورتِ حال یا رائے کو قانونی حیثیت دینا مطلوب ہوتا ہے، بالخصوص ایسے مسائل و معاملات میں جہاں پہلے سے کوئی ہدایت یا حکم موجود نہ ہوئے[1] ممکن ہے، جن نکات پر اجماع ہوا ہو، وُہ مختلف علماء کے ذاتی اجتہاد کا ثمرہ ہو اور جیسا کہ کریگ نے کہا ہے کہ مجتہد وُہ ہے جو شرعی دینی فہم رکھتا ہو، صرف و نحو کی تربیت کے بعد کسی معاملے میں فقہی رائے دینے کا اہل ہو، اور پھر شبانہ روز محنت کے بعد ایسے نتائج اخذ کر سکے جو اجماعِ اُمّت کا درجہ حاصل کر لیں۔ یہاں یہ کہنا تحصیل حاصل ہو کہ ان نتائج کو کسی حالت میں بھی نصوص کے منافی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ طریق کار اس لیے وضع کیا گیا کہ کہیں اُمّت بدعات کا شکار نہ ہو جائے۔

ایک مقبول رائے کے مطابق، کچھ عرصہ پہلے تک، سُنّی اسلام کے نزدیک "اجتہاد کا دروازہ" گیارھویں یا بارھویں صدی عیسوی میں بند کر دیا گیا تھا۔ (شیعہ حضرات اس خیال سے متفق نہیں) اس کی دو وجوہ تھیں۔ اولاً یہ کہ ہر ممکنہ صورتِ حال کا احاطہ کر لیا گیا تھا اور شریعت ہر طرح سے مکمل ہو گئی تھی اور اس میں کہیں بھی ابہام باقی نہیں۔ دوم یہ کہ ان قرون میں علماء اور فقہا پر مسلسل یہ دباؤ ڈالا جاتا رہا کہ وُہ اپنے فیصلے حکمران، خلیفہ، سلطان یا امیر کی خواہشات کے مطابق دیں۔ بعض صورتوں میں انہیں یہ بتانے میں کہ وُہ اِس کا اختیار نہیں رکھتے، اپنی جانوں کو بھی داؤ پر لگانا پڑتا تھا اور وُہ نہایت ادب سے گزارش کرتے تھے: "سلطانِ معظم! میں جانتا ہوں کہ تمام حکمرانوں میں سب سے زیادہ زیرک ہیں اور ساری مخلوق سے زیادہ نیکو کار بھی۔ مجھے آپ کے حق میں فیصلہ دینے سے زیادہ کسی بات سے خوشی نہ ہوتی مگر حیف کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔"

---

1. Kenneth Cragg, The Call of the Minaret, Oxford University Press, 1956

Marfat.com

گزشتہ دو صدیوں کے دوران میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ اصولاً نہیں تو عملاً ضرور کھول دیا گیا ہے۔ یہ اس وقت بند کر دیا گیا تھا جب کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ انسانی زندگی کے حالات اور ماحول اتنے بدل جائیں گے اور مسلم معاشرے میں اتنی تبدیلیاں رونما ہو جائیں گی۔ اب چونکہ ناممکن، ممکن ہو گیا ہے اس لیے یہ سوال بھی دوبارہ اُٹھایا جا رہا ہے کہ آیا اہلِ سنّت والجماعت کے چاروں "مذاہب" جو سُنّی مسلمانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں؟ کیا اُن میں کوئی ردّ و بدل ممکن ہی نہیں؟

یہ چاروں "مذاہب" آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں اُبھرے۔ ان کے نام ان کے بانیوں، امام ابو حنیفہؒ (متوفی ۷۶۷ء) امام مالک ابن انسؒ (متوفی ۷۹۵ء) ابن ادریس الشافعیؒ (متوفی ۸۱۹ء) اور امام احمد ابنِ حنبلؒ (متوفی ۸۵۵ء) کے نام پر مشہور ہوئے۔ ان لوگوں کو کلام اللہ کا نحوی یا قواعد داں کہا جاتا ہے لیکن یہ ایسے صرفی و نحوی نہیں تھے جن کی زندگی صرف کتب خانے کی زینت ہو۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی موت جیل خانے میں واقع ہوئی۔ اُنہیں اس "جرم" کی پاداش میں اسیر کیا کہ انہوں نے قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ کو اس جرم میں زندانی بنایا گیا تھا کہ اُنہوں نے نظریۂ خلقِ قرآن" کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ امام مالکؒ کے شانوں کی ہڈیاں خلیفہ کے محافظ دستے نے توڑیں تو گویا معاملہ یہ تھا کہ یہ لوگ ریاست کے دست و بازو بننے کی بجائے حکمران کے آگے ملت کی ڈھال بن گئے تھے۔ صدیوں تک بلند پایہ علماء کا یہی شیوہ رہا کہ انہوں نے نہایت اٹل اور بے لچک انداز میں شریعت کی آزادی اور وقار کو بلند رکھا اور یہ واضح کر دیا کہ شریعت کے آگے شاہی احکامات اور خواہشات کو فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

ان چار فقہاء سے قانون کے چار چشمے موجزن ہوئے جن کا پانی ایک ہی تھا۔ بعض اوقات ان چاروں "مذاہب" کے اختلافات کو دیکھتے ہوئے انہیں غلط طور پر فرقوں سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ ان میں فرق خفیف ہی سا ہے اور یہ بات اس حقیقت سے

Marfat.com

بھی واضح ہو جاتی ہے کہ امام شافعیؒ، امام مالکؒ کے شاگرد تھے اور امام احمدؒ ابنِ حنبل امام شافعیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان فقہا میں فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے بعض "واجبات" کے معاملے میں دُوسروں سے زیادہ سخت ہیں۔ حنبلی "اہلِ ظاہر" (لفظی معنوں پر زور دینے والے) ہیں اور "رائے" یا قرآن کے مجازی معنوں سے گریز کرتے ہیں۔ ان میں ایسے ترکِ فعل و قول پر جن سے نماز ساقط ہو جاتی ہے، اور وضو کے مسائل کے بارے میں اختلافات ہیں۔ ان جزوی اختلافات پر جب تنگ نظر لوگ مبالغہ آمیزی کا رنگ چڑھاتے ہیں تو سُنّی شریعت کی وحدت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

اِس دَور میں ان چاروں مذاہب کے درمیان امتیاز روا رکھنے کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہُوا ہے، بلکہ قرونِ وسطیٰ میں شریعت کی تدوین پر بھی حرف گیری کی گئی ہے اور جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے یہاں دو انتہائی نظریات مل جاتے ہیں۔ ایک طرف تو جدّت پسند عناصر شریعت کے جملہ مکاتبِ فکر کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ گھسے پٹے اور دقیانوسی ہیں تو دُوسری طرف وُہ لوگ ہیں جنہیں سہولت کی خاطر بنیاد پرستوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ سلف صالحین کی خالص اور پاک روش کو اختیار کرنے کی تڑپ میں صرف قرآن اور سنّت کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں اور دیگر تمام تعبیرات کو مسترد کر دینا چاہتے ہیں۔ یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ یہ بھول بیٹھے ہوں کہ کوئی بھی تعبیر کسی حقیقی ضرورت ہی کے جواب میں پیش کی جاتی ہے اور وُہ اِس بات کا اعتراف کرنے کو بھی تیار نہیں کہ جن لوگوں کے کام کو وُہ اتنی آسانی سے رد کر رہے ہیں وُہ شاید اُن سے زیادہ دانا اور بہتر تھے۔

بہرطور اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ قانونی اور فقہی ذہن اکثر افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے اور بڑی باریک بینی سے ہر معاملے کو دیکھتا ہے اور سیدھے سادے مسئلے کو بھی پیچ دار اور ژولیدہ بنا ڈالتا ہے۔ وُہ اکثر بڑی عرق ریزی سے اِن سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں جو سرے سے پوچھے ہی نہ گئے ہوں۔ اور اس روش پر قرآن مبین کی تنبیہ یوں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (مائدہ ۵: ۱۰۱)

Marfat.com

مومنو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ اگر ان کی حقیقتیں تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بُری لگیں۔

اور اسی روش کے لیے پیغمبر خدا نے فرمایا تھا:

"مجھ سے اُن معاملات کے متعلق نہ پوچھا کرو جنہیں میں نے بنا کچھ کہے چھوڑ دیا ہے۔ یقیناً تم سے پہلے کچھ لوگ ہو گزرے ہیں جو اپنے انجام کو صرف اس لیے پہنچ گئے تھے کہ وہ اپنے رسولوں سے بہت زیادہ سوالات پوچھتے تھے اور پھر اختلافات کا شکار ہو جاتے تھے۔" اور حقیقتاً اس کا امکان ہے کہ بہت زیادہ سوالات ان لوگوں کی طرف سے پوچھے گئے ہوں جو اگر اپنے ضمیر اور سوجھ بوجھ پر بھروسہ کرتے تو کہیں بہتر رہتے؛ لیکن وہ مسلمان جس کا ایمان پختہ ہے اور اپنے اس یقین پر سنجیدہ ہے وہ کسی کش مکش اور اُلجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی راہ چلتا ہے اور دوسروں کو ان کے راستے پر چلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اُسے یقین ہوتا ہے کہ بہت جلد تمام سوالات حل اور تمام اختلافات دُور ہو جائیں گے۔

مغرب کے لوگ شریعت کو ایک دائرہ عمل سمجھنے کی بجائے "زرہ بکتر" سمجھتے ہیں جس میں اعضاء کی حرکت بھی ممکن نہ ہو۔ وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتا کہ جامۂ شریعت میں آزادانہ حرکت و عمل اور انفرادی اختلافات کی گنجائش بھی موجود ہوتی ہے۔ وہ تو اس بات کے نفسیاتی مضرات کو بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ طبیعی وجود کو خلا میں رکھا جائے تو پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ سید حسین نصر کہتے ہیں: "شریعت انسان کے سامنے اس کی مخصوص طبائع اور عالمگیر حصار کے اندر ضروریات کی رعایت سے بہت سے راستے تجویز کرتی ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی ذکاوت پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ضروریات اور شریعت کے بتائے ہوئے خداوندی اصولوں کے مطابق مناسب رستے کا انتخاب کرے۔ ذکاوت اور ذہانت اس کا نام نہیں کہ انسان حقیقت سے بغاوت کر دے۔ یہ کام تو مشکل نہیں پتھر بھی تو اپنی فطرت کے مطابق ہی گرتے ہیں! حقیقی ذہانت اور جوہر تخلیق کا معیار یہ ہے کہ وہ حقیقت سے مطابقت پیدا کرے اور اُس کے اُصولوں کو اُن حالات پر استعمال میں لائے جو تقدیر نے انسان کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ اپنے تمام میلانات اور سرگرمیوں

Marfat.com

کو خدا کے مقرر کردہ اصولوں کے تابع کر دینے میں انسان کی اُس ذکاوت اور جدّت کا امتحان ہے جو اس کے حدِ امکان میں ہے۔"[1]

ہم انفرادی طور پر علائق زندگی میں گلے گلے دھنسے ہوئے ہیں جو فی نفسہٖ ہر منظر کو دھندلا دیتے ہیں۔ اگر ہمیں دیوانگی کا شکار ہونے یا جوشِ مستی میں اس طرح دندناتے پھرنے سے خود کو بچانا جیسے کہ ہمارے علاوہ گویا کوئی وجود رکھتا ہی نہیں تو ہمیں معروضی اقدار کو اپنانا ہوگا۔ اسلام کا غیر متبدّل قانون معروضیت کا معیار و میزان فراہم کرتا ہے اور یہی بات ہمیں عین منجدھار سے نکال لیتی ہے۔ اگر ہم اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کریں تو پھر اس کے لیے تعزیرات ہیں جو ہمیں یہ یاد دلاتی ہیں کہ 'قانون' ایک معروضی حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسی مستحکم چٹان ہے جو وقت کے سیلِ تند کے سامنے ڈٹ کر کھڑی رہتی ہے اور ذاتی خواہشات کی حرارت سے پگھلتی نہیں۔

اسلام میں جو سخت تعزیرات مقرر کی گئی ہیں (اگرچہ یہ اُن سزاؤں سے کہیں کم ہیں جو مقابلتاً کچھ ہی عرصہ قبل یورپ میں مروج تھیں) دراصل اُن اٹل اصولوں کی نمائندہ ہیں جو ہماری ذاتی سہولتوں کے لیے ہرگز تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اہمیت اس بات کی نہیں کہ موقع محل کے مناسب سزائیں دی جائیں بلکہ اہمیت اس اصول کو حاصل ہے جو برقرار رہنا چاہیے۔ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اُمتیوں سے کہا تھا: "تعزیرات کو شک سے ٹالو اور ہر وہ حکمت عملی، جو قانون کو بے اثر کیے بغیر، تعزیر کو ٹال دے، مباح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کے دور کا ایک قانون دان محض اس لیے دولت اور شہرت کے بامِ عروج تک پہنچ گیا تھا کہ اُس کے عالمانہ دلائل نے خلیفہ کو خود اپنے ہی بیٹے کو زنا کی سزا دینے سے بچا لیا تھا۔ کوئی مغربی شخص تو یہی کہے گا کہ اس چالاک قانون دان نے دولت کمانے کی خاطر اپنے آقا کی پسند کے مطابق قانون کو توڑ مروڑ ڈالا تھا جب کہ مسلمان اس بات پر اطمینان کا اظہار کرے گا کہ اس ماہرِ قانون نے قانون کی عظمت و بالادستی کو گزند پہنچائے بغیر رحم و کرم کا ایک

---

1. Syed Hossein Nasr, Ideals & Realities of Islam, London, Allen & Unwin Ltd., 1966, p.98

Marfat.com

تلاش کر لیا۔

زنا پر سخت سزا ایک ایسے معاشرے کے خلاف ایک مکروہ جُرم کی سنگینی کو ظاہر کرتی ہے جس کی بنیاد خاندانی دیانت وعصمت اور رشتوں کے تانوں بانوں پر ہو۔ سزا کی موجودگی ایک اہم نکتے کا ثبوت ہے لیکن اس پر عمل درآمد تقریباً ناممکن ہے۔ (ماسوئی اس حالت میں جرم کے ارتکاب کا اعتراف رضا کارانہ انداز میں کر لیا گیا ہو) کیونکہ اس کے لیے چار انتہائی دیانت دار گواہوں کی شہادت ان شرائط کے ساتھ ضروری ہے کہ اس فعل شنیع کے ارتکاب کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور وُہ اِس بات سے واقف ہوں کہ جرم ثابت نہ ہونے کی صورت میں وہ کوڑوں کی سزا کے مستوجب ہوں گے۔ کوڑوں کی سزا متعدد جرائم کے لیے مقرر کی گئی ہے؛ تاہم قانون اِس آلے کی وضاحت نہیں کرتا جس سے یہ سزا دی جائے گی۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں کوڑے کے لیے ایک معمولی چپلی یا ایک لباس کے سرے والا حصہ استعمال کیا جاتا تھا اور اسے تکنیکی نوعیت سے کوڑے مارنا ہی سمجھا جاتا تھا؛ گو یا یوں سمجھئے کہ سزا پر عمل درآمد بھی ہو جاتا تھا اور قانون کی بالادستی بھی برقرار رہتی تھی۔ کسی چور کا ہاتھ کاٹا جا سکتا تھا بشرطیکہ اس نے چوری کسی حقیقی ضرورت یا اپنے خاندان کی بھوک بجھانے کے لیے نہ کی ہو یا پھر اِس نے سرکاری املاک کی چوری کی ہو[۱]۔

"دروغ حلفی" کسی دیوانی مقدمے میں بھی بڑا سنگین جرم تصوّر ہوتا ہے کیونکہ یہ اپنی ذات میں خود قانون کے خلاف ایک جرم ہے۔ کسی چھوٹے مقدمے میں کامیابی کے لیئے وکیلانہ حربے استعمال کرنے کی بھی مذمت کی جاتی ہے۔ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ایک موقع پر فرمایا

---

[۱] عصرِ حاضر میں املاک کو "قومیانے" کے حامیوں کے برخلاف، زمانہ قدیم کے فقہائے اسلام سرکاری املاک کو نجی املاک سے الگ، بڑی درست منطق کے تحت سرکاری ملک ہی سمجھتے تھے جس میں ہر شہری جزوی طور پر حصّہ دار ہوتا ہے، اور کوئی انسان اپنی ہی املاک کی چوری نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

تھا: "تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ اپنا معاملہ دُوسروں کی نسبت بہتر طریق پر پیش کر سکتے ہوں۔ مجھے فیصلہ ان شہادتوں پر کرنا ہوتا ہے جو میرے سامنے ہوتی ہیں۔ اگر میں نے کسی شخص کا حق مار کر اس کے بھائی کو دے دیا تو وُہ اُسے نہ لے کیونکہ میں نے اُسے جہنم کا ایک ٹکڑا دے دیا۔"

کسی جج کا منصب کسی حکمران کی طرح ناقابل رشک ہے۔ وقائع نویسوں نے عہدِ عباسی کے ایک متقی شخص کا ذکر لکھا ہے جس نے خلیفہ کے دربار میں دورانہ وار پہنچ کر اس کے مُنہ پر اس کے ظلم وستم کی مذمت کی تھی (پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے: "سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنا افضل ترین جہاد ہے۔") اس سے قبل کہ خلیفہ اس کے معاملے میں کوئی سخت سزا تجویز کر سکے، یہ شخص وہاں سے غائب ہو گیا۔ اِس کی "سزا" یہ تھی کہ اسے قاضی مقرر کر دیا جائے اور یہ فرمان جاری کر دیا جائے کہ کوئی عدالت مرافعہ اس کے فیصلے کو رد کرنے کی مجاز نہ ہو گی۔ سپاہیوں کو اُسے پکڑ کر لانے کے لیے دوڑایا گیا مگر وُہ ملا نہیں۔

اسلام میں شرعی قوانین کی سختی کو رحم وکرم سے نرم کیا جاتا رہا ہے مگر اس حد تک بھی نہیں کہ وُہ بنیادی اصولوں ہی کو تباہ کر کے رکھ دے۔ ایک مرتبہ ایک شخص پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں ایک گناہ کا اعتراف کرنے اور اس کے لیے جو بھی سزا ہو، قبول کرنے حاضر ہوا (کیونکہ ایک حدیث کے مطابق اِس دُنیا کی شرمساری، اُس دنیا کی خجالت سے بہتر ہے) تو اُس سے پوچھا گیا کہ وُہ ایک غلام آزاد کر سکتا ہے؟ اِس نے جواب دیا وُہ یہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس سے پوچھا گیا کہ کیا وُہ دو ماہ تک روزے رکھ سکتا ہے؟ اس نے بتایا کہ وُہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ آخر اس سے سوال کیا گیا کہ کیا وُہ غرباء کو کھانا کھلا سکتا ہے؟ اس نے جواب میں کہا وُہ یہ کرنے سے بھی معذور ہے۔ اس پر پیغمبر اسلامؐ نے اِس سے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا تاکہ وُہ اِس معاملے پر غور کر سکیں۔ اِس اثناء میں کوئی شخص آپؐ کے لیے ایک ٹوکری کھجور بطورِ تحفہ لے آیا۔ حضورؐ نے وُہ ٹوکری اِس شخص کو دے دی اور کہا کہ وُہ اسے ضرورت مندوں میں صدقہ کر دے۔ اس پر اس شخص نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں اپنے سے زیادہ کسی غریب شخص کو یہ دے دُوں؟ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میرے خاندان سے زیادہ

Marfat.com

غریب کوئی خاندان مدینے کی دونوں آتش فشاں گھاٹیوں کے درمیان نہیں۔" اس پر حضور پیغمبر اسلامؐ اتنا ہنسے کہ آپؐ کے دانت نظر آنے لگے، پھر آپؐ نے فرمایا: "اچھا تو پھر تم انہیں اپنے ہی خاندان کو کھانے کے لیے دے دو۔"

وہ اُمّت جو شریعت کی پناہ میں ہو اور اس کے تابع ہو ہدایت یافتہ اُمّت ہے اور ایسی اُمت کا رکن ہونا مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے اور ایسی اُمّت کو چھوڑنا ایمان ترک کرنے کے برابر ہے۔ منٹگمری واٹ (Montgomery Watt) کہتے ہیں: "انسانیت کو ایک ایسے مذہبی معاشرے کی ضرورت ہے جس پر اللہ کی رحمت سایہ فگن ہو اور اسلام نے دوسرے تمام بڑے مذاہب سے کہیں زیادہ ایسی اُمّت کی تشکیل کی جس کی مثالی زندگی کشف و القاء پر مبنی ہو۔"[1]

اسلام میں مرکزی حیثیت دین کو ہے۔ اس لیے ملّت کا اتحاد و یکجہتی بنیادی طور پر ایمان کی وجہ سے ہے۔ یہ اتحاد اور ہم آہنگی کسی حکومت یا کسی قیادت کی مرہونِ منّت نہیں۔ انفرادی طور پر ہر مسلمان اس کا ذمہ دار ہے کہ اپنے دینی بھائی بہنوں کی غربت اور افلاس میں مدد کرے، انہیں پریشانیوں اور تکالیف سے نجات دلائے، اور جب وہ راہِ حق سے بھٹک جائیں تو انہیں راہ راست پر لائے (اور اس میں بھی نرمی اور مہربانی برتے) اصولاً ملّت کے ہر فرد پر خواہ وہ کتنا بھی شکستہ حال ہو، یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اگر وہ کوئی غلط بات یا کجروی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھوں سے درست کرے یا پھر زبان سے اور اگر وہ اس کی قدرت بھی نہیں رکھتا تو پھر اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے۔ اس کی ذمہ داری اس حد تک نہیں ہوتی کہ وہ پولیس کو بلائے یا معاملے کی اطلاع حکامِ بالا تک پہنچائے کیونکہ بحیثیت مسلم وہ خود قانون ہے اس لیے اپنی ذمہ داریاں کسی لاتعلق ریاست کو سونپ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ بہت سے مصنفین نے جن میں فریتھ جوف شوآن بھی شامل ہیں، خیال ظاہر

---

1. W. Montgomery Watt, Islam and the Integration of Society, p. 234

Marfat.com

کیا ہے کہ مغرب میں اِس قسم کے مسلم معاشرے کے قریب ترمیحی رہبانی فرقہ ہے۔ اس تقابل پر یہ بات کسی صورت بھی اثر انداز نہیں ہوتی کہ یہاں (اسلام میں) "راہب" شادی بھی کرتے ہیں اور بچے بھی پیدا کرتے ہیں! یہ لوگ ایک "ماورائی صداقت" وحی الٰہی اور ایسے ضابطہ ہائے قانون پر مشترکہ ایمان رکھتے ہیں جو دین کا جزو ہیں۔ ان تمام امور کی اساس معاشرتی نہیں دینی ہے، جیسے دن بھر میں شرعی عبادات یا نمازیں ادا کرنے اور سال میں خاص خاص دینی تہوار منانے سے ظاہر ہے۔ یہ ایسے عام شعائرِ دینی ہیں جن سے ملّت کے تمام اراکین باہم مربوط اور متحد ہیں اور یہ صاف عیاں ہے کہ یہ اتحاد شہری فرائض کا حصّہ نہیں بلکہ دینی احکامات کی وجہ سے ہے۔ اس معاشرے میں بے دین اور ملحد افراد اور اجنبی سیاسی نظریات رکھنے والوں، جیسے مارکسزم وغیرہ کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ بہرحال ان نظریات کے لیے شاید کسی ریگستان میں جگہ ہو جہاں یہ اپنا گھروندہ اس وقت تک بنا کر رہ سکتے ہیں جب تک جہنم کی آگ میں نہ ڈال دیے جائیں کیونکہ اسلام اپنے گھر میں تخریب کاری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے ہاں عیسائیوں، یہودیوں اور ان تمام لوگوں کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جہاں یہ لوگ سکون سے بیٹھ کر اپنے عقائد کے مطابق دینی شعائر ادا کر سکتے ہیں۔

فرانسوا بون ژان (Francois Bonjean) نے اسلام کے بلادِ مقدسہ اور (عیسائی) رہبانی گروہوں کا تقابل عجیب وغریب مگر واضح انداز میں کیا ہے۔ وُہ لکھتے ہیں: "عام اہلِ حُرفہ، انتظامی عہدیدار اور تاجر بھی ہمارے پادریوں سے بہتر تمیز و آداب کے مالک ہیں، اور عام انسانوں کی بجائے مذہبی رہنما نظر آتے ہیں"۔ فرتھ جوف شواَن کہتے ہیں کہ اگر رہبانیت کی تعریف "خدا کی خاطر تیاگ و ترکِ دُنیا" کی جائے اور اگر اسکے عالمگیر بین الادیان کردار کو اس بنا پر تسلیم کر لیا جائے کہ مافوق الفطرت کو پانے کی خواہش ہر نارمل آدمی میں ہوتی ہے تو اس تعریف کا انطباق اِن روحانی لوگوں پر کیونکر ہو سکتا ہے جو مسلمان ہیں اور بنا بریں معاشرے سے اپنا تعلق نہیں توڑتے؟ ... اس کا جواب یقیناً یہی ہونا چاہیے کہ اسلام کی ایک علتِ غائی کسی رہبانی معاشرے کی تخلیق ہے (اگر اِس اصطلاح کے استعمال میں

Marfat.com

کوئی حرج نہ سمجھا جائے) بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اسلام کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ مراقبہ اور استغراق کو زندگی کے معمولات کا حصّہ ہونا چاہیئے۔ زندگی کے اِس حصار کے اندر اسلام، مزاج اور طریقِ عمل کے ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو ہنگامۂ دُنیا کے درمیان بھی مراقبے کے لیے تنہائی مہیّا کرتے ہیں (یعنی انجمن میں خلوت) درحقیقت یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، اِس کے معنی درحقیقت یہ نہیں کہ اہلِ مراقبہ دُنیا سے کنارہ نہ کریں بلکہ اس کے برعکس یہ ہے کہ دُنیا، اہلِ مراقبہ سے ہٹا نہ لی جائے۔[1]

یہ ہے معاملے کا لُبِ لُباب۔ ایک بات جو عیسائی اور مغربی افراد بالعموم سمجھنے سے قاصر ہیں، وُہ ہے "جہاد" (یا جدوجہد) — کہ دُنیاوی زندگی کا کوئی عنصر پھسل نہ جائے اور اپنا الگ وجود قائم نہ کرے یا کسی مرکز گریز طاقت کے زور سے باہر نکل کر اُس خلا میں جانشین نہ ہو جائے جسے ہم لادین یا نجس اقلیم کہتے ہیں۔ وہ مسلمان جو مسجد میں چُپ چاپ قبلہ رُو بیٹھ کر اپنے رب سے مناجات میں مصروف ہوتا ہے، دُنیا کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دے رہا۔ وُہ صاحبِ مراقبہ ہی نہیں، مجاہد بھی ہے اور دُنیا اس کی "جنگی قیدی" ہے۔ وُہ اسے کنکھیوں سے دیکھتا رہتا کہ کہیں وُہ اس سے بچ نہ نکلے۔

اِس بارے میں سیّد حسین نصر لکھتے ہیں: "اسلام کا اصولِ وحدت مراقبے کے طریق کو اُس ضابطے سے باہر ہو کر علیحدہ ادارہ نہیں بننے دیتا جو شریعت نے تشکیل دیا ہے۔ اسے شریعت ہی کا ایک داخلی رُخ بن کر رہنا ہوگا اور ادارے کے اعتبار سے ایک ایسی تنظیم بننا ہوگا جو اسلامی معاشرتی نظام میں شامل ہے اور اس کا جزوِ لاینفک ہے۔"[2]

اس "خُداشناس" معاشرے میں ضم ہو کر ہر مرد و زن خواہ وُہ طبعاً متّقی یا پرہیزگار نہ ہو، اُس راستے پر گامزن ہو جاتا ہے جو نجات کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی روزمرّہ کی زندگیاں

---

1. F. Schuon, Light on the Ancient World, London Perennial Books, 1965
2. Syed Hossein Nasr, Islam & the Plight of Modern Man, London, Longman, 1975

Marfat.com

ایک ماورائی اور ملکوتی پس منظر سے روشن ہو جاتی ہیں ورنہ وُہ اِس کی فہم تو کجا اس کی حالت کیفیت کو محسوس تک نہیں کر سکتے۔ بعینہٖ جیسے ننھی مچھلیاں سمندر کی بیکرانیوں میں تنہا تیریں تو فنا ہو جائیں مگر اپنے غول سے مل کر وُہ صحیح سمت اختیار کرتی ہیں۔

اِس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ اس ملّت کے افراد نے اس پاکیزہ زندگی کو اپنی مرضی سے اختیار نہیں کیا بلکہ وُہ اِس میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے اِن سے بہت بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لینا اِس حقیقت پسندی سے بعید ہو گا جو اسلامی پس منظر کا لازمہ ہے۔ مسلمانوں کے "اجماع" نے خارجیوں کے اِس نظریے کو مسترد کر دیا تھا کہ "فاسق" چونکہ معاشرے کو خطرے میں ڈال دیتا ہے' اس لیے اُسے یا تو قتل کر دینا چاہیے یا اُسے پھر اسلامی برادری سے خارج کر دینا چاہیے۔ انہیں یہ نظریہ کسی حد تک قبائلی سماج سے ورثے میں ملا ہے، کیونکہ صحرائے عرب میں کسی عرب قبیلے کا وجود اِن ضابطوں کی بھرپور پابندی کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا تھا جو اس تُند خو ماحول نے مقرر کیے تھے۔ یہ راستہ (خارجی انتہا پسندی) پیغمبرِ اسلامؐ کا راستہ نہ تھا۔ آپؐ نے کئی مواقع پر فرمایا کہ میں اس لیے نہیں بھیجا گیا ہوں کہ تمہارے لیے تمہارا مذہب مشکل بنا دُوں۔ آپؐ نے اپنے اُمتیوں سے ایسی نیک سیرتی کا مطالبہ نہیں کیا تھا جو اُن کے اختیار سے باہر ہو بلکہ یہ چاہا تھا کہ وُہ اپنے مقدور بھر کوشش کرتے رہیں خواہ وُہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ آپؐ کو چھوٹے چھوٹے معاملات میں غیر ضروری تردّد اور تشویش پسند نہ تھی کیونکہ آپؐ ترجیحات کے بارے میں قطعی شعور رکھتے تھے۔ یہ بات ایک چھوٹی سی مثال سے سمجھی جا سکتی ہے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر کسی بدّو نے جو مدینے کی مسجد میں موجود تھا، اُٹھ کر اسی مقام پر پیشاب کر دیا جہاں وُہ بیٹھا تھا۔ لوگوں نے غصّے میں آکر اُسے دبوچ لیا لیکن پیغمبرِ اسلامؐ نے اُن سے کہا:

"اسے کچھ نہ کہو اور ایک بالٹی پانی اس جگہ پر پھینک دو جہاں اس نے فراغت پائی ہے کیونکہ تم امور کو آسان بنانے کے لیے بھیجے گئے ہو، مشکل بنانے کے لیے نہیں۔"

یاد رہے کہ تنہا ایمان اور شریعت ہی باہم مربوط کرنے والے وُہ عناصر نہیں جنھوں نے اسلامی معاشروں کو بے پناہ قوّتِ برداشت بخشی ہے۔ اِس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ اُمت

Marfat.com

سے وفاداری دیگر تمام "قدرتی" وفاداریوں کی جگہ لے لے گی اور فی الواقع یہ ہوا بھی کہ اُمت سے وفاداری نے قبیلے سے وفاداری کی جگہ لے لی، تاہم وُہ بندھن جو انسانوں کو ایک دُوسرے سے وابستہ رکھتا ہے، وہی اُمّت کی ساری عمارت کی بنیادیں بنے کیونکہ اسلام، قدرت کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے اس کے خلاف نہیں۔ وُہ دھاگے جو رشتوں کا وسیع تانا بانا بنتے ہیں اور جن سے ہر فرد بندھا ہُوا ہے، ازدواج کے ذریعے گندھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے شاید پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ نکاح نصف ایمان ہے۔ ایک طرف تو خاندان اولاد (اور پھر اولاد کی شادیوں) سے وسعت پاتے ہیں تو دوسری طرف جانبین کے خونی بندھنوں سے بھی خاندان کی توسیع اور اُسے قوت فراہم ہوتی ہے پھر انہیں مزید تقویت اِن خونی بندھنوں سے ملتی ہے جن سے جانبین کی رشتہ داریاں ہوتی ہیں۔ کثرتِ ازدواج اِن رشتوں کی مزید وسعت کا موجب بنتی ہے اور ہر توسیع شدہ خاندان دوسرے بہت سے خاندانوں سے منسلک ہو جاتا ہے اور اس طرح رشتوں کے تار ٹوٹنے نہیں پاتے، اور یہ بات شہر کی باہم مربوط سماجی زندگی میں ایک جزوِ اضافی کا حکم رکھتی ہے۔

مذہب کی ابتدائی تاریخ میں خانہ بدوشوں کی اہمیت کے باوصف یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ اسلامی شہر ہی ہیں جنہوں نے اپنی مخصوص نادرۂ روزگار حیثیت کا خوبی سے اظہار کیا ہے۔ خانہ بدوش قبائل کے نظام اور موسم و روایات کے بہترین عناصر کو تباہ و برباد کرنے کی بجائے انہیں نئے معاشرے کی رعایت سے نئی صورت عطا کی۔

کسی بھی مسلم معاشرے میں مرکزی حیثیت باجماعت نماز کو حاصل ہے جو اس کی اجتماعی زندگی کا سرچشمہ بھی ہے۔ کسی شہر کی زندگی کا محور اس کی جامع مسجد ہوتا ہے جب کہ ہر ضلع میں مقامی مسجد مقامی زندگی کا مرکز ہوتی ہے جہاں تقریباً ہر خاندان اس سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ اس سے بلند ہونے والی مؤذن کی اذان کو باآسانی سُن سکتا ہے، جو اُسے نماز کی طرف بلاتی ہے، اُمّت میں اتحاد کی دعوت دیتی ہے اور جنت کی نوید دیتی ہے، جو خود جائے ملاقات ہے۔ اگر کسی شہر کی مسجد جامع کو اس کا قلب کہا جا سکتا ہے تو اس کا شکم اس کی منڈی ہے (اور یہ بھی مقدس جگہ ہے کیونکہ جو اچھی چیزیں ہم استعمال کرتے ہیں اور

Marfat.com

جو خوراک ہمیں توانائی فراہم کرتی ہے وُہ سب اللہ کی نعمتیں ہی تو ہیں) اسی طرح شہر کا دماغ اِس کے مدرسے اور کالج ہوتے ہیں جو علم کی "منڈیاں" ہیں۔

اسلامی شہروں میں کوئی چیز بھی شان و شکوہ والی نہیں کہی جا سکتی۔ اسلامی شہروں میں ہمیں رومی سلطنت کا جمال و حشمت نظر نہیں آتا۔ ان کی گلیاں تنگ ہیں جن میں عبادت یا خاندانی زندگی گزارنے کے لیے مکان بنے ہوئے ہیں۔ اسلام پُر تکلف اور پُر تصنع آرائش اور دیدہ زیبی کا قائل نہیں۔ سترھویں صدی عیسوی کا ایک فرانسیسی سیاح جس نے مصر کی سیر کی تھی، لکھتا ہے کہ قاہرہ میں کوئی بھی سڑک عمدہ اور نفیس نہیں۔ یہاں تو بے شمار چھوٹی چھوٹی گلیوں کا جال بچھا ہوا ہے جن میں کئی موڑ ہیں جو واضح طور پر یہ بات ظاہر کرتی ہیں کہ تمام گھر کسی نقشے کے بغیر تعمیر کیے گئے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہر گھر نے اپنی مرضی اور خوشی کے مطابق، اس بات کا خیال رکھے بغیر کہ اس تعمیر سے وُہ گلی کو بند کر دے گا اِس جگہ کا انتخاب کر لیا ہے جہاں اس کی تعمیر ہونا تھی[1] گلیوں کے اس پیچاک نے وُہ ربط اور آزادی برقرار رکھی جو کسی مسلمان کی زندگی میں انتہائی اہمیت کی حامل تھی اور اسی کی بدولت ریاست کی "لاشخصی" طاقتیں عام انسانوں سے فاصلے پر رہیں کیونکہ اسلامی شہروں میں ایسی شاہراہیں اور چوک نہیں تھے جو فوجی قواعد اور پریڈ کے لیے حوصلہ افزا ہوتے۔ جو نظام انسانی زندگیوں پر اثر انداز تھا وُہ بیرونی سے کہیں زیادہ داخلی تھا۔[2]

---

[1] حوالہ از کیمبرج ہسٹری آف اسلام جلد ۲ صفحہ ۴۵۶

[2] اسلامی شہروں کے متعلق صیغۂ ماضی استعمال کرنا پڑتا ہے اور اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج مسلمانوں کی زندگیاں کسی قسم کے روحانی اور نفسیاتی عوارض سے دوچار ہیں۔ فاس (مراکش) اور صنعا (یمن) شہروں کے سوا گنتی ہی کے چند شہر ہوں گے جن کا بیرونی منظر ایمان پرور ہو اور انہیں دیکھ کر کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں اطمینان محسوس کرے۔ اب تو یہ ہوتا ہے کہ اکثر وُہ اپنے وطن میں بھی خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اِس کا گرد و پیش اسے خُدا کی یاد نہیں دلواتا اور کسی بھی عمارت کے ڈیزائن میں مذہبی فرائض کی بجا آوری کی رعایت نظر نہیں آتی اور کسی جگہ بھی اُسے وُہ تسلسل نظر نہیں آتا جو روحانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۶ پر)

Marfat.com

کسی بھی شہر کی اقتصادی زندگی کی شہ رگ تجارت ہوتی ہے جو باہمی تعلقات کو زیادہ مضبوط بناتی ہے؛ تاہم اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں ان کی قدر و قیمت اس وقت ضرور بڑھ جاتی ہے جب وہ ان اشیا کا کاروبار کرنے والوں کا وسیلۂ رزق بن جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مال کے بدلے مال کی تجارت میں بھی کام آتی ہیں۔ اہلِ ایمان کا ایک دُوسرے سے محض ملنا بھی باعثِ برکت ہوتا ہے پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے: "دُو مسلمان جب ایک دُوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے الگ ہونے سے پہلے ہی اُن کی خطائیں معاف ہو جاتی ہیں"۔ اور پیغمبر اسلامؐ کے ایک صحابی ابنِ عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ہر مرتبہ جب کوئی مسلمان ایک دُوسرے مسلمان سے ملتے وقت "السلامُ علیکم" کہتا ہے تو شیطان روتا ہے اور کہتا ہے حیف ہے مجھ پر یہ اس وقت تک جُدا نہیں ہوں گے جب تک اللہ ان دونوں کو معاف نہ کر دے۔

ایک لحاظ سے، ان ملاقاتوں کے مقابلے تجارتی کاروبار ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ وقتِ ملاقات میزبان لوگوں سے تجارتی معاملات پر گفت و شنید کرتا ہے تو دورانِ گفتگو میں قہوہ یا کوئی دوسرا مشروب پیش کرتا ہے جس سے ان کے درمیان رشتے اور زیادہ قوی ہو جاتے ہیں، کیونکہ اسے یہ معلوم تھا کہ خُدا حاضر و ناظر ہے اور اس قسم کے تعلقات قائم ہو جانے کو منظور فرماتا ہے۔ جب حاضرین کے درمیان سماوار گردش کرتا تو خُدا اِن سے خوش ہوتا۔ رہ گیا مسئلہ نفع و نقصان کا، سو انہیں معلوم تھا کہ یہ تو وقتی چیز ہے مگر ان کی باہم ملاقات تو ابدی ہے۔

حضرت پیغمبرِ اسلام نے فرمایا تھا: "لوگوں کو نمازیں پڑھتا دیکھ کر شیطان مایوس ہو جاتا ہے؛ تاہم اسے یہ اُمید پھر بھی ہوتی ہے کہ وُہ انہیں ایک دُوسرے سے لڑا سکتا ہے"۔ سب سے سنگین گناہ جس کا ذکر قرآن مبین میں کیا گیا ہے وہ "قطعِ رحمی" ہے، یعنی خاندانی رشتوں، دوستی کے رشتوں، ملّت کے رشتوں اور کسی کاروبار میں شراکت کے رشتوں کا توڑنا۔ یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵ کا) زندگی کی بقا کے لیے اشد ضروری ہے۔

Marfat.com

تمام رشتے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی دُنیا کو یکجا کرنے کے مترادف ہیں اور اس اتحاد و یکجائی میں انسانوں کی حیثیت ایسے ایٹمی ذرّوں کی سی ہے جو ایک سے دُوسرے کو پیوستہ کرتے ہیں۔ صلۂ رحمی سے بہت سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ کوئی شخص پیغمبر اسلامؐ کے پاس آیا اور کہا کہ اس سے ایک شدید گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ کیا اس کے کفارے کی کوئی صورت ہے؟ اس پر پیغمبر اسلامؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا اس کی ماں زندہ ہے؟ اور جب انہیں یہ جواب ملا کہ وُہ فوت ہو چکی ہے تو آپؐ نے پُوچھا کہ کیا تمہاری کوئی خالہ زندہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جی ہاں، اس پر آپؐ نے کہا: "جاؤ اس سے نیکی کا سلوک کرو۔"

ایک اور حدیث کے مطابق اللہ روزِ قیامت پُوچھے گا: "وُہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے میری خاطر ایک دُوسرے سے محبّت رکھی۔ آج کے دن جب کہ میرے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہیں، میں انہیں اپنے سائے میں جگہ دُوں گا۔" اور پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشاد ہے: "تم اہلِ ایمان کو باہمی محبّت اور اخلاص کے اعتبار سے ایک جسم کی مانند پاؤ گے۔ جسم کا ایک عضو اگر تکلیف میں مبتلا ہو تو بقیہ جسم بے خوابی اور بخار کی صورت میں درد میں شریک ہو جاتا ہے۔" ایسی حدیثوں کے حوالے سے جن کی تعداد خاصی ہے، ہم ان گناہوں کی سنگینی کا اندازہ کر سکتے ہیں جن سے ملّت کا اتحاد اور اخوّت پارہ پارہ ہوتی ہے۔ عموماً یہ رشتے زبان کی بے لگامیوں سے شکستہ ہوتے ہیں۔ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: "اگر کوئی شخص مجھے اس چیز کی جو اس کے دو جبڑوں اور دو ٹانگوں کے درمیان ہے ضمانت مہیّا کر دے تو میں اسے بہشت کی ضمانت فراہم کر سکتا ہوں۔" ایک اور موقع پر پیغمبر اسلامؐ نے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تہمت کیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: "یہ اپنے بھائی (مسلمان) کے متعلّق کوئی ایسی بات کرنا ہے جسے وُہ ناپسند کرتا ہو۔" اس پر ایک شخص نے پوچھا، اگر جو کچھ وُہ کہتا ہے سچ ہو؟۔ اس پر آپؐ نے جواب دیا: "اگر جو کچھ تم نے کہا وُہ سچ ہے تو یہ تہمت ہے اور اگر وُہ صحیح نہیں تو تم نے اس پر بہتان رکھا۔"

اور قرآن ہمیں اس سلسلے میں یُوں آگاہ کرتا ہے:

Marfat.com

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (النور (۲۴): ۱۹)

"جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت بدکاری کی خبر) پھیلے اُن کو دُنیا اور آخرت میں دُکھ دینے والا عذاب ہوگا اور خُدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ (الحجرات (۴۹): ۱۱-۱۲)

"مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے کہ وُہ لوگ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے (تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وُہ اُن سے اچھی ہوں، اور اپنے (مومن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دُوسرے کا بُرا نام رکھو۔ ایمان لانے کے بعد بُرا نام (رکھنا) گناہ ہے، اور جو توبہ نہ کریں وہ ظالم ہیں۔ اے اہلِ ایمان! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دُوسرے کے حال کا تجسّس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور خدا کا ڈر رکھو۔ بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ آدمیوں اور عورتوں کے گزشتہ گناہ "مردہ گوشت" ہے جنہیں دہرانا اور ان پر نئی دلچسپی سے بات چیت مناسب نہیں اور اس کے متعلق متعدد

Marfat.com

احادیث میں بہت کچھ بیان ہوا ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ خدا ہمارے گناہوں سے صرف نظر کرے تو ہمیں اپنے پڑوسیوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرنا چاہیے اور اگر ہم اس کی سرزنش کر سکتے ہوں تو ہمیں یہ کام انتہائی تخلیے میں کرنا چاہیے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"مومن اپنے دوسرے مومن بھائی کی پردہ پوشی کرے تو اللہ روز قیامت اس کی پردہ پوشی کرے گا" اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے "اہل ایمان کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچاؤ نہ ان پر برائی کی تہمت لگاؤ اور نہ ان کی (ڈھکی ہوئی) برہنگی کو کھولنے کی کوشش کرو۔ (یعنی ان کے عیوب نہ کھولو) کیونکہ سچ یہ ہے کہ جو کوئی اپنے بھائی کی برہنگی کو ڈھانپنے کی کوشش کرے گا، روزِ قیامت اللہ اُس کی برہنگی (یعنی گناہ و مصائب) کو ڈھانپ لے گا"

ایسی پردہ پوشی اور حزم و احتیاط آج کی مغربی دنیا کے مزاج کے قطعی برعکس ہیں جو ہر بات کو کھلے بندوں منظرِ عام پر لانے کو ترجیح دیتی ہے یا جیسا کہ عرفِ عام میں کہا جاتا ہے "الگنی پر لٹکا دو" عصرِ حاضر سے یہ مشورہ بھی لگا نہیں کھاتا کہ ہمیں اپنے گناہ اور کمزوریاں اس کہاوت کے مصداق چھپانی چاہییں کہ خدا کی نظروں میں سو گناہ آجانے بہتر ہیں بہ نسبت اس کے کہ ایک بھی گناہ لوگوں کے سامنے ہو۔ ایک بہت مستند حدیث جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں، یہ ہے کہ فرمایا رسولِ خدا نے میرے تمام اُمتی محفوظ رہیں گے، سوائے اُن کے جو خود اپنی بداعمالیوں کی تشہیر کرتے ہیں۔ یہ انتہائی دیدہ دلیری کی بات ہے کہ کوئی شخص رات میں تو نافرمانی کا مرتکب ہو اور جب اللہ اس کی اس نافرمانی کی پردہ پوشی کرے تو وہ صبح اُٹھ کر لوگوں کو وہ بتا دے جو اس نے رات میں کیا ہوتا ہے۔ اس کے رب نے تو رات بھر اس بات کو ڈھانکے رکھا لیکن اس نے صبح اُٹھ کر اسے افشا کر دیا جسے اللہ نے رات بھر ڈھانکا تھا"

انگلستان اور امریکہ میں ہمارے ہم عصر تو یقیناً اسے منافقت کی ترغیب سے تعبیر کریں گے۔ (خود ساختہ) دیانتداری کی روش اس حد تک جا پہنچی ہے کہ بہت سے لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کریں "دیانتداری" یہ ہے کہ اُس کا برملا اظہار کیا جائے

Marfat.com

اور انسان جو کچھ ہے، اُس سے بہتر نظر آنے کی کوشش نہ کرے۔ ان کے نزدیک کسی سرزد ہونے والے گناہ کو چھپانے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وُہ اپنے آپ سے شرمندہ ہیں۔ اب بھلا یہ اس دَور میں کیسے ممکن ہے جب کہ "ذات" (نعوذ باللہ) خدا کا درجہ پا چکی ہے۔ جس کے سوا غالباً ان لوگوں کا اور کوئی 'خدا' بھی نہیں! سطحی طور پر یہ نقطۂ خیال انیسویں صدی کی "منافقت" کے خلاف ردِّ عمل کا اظہار تھا؛ حالانکہ اُس دَور کے لوگوں کی جو چیز حقیقی معنوں میں قابلِ مذمت ہو سکتی تھی وُہ اِن کی رازداری کی عادت نہیں بلکہ خودستائی تھی لیکن اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے، اور یہ بات کتنی ہی بعید از عقل معلوم ہو، تو یہ نظر آتا ہے کہ دراصل اپنی ذات کا برملا اظہار دراصل معاشرے میں اپنا مقام بنانا اور اس سے داد پانا تھا۔ یوں سمجھئے کہ اگر میں بے حیائی سے اپنے گناہ کا اقرار کر لوں (اور اُس پر اپنی مرضی کا رنگ و روغن کر لُوں) اور میرے دوست بھی مجھے حقیر نہ سمجھیں، تو پھر کوئی بات نہیں اور میرے ضمیر میں کوئی خلش نہیں ہونی چاہیے۔

مسلمان کے لیے شریعت کی ہر خلاف ورزی، ہر گناہ، کے دو بالکل جُدا پہلو ہوتے ہیں۔ اولاً یہ کہ انفرادی طور پر اس کا تعلق اِس کے خالق سے بنتا ہے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ وُہ بخشش کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتا ہے بشرطیکہ گنہگار دل سے نادم ہو، کہ توبہ کرے اور یہ عہد کر لے کہ آئندہ وُہ حتی الوسع نیک بنے گا۔ دُوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر اس گناہ کی تشہیرِ عام ہو تو یہ دُوسروں کے لیے ایک طرح کی ترغیب ہوگی کہ وُہ بھی ایسا ہی کریں۔ اور یہ بات اُمّت کے (یعنی صحیح ہدایت یافتہ اُمّت) کے نقطۂ نظر سے زیادہ سنگین بات ہوگی۔ کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ لوگ کس طرح ایک دُوسرے کی ریس پر ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں اور اپنی غلطیوں کا جواز اس میں تلاش کر لیتے ہیں کہ وُہ اکیلے نہیں دُوسرے لوگ بھی یہی کر رہے ہیں۔ اس لیے عوام کی نظروں میں کسی بُری مثال کا آنا اُمّت کو گھائل کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اس سے اُمّت کو زک پہنچتی ہے اور اس جُرم کی معافی کا امکان بہت کم ہے۔ آپس کے رشتے شکستہ ہونے لگتے ہیں۔

بہر حال دُوسروں کی برہنگی کو راز رکھنے اور خود اپنی برہنگی کو ڈھانپنے کے کچھ اور زیادہ

Marfat.com

گہرے وجوہ بھی ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تھا کہ ایسی شخصیتیں شاید ہی ہوں جو ہر طرح سے مکمل اور سالم ہوں۔ کسی شخص کا اپنے ایسے جذبات کو، جنہیں وہ ناپسند کرتا ہے، دبانے کی کوشش کرنا، اور ایسے جذبات جنھیں وہ فتح مند دیکھنا چاہتا ہے، آگے لانا، منافقت نہیں وہ جو کچھ ہے اگر اس سے بہتر ہونا چاہتا ہے تو ان مقاصد و عزائم میں اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے، اور ہمارے دور میں یہ عجیب اور انوکھا رجحان دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی شخص کی بدترین خصلتوں اور عادات کو اس کے وجود کا حقیقی ترجمان اور نمائندہ سمجھ لیا جاتا ہے؛ حالانکہ یہ بات اِس عام دعوے کے دوش بدوش چلتی ہے کہ بدصورتی، اپنے عجیب رنگ میں خوبصورتی سے زیادہ حقیقی ہوتی ہے اور کسی شرمناک راز کی دریافت گویا حقیقت کو پالینا ہے۔ شاید اس سے زیادہ معقول نظریہ وہ ہے جو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں مسلمان بیان کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ انہیں راہ میں ایک مردہ کتا پڑا نظر آیا۔ اِن کے پیروکاروں نے کہا: "اس میں سے کیسی بُری بُو آ رہی ہے!" مگر انہوں نے (حضرت عیسیٰؑ) نے کہا "اِن کے دانت کتنے سفید ہیں!"

لوگوں کے متعلق اچھی بات سوچنے والے کو کبھی گالی نہیں دی گئی۔ کہا جاتا ہے سینٹ ٹامس اکوائنس (Saint Thomas Aquinas) کے ساتھی راہبوں نے ایک مرتبہ طعام خانے کی کھڑکی کے پاس سے انہیں پکار کر کہا: "بھائی ٹامس! ذرا جلدی سے آکر اڑنے والا بیل تو دیکھ لیجیے!" اِس پر انہوں نے اپنا بھاری بھر کم وجود کرسی سے بدقت نکالا اور کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں انہیں کچھ نظر نہ آیا اور اِن کے ساتھی راہبوں نے اِن کا مذاق اڑاتے ہوئے قہقہے لگائے، مگر سینٹ ٹامس یہ کہتے ہوئے اپنی کرسی پر آ بیٹھے کہ "کسی جھوٹے راہب کی بات کا یقین کرنے سے یہ بہتر ہے کہ اُڑنے والے بیل پر یقین کر لیا جائے"!

ہم طبعاً کسی چیز یا کسی بھی شخص کے بارے میں صحیح صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں اور حقیقت پر مبنی شہادت بھی تضادات سے پُر نہیں تو کسی حد تک جانبدارانہ ضرور ہوتی ہے۔ بالآخر ایک ہی سادا سا اخلاقی راستہ رہ جاتا ہے کہ یا تو ہم سب سے اچھی بات

Marfat.com

مانیں یا سب سے بُری، ایمان واثق رکھیں یا پھر اندھیرے میں جست لگانے کی بجائے، بُسورتے ہوئے کسی کونے میں جا بیٹھیں تا آنکہ موت ہمیں آدبوچے۔

بہر نوع دُنیا کو اپنا بہترین رُخ دکھانے کے سوال کی طرف پلٹتے ہوئے، ہم کسی ایسے شخص کے احوال پر غور کرسکتے ہیں جس کے کردار میں کوئی بھی طبعی وقار یا رکھ رکھاؤ نہیں۔ اگر ایسا شخص اپنے گردوپیش کے لوگوں کو متاثر کرنے یا کسی مالی منفعت کی خاطر باتمکین نظر آنے کی کوشش کرے تو وہ حقیقی معنوں میں منافق ہے لیکن اگر وُہ تمکنت اور وقار کی محبت میں یا اس کی خوبی اور احترام کی خاطر ایسا کرتا ہے، یا اپنی خامیوں کے باوجود اپنے خالق کے معیار کے قابل بننے کے لیے ایسا کرتا ہے تو پھر اُسے آپ کیا کہیں گے؟ اگر ہم کسی طرح حشر کے دن ہونے والے روحوں کے انجام کو دیکھ سکتے تو ہوسکتا ہے کہ ہم اس شخص کے بارے میں کیے جانے والے فیصلے سے حیران ہوجائیں۔ بہرحال کچھ بھی ہو یہ ہمارا کام نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے چہرے سے نقاب نوچ پھینکیں اور "دیانت" کے کسی فرضی تصوّر کی خاطر اِس کے بگڑے ہوئے خدوخال لوگوں کے سامنے نمایاں کردیں۔

ذاتی وقار اور رکھ رکھاؤ کی صفات کو یقیناً قدیم دَورِ اسلام میں انتہائی گرانقدر سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی روایت پرست مسلمان، جدید مغربی آداب و اخلاق کے اثرات کے تحت نمود و نمائش کے باوجود انہیں بڑی اہمیت دیتے ہیں یہ نمود و نمائش، اُس روش کے ساتھ ساتھ جسے اکثر "حسن اخلاق" کا نام دیا جاتا ہے، یقیناً "منافقت" کے الزام سے مبرّا نہیں۔ لیکن کسی خوب گندھے ہوئے معاشرے میں اچھے اخلاق و آداب لوگوں کے درمیان کسی قدر فاصلہ رکھنے اور تنہائی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں زندگی محال ہوجائے اگر ہر شخص کے دل کی بات زبان پر آجائے۔

یون ژاں، جو عام مسلمانوں کی "کلیسیائی وضع قطع" کا ذکر کرتا ہے (جس کا حوالہ ہم پہلے دے آئے ہیں) کہتا ہے کہ کسی قوم کی "خوش خلقی" (بد خلقی) خود وہ قوم ہوتی ہے، اور اُن کے پورے کردار زندگی کے متعلق اِن کے تصوّرات کی عکاس ہوتی ہے۔" اور پھر وُہ پوچھتا ہے "صحیح معنوں میں کون باخلق مسلمان ہے؟" اور پھر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "باخلق مسلمان وُہ ہوتا ہے

Marfat.com

جس کی گرفت اپنی روایات پر مضبوط ہو، جو ہر صورت حال میں اسے اپنے باطن میں اور دُوسرے لوگوں میں متحرک اور زندہ بنائے رکھنے میں کامیاب ہو، اور جو اپنے بچّوں، اپنے رشتہ داروں، اپنے ہمسایوں، اپنے محلہ داروں، اپنے شہر کے باسیوں؛ حتّٰی کہ عام راہگیروں اور مسافروں بلکہ ساری انسانیّت کے لیے ایسے پاکیزہ اوصاف رکھتا ہو جو اُسے مثالی نمونہ بننے کے نااہل قرار نہ دیں۔ اسی بات کو دُوسرے انداز میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ مسلمان ہوتا ہے جو اتباعِ اسوۂ رسولؐ سے انتہائی قریب تر ہوتا ہے۔ آخر میں بون ژاں نے خود اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام خوش خلقی اور نرم خوئی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی شہادت پر ختم ہوتی ہے، اور وُہ یہ بھی کہتا ہے کہ خوش خلقی اِس بات کی آگہی بھی ہوتی ہے کہ یہ دُنیا بے حقیقت ہے، اور وُہ اس بات کا اضافہ بھی کرتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی نظروں کو مکروہات اور آلائش دُنیا میں آلودہ ہونے کی اجازت نہیں دیتا، جو ہماری کمتری اور چھوٹے پن کا حصّہ ہیں۔ "کسی ایمان والے کو خُدا کے تصوّر کی گرفت کو ایک لمحے کے لیے بھی ڈھیلا نہ پڑنے دینا چاہیے۔"[1]

بون ژاں آگے چل کر ایک عربی اصطلاح "حشمۃ"، (جو اُردو کے لفظ "حشمت" سے مختلف ہے) کی اہمیّت پر بحث کرتا ہے، جس کا ترجمہ "حیا"، "کم آمیزی"، "تمیز"، یا "سلیقہ" کیا جا سکتا ہے۔ یہ صفات کسی روایتی مسلمان کی زندگی میں انتہائی اہم سمجھی جاتی رہی ہیں اور اِن ہی اصولوں کے تحت اُونچی آواز سے بولنا، جھگڑالوپن، غصّہ اور جوش ناپسند کیے جاتے رہے جو بدقسمتی سے آج مسلمان ممالک میں وسیع پیمانے پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ بہرحال کہیں بھی بون ژاں نے مساوات کے اِس اصول کا تذکرہ نہیں کیا جو اسلام کا نمایاں وصف سمجھا جاتا ہے۔ اِس کے لیے اس بات کو تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کی معاشرتی حیثیت سے قطع نظر، اُن سے خوش خلقی سے پیش آنا اُنھیں اپنے مساوی سمجھنا ہی ہے۔

اس سلسلے میں دیگر تمام معاملات کی طرح جب ایک عام سی اصطلاح کسی دُوسرے

---

1. Francois Bonjean in Les Cahiers du sud.

Marfat.com

تہذیبی و ثقافتی علاقے میں استعمال کی جائے تو وہ انتہائی گمراہ کُن بن جاتی ہے اور بائیں بازو کے خیالات رکھنے والے مسلمان جب "مساوات" کا پرچار کرتے ہیں تو یہ ایک اور مثال ہے کہ کس طرح ملت اسلامیہ کے جسد میں لادینی نظریات کا زہر اتارا جا رہا ہے جو سطحی نظر میں کچھ اسلامی اصولوں کے مماثل دکھائی دیتے ہیں اور اسی لیے نظروں میں آئے بغیر سرحد پار کر آتے ہیں۔

مغرب میں مساوات کے جدید نظریات سے جو کچھ بھی مراد لی جاتی ہو، اس کی جڑیں ایک طرح کی بغاوت اور اس عقیدے میں پیوست ہوتی ہیں کہ انسان اپنی تقدیر خود بنانے پر قادر ہے، اور وہ دوبارہ پیدا نہ کرنے والی قدرت اور فطرت کو مسخر کر سکتا ہے۔ یہی بات دہریت کا ایک منطقی نتیجہ ہے کیونکہ اگر اس زندگی سے ماوری کچھ نہیں ہے (یعنی نہ غلطیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے نہ نقصانات کی تلافی کی جا سکتی ہے) تو پھر تو بات یہاں ٹھہرتی ہے کہ وہ شخص جسے اس دُنیا میں اپنا جائز اور مناسب حصّہ نہیں ملا وہ ہمیشہ کے لیے خسارے میں رہا۔ وہ غریب اور نادار آدمی جو اسلام اور عیسائیت دونوں ہی کے نظریات کے مطابق خُدا کا منظورِ نظر ہے (اور پہلے ہی سے "رحمت" میں داخل ہے) اس نقطۂ نظر کے تحت ہمیشہ ہی غریب رہا۔ انقلابِ فرانس، جس کے سر تاریخ میں 'مساوات' کا نظریہ پیش کرنے کا سہرا ہے، درحقیقت نہ صرف اُس طبقۂ امراء کے خلاف بغاوت تھا جو انتہائی ذلیل اور بدکار ہو گیا تھا بلکہ یہ انقلاب مذہب کے خلاف بھی ایک بغاوت تھا اور انجامِ کار یہ اشیاء کی فطرتِ اصلی کے خلاف بغاوت تھا۔

بلاشبہ کچھ حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے تحت تمام انسان برابر ہوتے ہیں۔ وہ جیل یا قحبہ خانے میں بھی برابر ہوتے ہیں اور خانقاہوں میں بھی۔ مغرب کی مساوات پرستی (محض اُصولوں کی حد تک، کیونکہ عملی زندگی میں یہ کبھی حاصل نہیں کی جا سکی) جیل یا قحبہ خانے کی مساوات ہے، جب کہ مسلمانوں کی مساوات خانقاہوں کی یا مذہبی فضلاء کی، مساوات ہے جو بذاتِ خود ایک قسم کی حکومت اشرافیہ ہے۔ جس بات کو اسلام بمنزلہ ایسے عقیدے تسلیم کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ تمام دنیاوی امتیازات اضافی ہیں اور یہاں کسی مرد یا عورت

Marfat.com

کی حقیقی قدر و قیمت اِن کی معاشرتی یا اقتصادی حالت کے تحت قائم کرنا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کے جلال و عظمت کے آگے ماسوی اللہ یہ خاک کے برابر ہے۔ حضرت پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا: "تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے" ــــ آفتاب عالمتاب کی روشنی کے آگے کوئی مشعل بھی موم بتّی سے زیادہ روشن نہیں ہوتی۔ مشعل اور موم بتی اس وقت برابر ہوتے ہیں جب سُورج چمک نہیں رہا ہوتا۔ جب خُدا اپنا چہرہ نقاب میں کر لیتا ہے جیسا کہ وُہ ہماری اس دینوی زندگی میں کیے ہوئے ہے تو ان کا فرق بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔

مساوات صرف طبقۂ امراء ہی میں نہیں، غریبوں میں بھی ہے اور قرآن کا اِس ضمن میں ارشاد ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (فاطر (۳۵): ۱۵)

"لوگو! تم (سب) خُدا کے محتاج ہو اور خُدا بے پروا سزاوارِ حمد و ثنا ہے۔"

مسلمانوں کا نظریۂ مساوات دونوں ہی کے نقطۂ نگاہ کو شمار میں لاتا ہے۔ تمام مسلمانوں میں ایک طرح کی مساوات ہے کیونکہ وُہ سب طبقۂ اعلیٰ کے ارکان ہیں یا بقول قرآن "بہترین اُمت" ہیں، اور اس لیے بھی برابر ہیں کہ باری تعالیٰ کے آگے سب خاک ہیں، "فقراء" ہیں، جن کے پاس کوئی اختیار ہے نہ طاقت، حقوق ہیں نہ ملکیّت کیونکہ سب کچھ اُس خدائے واحد کا ہے۔ وُہ کتّے نہیں کہ ہڈیوں پر لڑیں، اور نورِ خداوندی کے سامنے اِس دُنیا کی منفعتیں ریگستان میں بکھری ہوئی خشک ہڈیوں سے زیادہ کچھ نہیں۔

مگر یہاں، اس دُنیا میں اور فی الحال:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انعام (۶) ۱۶۵)

"اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور ایک دُوسرے پر درجے بلند کیے تاکہ جو کچھ اُس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے، بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔"

Marfat.com

اس آزمائش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اِن لوگوں کو رشک وحسد کی نظروں سے نہ دیکھیں جن کے درجے بلند کیے گئے ہیں اور جنھیں دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ دُنیاوی نعمتیں حاصل ہیں اور اس سلسلے میں ارشادِ ربِ کریم ہے:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ (طٰہٰ (۲۰) : ۱۳۱)

"اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دُنیا کی (زندگی میں) آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے تاکہ اُن کی آزمائش کریں اُن پر نگاہ نہ کرنا"

کوئی برائی اسلامی پس منظر میں اتنی قابلِ مذمّت نہیں جتنی حسد؛ اور حسد ہی وُہ محرّک ہے جو بعد مسیح کی دُنیا کے مساوات کے نظریات کو خُون خرابے اور فتنہ وفساد میں بدل دیتا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشاد ہے: "حسد اور کینہ اچھّے اعمال کو یُوں نگل لیتے ہیں جیسے آگ ایندھن کو۔"

اسلام کا معاشرتی نظریہ یہ ہے کہ ایک ایسی اُمّت ہے جس میں ہر فرد قانون کی حکومت کے تحت اپنے متفوضہ کردار کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور اس سانچے میں سما جاتا ہے جو دُنیا کے حالات نے اس کے واسطے تیار کیا ہے۔ وُہ زندگی میں ہر لمحہ اس بات کو مدِّنظر رکھتا ہے کہ خُدا اس کے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور یُوں انسانی رشتوں کے مضبوط تانے بانے میں سیدھے اور جانے پہچانے راستے پر اس ہدف کی طرف بڑھتا ہے جو جسمانی موت سے ماوریٰ ہے۔ یہ حقیقت کہ کوئی انسانی معاشرہ یا یوں کہیے کہ انسانی معاشروں کا ایک جال، اس مثلی نظریے کے تحت تقریباً ایک ہزار سال سے زندگیاں بسر کرتا آرہا ہے اور اس عرصے میں انھوں نے کبھی اس انداز اور طرزِ حیات کو تبدیل کرنے کے متعلق سوچا بھی نہیں، آج کی دُنیا میں ہمارے لیے بیک وقت ایک سبق بھی ہے اور ایک انتباہ بھی۔

Marfat.com

باب دہم

اِنسانی بوالعجبیاں

اب ایک مرتبہ پھر آدمؑ کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئی ہے یعنی اُس مثالی اور اوّلین انسان کے متعلق — اور یہی محل کچھ حوّا کے متعلق بات کرنے کا بھی ہے جن کے بغیر پہلی تخلیق نامکمل اور ناقص رہتی۔ عیسائیوں میں یہ بات مدت تک وجہ بحث و تمحیص رہی ہے کہ انجیل مقدس میں انسان کی ابتدا کے بارے میں دیے ہوئے واقعات کے لفظی معنی لیے جائیں یا مجازی وتمثیلی۔ یہ مباحثہ قرآن کے حوالے سے، مسلمانوں کیلئے بھی نیا نہیں؛ تاہم بحیثیت مجموعی مسلمانوں کو اس سوال سے بہت کم پریشانی لاحق ہوئی ہے۔ اگر ان میں فہم اور دانائی ہے تو وہ یہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ دونوں نقطہ ہائے نظر سچ کے وسیع دائرے میں آتے ہیں۔

قرآن کریم میں تخلیقِ آدم اور اس پہلے انسانی جوڑے کے ہبوط کا بیان ہے، اور مسلمانوں کے لیے قرآن کریم لاریب اور سچا ہے۔ اب رہا یہ معاملہ کہ یہ بیان تاریخی طور پر مبنی بر حقائق ہے یا مجازی انداز کا ہے، اِس کا انحصار اس پس منظر پر ہے جس کا بہر حال واقعے کے مواد و متن پر اثر نہیں پڑتا۔ حقیقی اور مجازی اندازِ نظر میں فرق اتنا نمایاں نہیں؛

Marfat.com

جتنا کہ مغربی دماغوں کو محسوس ہوتا ہے کیونکہ تاریخی واقعات اور تمثیل دونوں ہی خدا کیلئے آسان ہیں اور اس کا ذریعہ بیان ہیں اور خدا ہمیں قرآن کے ذریعے تعلیم فرماتا اور مطلع کرتا ہے۔ وُہ یہ کام ہماری ضرورت، اندازِ فہم اور ذہنی و تصوّراتی صلاحیّت کے مطابق نہایت بہتر رعایت سے کرتا ہے۔ پس تخلیقِ آدم کے سلسلے میں قرآن کا بیان اپنے مقصد و منشا کو ہر طرح پورا کرتا ہے اور اس بات کا قطعاً کوئی موقع نہیں کہ ہم اِس بحث و مباحثے میں ایک دُوسرے کے سر توڑتے پھریں۔ جو بات اہمیّت رکھتی ہے وُہ اس واقعے سے نکلنے والے معنی اور مفاہیم ہیں جو انسانی دماغ کو، اس کی تمام تر نارسائی کے باوصف ابدی انداز میں رفعتوں تک لے جاتے ہیں۔ آدم کا بہشت سے پھینکا جانا یقیناً ایک معجزاتی عمل تھا۔ اس کا مفہوم نہ صرف ایک انتہائی قدیم واقعے سے متعلق ہے بلکہ ہم سے بھی ہے کیونکہ بہرحال ہم سب اولادِ آدم ہیں اور ایک ہی رُوح سے ڈھالے گئے ہیں۔ یہی ہمارا تشخص ہے جو ہمارے پاسپورٹوں پر درج کیے جانے کے لیے موزوں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ

Marfat.com

اِلٰی حِیْنٍ (بقرہ (۲): ۳۰ — ۳۶)

"اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں (خدا نے) فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اس نے آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا تو پاک ہے جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں بیشک تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔ (تب) خدا نے (آدم کو) حکم دیا کہ آدم! تم ان کو ان (چیزوں) کے نام بتاؤ جب انہوں نے ان کو ان کے نام بتائے تو (فرشتوں سے) فرمایا کیوں میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) پوشیدہ باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو (سب) مجھ کو معلوم ہے اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو وہ سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آ کر کافر بن گیا، اور ہم نے کہا کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور جہاں سے چاہو بے روک ٹوک کھاؤ (پیو) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں (داخل) ہو جاؤ گے۔

پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس (عیش و نشاط) میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا، تب ہم نے حکم دیا کہ بہشت بریں سے چلے جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے۔

ایک دوسری سورۂ مبارکہ میں آیا ہے:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (اعراف (۷): ۱۲)

Marfat.com

"خدا نے فرمایا جب میں نے تجھ کو حکم دیا تو کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا۔ اس نے کہا کہ میں اس سے افضل ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے۔"

اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آدم کو بہکانے کے لیے:

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَا يَبْلَىٰ (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۰)

"تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا کہ آدم بھلا میں تم کو (ایسا) درخت بتاؤں (جو) ہمیشہ کی زندگی کا (ثمرہ دے) اور (ایسی) بادشاہت کہ کبھی زائل نہ ہو۔"

ان سوالات کے متعلق جو کچھ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ہے، وقائع نگاروں اور مفسرین[1] نے بعض اوقات ان پر تعمیم کیا ہے اور بعض اوقات محض اٹکل سے کام لے کر اس قصے میں بڑی رنگ آمیزی کی ہے۔ تفسیرات میں جا کر وہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ حوا کے بالوں کا رنگ قرمزی (شنگرفی) تھا (یعنی جس میں نیلے اور لال رنگوں کی آمیزش ہو) اور ان کے بال اتنے لمبے تھے کہ آپس میں ٹکرانے سے آواز پیدا ہوتی تھی اور وہ اتنے گداز جسم کی مالک تھیں کہ جب چلتی تھیں تو ان کی رانیں آپس میں ٹکراتی تھیں — اور پھر خدا نے آدم سے کہا: "یہ میری باندی ہے اور تم میرے غلام ہو۔ اے آدم! میں نے جو کچھ بھی تخلیق کیا ہے وہ تم دونوں کے جوڑے سے زیادہ مجھے عزیز نہیں بشرطیکہ تم میری اطاعت کرتے رہو۔" خدا ان سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس نے ان کی شادی بھی خود کروائی۔ فرشتوں کے پیشوا جبرائیل "شہ بالا" بنے باقی سب فرشتے گواہ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان کو اپنے باپ آدم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی شادی برملا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے شاید یہ بتلانا مقصود ہو کہ اولین تخلیق جوڑے کی صورت میں ہوئی۔

---

[1] مثلاً دیکھیے الکسائی کی "قصص الانبیاء"

Marfat.com

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ
وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (۳۶:۳۶)

"وُہ خُدا پاک ہے جس نے زمین کی نباتات کے اور خود اُن کے اور جن چیزوں
کی اُن کو خبر نہیں سب کے جوڑے بنائے۔"

اور یہ جوڑے جوڑے ہونا ایک ایسی تقسیم تھی جو الگ الگ بھی تھی اور یکجا بھی، جیسے ازدواج سے ایک ہونا تھا اور حرکت کی تجدید کرتے ہوئے بھی باہم رہنا تھا۔ اب سوچیے کیا شادی یا مناکحت نصف مذہب نہیں ؟

مفسرین ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ملائکہ نے کس ترتیب سے آدمؑ کو سجدہ کیا۔ وُہ ہمیں بتاتے ہیں کہ آدمؑ نہ صرف تمام چیزوں کے نام ہی جانتے تھے بلکہ ہر زبان سے بھی واقف تھے حتٰی کہ مچھلیوں اور مینڈکوں کی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ وُہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ کس طرح فرشتے آدمؑ کو کاندھوں پر بلند کیے جنّت کی روشوں پر گھومتے تھے۔ دُوسرے تمام فرشتے دو رُویہ پرے باندھے کھڑے رہتے تھے۔ پھر جیسے جیسے آدمؑ ان کے قریب سے گزرتے تو اُنہیں سلام کہتے جاتے جس کے جواب میں تمام فرشتے بیک زبان کہتے:

"تم پر بھی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو اے اللہ کے محبوب، اسکے منظورِ نظر
اِس کی شاہکار تخلیق۔"

کند ذہن انسانوں پر آدم کی برتری اور تفوق ظاہر کرنے کا یہی روایتی طریقہ ہے جو مفسرین حضرات نے برتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بہشت میں حضرت آدمؑ کے لیے ایک منبر بنایا گیا تھا اور بہشت کے تمام مکینوں کو درجہ بہ درجہ ان کے رُوبرُو طلب کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو ایسی آواز عطا کی گئی تھی جو سب تک پہنچی تھی۔ اس دن وُہ ایک ایسے چمک دمک والے حلّۂ بہشتی میں ملبوس تھے جو ہوا سے بھی ہلکا تھا۔ جواہرات سے مزیّن، اور مشک و عنبر میں بسی، دو پٹیاں ان کی کمر کے گرد بندھی ہوئی تھیں۔ آدمؑ کے سر پر سونے کا چوگوشہ تاج تھا۔ ہر گوشے پر ایک بیش قیمت موتی جڑا ہُوا تھا جو نہایت آبدار تھا اور اس میں سے ایسی نورانی روشنی نکل رہی تھی کہ سُورج اور چاند بھی اِس کے آگے ماند

Marfat.com

تھے۔ ان کی کمر کے گرد خُدا کی "رضوان" کا پٹکا بندھا تھا اور اس میں جو روشنی نکل رہی تھی وُہ بہشت کے ہر کونے تک پہنچ رہی تھی۔ حضرت آدمؑ اس نورانی مجمع کے سامنے سیدھے کھڑے ہوئے اور حاضرین کو سلام کر کے خوش آمدید کہا۔ اس پر خُدائے عزوجل نے کہا:

"اے آدم! اس کلمۂ سلامتی کے لیے میں نے تجھے تخلیق کیا ہے اور سلامتی اور امن کا یہی سلام قیامت تک کے لیے تمہارے اور تمہارے اخلاف کے لیے مقرر کر دیا ہے۔"

پھر جس وقت آدمؑ منبر سے نیچے اُترے تو اُن کی آب و تاب پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ اس وقت انگوروں کا ایک خوشہ لایا گیا جس میں سے انہوں نے کھایا۔ یہ پہلی سماوی غذا تھی جو اُنہوں نے چکھی اور جب وُہ اس سے سیر ہو گئے تو اُنہوں نے کہا: "اَلحَمدُ لِلّٰہِ یعنی اللہ کا شکر ہے۔" اور ان کے خالق نے کہا:

"اے آدم! اس کلمۂ مبارک ہی کے لیے میں نے تجھے تخلیق کیا اور یہ کلمہ تیرے اور تیرے اخلاف کے لیے قیامت تک کے لیے ایک وظیفہ بنا دیا گیا ہے۔"

مگر جب ابلیس مردُود نے سُنا کہ آدمؑ نے غذا تناول کر لی ہے تو اس نے کہا: "اب میں اسے ورغلا سکوں گا۔"

شیطانی سائے نے ابھی اس آب و تاب کو گہنایا نہ تھا اور نہ اس کے وُہ اثرات پیدا ہوئے تھے جن کے درمیان ہم اپنی زندگیاں گزارتے ہیں ــــ اس وقت تو بہشت بریں میں ایک عظیم جلوس بے سایہ روشنی میں رواں تھا۔ اوّلین انسان اپنے گھوڑے پر بیٹھا تھا اور اس کے بازو میں اوّلین عورت اپنی شریف اونٹنی پر سوار تھی۔ اس دھندلائی ہوئی دُنیا میں ہم اِس منظر کی آب و تاب کا اندازہ آج بھی کر سکتے ہیں کیونکہ یہ وقت کے ماوریٰ ہے۔ اب رہا معاملہ سائے اور پرچھائیوں کا، تو آخر الامر ان کی حیثیت سائے اور پرچھائیوں سے زیادہ نہیں رہ گئی؛ تاہم اِس وقت انسان اور خُدا کے درمیان ایک میثاق عمل میں آیا اور یہ شرط رکھی گئی کہ ہم (انسان) اس میثاق پر صادق اُتریں گے۔ اِس میثاق کے گواہ تمام

Marfat.com

اہلِ بہشت تھے اور یہ گواہی اس لیے تھی کہ کبھی وعدہ خلافی نہ کی جاسکے اور آدم و حوا کے اخلاف کبھی اپنے فرائض سے رُوگردانی نہ کرسکیں۔ اِس عہد کا اقرار آدم کی صُلب میں موجود آنے والی تمام نسلوں کی طرف سے بھی تھا۔ اس میثاق کے ذریعے بنی نوعِ انسان نے اپنے ربّ کو زوردار "بلیٰ" کہہ کر مانا تھا اور قیامت کے لیے اس پر مُہرِ توثیق ثبت کردی۔

خلا میں ہبوط سے اِس عہد کی پابندی میں کوئی فرق نہ پڑا اور اِس وعدۂ الست کی یاددہانی انسانیت کو وحیٔ الٰہی کے نزول سے متواتر کرائی جاتی رہی ہے۔ بہشت کا نقش و تصوّر بھی اِس کرۂ ارض سے اور انسانوں کے ذہنوں سے کلیتاً مٹایا نہیں جاسکا۔ کہا جاتا ہے کہ جب آدم زمین پر گرے تو وُہ اپنے ساتھ بہشت کی تھوڑی سی معطّر ہوا بھی لائے تھے جس کی مہک اطراف و جوانب کے پیڑوں، پودوں اور وادیوں میں بس گئی (آج بھی ہم جن خوشبوؤں سے واقف ہیں وُہ اس معطّر ہوا ہی سے کشید کی جاتی ہیں) آدم اور حوّا ہی کے ساتھ حجرِ اسود بھی آیا تھا جو اُس وقت رُوئی سے بھی زیادہ سفید تھا۔ اور اِن کے ساتھ ہی حنا کی وُہ لکڑی بھی تھی جس سے عصائے موسیٰ بنا۔ آدم نے اپنے رب سے مخاطب ہوکر التجا کی۔

> "اے میرے رب! میں تیرے جوار میں تیرے قریب ترین تھا، میرا تیرے سوا اور کوئی رب نہیں تھا۔ وہاں میں آسودگی سے جو کچھ چاہتا کھاتا پیتا تھا اور اپنے من کی پسند سے جہاں چاہتا رہتا تھا مگر تو نے مجھے دُور کردیا لیکن میں تب بھی فرشتوں کی آوازیں سنتا اور اُنہیں تیرے نورانی تخت کے گرد طواف کرتے دیکھتا تھا اور بہشت کے باغوں کی لطیف خوشبوؤں کو محسوس کرتا تھا۔ لیکن وا حسرتا! تو نے مجھے زمین پر پھینک دیا اور میرے قد کو بقدر ساٹھ ہاتھ کردیا، اور میری سماعت اور بصارت کو محدود کردیا۔"[1]

اور ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اُس وقت خدا نے آدم اور اُن کی اولاد کے لیے یہ وعدہ

---

[1] حوالہ از کتاب "الطبقات الکبریٰ" ابنِ سعد (وفات ۸۴۵)

Marfat.com

فرمایا کہ وُہ بحر و برّ کی مہیب تاریکیوں میں بھی ہدایت سے محروم نہیں رہیں گے۔

تو یہ تھا آدم اور اُن کی بیوی حوّا کا مرتبہ اور مقام؛ تاہم "آدم، خاکی تھے" اور انسان، جیسا بھی وُہ ہے، "زمین پر خلیفۃ اللہ" ہے، جب وُہ یہ بھُول جاتا کہ وُہ مٹی سے بنا ہے تو یہ منصب اُس سے چھن جاتا ہے اور پھر قرآن مجید کے الفاظ میں وُہ:

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ٥ (۵:۹۵)

"پھر (رفتہ رفتہ) اِس (کی حالت) کو (بدل کر) پست کر دیا"

گویا ایک مخلوق کی حیثیت سے وُہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ عملی لحاظ سے اُسے سب کچھ ہونے یا نہ ہونے میں سے ایک انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث کے مطابق اِنسان خُدا کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے؛ یعنی وُہ خُدا کا "عکس" ہے جس کی فطرت خُدا کے اسمائے حُسنہ یا صفات کی آئینہ دار ہے؛ تاہم وُہ گوشت پوست کا بنا انسان ہے جس کی صورت گری مٹی سے کی گئی ہے، جس پر وُہ کچھ عرصے کیلئے چلتا پھرتا ہے اور وُہ قیامت تک کے لیے اس کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ وُہ ایک گمراہ مخلوق ہے جس کی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں اور اُنہیں پورا کرنے کے لیے وُہ اپنی سطح سے نیچے بھی گر سکتا ہے۔ انسانی صحت حال کا یہی تضاد ہے۔

قرآن مبین نے فرشتوں پر آدم کی برتری پر جو اصرار کیا ہے اس کی تعبیر کئی طرح سے ہو سکتی ہے، مگر کوئی بھی مسئلے کی ان میں پوری وضاحت نہیں کر پاتی۔ اپنی بنیادی صداقت محض ایک مذہب کا حصّہ یا ایک وحیِ الٰہی تک محدود نہیں رہ سکتی تھی عیسائی بھی اس سے آشنا ہیں۔ سینٹ گریگری پالاماس (St. Gregory Palamas) کا کہنا ہے:

"اگرچہ بہت سی چیزوں میں فرشتے ہم سے برتر ہیں پھر بھی ایک طریقے سے وُہ ہم سے بہر طور کمتر ہیں مثال کے طور پر ہمارا وجود خُدا کی صورت پر ہے اور ہم ان سے زیادہ بہتر طور پر خُدا کی شبیہہ کے مماثل تخلیق کیے گئے ہیں۔"

اس تشریح سے بہت سے مسلمان فلسفی بھی آگاہ ہیں اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ اپنی تمام تر شان و شوکت کے باوصف فرشتے دائرے کے محیط سے نسبت رکھنے والی

Marfat.com

مخلوق ہیں یعنی اُن میں سے ہر ایک کسی ایک صفتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ اِن میں سے کوئی بھی کلی طور پر اس کی مجموعی صفات کا حامل نہیں، جب کہ انسان کامل، اگرچہ کہ وُہ انوارِ بہشتی سے بہت دُور ہے پھر بھی وُہ یُوں استادہ ہے جیسے خُدا کے عرش کے عین نیچے کھڑا ہو اور ذات باری کی تمام صفات کا عکاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اِنسان کی فطرت و طبیعت تکمیل اور توازن کے مراحل طے کر لیتی ہے تو اس کا وجود اور ذات ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور اس کے لیے اللہ کا نائب اور خلیفۃ الارضی بن جانا ممکن ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ فرشتے تو عدول حکمی کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور اس بنا پر ارتکاب گناہ کی قدرت سے بھی عاری ہیں۔ منشاء اور مرضیٔ الٰہی کے پُوری طرح مطیع و منقاد ہونے کی بنا پر وُہ ہر قسم کی ذمے داری اور قوتِ فیصلہ سے تہی ہیں۔ یہ ایک مزید بوالعجبی اور تضاد ہے، یعنی صرف خیر و شر میں اختیار رکھنے اور اسی سبب سے ارتکابِ گناہ کے قابل ہونے کی صلاحیّت رکھنے والی ہستی خُدا کی سرزمین پر اس کا "خلیفہ" اور نمائندہ ہے۔ ملائکہ اور حیوانات دونوں ہی اپنے مالک و خالق کی حکم عدولی نہیں کر سکتے، جب کہ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کیونکہ یہ اُسے تفویض کردہ ذمے داری اور اس کی برتر حالت کا لازمی جزو ہے۔

یقیناً یہی وُہ صورتِ حال ہے، یعنی انسانی وجود کی مرکزیت جو اُس سے بڑے عظیم جرائم کا ارتکاب ممکن بنا دیتی ہے۔ کسی مجرم کے متعلق بات کرتے ہوئے یہ کہنا کہ "اس میں حیوانیت ہے"، لغو سی بات ہے کیونکہ جانور کبھی کوئی جُرم نہیں کرتے۔ کوئی مخلوق جتنی بلند مرتبہ ہو گی اسی قدر پستی میں گرنے کی صلاحیّت رکھے گی۔ کچھ مُسلم فلسفیوں کا یہ کہنا کہ اللہ کے جملہ اسمائے حُسنہ (یا صفات) انسانی قلب میں جلوہ فگن ہوتے ہیں، اس بوالعجبی اور تضاد کی کلید فراہم کرتا ہے۔ ایک شخص سخی اور کریم النفس اس لیے ہوتا ہے کہ وُہ باری تعالیٰ کے اسم مبارک "الکریم" کی صفت کا آئینہ دار ہے۔ اسی طرح جو شخص حسنِ سیرت کا حامل ہے یا جو عورت جسمانی طور پر خوبصورت اور حسین ہے وُہ درحقیقت

Marfat.com

اللہ کے صفاتی نام "الجمیل" کا پرتو ہے۔ بعینہٖ، اسی طرح کوئی مضبوط انسان کبھی توانا نہ ہوتا اگر وُہ اللہ کی صفات 'القوی' اور القہار کا امین نہ ہوتا۔ لیکن بہرصورت اللہ، الاحد بھی ہے یعنی واحد اور تنہا، جس کا کوئی شریک نہیں، وُہ منفرد اور بے مثل ہے اور اسی نام (الاحد) سے ہر انسان کی انفرادیت وابستہ ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر انسان اپنی ذات میں ایک "عالم اصغر"، یعنی ایک چھوٹی سی مکمل دُنیا ہے۔

انگلستان میں ہر اُس بچّے سے، جو بہت زیادہ ضدیں کرتا ہو کہا جاتا ہے:

"ساحل پر پڑے تنہا تم ہی ایک سنگریزے تو نہیں ہو"

یہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی ذات کی پہنائیوں میں ایک اعتبار سے "واحد سنگریزہ" ہی ہے۔ حقیقت میں ہر شخص کوئی عام مرد یا عورت نہیں، بلکہ اپنی ذات میں "خاص" ہے۔ جب یہ روحانی صفت فانی انا سے مغلوب ہو جائے تو انسان اللہ کے علاوہ "خدا" بن جاتا ہے؛ گویا بادشاہ کے تخت پر اس کا نائب قابض ہو جاتا ہے۔ پھر وُہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ خدا کی "اصلی" تخلیق وہی ہے اور باقی سب انسان اس کی تفریحِ طبع کے لیے کھلونے ہیں یا اِس کی راہ کے روڑے۔ اِس کے ساتھ ہی وُہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس سے الگ، لوگوں کا کوئی وجود نہیں، کیونکہ یقیناً مخلوق، خدا سے ہٹ کر کوئی وجود نہیں رکھتی۔ انسان ہی وُہ واحد مخلوق ہے جو اپنے ابنائے جنس کو بالعموم قتل[1] کرتا ہے۔ وُہ دُوسرے انسانوں کو محض اِس لیے سزا دیتا ہے کہ وُہ راست روی کے اِس نمونے پر پُورے نہیں اُترتے جو اِس کے نزدیک مسلّمہ ہے اور وُہ ایسی قوّت اور مملکت کی ہوس رکھتا ہے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ وُہ حقیقتاً واحد اور منفرد ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں اور وُہ تنہا اپنی ذات میں سب کچھ ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انسان کو جو عظیم مراعات اور برتری حاصل ہے اِس کے برعکس بن جانا ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس سے کم تر مصائب بھی درحقیقت اُن محاسن ہی کا اُلٹ ہیں

---

[1] اللہ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام 'الممیت'، یعنی "مارنے والا" بھی ہے۔

Marfat.com

جو کسی نہ کسی انداز میں ذاتِ باری کے کمال ہی کے مظاہر ہیں اور تکلیف وہ انداز ہیں ہمارے علوئے مراتب کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ جانوروں کی راہ اس دُنیا میں ہر طرح محفوظ ہے جب کہ انسان تو تلوار کی دھار پر چلتا نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ فرشتوں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ یہ نئی مخلوق روئے زمین پر ضرور فساد پیدا کرے گی۔

قرآن مجید نے تخلیقِ آدم کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اور خدا نے فرشتوں کو آدم کے آگے سجدہ ریز ہو جانے کا حکم دیا تھا، اس میں ایک خاص نکتہ قابلِ لحاظ ہے، اور وُہ یہ ہے کہ آدم کو وُہ علم دیا گیا تھا جو فرشتوں کے پاس نہ تھا۔ اُسے تمام اشیاء کے نام تعلیم فرما دیے گئے تھے۔ یہ اُس کی فطرت کا ایک پہلو ہے جو خُدا کی صورت پر تخلیق ہوئی۔ کیونکہ بحیثیت خالق، اللہ تعالیٰ نے اُن تمام امکانات کو نام بنام گنوا دیا، جنہیں خزانۂ خداوندی سے خارج میں اس دُنیا میں اس کا مظہر بنتا تھا۔ بحیثیت "الباری" وُہ تمام اشیاء کو پیدا کرتا ہے اور بحیثیت "المصوّر" وُہ ان کی دنیا میں ظاہر ہونے والی مشکلوں کی صورت گری کرتا ہے۔ بہر حال، اس تمام عمل میں پہلا قدم، اُنہیں نام دینے کا عظیم تخلیقی عمل تھا۔

اسلام کو عام طور پر قانون کا مذہب سمجھا جاتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر وُہ "علم" کا مذہب ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ان میں کوئی تضاد ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے 'قانون' کے لیے جو عربی لفظ ہے اس کے بنیادی معنی تفہیم یا شعور کے ہیں، پس اس کا (قانون کا) تعلق علم سے ہے۔ کسی شے کے نام معلوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شے کو شعور میں بٹھا لیا جائے اور ذہانت کی آنکھوں سے اُس کا مشاہدہ کیا جائے۔ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ اللہ نے دانائی سے زیادہ عمدہ کوئی شے پیدا نہیں کی، اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "عالم، کسی عام نمازی کے مقابلے میں ایسا ہے جس طرح چودھویں کا چاند ستاروں کے مقابل" ——— اور قرآن کہتا ہے:

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ (البقرہ (۲): ۲۶۹)

Marfat.com

"وُہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بیشک اس کو بڑی نعمت ملی"

اور ایک دُوسری جگہ ارشاد باری ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر (۳۹): ۹)

"کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟"

اسلام کے نزدیک انسان نام ہے عقل وحکمت اور فہم وشعور کا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وُہ نیک یا قوی یا محبّت کرنے والی مخلوق ہے، لیکن ہم اِس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ وُہ عقل رکھتا ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔

کہیں ہم ایک لمحے کو بھی یہ خیال دل میں نہ لائیں کہ علم ودانش تو ہماری ملک ہے، ہم چاہیں تو اُسے ذخیرہ کر لیں، قرآن ہمیں فوراً ہی یاد دلاتا ہے!

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (النّور (۲۴): ۱۹)

"اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

آدمؑ کو اللہ نے تمام اشیاء کے نام سکھائے اور اسلامی روایت کے مطابق آدم ایک پیغمبر تھے، اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کو قرآن کریم اُسی منبع سے حاصل ہوا تھا جس سے آدم کو پیغمبری ملی، اور یہی وُہ واحد سرچشمہ ہے جس سے تمام علم ودانش کا اخذ واکتساب کیا جاتا ہے اور حضرت محمد مصطفیٰؐ "خاتم النّبیین" تھے جن پر حضرت آدمؑ سے شروع ہونے والی نبوت ختم ہوئی۔ اگر کسی مسلمان کو اسی سرچشمے سے کسب فیض کرنا ہو اور صاحب فہم ہونا ہو تو اس درجے پر پہنچنے کے لیے اس کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں رہ جاتی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وُہ اپنے کردار اور سیرت کو حضرت محمد مصطفیٰ کے اُسوۂ کامل پر ڈھالنے کی کوشش کرے، کیونکہ بقول قرآن:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ؕ (احزاب (۳۳): ۶)

"پیغمبر مومنوں پر اُن کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔"

Marfat.com

اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ آپؐ اہلِ ایمان کا "نفسِ ثانی" اِس سے بھی بڑھ کر، خود اُن کی ذات ہے اور باہم متضاد جذبات یا اجزا کا مجموعہ نہیں جسے ہم بالعموم "خودی" کہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کتب احادیث مسلمانوں کی زندگیوں میں اتنی اہمیت رکھتی ہیں حدیث کا خزانہ اتنا وسیع ہے کہ روشن خیال مسلمان بھی اکثر اوقات اپنے دوستوں کو ایسی حدیثِ رسول سُنا کر حیران اور خوش کر سکتے ہیں جو انہوں نے پہلے کبھی نہ سُنی ہو۔ آج ہم پیغمبرِ اسلامؐ کی سیرت کا جو گہرا علم رکھتے ہیں (جس کا بڑا حصہ حضرت عائشہ صدیقہ کا مرہونِ منّت ہے) وُہ بھی عملاً اتنی ہی اہمیّت رکھتا ہے جتنی کہ آپ کی تعلیمات اور بعض زیادہ اہم معاملات میں آپؐ کی پیش کردہ مثال کوئی بھی مومن اپنی زندگی میں حضرت پیغمبرِ اسلامؐ سے خود کو انتہائی قریب محسوس کرتا ہے اور مرنے کے بعد اُس سے بھی زیادہ قرب کی اُمید رکھتا ہے۔ وُہ اُن سے نہ صرف آقا اور ہادی ہونے کی حیثیت سے محبّت کرتا ہے بلکہ ایک مسلمان بھائی کی طرح بھی اور اسی رشتے کی روشنی میں ہم احادیث کے مجموعوں کے بعض ایسے اجزا اور واقعات کو پُوری طرح سمجھ سکتے ہیں جنہیں مغربی لوگ روزمرّہ کی نہایت معمولی باتیں خیال کرتے ہیں۔

حضورؐ کی زندگی کے بعض انتہائی معمولی واقعات ہی سے ہم آپؐ کے طرزِ بود و باش کا واضح اندازہ کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر آپؐ کی فہم و فراست کے متعلق۔ ایک مرتبہ کوئی عورت پیغمبرِ اسلامؐ کی اونٹنی کے ذریعے کچھ حملہ آوروں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے آپؐ سے بیان کیا کہ میں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس اونٹنی کے ذریعے میں بچ نکلی تو اسے اللہ کے نام پر قربان کر دُوں گی۔ یہ واقعہ سُن کر آپؐ نے فرمایا: "یہ تو بہت بُرا صلہ ہے۔ اللہ نے تو تجھے اِس کے ذریعے بچایا اور اب تو اُسے مار دینا چاہتی ہے۔ اسے جانے دے۔" اِس کے بعد غالباً آپؐ نے کچھ سوچ کر فرمایا: "اُس کے علاوہ یہ بات بھی تو ہے کہ یہ میری مِلک ہے۔" آپؐ کے اس ارشادِ مبارک سے بعض لوگوں کی اس تقدس مآبی کا حال ظاہر ہوتا ہے جو بڑی جلدی اپنی ذات

Marfat.com

کی خاطر دُوسرے لوگوں کے مفادات قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی نجی زندگیوں میں مداخلت حضرت پیغمبر اسلامؐ کو ناپسند تھی۔ یہ بھی ان کی قائدانہ زندگی کا ایک پہلوئے خاص ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کو سخت ناپسند کرتی تھی جس بنا پر اس نے شوہر کو گھر سے نکال دیا جب کہ خاوند اس پر بُری طرح مفتوں تھا۔ ابنِ عباسؓ کا کہنا تھا کہ اس واقعہ کو بیان کرتے وقت اس شخص کی تصویر ان کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی کہ وُہ روتا ہوا اس عورت کے پیچھے پیچھے مدینے کی گلیوں میں چل رہا تھا اور اس کے آنسو اس کی ڈاڑھی سے ٹپک رہے تھے۔ حضرت پیغمبرِ اسلامؐ نے اس عورت سے دریافت فرمایا کہ کیا وُہ اس شخص کو واپس اپنے گھر میں بلانا نہیں چاہتی؟ اس پر اس عورت نے پوچھا: "کیا آپ اس کا حُکم دے رہے ہیں؟" پیغمبرؐ نے جواب دیا: "میں تو محض اس شخص کی خاطر اس معاملے میں مداخلت کر رہا ہوں۔" اس پر اس عورت نے کہا: "اگر ایسا ہے تو پھر میرا جواب یہ ہے کہ مجھے اس شخص کی کوئی ضرورت نہیں!" مسلمانوں کی روایات میں ایسے واقعات، اپنی روح میں، حضرت آدم کا فرشتوں کے جمِ غفیر کو تعلیم دینے سے زیادہ مختلف یا تعجّب انگیز نہیں اور یہی بات مغربی دماغ قبول نہیں کرتا۔

الغزالی (وفات ۱۱۱۱ء) جنہیں سند سمجھا جاتا ہے، رقم طراز ہیں: "سچا مسلمان وُہ ہے جو باہر جانے اور لوٹ کر آنے، اپنی حرکات و سکنات، آدابِ طعام، رکھ رکھاؤ، سونے اور بولنے میں رسول اللہؐ کے اسوہ پر عمل کرے۔" اس لیے مسلمان کو پائجامہ پہنتے وقت بیٹھنا چاہیے، پگڑی کھڑے ہو کر باندھنا چاہیے، جب جوتا پہننے لگے تو داہنے پیر سے ابتدا کرے اور جب ناخن کاٹنا شروع کرے تو سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے آغاز کرے۔ الغزالی نے ایک ایسے متقی شخص کا ذکر کیا ہے جو اپنی انتہائی خواہش کے باوجود کبھی خربوزہ اس لیے کھا سکنے کی ہمت نہ کر سکا کہ اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اللہ کے رسول کس طریقے سے خربوزہ نوش فرمایا کرتے تھے۔ اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ آپؐ اس کی قاشیں تراشا کرتے تھے یا کسی چمچے سے کھُرچ کر اس کا گودا نکالا کرتے تھے؟ ہم

Marfat.com

بھی نہیں جانتے نہ جان سکیں گے؛ تاہم ظاہرہ باتوں میں رسولِ کریمؐ سے یہ مطابقت اس وقت تک بے معنی تصوّر ہو گی جب تک کہ اندرونی طور پر بھی اس نمونۂ کامل سے جسے اللہ نے انسانیت کے لیے رحمت اللعالمین بنا کر بطورِ انعام و کرام بھیجا تھا، کامل ترین مطابقت نہ پیدا کر لی جائے۔ حقیقی پیروی کے معنی یہ ہیں کہ مومن کی روح اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کی روح کے درمیان کامل مطابقت پیدا ہو جائے۔

کچھ پودے اور جھاڑیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں مناسب نشو و نما کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ زمین پر گر کر بے سمت پھیلنے لگتی ہیں اور رینگنے والے کیڑے اور دیگر حشرات اِن کی پتیوں کو لقمہ بنا لیتے ہیں اور اِن کا وجود بے مقصد رہتا ہے۔ انسان بھی ایک ایسی ہی چڑھنے والی بیل ہے اور ہمیں اِن مثالوں کے لیے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں کہ انسان کسی سہارے کے بغیر بڑھ ہی نہیں سکتا، نہ خالص انسانی حیثیت سے رو بہ عمل ہو سکتا ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی سُنت، نہ صرف ایک لائحۂ عمل مہیّا کرتی ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وُہ نہروں کا ایک ایسا شاخ در شاخ جال ہو جس میں اہلِ ایمان کا منشا و ارادہ داخل ہو کر محفوظ اور ہدایت یافتہ طریقے پر نہایت پُر سکون اور سہل انداز میں مثلِ آب، رواں دواں ہوتا ہے۔ یہ کسی مسلمان کا شیوہ نہیں کہ اپنی اختیار کردہ زندگی کے لیے سنگلاخ اور پتھریلے علاقوں میں نئی گُزر گاہیں تراشے اور چیزوں کے اصلی مزاج اور طبائع کے خلاف جائے۔ پہلی نظر میں تو انسان کو یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس سے تکلیف دہ یکسانیت پیدا ہوتی ہے؛ تاہم شواہد اس کے برعکس جاتے ہیں اور واضح کر دیتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ جسے بھی متقی اور پرہیز گار مسلمانوں سے قریبی ربط رہا ہے، جانتا ہے کہ اگرچہ کہ یہ لوگ ایمان اور طرزِ سلوک کے معاملے میں مختلف نہیں، اِن میں سے ہر ایک کی زندگی دُوسرے عام لوگوں سے الگ اور ممتاز ہے۔ اِن کے کردار زیادہ مضبوط اور ان کی شخصیتوں کے خطوط واضح ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگیاں ماورائی اقدار کے مطابق ڈھالی ہُوئی ہوتی ہیں جن کی خوبیاں اور حُسن کبھی ختم ہونے والا نہیں، جب کہ دُنیا دار لوگ اپنی زندگیاں

Marfat.com

زمانے کے طور طریقوں کے مطابق گزارتے ہیں۔ اسی بات کو ایک دُوسرے طریقے سے اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اخلاقِ حسنہ (یہاں یہ یاد رہے کہ مسلمان پیغمبرِ خدا کی نیکیوں اور اچھائیوں کو نمونہ بناتا ہے) انسانی طبائع میں انگنت طریقوں اور انداز سے اظہار پا سکتی ہیں جب کہ دُنیوی طور طریقے یکسانیت پیدا کرتے ہیں، مثلاً اشتہار بازی میں ایک ماڈل دُوسرے ماڈل جیسا ہی نظر آتا ہے۔

بہر حال اہلِ مغرب ان تمام باتوں میں فطری بے ساختگی کا فقدان اور "شخصیت" کو ملیا میٹ ہوتا ہوا پاتے ہیں۔ "بیساختگی" ایسے عمل کا نام ہے جو ہمارے وجود کی پہنائیوں سے خود بخود اُبھرے مگر فی زمانہ اس لفظ کا استعمال بہت غلط انداز میں ہو رہا ہے۔ اس کے معنی اب خارجی طور پر کسی اشتعال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی "بے ہودگی" ہے، حالانکہ بنیادی طور پر اب بھی یہ ایسا عمل ہے جو کسی محرّک کا منتظر نہ ہو اور یہ بات اب قطعاً فراموش کر دی گئی ہے۔ مسلمانوں کا طرزِ زندگی یقیناً ایسا ہے جو اُن واقعات سے پیدا ہونے والے خود کار ردّعمل کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا جو ہماری زندگیوں پر باہر سے "حملہ آور" ہیں اور مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق بھی اِن کی پذیرائی نہیں کرتا، تاہم یہی بات تو حقیقی بیساختگی کو بروئے کار لانے کے سامان پیدا کرتی ہے اور یہیں وُہ حدیث یاد آتی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام ؐ نے آہستگی اور سوچ سمجھ کر کام کرنے کو خوبی، اور جلد بازی کو "کارِ شیطان" قرار دیا تھا۔ حقیقی بیساختہ عمل، شخصیّت کی بالائی سطح سے ظہور میں نہیں آتا بلکہ یہ ہمارے وجود کی اتاہ گہرائیوں سے برآمد ہوتا ہے اور یہی وُہ سطح ہے جس پر پیغمبرِ اسلامؐ "مومنین سے اِن کی اپنی ذات سے زیادہ قریب ہیں"۔

بہت سے مُستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام، کسی انسان میں اپنی شخصیّت کا راستہ خود تلاش کرنے کی صلاحیّت پیدا کرنے کی بجائے کسی دُوسرے شخص کے نمونے کی تقلید کا حُکم دے کر اُس کی شخصیّت کو فنا کر دیتا ہے مگر یہی بات تو عیسائیت اور دیگر مذاہب کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ اب "اپنا آپ ہونا" ایک مبہم اصطلاح ہے جو کسی صاحبِ ایمان کے لیے ایک معنی رکھتی ہے اور کسی "لاادری" کے لیے جُدا معنی رکھتی

Marfat.com

ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے ظاہری وجود کی قربانی دینا مسلمانوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور بودھوں میں بنیادی روحانی ضرورت تسلیم کی جاتی ہے مگر چونکہ یہ ظاہری وجود، عالم اشیاء میں رہتا ہے، اِس لیے اِس ظاہری وجود کی قربانی اس ناگزیر انجام کو قریب تر کر دیتی ہے۔ (پیغمبرِ اسلامؐ کا ایک قول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "اپنی موت سے پہلے مر جاؤ") بہرصورت سوال یہ نہیں ہے کہ کیا ہم اپنا وجود کھو دیں کیونکہ یہ تو بہر حال ایک نہ ایک طریقے سے ہونا ہی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم "خود کو" "کہاں" گم کریں؟ روشنی میں یا اندھیرے میں؟ سہانے سپنوں میں یا ڈراؤنے اور بھیانک خوابوں میں، سچ میں یا جھوٹ میں؟

عجیب بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ انسانی وجود کو ایک بے معنی کائنات میں ایک لایعنی حادثہ سمجھتے ہیں (اور یہ اُن کے حسابوں سائنسی نظریہ ہے)۔ اس لیے اُنھوں نے ظاہری وجود کو تو اتنی اہمیت دے رکھی ہے اور ہر اُس چیز سے جو روائتی مذہب میں "غیر شخصی" نظر آئے، سخ پا ہوتے ہیں۔ بنا بریں وہ مجبور ہیں کہ محض انسانوں پر اعتبار کریں۔ خلا کی یخ بستگی اور وقت کے بھسم کرنے والے شعلوں میں بھی اس سے چمٹے رہیں۔ مگر اب یہ سوال اُبھرتا ہے کہ "شخص" یا "ذات" آخر ہے کون یا کیا؟۔ کیا یہ خود میں ہوں۔ ایک بچّہ، کھلنڈرا جوان، ادھیڑ عُمر مرد، سٹھیایا ہُوا بوڑھا اور بالآخر حوالۂ اجل ہونے والا انسان؟ ہم کسی طرح بھی قطعی سراغ نہیں پا سکتے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ کسی شخص کو ضعیف العمری اور بچپن میں ایک نسبت سی ہے جنہیں یادوں کا ایک کمزور سا تسمہ باندھے ہوئے ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ عملاً یہ وہ شخص نہیں۔

اس سے پہلے ہم نے انسانی شخصیت کو ایسے شہر سے تشبیہ دی تھی جس میں بے شمار فرقے رہتے ہوں۔ یہ بات اب صادق آتی ہے۔ ایک طرف تو وقتِ گزراں ہم پر مسلسل یورش کرتا اور ہمارے اندر تبدیلیاں لاتا رہتا ہے اور دوسری طرف ہمارا وجود کسی لمحے بھی "سالم و ثابت" نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں اپنی حقیقی ذات کی تلاش ہے تو اسے کہیں اور تلاش کرنا پڑے گا۔ 'توحید' دین یا مذہب میں۔ یہ وحدت ظاہر کی باطن سے ہے۔ ظاہر اور باطن کی شیرازہ بندی ہے۔ اگر ہم اپنی بیرونی یا ظاہری شخصیت کو ایک غیر متبدل مرکز کی ہی توسیع سمجھیں تو ہمیں اس ازلی

Marfat.com

اور ابدی سوال کا جواب مل جائے: یعنی یہ کہ "میں کون ہوں"؟ لیکن ہم یہاں رُک نہیں سکتے۔ اس سوال کے شافی و کافی جواب کے حصول کے لیے ہمیں ایک قدم اور آگے جانا ہوگا۔ یہ مرکزہ، جسے مسلمان (اور صرف مسلمان ہی نہیں، دُوسرے بھی) 'دل' کہتے ہیں، دراصل وُہ مرکز ہے جس کا محیط ہماری شخصیت ہے 'دل' اگرچہ کہ ہمارے اندر ہوتا ہے لیکن یہ ہمارا نہیں، خدا کا ہوتا ہے اور ازل سے خُدا ہی کے پاس موجود ہے، اور چونکہ یہ ہمارے اندر بھی ہے اس لیے یہی وُہ جگہ ہے جہاں وُہ موجود بھی ہے اور محیط کل بھی ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر ہم اپنے باطن کی تمام ظلمتوں اور خوابوں کو چیرتے داخل ہو جائیں تو ہم خود کو ایک ایسی کھلی جگہ میں پائیں گے جہاں ہر چیز موجود ہوگی۔ اس لیے پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ عَرَفَ رَبَّہٗ" (جس نے اپنا آپ جان لیا، اُس نے اپنے رب کو جان لیا)

مسلمان صوفیا، قلب کو 'برزخ' کہتے ہیں، یعنی ایک ایسی خاکنائے جس کے ایک طرف اس دُنیا کا پُرشور سمندر ہے جس میں ہمیشہ تلاطم برپا رہتا ہے اور دُوسری طرف وراء الوریٰ کا سماوی بحرِ ذخّار ہے۔ خاکنائے سمندر کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وُہ ان دو حصّوں کے درمیان وجہِ اتصال بھی ہے۔ اس طرف ایک قدم ڈال کر آپ "بحرِ تغیّرات" میں جا پڑتے ہیں لیکن اگر آپ اس تنگ خاکنائے یعنی برزخ کو عبور کر لیں تو پھر آپ کائنات کے بحرِ بے کراں میں چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ یہ برزخ دونوں سمندروں کی ملک ہے، عین اسی طرح جیسے یہ دل ہمارا ہوتے ہوئے بھی ہمارا نہیں۔

"خدا آگہی" اور "خود آگہی" میں جو رشتہ ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید یوں کہتا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ط (الحشر (۵۹): ۱۹)

"اور اُن لوگوں جیسے نہ ہونا جنھوں نے خُدا کو بھلا دیا تو خُدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے۔"

اور ایک حدیث قدسی ہے: "میری جگہ زمین میں ہے نہ آسمانوں میں اگر میری جگہ ہے تو میرے مومن بندے کے دل میں ہے۔"

کچھ لوگ اس حدیث قدسی کو غیر مستند سمجھتے ہیں، تاہم اس کی رُوح ہمیں اسلام کی بہت

Marfat.com

سی بنیادی تعلیمات میں کارفرما نظر آتی ہے اور اسی کی صدائے بازگشت ہمیں عیسائیت میں بھی سُنائی دیتی ہے۔ نہ صرف انجیلس سائی لیس (Angelus Sileius) کی اس تحریر میں (ہو سکتا ہے وُہ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوا ہو) جس میں اِس نے لکھا ہے کہ:

"سب سے اعلیٰ سب سے عظمت والے (رب) کو کسی پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا، پھر بھی وُہ ایک انسانی دل میں پوری طرح سما جاتا ہے"۔ یہ بات انجیلس ہی نے نہیں کہی مائسٹر ایکہارٹ (Meister Eckhardt) نے بھی کہا ہے کہ:

"خدا بے شمار زمین اور آسمان بنا سکتا ہے پھر بھی اِن کی (آسمانوں اور زمینوں کی) وقعت اس قلب سے جو خُدا سے لو لگا لے، ایک سوئی کی نوک سے زیادہ نہیں"۔ اگر کسی مومن کے کے قلب میں خالق کے لیے جگہ ہو تو یقیناً اس کی روح میں مخلوق کے لیے بھی جگہ ہو گی۔ انسان اپنے اندر کائنات لیے بیٹھا ہے، کائنات اُسے لیے نہیں بیٹھی۔

یہاں ہمیں زمین پر انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا ایک اور اشارہ ملتا ہے۔ انسانی قلب جو انسان کے وجود کا مرکز ہے، وُہ مقام ہے جہاں "دو سمندر" ملتے ہیں یہی ثریا اور ثریٰ میں نقطۂ اتصال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "دل کی آنکھ" ہی سے خُدا ہمیں دیکھتا ہے اور ہم خُدا کو دیکھتے ہیں۔ اس بات کو ایک ہمعصر مسلم مصنف نے ان الفاظ سے واضح کیا ہے:

"اگر زمین کو کسی بے روزن گھر سے تشبیہ دی جائے تو انسان کی حیثیت اِس گھر میں دیدبان کی ہے، اور اس کے دل کی آنکھ کو اس دیدبان کی وُہ واحد کھڑکی کہنا چاہیے جس کی طرف اس گھر کے رہنے والے اکتسابِ نور[1] کے لیے متوجہ رہتے ہیں۔ اس آنکھ کے بغیر انسان اپنی فطرت اصلی سے گر کر اپنے بنیادی فرائض و مقاصد بجا لانے سے قاصر رہتا ہے لیکن اگر اس کے اندر یہ آنکھ وا ہے تو وہ روحانی روشنی کا تنہا ارضی ظرف بن جاتا ہے جسے وہ اپنی ہم جنس مخلوق میں بانٹتا ہے....

---

[1] مولانا روم اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں "خانۂ بے روزن، جہنم کی طرح ہوتا ہے۔ کار دین محض روزن سازی ہے"۔ (مثنوی III۔ ۲۴۰۴)

Marfat.com

یہاں تک کہ باوجود اس امر کے کہ وُہ آسمانوں کا مالک نہیں، آسمان جھک کر اس کے اندر زمین کو چھوتے ہیں جو اس کا بلند ترین مقام ہے۔"[1]

یہ بات واضح ہے کہ اگر ہمیں اپنے حقیقی مقاصد و فرائض بجالانے ہیں تو پہلے ہمیں اپنی پہچان کرانی ہوگی اور پھر اپنا 'اصلی وجود' بننا ہوگا۔ جو شخص اپنے ہی مرکز سے ہٹ جاتا ہے وُہ تمام چیزوں سے دُور ہو جاتا ہے۔ وُہ نہ صرف اپنے آپ کے لیے اجنبی بن جاتا ہے بلکہ اس کائنات میں بھی اجنبی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وُہ اپنا مرکز دریافت کر پاتا ہے نہ بغیر امداد اپنا وجود اصلی۔ مسلمان کے لیے پیغمبرِ اسلام نہ صرف اس کی رہبری فرماتے ہیں بلکہ ایک پہلو سے آپؐ خود اس کی راہ بھی ہیں، کیونکہ آپؐ کو اپنے لیے ایک نمونہ بنا کر، آپؐ کی شخصیت کے سانچے میں ڈھل کر ہی ہم اپنی منزلِ مقصود تک کا سفر بآسانی کر سکتے ہیں۔ وُہ عمل جو ہمارے وجود کے حقیقی مرکز سے "بلاکسی بیرونی محرک کے" صادر ہوتا ہے، وہی اور صرف وہی دراصل "بیساختہ" عمل ہوتا ہے۔ اس لیے پیغمبرِ اسلامؐ کی تقلید کر کے ہی ہم صحیح "بے ساختہ پن" حاصل کر سکتے ہیں۔

مگر اب سوال ان لوگوں کا ہے جو پیغمبرِ خُدا کی ہدایت کو قبول نہیں کرتے یا ان کے نقشِ قدم پر نہیں چلتے؟ ان لوگوں کا کیا ہوگا جو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتے؟ ہمیں ان کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اچھے اعمال بھی میزانِ عدل پر بے وزن قرار پاتے ہیں، اور یہ بات کسی جدید لادری یا آزاد خیال عیسائی کے لیے سمجھنا سخت مشکل ہے۔

قرآن پہلے یہ پوچھتا ہے کہ وُہ کون ہیں جن کے اعمال رائیگاں گئے؟ پھر اس کا جواب یوں دیتا ہے:

اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ۝ (کہف (۱۸): ۱۰۳-۱۰۴)

---

[1] The Book of Certainty ابوبکر سراج الدین (صفحہ ۳۰: ۳۱)

"وُہ لوگ جن کی سعی دُنیا کی زندگی میں برباد ہو گئی اور وُہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔"

اور اسی بات کی مزید تصریح فرماتا ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (ابراہیم (۱۴): ۱۸)

"جن لوگوں نے اپنے پروردگار سے کُفر کیا اُن کے اعمال کی مثال راکھ سی ہے کہ آندھی کے دن اس پر زور کی ہوا چلے (اور) اُسے اُڑا لے جائے (اسی طرح) جو کام وُہ کرتے رہے اُن پر اُن کی کچھ دسترس نہ ہو گی۔ یہی تو پرلے درجے کی گمراہی ہے۔"

اور اسی پہلو پر مزید زور ان آیاتِ مبارکہ میں دیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ ۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ (النور (۲۴): ۳۹)

"اور جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اُسے پانی سمجھے۔ یہاں تک کہ جب اُس کے پاس آئے تو اُسے کچھ بھی نہ پائے اور خُدا ہی کو اپنے پاس دیکھے۔"

اور پھر ایک آیۃ مبارکہ میں اُن لوگوں کے متعلق جو اس دُنیا اور اس کی چمک دمک کی زندگی کے جویا ہیں، ارشاد ہے:

وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (ہود (۱۱): ۱۶)

"اور جو عمل اُنہوں نے دُنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وُہ کرتے رہے سب ضائع ہوا۔"[1]

---

[1] ایک متفق علیہ حدیث کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے پیغمبر اسلام

(باقی حاشیہ صفحہ ۴۰۸ پر)

Marfat.com

یہاں مسئلہ اخلاقیات کا نہیں، نہ اسے کسی پادری کے انداز ے کے مطابق، کفر کی سزا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو ایک انتہائی وسیع اور گہرا معاملہ ہے کیونکہ اس کا تعلق صداقت کی ماہیّت سے ہے یا شاید "غیر صداقت کی ماہیّت سے۔ انسان کی ظاہری شخصیت جب اپنے خالق سے تعلق توڑ دیتی ہے، جو اس کے وجود کا مصدر رہا ہے اور خود اپنے مرکز سے بھی کٹ جاتی ہے تو اس کی حیثیت ایک پرچھائیں کی رہ جاتی ہے، اور پرچھائیوں کی کوئی حیثیت نہیں نہیں ہوتی۔ اسلام کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ تمام مثبت اعمال کا مبداء اور سرچشمہ اللہ عزوجل ہے۔ اگر کسی انسان کا کوئی مرکز ہی نہیں تو اس کے نیک اعمال کو ثبات میسّر نہیں آسکتا کہ وہ روزِ حساب حق میں شمار کیے جا سکیں۔ سرابوں کے درمیان زندگی گزار کر، وہ صداقت ازلی کی نظر میں اجنبی بن جاتا ہے تا آنکہ یوم حساب اس کے واہموں کے تمام پردے چاک ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے تہی دست کھڑا ہوگا اور اس کی سابقہ زندگی بے اصل و حقیقت ہوگی۔[۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۷ کا) کو یہ کہتے سُنا "کہ تم میں کوئی اپنے اعمال کی بنا پر نہیں بچایا جائے گا تاہم اگر تم صراطِ مستقیم پر رہے اور اعتدال کی روش اپنائے رکھی اور صبح، شام اور رات کے کچھ حصّے میں نمازیں ادا کرتے رہے اور اخلاصِ نیت سے معتدل راہ پر رہنے کی کوشش کرتے رہے تو تم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکو گے"۔

[۱] بہت سے عیسائی اس عقیدے کو بے رحمانہ اور ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔ وہ اِس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اچھے لوگ حتیٰ کہ اچھے مار کسی بھی بغیر کسی سعی و کاوش کے بہشت میں جا براجیں گے؛ تاہم عیسائی خواہ رومی کیتھولک ہوں یا پروٹسٹنٹ بنیادی طور پر ایک دُوسرے پس منظر میں (یعنی بنیادی گناہ آدم کے پس منظر میں) یہی عقیدہ رکھتے ہیں، خاص طور پر لُوتھر کا یہ کہنا ہے کہ بغیر ایمان کوئی بھی اپنی روح کو عذاب و عقوبت سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اگر کسی نے پوری زندگی انسانیت کی مخلصانہ خدمت میں گزار دی ہو تو بھی اگر اس کے اندر ایمان نہیں تو سمجھیے یہ سارا عمل کسی شمار و قطار میں نہیں آتا۔ یہاں اِس اضافے کی ضرورت نہیں کہ (باقی حاشیہ صفحہ ۴۰۹ پر)

یومِ حساب گناہوں کی یا تو سزا دی جائے گی یا انہیں معاف کر دیا جائے گا؛ تاہم حقیقت کی کنہ کے بارے میں بنیادی غلطی لوگ کرتے ہیں، اسے اندھے پن سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اور قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ:

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل (۱۷):۷۲)

"اور جو شخص اِس (دُنیا) میں اندھا ہو وُہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور (نجات کے) رستے سے بہت دُور۔"

کُفر اور شرک کی بڑی خطاؤں میں اسلام نے ایک تیسرا گناہ بھی شامل کر دیا ہے، اور وُہ ہے ناشکر گزاری، مگر یہ کفر سے اتنی قریب ہے کہ دونوں کے لیے ایک ہی لفظ (کُفر، کفران) استعمال ہوتا ہے لیکن سیاق سباق سے صحیح مفہوم واضح ہوتا ہے۔ ناشکر گزاری میں شرک کا پہلو بھی نکلتا ہے کیونکہ ناشکر گزار ہو کر ہم اپنے آپ سے وُہ صفات وابستہ کر لیتے ہیں جو خُدا ہی کے لیے سزاوار ہیں اور اس طرح نعوذ باللہ خود کو "معبود" تصوّر کر لیتے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے:

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ (سبا (۳۴):۱۷)

"یہ ہم نے اُن کی ناشکری کی اُن کو سزا دی۔ اور ہم سزا ناشکرے ہی کو دیا کرتے ہیں۔"

اور اس کی وجہ نہایت واضح ہے جو اللہ ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (النحل (۱۶):۷۸)

اور خُدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۸ کا) کوئی بھی مسلم یا عیسائی عالمِ دین، اللہ کے کرم کے بحرِ بے کراں کو محدود نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کوئی بھی نہ اپنے واسطے اور نہ اُن دوسروں کے واسطے جو اپنے بنیادی انسانی فرائض اور ذمے داریاں نبھانے میں ناکام رہے ہوں، خدا کی رحمت پر اپنا استحقاق و اجارہ داری کا تصوّر دل میں نہیں لا سکتا۔

Marfat.com

اور اس نے تم کو کان اور آنکھیں اور دل (اور ان کے علاوہ اور اعضا) بخشے تاکہ تم شکر کرو۔"

اور اللہ اسی کی صراحت مزید ان آیات سے کرتا ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ وَالنَّھَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ (المومن (۴۰): ۶۱)

"خدا ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا (کہ اس میں کام کرو) بے شک خدا لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ ۚۖ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ ھُوَ الْحَیُّ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (المومن (۴۰) ۶۴-۶۵)

"خدا ہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے ٹھیرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی اچھی بنائیں اور تمہیں پاکیزہ چیزیں کھانے کو دیں۔ یہی خدا تمہارا پروردگار ہے۔ پس خدائے پروردگار عالم بہت ہی بابرکت ہے۔ وہ زندہ ہے (جسے موت نہیں) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو اس کی عبادت کو خالص کر کے اسی کو پکارو۔ ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔"

خدا نے آدمؑ اور ان کے اخلاف کو عقل و حکمت عطا فرمائی اور اس کے بدلے میں اس نے اپنی اندھی حمد و ثنا کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ یہ تقاضا کیا کہ وہ اشیا کی ماہیت اور مصدر کا صاف اور خوشگوار شعور پیدا کرے۔ اس لیے ہم پر واجب ہے کہ ہم اپنی اس صورت حال کی حقیقت کا ادراک کریں جو کاملاً اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کی مرہون منت ہے اور اس کی نعمتوں کے شکریے کی مستحق ہے۔

Marfat.com

جدید مغربی انسان کے لیے اس انداز کا "تکیہ" اور اطاعت ناقابلِ برداشت ہے؛ گو کسی حقیقی عیسائی کا یہ اندازِ فکر نہیں ۔ نشاۃ الثانیہ کے زمانے ہی سے مغربی انسان نے اگر اور کسی چیز پر نہیں تو، اپنی آزادی پر بے اندازہ ناز کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ آزادی خدا کے خلاف بغاوت، تقدیر کے خلاف بغاوت اور حد تو یہ کہ چیزوں کی اصل فطرت اور طبائع کے خلاف بغاوت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ (قدیم یونانی دیومالا کے مطابق) پرومیتھیئس (Prometheus) نے بہشت سے آگ چرالی تھی، اور اس نے اس کے بخشے جانے کا انتظار نہیں کیا تھا ۔ اور اگر یہی کردار اب مغربی انسان کے لیے مثال بن گیا ہے! مسلمان جو بڑی حد تک عملی انسان بھی ہوتا ہے، اسے کوئی کارنامہ نہیں سمجھتا، وُہ تو اُسے محض حماقت خیال کرتا ہے اور کہتا ہے حقائق تو حقائق ہی ہیں، ہمارا انحصار مکمل طور پر خُدا پر ہے اور یہاں بات ختم ہو جاتی ہے۔

اور اس انحصار کے شواہد ہمارے چار طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ ہزاروں اسباب ہیں جن سے ہمارا وجود ایک پل میں ختم ہو سکتا ہے۔ کوئی معمولی سی دوا ہم میں سے کسی ذہین ترین شخص کو مکمل طور پر فاترالعقل بنا سکتی ہے یا ہم میں سے بہادر ترین شخص کو پل بھر میں انتہائی ڈرپوک اور بزدل شخص میں تبدیل کر سکتی ہے۔ ہم اگر تجربے سے نہیں تو اپنے مطالعے سے یہ بھی جانتے ہیں کہ ایذا رسانی کے جدید طریقے جو آج گزشتہ زمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع انداز میں بروئے کار لائے جا رہے ہیں، انسانی عزتِ نفس کو لمحوں میں نیست و نابود کر سکتے ہیں۔

یہ عزتِ نفس جو ہمیں ملی ہے (اور خُدا کا نائب ہونا حقیقتاً انسان کے لیے باعثِ افتخار ہے)، کسی لباس کی طرح ہمیں عاریتاً حاصل ہے۔ جیسے کسی عورت کا حُسن مُستعار ہے، جیسے ہمارا ہر ہُنر (خواہ وُہ ہمیں ورثے میں ملا ہو یا اکتسابی ہو) مستعار ہے، جیسے ہمارے قویٰ اور ہمارے نیک اعمال مستعار ہیں۔ اگر ہم کسی چیز پر اپنا حق جتا سکتے ہیں تو وُہ ہماری کمزوریاں نقائص ہی ہیں جن میں ہمارے دنیاوی بداعمال بھی شامل ہیں۔ قرآن ہمیں اس بات کی یقین دہانی کراتا ہے کہ تمام حسنات (اچھائیاں) خُدا کی طرف سے ہیں اور سیّات (برائیاں) انسان کی

Marfat.com

طرف سے۔ ہمیں تو اپنی سانسوں تک پر بھی اختیار نہیں کیونکہ:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (لقمٰن (۳۱):۳۴)

"اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا۔ اور کوئی متنفّس نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں اُسے موت آئے گی، بیشک خدا ہی جاننے والا (اور) خبردار ہے۔"

ہماری ہستی خالصتاً عطیۂ الٰہی ہے۔ ہمارا شعور بھی عطیۂ الٰہی ہے اسی طرح ہماری آنکھیں، کان، ہمارے ہاتھ پاؤں حتّٰی کہ ہمارے اعضاء جنسی بھی۔ اور یہی نہیں، یہ پہاڑ، دریا، یہ نیلا سمندر، یہ ہوا، یہ ہماری سانسیں، یہ روشنی، یہ تاریکی جو ہمیں نیند اور آرام کے لیے دی گئی ہے، اور اس سے بھی آگے جو قوت بخش غذائیں ہمیں زمین سے فراہم ہوتی ہیں یا ہمیں طاقت بہم پہنچانے کے لیے جانوروں اور مچھلیوں کا وہ گوشت جو ہمارے لیے حلال کر دیا گیا ہے اللہ کی نعمتیں ہی تو ہیں؛ تاہم ان سب سے بڑھ کر وہ آگہی، جو ان تمام نعمتوں کا شعور اور ان سے حظ اُٹھانے کی صلاحیت بخشتی ہے، جو ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کو پہچاننے اور اس کا شکر ادا کرنے کی طاقت دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کے عطیات ہی تو ہیں۔

ناشکرے ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس عظیم عطیۂ خداوندی کو ہم اپنے تک پہنچنے سے روک دیں جو اُن تمام سے بلند و ارفع ہے؛ یعنی اللہ کی رحمت جس کا ثمرہ بہشت ہے، جہاں اللہ کی تمام نعمتیں شمار سے باہر ہیں۔ اس فانی جسم کے ساتھ، اور اس فنا پذیر دُنیا میں ہم خُدا کی حمد بیان کرتے ہیں اور اُس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ مسلمان کے نزدیک ہماری تخلیق کا مقصد ہی یہ تھا۔

مغرب کا انسان اُصولاً تو انسان کے ذاتِ باری تعالیٰ پر انحصار کا منکر نہیں۔ اگر وہ ایک عیسائی ہے تو وہ خود کو تاوقتیکہ حضرت عیسیٰؑ کی قربانی کا لہو اسے نجات نہ دلا دے، ایک بدبخت گنہگار ہی سمجھتا ہے جس کے لیے دائمی عذاب تیار ہے۔ اگر وہ "لاادری" ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ سائنسی نظریات ہی علم کا جامع ذریعہ ہیں، تو وہ خود کو توانائی اور ذرّوں کا "اتفاقی مجموعہ" سمجھتا ہے، (ایسے ہی جیسے کہ بندر کا بچہ بندر ہی ہوتا ہے) جس کی کوئی اہمیت نہیں۔ پھر بھی اس جہل کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی اس کی اکڑ اور ضد اس

Marfat.com

سے جُدا نہیں ہوتی۔ وُہ اپنے آپ کو فاتح فطرت سمجھتا ہے بلکہ اسی بنا پر خود کو خُدا پر بھی غالب خیال کرتا ہے جس پر اس کا ایمان ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ یہ طرزِ فکر ہمیں "پرومیتھس" سے ورثے میں ملی ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے جو صدیوں پہلے کے رُوم و یونان سے چلی آتی ہے جو آج اپنی روح کھو چکے ہیں۔ مغربی انسان کے دماغ کے نہاں خانوں سے عجیب و غریب ڈھانچے برآمد ہوتے ہیں۔

کسی بھلے دن، کسی خوش باش خاندان کی شکرگزاری ایک علیحدہ بات ہے لیکن مصائب، تکالیف اور نقصانات کے باوجود شکرگزاری بالکل جدا بات ہے۔ مصائب و آلام مُدت سے ہمارے ساتھ ہیں؛ تاہم جہاں تک ان کے مذہبی اور فلسفیانہ مباحث میں موضوع بن جانے کا سوال ہے، تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا آغاز بُہت پُرانا نہیں۔ یہ بات اس وقت ایک بڑا مسئلہ بنتی ہے جب انسانوں کی ایک بڑی تعداد یہ سوچنے اور محسوس کرنے لگتی ہے کہ ان مصائب و آلام کو نہیں ہونا چاہیے اور انسانوں کو دائمی مسرت کا حق حاصل ہے۔ آج بھی ایسے نیک اور اچھے عیسائی ہیں جن کے منہ سے انتہائی نقصان اور صدمے کی صورت میں بھی یہی نکلتا ہے کہ "رہے نام اللہ کا! وہی دیتا ہے اور وہی لے لیتا ہے۔" یہ وُہ لوگ ہیں جو نعمت پر خوش ہوتے، اور سلبِ نعمت کو صبر و شکر سے برداشت کر لیتے ہیں ـــ مگر ان لوگوں کی تعداد بُہت ہی قلیل ہے کیونکہ آج مغرب میں بیشتر لوگوں کا تصور یہ ہے: "وُہ خُدا جو ہمیں مصیبت اور دُکھ میں مبتلا کرے، ایمان لانے کے قابل خُدا نہیں ہو سکتا۔"

اس سلسلے میں مسلمانوں کے نظریے کی بنیاد اس آگہی پر ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اور جس قدر ہم اس سے لُطف و اطمینان حاصل کر رہے ہیں، در حقیقت خُدا کی طرف سے عاریتاً حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وُہ اس بات کے قائل ہیں کہ ہر انسان کے مقدر میں وہی کچھ ہے جو خُدا نے لکھ رکھا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں آتا ہے کہ:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰھَا (الطلاق (۶۵) : ۷)

"خُدا کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اُسی کے مطابق جو اُس کو دیا ہے۔"

Marfat.com

اور یہ کہ:

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۝ (النجم (۵۳): ۴۳-۴۴)

"اور یہ کہ وُہ ہنستا اور رُلاتا ہے، اور یہ کہ وہی مارتا اور جلاتا ہے۔"

اور یہ کہ:

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (بقرہ (۲): ۱۵۶)

"ہم خُدا ہی کا مال ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔"

وہیں قرآن مجید یہ کہتا ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ (۵۷: ۲۲-۲۳)

"کوئی مصیبت مُلک پر اور خود تم پر بھی نہیں پڑتی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں۔ ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔ (اور) یہ (کام) خُدا کو آسان ہے۔ تاکہ جو (مطلب) تم سے فوت ہو گیا ہو اس کا غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو اُس نے دیا ہو اس پر اترایا نہ کرو۔"

اس بات کا علم کہ خُدا ہماری جانوں کا اور سب موجودات کا واحد آقا اور مالک ہے، انسانی جذبات کو مانع نہیں کیونکہ یہ جذبات بھی تو خود خُدا ہی کے دیے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ جب پیغمبرِ اسلامؐ کچھ لوگوں کے درمیان مصروف تھے تو ان کی صاحب زادیوں میں سے ایک نے یہ پیغام بھیجا کہ ان کا کمسن بچّہ مرنے والا ہے تو آپؐ نے پیغام رساں کے ہاتھ یہ کہلا بھیجا کہ "اللہ جو لے لیتا ہے وُہ اُسی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ جو دیا ہے وُہ بھی اسی کا ہے اور اس نے ہر ایک کے لیے وقت مقرّر کر رکھا ہے"۔ آپؐ کی صاحبزادی نے اسی پیغام رساں کو پھر بھیجا کہ آپؐ سے تشریف لانے کی استدعا اُن کی جانب سے کرے۔ اس پر حضورؐ کچھ صحابہؓ کے ساتھ اُن کے گھر گئے اس وقت بچّہ نزع کے عالم میں تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ حاضرین میں سے کسی شخص نے

Marfat.com

پوچھا: "حضور! یہ کیا ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا: "یہ وُہ رحم ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے اور اللہ اپنے ان ہی بندوں پر رحم کھاتا ہے جو دُوسروں پر رحم کھاتے ہیں۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرزِ عمل سے اس قرآنی حکم کا کیسے تطابق کیا جائے جس میں رنج و ماتم نہ کرنے کو کہا گیا ہے ــــ یہاں یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ ہمیں اپنے جبلی جذبات کو ان کے فطری دائرے سے نکال کر فلسفیانہ اصولوں کے درجے پر فائز نہیں کر دینا چاہیے۔ اس حقیقت کے کہ "میں غمزدہ ہوں" معنی یہ نہیں کہ ساری دنیا خراب حال ہو چکی ہے۔ اگر مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ خُدا عادل نہیں۔ اسی طرح یہ سوچنا کہ چونکہ میری زندگی تاریک ہوگئی ہے تو کائنات پر سُورج نے چمکنا بند کر دیا ہے غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تکلیف اور ایذا کا مسئلہ اس وقت سر اُٹھاتا ہے جب ہم اپنے جذبات کو بالکل مخالف سمت میں موڑ دیتے ہیں اور آج کے زمانے میں یہی ہو رہا ہے۔

جب دُنیا کے عام لوگ بدقسمتی کا شکار ہوتے ہیں تو وُہ دہرے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف تو وُہ بدقسمتی ہوتی ہے جس کا درد وُہ محسوس کرتے ہیں۔ دُوسری طرف اِن کا یہ احساس اِن کے لیے عذاب بن جاتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا اور یہ کہ اس بدقسمتی کا وقوع پذیر ہونا ان کے لیے اس دُنیا کی انتہائی تلخ اور کریہہ بات ہے اگر خدا معرضِ بحث میں ہو تو اُسے بھی معاف نہیں کرتے) انہیں پہلا دکھ یہ ہوتا ہے کہ "کوئی چیز بھی ٹھیک نہیں۔" اس راہ کے (جس پر وُہ گامزن ہیں) اختتام پر ایک گہری کھائی ہے جسے ہم "مایوسی" کہتے ہیں جو مسلمانوں اور کیتھولک عیسائیوں دونوں کے نزدیک ایک عظیم گناہ ہے کیونکہ جو زخم ابتدا میں معمولی تھا، بتدریج پیپ زدہ ہو کر جسم کے تمام خون کو زہر آلودہ کر دیتا ہے۔

اب چونکہ کوئی بھی شخص مسلسل عذاب میں جو اپنے آپ پر پل رہا ہو، اور کسی خالی اور بے معنی دنیا میں جو رحم سے ناآشنا ہو، زندگی بسر کر سکتا ہے نہ ٹھیک سے کام ہی کر سکتا ہے، تو اس موڑ پر ایک

Marfat.com

تیسری برائی، جو دوسری تمام برائیوں سے کہیں زیادہ بڑی ہے، ان دو برائیوں میں شامل ہو جاتی ہے اور وُہ ہے "قلب کی سختی"۔ پرہیزگار مسلمان (اور پرہیزگار عیسائی) تو بدقسمتی کو اس لیے برداشت کر لیتا ہے کہ اُسے یہ یقین ہوتا ہے کہ جو ظلمت اُسے گھیرے ہوئے ہے وُہ جلد مِٹ جائے گی اور اس کے بعد روشن اُجالا ہے؛ خواہ اس کا دُور دُور تک پتا نہ ہو۔ مگر اس کی قوّتِ برداشت میں خُوبی اور برائی بہت زیادہ ہے جو ہمارے اُن حواس کو معطّل کر دے جن سے ہم، خُدا، قدرت اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ روابط و تعلق پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے وہ حالت کے مقابلے میں بد سے بدتر چیز بھی قابلِ قبول ہے؛ حتّٰی کہ شدید پست ہمتی بھی کیونکہ ان لوگوں کے لیے تو اُمید کی کوئی کرن بھی نہیں ہوتی جو روحانی طور پر خودکشی کر کے مَر جاتے ہیں۔ وُہ قوّتِ برداشت جس کے ساتھ قلب کی سختی نہ ہو صرف مذہبی بنیادوں پر قائم رہ سکتی ہے کیونکہ یہ انھی حالات میں باقی رہے گی جہاں توازن قائم رہے؛ یعنی دُوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہی تکلیف قابلِ برداشت ہے "جو قابلِ فہم ہو، اگرچہ اس کا ادراک مبہم اور غیر معیّن ہو"۔

مسلمان کو جو کچھ پیش آتا ہے اُس پر "آمنّا و صدّقنا" کہتا ہے، (یا کم از کم کہنے کی کوشش کرتا ہے جو اپنی جگہ کافی ہے، کیونکہ ایک حدیث ہے "الاعمال بالنیّات" یعنی اعمال نیتوں ہی سے جانچے جا سکتے ہیں) کیونکہ وُہ جانتا ہے کہ یہ تکلیف کہاں سے آئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وُہ یہ بھی جانتا ہے کہ دُنیا میں تزکیہ آخرت کے تزکیے سے کہیں بہتر ہے۔ عربی کے لفظ "تزکیہ" کے دوہرے معنی ہیں جو بڑے اہم ہیں۔ اس کا ترجمہ یا تو پاک و صاف ہونا کیا جا سکتا ہے، یا بالیدگی پانا۔ اس کی متعدد مثالوں میں سے صرف ایک مثال پیش کی جا سکتی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (اعلیٰ (۸۷): ۱۴) جس کے معنی کچھ مترجمین نے یہ کیے ہیں۔

"بے شک وُہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہُوا"

اور دُوسروں نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ "بے شک وُہ کامیاب ہے جس نے ترقی کی اور بڑھا"۔ انگریزی زبان دونوں معنی بیک وقت ادا نہیں کر سکتی۔ پھر بھی لفظ "تزکیہ" کے پیچھے پُورا فلسفہ ہے۔

Marfat.com

ایک قدیم چینی فلسفی "مینسی اس" (Mencius) کے قول کے مطابق "رنج و تکالیف زندگی دیتے ہیں جب کہ خوشحالی اور آسودگی موت۔" اس کے قول کا اعادہ اس کے بعد بہت بار کیا گیا اور قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ اور پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: "بہشت کو وہ چیزیں گھیرے ہوئے ہیں جنہیں تم پسند نہیں کرتے۔" اگر ہم بالیدگی اور بلوغت حاصل کرنا چاہتے ہیں (اور یقیناً یہ ہر مسلمان کی یہی خواہش ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی یہ زندگی تو درحقیقت آخرت کی زندگی کے لیے ایک مہلت ہے) تو بدقسمتی سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو اسے منفی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ جیسے کہ کوئی عام دُنیا دار دیکھتا ہے۔ مسلمان سے جو بہشت پر یقین رکھتا ہے، یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس دُنیا کو بھی بہشت سمجھے۔ اس نقطۂ نظر کے باعث وہ بے اندازہ تلخی اور رنج مکرر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

فلپ گی برتو (Phillip Guibertoau) ان فرانسیسی لوگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے اپنے ملک کی نوآبادیاتی دراز دستیوں کی تلافی اسلام کو پوری طرح سمجھنے سے کی۔ ان کی اس روش نے ان کے اپنے دین کو نقصان پہنچانے کی بجائے خود اسے پوری طرح سمجھنے کا سامان پیدا کیا۔ وہ کہتا ہے: "میں نے حجاز اور مراکش کی اسلامی سرزمین پر بیمار لوگوں کو دیکھا ہے جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے۔ جب ان کی تکالیف حد سے بڑھ جاتی ہیں تو وہ ضرور کراہتے ہیں، تاہم خدا کے خلاف وہ کبھی بھی حرفِ شکایت لب پر نہیں لاتے، نہ وہ خدا پر الزام دھرتے ہیں کہ وہ انہیں تکلیف دے رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے اس حد تک قطع تعلق کر لیتے ہیں کہ وہ یہ تک نہیں پوچھتے کہ انہیں صحت یاب ہونے میں کتنی مدت لگے گی یا یہ کہ وہ صحت یاب ہوں گے بھی یا نہیں؟ جب کہ دوسری طرف مغربی لوگ خواہ وہ کیتھولک ہونے ہی کا کیوں نہ دعویٰ کرتے ہوں، اس بات سے سخت غضبناک ہو جاتے ہیں کہ انہیں بیماری نے کیوں آن گھیرا ہے اور کہتے ہیں بھلا ایسی بات میرے ساتھ کیوں ہوگئی؟"[۱]

---

[۱] Phillip Guiberteau, Islam Occident et chrelenet

Marfat.com

گی برتو کا کہنا قطعاً تعجب خیز نہیں کہ شمالی افریقہ کی سرزمین ہی پر بہت سے یورپینوں نے مافوق الفطرت ہستی کا شعور دوبارہ دریافت کیا ہے ۔ یہ ایسی سرزمین ہے جہاں "ان لوگوں کا ایسے لوگوں سے سامنا ہوا جنہیں اَن دیکھے خُدا پر اس قدر گہرا ایمان ہے کہ وُہ اس پر مر مٹتے ہیں اور انہیں اس چیز سے نفرت ہے جو غیر اللہ ہے۔"
"مر مٹنا" کہئے یا "جینا" ہر کسی کے اپنے خیال کے مطابق ہو سکتا ہے کیونکہ آخر تو ابدی زندگی، ہمارے دنیوی تجربے کی میزان پر، موت ہی تو ہوتی ہے۔ "کُل" میں تمام اجزاء کی موت شامل ہے۔ شمع کی روشنی سُورج کے سامنے بے حقیقت ہو جاتی ہے۔

جو لوگ اپنے آپ کو صرف اجزا کی صورت میں دیکھتے ہیں ان کے لیے آلام و مصائب، ایذا اور تکالیف ایسے ہیں گویا وُہ سب سے کٹ کر رہ گئے ہوں اور اسی لیے وُہ انہیں ایک ناقابلِ برداشت حملہ سمجھتے ہیں۔ مسلمان کے لیے اس کی ذات اور اس کی تقدیر ایک ہی ہیں۔ جو کچھ بھی اس کے تجربے میں آتا ہے اسے کسی طرح بھی ایک خارجی امر تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم اس بات کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ (آلِ عمران (۳): ۱۶۵)

"(بھلا یہ) کیا (بات ہے کہ) جب (اُحد کے دن کفّار کے ہاتھ سے) تم پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ (جنگِ بدر میں) اس سے دوچند مصیبت تمہارے ہاتھ سے اُن پر پڑ چکی ہے تو تم چلّا اُٹھے کہ (ہائے) آفت (ہم پر) کہاں سے آپڑی کہہ دو کہ یہ تمہاری ہی شامتِ اعمال ہے"

لفظ "مکتوب" (یعنی لکھا ہوا یا مقدر بندھا ہوا) کا مطلب یہ ہے کہ جو ہمیں درپیش آتا ہے وُہ ازل سے ہمارا مقدر ہوتا ہے؛ لہٰذا اس بات کی آرزو کرنا کہ اے کاش ہمیں کچھ اور درپیش آتا حقیقتاً اپنے سوا کچھ اور بننے کی آرزو ہے جو گمراہ کُن منفی ذات ہے بلکہ اپنے خالق ہی کی ہے جس نے ہمیں جو کچھ دینا تھا، دے دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: "جہاں تک اچھی باتوں کا تعلق ہے تو ان کے آرزومند

Marfat.com

رہو جو تمہارے لیے فائدہ مند ہیں۔ اس میں اللہ کی امداد اور استعانت طلب کرو مگر ایسا کرنے میں کوئی کوتاہی ظاہر نہ کرو۔ اگر تمہیں کو مصیبت در پیش ہو تو یہ نہ کہنے لگو کہ اگر میں نے ایسا اور ایسا کیا ہوتا تو یہ مصیبت درپیش نہ آتی بلکہ یہ کہو کہ اللہ کا حکم یہی تھا اور وُہ جو چاہتا ہے کرتا ہے کیونکہ یہ کہنا کہ اگر میں ایسا کرتا، شیطان کے لیے راستہ بنا دیتا ہے۔

عالم اسلام میں جبر و قدر کے مؤیدین میں بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ دونوں گروہوں نے اپنے خیالات کی تائید میں قرآن اور کتب حدیث کے حوالے سے خاصے سطحی دلائل دیے ہیں۔ ان لوگوں نے یہ سب بحثیں اس امر کے باوجود کیں کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت بیان کی جاتی ہے: "رسولِ خداؐ اس وقت ہمارے پاس تشریف لائے جب ہم تقدیرِ الٰہی کی ماہیت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ آپؐ یہ دیکھ کر انتہائی برہم ہو گئے اور آپؐ کا چہرہ اس طرح سُرخ ہو گیا گویا کہ کوئی انار کا دانہ آپؐ کے رخسار دل پر پھٹ گیا ہو، اور آپؐ نے فرمایا: 'کیا تمہیں یہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی سب کے لیے میں تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں؟ تم سے اگلے لوگ انہی معاملات کے متعلق سوالات پوچھنے کی وجہ سے تباہ ہوئے۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں'۔۔۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ ان معاملات کے متعلق کبھی بحث و تمحیص نہ کرنا"

یقیناً دو باتیں ایسی ہیں جنہیں ہمیں ہر ممکن طریق پر حل کرنا چاہیے یا پھر اس کا حل کسی زیادہ صاحب فہم کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ سب سے اوّل تو یہ کہ خُدا کے "علیم و خبیر" ہونے کا نظریہ بے معنی ہو گا اگر ہم اس امر کو تسلیم نہ کریں کہ خدا نہ صرف اس بات کو جانتا ہے جو ہو چکی ہے بلکہ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو پیش آنے والی ہیں؛ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ "مستقبل" ایک اعتبار سے پہلے ہی "ماضی" بن چکا ہے۔ بقول انجیل: "جو ہو چکا ہے وُہ آج ہے، اور جو ہونا ہے پہلے ہی ہو گزرا ہے[1]"۔ کسی عالمگیر شہرت کی مالک شے کی وضاحت اس کے ہوتے ہوئے غیر ضروری ہوتی ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!

---

1. Ecclesiastes 3 : 15.

Marfat.com

دُوسری بات یہ ہے کہ بحیثیت انسان چونکہ وقت ہم پر اثر انداز ہے اور ہم مستقبل کو نہیں دیکھ سکتے اس لیے ہمیں کسی راہ کو اختیار کرنے کی آزادی ہے جو اپنے طور پر درست بات ہے اور اسی اعتبار سے ہم پر یہ بھی واضح اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ مکمل ترین آزادی خُدا ہی کو حاصل ہے۔ ہم کوئی راہ چلتے اور اس پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی امر واقعہ ہو گزرا ہو اور وہ دن تمام ہو جائے تبھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو مقدّر کا لکھا تھا؛ یعنی مکتوب تھا؛ یعنی ازل ہی سے ہمارا مقسوم تھا۔ لیکن اس وقت تک دُوسرا دِن طلُوع ہو چُکا ہوتا ہے جس میں ہمیں دُوسری راہوں اور امور کا انتخاب کرنا ہوتا ہے تو اگر ہم واقعی مسلمان ہیں تو ہم اس میں وقت ضائع نہیں کر سکتے کہ اگر یوں ہو جاتا تو کیا ہوتا، جو کہ حقیقت میں کبھی نہیں ہو سکتا۔

یہاں بھی ہمیں اس حقیقت کو مدِّ نظر رکھنا ہوگا کہ مومن اور کافر میں فرق دراصل فکر کی دو الگ کائناتوں یا دو مختلف احساسات کا فرق ہے۔ اگر کسی "لاادری"، یا متشکک (اگر ایسا شخص واقعی ہے!) کو بتایا جائے کہ تقدیر کا لکھا کبھی ٹل نہیں سکتا تو وُہ اپنے آپ کو قفس میں ایسا جانور سمجھتا ہے جیسے کسی اجنبی مخالف قوّت نے بجبر قید کر رکھا ہو۔ دُوسری طرف مومن اگرچہ بہشتِ ارضی سے محروم ہے، کبھی قربِ الٰہی سے محروم نہیں ہوتا، نہ اس کے حضور، جس کی بنائی ہوئی تقدیر کے سہارے وُہ جیتا اور مرتا ہے، خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔

عربی میں آدمیوں کے لیے "اِنس" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کا براہِ راست تعلق اُنس (تعلق و محبّت) سے ہے اور یہ ذاتِ الٰہی سے تعلق قریبی کے اظہار کا ایک نفیس طریقہ ہے؛ یا کم از کم اس گہرے باہمی ربط کا مظہر ہے جو خُدا اور انسان کے درمیان ہے اسی باہمی ربط کے حوالے سے ہم عبادت کی ماہیّت اور مسلمان کی زندگی میں اس کی اہمیّت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

آقا و غلام کے تصوّر سے، جسے اسلامی پس منظر میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے مسیحی بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ مذہب کو اپنے دین کے مقابلے میں ایک غیر شخصی عمل سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

اور اکثر پوچھتے ہیں آیا مسلمان اپنے خالق سے شخصی اور دو طرفہ تعلّق کا تصوّر رکھتے ہیں؟ جب کہ دُوسری طرف مسلمان خُدا کے ہر طرح بے نیاز اور مستغنی ہونے پر زور دیتے ہیں اور انہیں عیسائیوں کے اس عقیدے سے صدمہ پہنچتا ہے کہ خدا کو کسی "پُراسرار" انداز میں انسان کی ضرورت ہے"۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے عقیدے میں ایک بنیادی فرق ضرور موجود ہے؛ تاہم کسی حد تک اس کا تعلق بات کو پیش کرنے کے انداز سے بھی ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے خالق اور بندے کے درمیان دو طرفہ تعلقات کے جس کا ایک پہلو ایک کو دُوسرے کی ضرورت بھی ہے، معنی یہ نہیں کہ خدا کو نعوذ باللہ اپنے اندر کسی کمی یا کمزوری کے باعث ہماری ضرورت ہے بلکہ یہ کہ وُہ اس بات پر راضی ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ دو طرفہ تعلّقات ایک طرف ہماری ضرورت ہے اور دُوسری طرف خُدا کی بے پایاں بخشش اور کرم سے عمل میں آتے ہیں۔

قرآن خُدا کو بھُول جانے کی مذمّت ان الفاظ میں کرتا ہے:

نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَہُمْ ط (توبہ (۹): ۶۷)

"انہوں نے خُدا کو بھلا دیا تو خُدا نے اُن کو بھلا دیا"

خدا نے غفلت، بے حسی اور لاتعلقی کی روش کی اصلاح کے لیے مسلسل انداز سے آگہی اور باخبری حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ بعض مواقع پر اس باخبری کو لفظ "تقویٰ" سے ظاہر کیا گیا ہے جس کا ترجمہ خوفِ خُدا یا خدا آگہی، کے نکلتے ہیں۔ کبھی اس باخبری اور آگہی کے حصول کے لیے 'ذکر' پر زور دیا ہے جو اسلام کی ایک کلیدی اصطلاح ہے جس کے معنی یاد کرنا یا نام لینا ہیں۔ اللہ قرآنِ حکیم میں فرماتا ہے:

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (بقرہ (۲): ۱۵۲)

"سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا"

اور اسی ذکر اور یاد الٰہی سے دل طمانیت اور سکون پاتے ہیں:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرّعد (۱۳): ۲۸)

"اور سُن رکھو کہ خُدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں"

Marfat.com

عبادت یا نماز کو بھی "ذکر" کہا گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ خدا کا ذکر عبادت ہی ہے کیونکہ اس کے بارے میں سوچنا اور اُسے یاد رکھنا ایسا ہی ہے جیسے عبادت کرنا، اور یہ عبادت اور یادِ الٰہی ہی وہ راستہ اور طریقہ ہے جس سے آدمی کا ظاہر و باطن جو اپنے دُنیوی تجربات کی وجہ سے سخت ہو گیا ہے، پگھل جاتا ہے۔ ان میں رجوعِ الٰہی کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اللہ فرماتا ہے:

ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ (الزمر (۳۹) : ۲۳)

"پھر اُن کے بدن اور دل نرم (ہو کر) خدا کی یاد کی طرف (متوجہ) ہو جاتے ہیں۔"

اور پھر اُن لوگوں پر افسوس کیا گیا ہے جن کے دل یادِ خدا سے غافل ہیں:

فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ (الزمر (۳۹) : ۲۲)

"پس اُن پر افسوس ہی ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔"

مزید ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ (طٰهٰ (۲۰) : ۱۲۴)

"اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔"

قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کو صرف ایک مقصد کی خاطر پیدا کیا گیا اور وہ ہے "عبادت"۔ اور وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس عبادت اور دُعا کا فوری طور پر جواب بھی دیا جاتا ہے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (المؤمن (۴۰) : ۶۰)

"اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دُعا کرو، میں تمہاری (دُعا) قبول کروں گا۔"

عبادت ایک طرح کی مناجات ہے لیکن صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو عبادت میں اپنے خالق سے ہم کلام ہونے کی اہل ہے۔ باقی سب مخلوقات صرف تسبیح اور حمد و ثنا ہی کرتی ہے مگر وہ غیر شعوری طور پر ایسا کرتی ہے کیونکہ یہ اس کی جبلّت ہے۔ اس ضمن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

Marfat.com

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ (بنی اسرائیل (۱۷) : ۴۴)

"ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ اُن میں ہیں سب اُسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ لیکن تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔"

مولانا جلال الدین رومی سے ایک عبارت منسوب ہے جس کے مطابق "رات کی ظلمت، دن کی آب وتاب، سورج کی زرنگار شعاعیں، چاند کی خنک روشنی، پانی کی گنگناہٹ اور تتلیوں کی سرگوشیاں، آسمان کے ستارے، زمین کی خاک، پہاڑوں کے پتھر، ریگزاروں کی سیت، سمندروں کی موجیں، اور بحروبر کے جانور تیری حمد و تسبیح کرتے ہیں مگر اِن کی حمد و تسبیح ناقابلِ فہم ہوتی ہے جب کہ انسان کو قوتِ گویائی کی نعمت کے ساتھ ذہانت بھی عطا کی گئی ہے جو تقریر میں ربط پیدا کرتی ہے، جو ہم کلامی کا سبب بن جاتی ہے۔ انسان عبادت کرتا ہے اور عبادت اسے بناتی سنوارتی اور نکھارتی ہے، اور زاہد عابد خود مجسم عبادت بن جاتا ہے یعنی وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جہاں زمین و آسمان ملتے ہیں اور اس صورت میں گویا پوری کائنات اُس کے اندر ہوتی ہے اور اس کے ساتھ شامل ہوتی ہے، اور وہ ہر اس جگہ ہوتا ہے جہاں فطرت محوِ عبادت ہوتی ہے اور وہ اس کے ساتھ اور اس کے اندر عبادت کرتا ہے یعنی ان بلند چوٹیوں کے ساتھ مل کر عبادت کرتا ہے جو آسمان اور ابد کو چھوتی ہیں، اور اس پھول کے اندر عبادت کرتا ہے جو بکھر جاتا ہے یا کسی پرندے کے ترک کردہ گیت میں عبادت کرتا ہے[1]۔"

اور یہی ہے کارِ منصبی کسی "خلیفہ" ارض یا خدا کے نائب کا اور اسی کے لیے انسان کو تخلیق کیا گیا، اور اس منصب کی بجا آوری کے دوران میں عبادت ہی اس کا رنگ روپ نکھارتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلام کے نواسے، حضرت حسنؓ، سے پوچھا گیا کہ وہ لوگ

---

1. Schuon, F., Spiritual Prospective and Human Facts, p.213

Marfat.com

جو رات کا بڑا حصّہ عبادت میں گزارتے ہیں ان کے چہرے تابدار کیوں نظر آتے ہیں جواب میں انہوں نے فرمایا: "یہ اس لیے ہے کہ وہ (رات میں) اس الرّحم الرّحمین کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں جو انہیں اپنے نور سے ڈھانپ لیتا ہے۔"

انسان کے لیے جو لُطف و کرم کا عالم بھی ہے اور ساتھ ہی بڑے مہیب خطرات سے بھی دوچار رہنا ہے، زندگی نام ہے فانی، عارضی کے باقی و مستقل کی طرف سفر کا یا اسے پراگندگی کی طرف نقل و حرکت کہہ سکتے ہیں۔ امام غزالی کے مطابق "غیر مرئی میں ایسے ایسے مناظر و عجائب ہیں جن کے آگے ہماری اس محسوس اور مرئی دُنیا کی اشیاء مناظر کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ وُہ شخص جس کی معراج وُہ دُنیا نہ ہو، ایک وحشی جانور ہے کیوں کہ جنگلی درندے پر پرواز ہی نہیں رکھتے سو یہ جان لو کہ میری دُنیا غیر مرئی دُنیا کے مقابلے میں ایسے ہی ہے جیسے مغز کے سامنے چھلکا، یا جیسے روح کے مقابلے میں جسم، یا نور کے مقابلے میں ظلمت وُہ جو ملاءِ اعلیٰ میں سے، خُدا کے ساتھ ہے اور اس کی دسترس میں غیر مرئی کی کنجیاں ہیں۔[1]"

یہاں پھر ہمیں ایک تضاد نظر آتا ہے، یعنی انسان بحیثیت دو دنیاؤں کی مخلوق کے یا اسی بات کو دُوسرے انداز میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ایک جسم واحد میں دو شخصیتیں رکھتا ہے۔ ایک شخصیت فنا ہو جانے والی ہے جب کہ دُوسری لافانی۔ خُدا اور بندے کے مابین گفت گو کا تصوّر ذہن میں مشکل آتا ہے مگر اس سے زیادہ دشوار یہ تصوّر ہے کہ خُدا اپنے منتخب کردہ نائب سے ہم کلام ہو۔ مگر حدیث قدسی سے واضح ہوتا ہے (حدیث قدسی وہ اقوال پیغمبر اسلامؐ ہیں جن میں خُدا نے براہ راست آپ کے وسیلے سے بات کی) کہ دو طرفہ بات چیت کا امکان ہے۔

حدیثِ قدسی ہے: "میں ہوتا ہوں (اپنے بندے) کے ساتھ جب وہ میرا نام لیتا ہے یا جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، اگر وہ اپنے آپ سے میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اپنے آپ سے کرتا ہوں، اگر وُہ بالشت بھر بھی میرے قریب آتا ہے تو میں اُس سے گز بھر قریب آجاتا ہوں

---

[1] حوالہ از المشکوٰۃ الانوار از امام غزالیؒ۔

Marfat.com

اور اگر وُہ مجھ سے ایک گز قریب آتا ہے تو میں اُس سے ایک جریب تک قریب آجاتا ہوں، اور اگر وُہ میری طرف قدم قدم چل کر آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔"
یہاں دُعا و عبادت کے جواب کی یا محض خُدا کے ذکر کی بات بے پناہ وسعت و اہمیت اختیار کر جاتی ہے کیونکہ خدا کا قرب ہر ممکنہ انعام سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ جہاں تک انسانی عاجزی والحاح کا تعلق ہے تو خُدا نہ صرف اسے سُنتا ہے بلکہ اُسے اِس کا انتظار رہتا ہے:

"ہمارا رب جو عظیم و بابرکت ہے، ہر شب جب دو تہائی رات گزر چکتی ہے تو وُہ سب سے نچلے آسمان پر اُتر آتا ہے اور دریافت کرتا ہے: ہے کوئی جو مجھ سے درخواست کرے تاکہ میں اُسے قبول کر لوں؟ ہے کوئی جو مجھ سے طلب کرے تاکہ میں اُسے دُوں؟ ہے کوئی جو مجھ سے معافی طلب کرے تاکہ میں اُسے معاف کروں؟"

ایک دُوسری حدیث کے مطابق اللہ نے ہماری بے وقعت اور حقیر دُنیا میں ایسے فرشتے اُتارے ہوئے ہیں جو سڑکوں پر چل کر ان لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جو اللہ سے لو لگائے ہوئے ہیں، اور اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اور جب اُنہیں ایسے لوگ نظر آجاتے ہیں تو وُہ ایک دُوسرے کو آواز دے کر کہتے ہیں: "یہ رہے وُہ لوگ جنہیں تم ڈھونڈ رہے تھے۔" اور پھر وُہ ایسے لوگوں کو اپنے پروں میں سمیٹ کر نچلے آسمان تک لے جاتے ہیں اور وُہ مالک الملک (اگرچہ وُہ دانا و بینا ہے) ان سے پوچھتا ہے یہ عبادت گزار کیا کہہ رہے تھے؟ اور فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اے خالق و مالک یہ لوگ تیری تسبیح بیان کر رہے ہیں، حالانکہ اُنہوں نے تجھے کبھی نہیں دیکھا۔ وُہ جنّت کی دُعا مانگ رہے ہیں اگرچہ انہوں نے کبھی جنّت کو نہیں دیکھا، اور وُہ دُوزخ سے پناہ طلب کر رہے تھے اگرچہ انہوں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔ تب مالک و خالق اپنے فرشتوں سے کہتا ہے: "میں چاہتا ہوں کہ تم اس بات کے گواہ رہو کہ میں نے انہیں بخش دیا ہے۔"

کم از کم ہر کوئی خُدا سے ہم کلام ہونے کی جستجو نہیں کرتا۔ زیادہ تر جو لوگ عبادت یا دُعا میں اللہ کی طرف منہ کرتے ہیں وُہ یا تو خوف سے ایسا کرتے ہیں یا اپنی مراد پوری ہونے کے لیے۔ جو لوگ خوف کی وجہ سے اللہ سے رجوع کرتے ہیں وُہ عفو و بخشش کی طلب

Marfat.com

میں ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ خُدا کو اِس سے غرض نہیں کہ لوگ کس مقصد کے لیے اس سے رجوع کرتے ہیں۔ وُہ تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ اسے یاد کریں اور اُس سے نسبت قائم رکھیں، اس کی تصریح ایک عجیب و غریب حدیث سے ہوتی ہے جو کسی انتہائی مستند محدث سے روایت نہ ہوتی تو یقیناً ضعیف تصوّر کی جاتی۔ یہ حدیث یوں بیان کی گئی ہے کہ "اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر تم لوگ گنہگار نہ ہوتے تو اللہ تمہیں ہٹا کر وُہ لوگ لاتا جو گناہ کرتے اور پھر اللہ سے عفوو معافی طلب کرتے اور اس کے نتیجے میں بخش دیے جاتے۔" اور ایک حدیثِ قدسی کے مطابق: "اللہ نے فرمایا، اے ابنِ آدم! جب تک تو مجھے پکارے گا اور میرا خواستگار اور طالب ہوگا، جو کچھ تو نے کیا ہے میں معاف کر دُوں گا اور اسے قطعی نظر انداز کر دُوں گا۔! اے ابنِ آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی بلند ہوجائیں اور پھر بھی تو مجھ سے بخشش طلب کرے تو میں تجھے بخش دُوں گا! اور اے ابنِ آدم اگر تو میرے پاس اِس دُنیائے خاکی جتنے بڑے گناہوں کے ساتھ بھی آئے اور میرے رو برو ہو کر کسی کو میرا شریک نہ بنائے تو میں تجھے اتنی ہی بڑی مغفرت عطا کروں گا۔!"

اِن باتوں اور ان مقولوں کا تعلق عمومی طور پر عبادات سے ہے اور غالباً سب سے زیادہ 'ذکر' یعنی یادِ الٰہی سے ہے جو لُبِ لباب اور روح ہے تمام عبادات کی ــــ لیکن مسلمان اس دُعا میں جو مناجات کی صورت تنہائی میں خُدا سے مانگی جاتی ہے اور اس دُعا میں جو پنجوقتہ فرض نمازوں میں مانگی جاتی ہے، فرق کرتے ہیں۔ پنجوقتہ نماز کی تاثیر انفرادی صورتحال احساسات یا میلانِ طبع پر منحصر نہیں۔ یہ تو ایک فریضہ ہے اور خُدا کا مقرر کردہ ایک طریق کار، جسے ادا کرنا تمام انسانوں پر واجب ہے۔ اِن کی ادائیگی سے قبل 'وضو' کرنا ہوتا ہے جو جسم پر جمی ہوئی کثافت اور میل کو دھو ڈالتا ہے۔ پھر کعبے کی طرف منہ کرکے یہ نیّت کرنا ہوتی ہے کہ فلاں فلاں نماز ادا کرنی ہے یا اس میں شریک ہونا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام اور عیسائیت میں "ہبوطِ آدم" کے نتائج کی مختلف توجیہات کی جاتی ہیں۔ اسلام یہ قبول نہیں کرتا کہ کوئی گناہ، یا "ہبوط" انسانی مخلوق کی باطنی کیفیت

Marfat.com

کا تعین کر سکتا ہے اور اس نظریے کے تحت اِنسان اس مرتبے کو ضائع نہیں کرتا جو خُدا نے اُسے اپنی شبیہ پر بنا کر عطا کیا تھا، خواہ اِس پر کتنی بھی کثافت اور میل کی تہیں جم جائیں اور کوئی تیز سے تیز تیزاب بھی خُدا کے نقش کو مٹا نہیں سکتا۔

وضو سے انسان کی وُہ اوّلین پاکیزگی (تزکیہ) اوّل اوّل خُدا کے ہاتھوں سے تخلیق پا کر نکلا تھا، عارضی طور پر دوبارہ بحال ہو جاتی ہے اور وُہ اپنے خالق کے آگے قیام کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

ہمارا ماضی ہم سے چمٹا رہتا ہے: ماضی کے گناہ ماضی کی غلطیاں۔ خُدا کی مغفرت انہیں مٹا ڈالتی ہے یا وُہ انہیں اپنے نام "العفوُّ" کی رعایت سے دھو ڈالتا ہے۔ وُہ انہیں اِس طرح محو کر دیتا ہے جیسے وُہ کبھی سرزد ہی نہیں ہوئے تھے (یا یُوں کہا جا سکتا ہے جیسے وُہ کبھی ہمارے وجود سے چمٹے ہی نہ تھے) کیونکہ وہی قادرِ مطلق علّت و معلول کا رشتہ منقطع کر سکتا ہے۔ یہ محض رسمی وضو نہیں، اس کو خُدا کی مغفرت اور معافی کا ایک رنگ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے سے کل کی جمع شدہ کثافت جسم سے دُھل جاتی ہے اور ماضی کا میل کچیل روح سے دُھل جاتا ہے۔ دھونے کے اس عمل میں وہی چیز استعمال ہوتی ہے جس سے کہ پہلے پہل ہم بنائے گئے تھے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا (الفرقان (۲۵): ۵۴)

"اور وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا"

تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا: "اگر کوئی شخص صحیح اور ٹھیک طرح سے وضو کر لے تو اس کے گناہ اس کے جسم سے خارج ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی۔" اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی پیغمبر اسلامؐ کا یہ قول مروی ہے کہ: "جب کوئی مومن دورانِ وضو میں چہرہ دھوتا ہے تو ہر گناہ جو اس کی آنکھوں نے کیا ہو گا اس کے چہرے سے دُھل کر پانی کے ساتھ یا اس کے آخری قطرے کے ساتھ بہہ جاتا ہے۔ جب وُہ ہاتھ دُھوتا ہے تو ہر وُہ گناہ جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہوا ہوتا ہے پانی کے ساتھ اس کے آخری قطرے کے ساتھ بہہ جاتا ہے، اور جب وُہ اپنے پیر

Marfat.com

دھوتا ہے تو ہر وُہ گناہ جس کے لیے وُہ اپنے پیروں سے چل کر گیا تھا، پانی کے ساتھ یا اس کے آخری قطرے کے ساتھ بہہ جاتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں وُہ گناہ سے پاک صاف ہو کر نکل آتا ہے۔" اسلام میں طہارت و تزکیہ ہی غایت ہے کیونکہ اس کے بنیادی معنی اِس شخص اور موضوعی بگاڑ اور خود غرضی سے آزاد ہونا ہے جو ہمیں بڑی طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا کہ کوئی چیز "پاک" ہوگئی ہے یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اب اس میں کسی فالتو اور بیکار عنصر کی ملاوٹ نہیں رہی اور اب یہ اس طرح خالص ہے جیسے خالص سونا۔

اپنی ہیئتِ اصلیہ پر بحال ہو کر نمازی نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وُہ مکّے میں واقع کعبے کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہوتا ہے خواہ وُہ اِس سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں ارشادِ باری ہے:

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط البقرہ (۲): ۱۵۰)

"اور تم جہاں سے نکلو مسجد محترم کی طرف مُنہ (کر کے نماز پڑھا) کرو۔ اور مسلمانو تم جہاں ہوا کرو اُسی (مسجد) کی طرف رُخ کیا کرو۔"

اسلامی قوانین کی جو کتابیں قطب نما کے عام استعمال سے قبل مدوّن و مرتب کی گئی تھیں، بڑی تفصیل سے کسی مسافر کو صحیح سمتِ کعبہ دریافت کرنے کے طریقے بتاتی ہیں تاہم وُہ اس بات کو نظر انداز نہیں کرتیں کہ اعمال کا انحصار نیّتوں پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی نمازی کسی ناگزیر غلطی سے غلط رُخ پر اپنا منہ کر لیتا ہے اور اسے نماز کا وقت ختم ہونے تک اپنی غلطی کا پتا نہیں چلتا تو اِس صورت میں بھی اللہ اس کی نماز قبول فرما لیتا ہے کیونکہ اس کی نیّت کعبے کی طرف منہ کرنے کی تھی اور یہی مقصود ہے۔

کعبے کی طرف منہ کرنا، حقیقتاً اور استعارتاً، اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے[1] مسلمانوں

---

[1] مشہور امریکی ماہر نفسیات ولیم شیلڈن، جنھوں نے غالباً اسلام کے متعلق سُنا بھی نہ ہوگا، کا کہنا ہے کہ معالجاتی نفسیات میں مسلسل مشاہدات اس لابُدی نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ جنسی خواہشات، معاشرے میں قوّت حاصل کرنے کی آرزو اور خواہش ملکیت سے بھی کہیں زیادہ گہری اور عالمگیر خواہش اِنسانی پیکر

(باقی صفحہ ۴۲۹ پر)

Marfat.com

کے لیے کعبہ دُنیا کا مرکز ہے اور یہ مسلمان کے لیے باطن یعنی دل کی علامت بھی ہے جو ہر چیز کا جامع ہے۔ صحیح سمت میں منہ کرنے کے معنی یہ نکلیں گے کہ آپ کی ذات کے تمام اجزا یکجا ہو گئے ہیں، گویا یہ اُسی صراطِ مستقیم پر چل نکلنے کی ابتدا ہوتی ہے جس کی دُعا مسلمان اللہ سے نماز میں کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے مرحلے میں یہ راہ افقی ہوتی ہے جو کعبے کو لے جاتی ہے جب کہ دُوسرے مرحلے میں یہ عمودی ہوتی ہے اور ربّ کعبہ یعنی خود خُدا کی طرف لے جاتی ہے۔ یُوں سمجھئے کہ "افقی سفر" بھی دراصل ہموار میدان میں "عمودی سفر" ہی کا پرتو ہے۔ یعنی اوّل الذکر (افقی سفر) مؤخر الذکر (عمودی سفر) کی علامت اور اس کا پیشرو ہے۔

اس طرح صلوٰۃ یعنی پانچ فرض نمازیں "قائم" ہوتی ہیں۔ نماز شروع کرتے ہی آپ خود کو اللہ کے حضور اس طرح حاضر سمجھیں جیسے یوم حشر کو، جب پیش گاہ خداوندی میں آپ کسی ترجمان، کسی "شفیع" کے بغیر کھڑے ہوں گے۔ (وقت صلوٰۃ) اللہ آپ کو خوش آمدید کہتا ہے اور اس کے اور آپ کے درمیان اِس وقت راز و نیاز کی گفتگو ہوتی ہے۔ آپ اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں کہ آپ کس کے سامنے کھڑے ہیں کیونکہ وہ شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ جب آپ ہاتھ بلند کر کے "اللہ اکبر" کہتے ہیں تو اُس وقت اپنے دل میں اس کی حمد اور تکبیر کے سوا کچھ اور نہ رہنے دیجیے اور حمد و ثنا کے وقت آپ کے دماغ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے اور اس وقت دُنیا اور آخرت کا ہر خیال آپ کے دل سے نکل جانا چاہیے۔ جب ایک انسان نماز میں رکوع کرتا ہے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ وُہ اپنے آپ کو اٹھائے اور پھر سجدے میں جائے تاکہ اس کے جسم کا ہر عضو عرشِ خُداوندی کی جانب رجوع ہو جائے ۔ ۔ ۔ (نمازی) اس وقت اپنے آپ کو اتنا بھول جاتا ہے کہ خود کو خاک کے ایک ذرّے سے بھی کم تر سمجھتا ہے۔"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۸ کا) میں صحیح سمت معلوم کرنے کی پائی جاتی ہے۔"

1. Kharrag, quoted from : Readings from the Mystics of Islam, Margaret Smith, No.26

Marfat.com

(پنجوقتہ) نماز، پیغمبر اسلامؐ کے قول کے مطابق "بہشت کی کنجی ہے"۔ ایک موقع پر آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: "مجھے بتاؤ اگر کسی کے دروازے پر ایسا دریا بہہ رہا ہو جہاں وُہ روزانہ پانچ بار غسل کر کے خود کو پاک صاف کرتا ہو، تو کیا ایسی صورت میں کوئی میل کچیل اس پر باقی رہ سکتا ہے؟" جب صحابہؓ نے جواب دیا کہ کوئی میل باقی نہیں رہ سکتا تو آپؐ نے فرمایا: "یہی معاملہ پانچ نمازوں کا ہے جن سے اللہ گناہوں کو دھو ڈالتا ہے"۔ آپؐ نے فرمایا: "اگر لوگوں کو صرف یہ معلوم ہو جائے کہ فجر کی نماز میں کتنی برکتیں ہیں تو وُہ اس نماز کیلئے خواہ اُنہیں گھسٹتے ہوئے ہی کیوں نہ آنا پڑتا، آتے"۔ اور یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ جب اذان دی جاتی ہے تو شیطان اپنی پشت موڑ لیتا ہے اور اس کی ہوا سرک جاتی ہے تاکہ وُہ اِس بلاوے کو نہ سُن سکے۔ ۔ ۔" حقیقت سے کنّی کاٹنے کا شیطانی طریقہ یہی ہے لیکن وُہ مرد اور عورت جو صحیح و سالم ہیں اُس کا جواب دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "اے اللہ کے رسولؐ! میں نے ایسی حرکت کی ہے جو سزا کی مستوجب ہے۔ پس میرے لیے سزا مقرّر فرما دیجیے"۔ آپؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب نماز کا وقت آیا تو اُس شخص نے آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی جس کے بعد اس نے پھر اپنی استدعا دُھرائی جس پر حضورؐ نے کہا: "کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟" اس نے اقرار کیا کہ پڑھی ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: "اچھّا تو اللہ نے تمہارا گناہ معاف کر دیا ہے"۔

فرض نمازوں کے دو نقطہ ہائے ماسکہ ہیں، ایک کا تعلّق سمجھ اور فہم سے ہے جس کی وجہ سے اس کا ربط دماغ سے ہے۔ دُوسرے کا تعلّق ہستی سے ہے اور اسی لیے جسم سے غرض رکھتا ہے۔ پہلا قدم نماز کی ہر رکعت میں سب سے پہلے سورۃ "فاتحہ" کا پڑھنا ہے۔ یہ چھوٹی سی سورۃ قرآن کی اوّلین سورۃ ہے اور اس کے بعد قرآن کی کچھ آیات پہلی دو رکعتوں میں پڑھی جاتی ہیں اور کھڑے ہو کر پڑھی جاتی ہیں، اور یہ کھڑا ہونا بحیثیت "خلیفۃ اللہ" کے، عبادت گزار کے لیے مناسب ہے۔ اس کے بعد سجدہ کیا جاتا ہے جس میں ماتھا زمین کو لگتا ہے اور اس حالت میں انسان یُوں ہوتا ہے جیسے شکمِ مادر میں تھا۔ جلالِ خُداوندی کے سامنے بے وقعت ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں نقطہ ہائے ماسکہ انسانی تجربے اور اس کی حقیقت کے

Marfat.com

قطبین ہیں۔

سورۂ فاتحہ کا آغاز ان الفاظ سے نہیں ہوتا کہ "میں اللہ کی حمد کرتا ہوں" بلکہ یوں ہوتا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ "سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے" اور یہ (اندازِ کلام) اس لیے ہے کہ اللہ کا نائب تمام مخلوقات کی طرف سے عبادت کر رہا ہے۔ جس طرح پانی آسمان سے بارانِ رحمت بن کر برستا ہے اور پھر بھاپ یا بخارات بن کر اُوپر کی طرف اُٹھتا ہے اسی طرح اللہ کی نعمتیں حمد بن کر "رَبِّ الْعَالَمِیْن" کی طرف لوٹتی ہیں، جو "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم" ہے اور اس کے علاوہ "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْن" بھی ہے کیونکہ ہر راہ اس کے در تک پہنچی ہے اور ہر شے کو اسی کی طرف لوٹنا ہے تاکہ اس کی جانچ پرکھ کے بعد اُسے اس کے مزاج و طبیعت کے مطابق جگہ عطا فرمائے۔ سُورۃ فاتحہ میں مخلوق اور خالق کے باہمی تعلق کی تعریف کے بعد اللہ کا نائب صیغۂ جمع میں اپنے اردگرد کی تمام مخلوقات کی طرف سے اقرار کرتا ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْن "اے پروردگار) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی پناہ طلب کرتے ہیں یا تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں" اور پھر وُہ اس آفاقی اُمید کا اظہار کرتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ " ہم کو سیدھے رستے پر چلا صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ " اُن لوگوں کے راستے پر جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا نہ کہ اُن کے جن پر تو غصہ ہوتا رہا اور نہ گمراہوں کے"۔

یہ ہے سورۃ فاتحہ، یعنی ابتدا جسے کوئی نمازی مسلمان روزانہ فرض نمازوں میں کم از کم سترہ بار پڑھتا ہے، اور اگر وُہ "سنت" نمازیں بھی پڑھتا ہے تو اس سے بھی زیادہ تعداد میں پڑھے گا۔ پہلی رکعت ختم کر کے وُہ اس طرح رکوع میں جھکتا ہے کہ اس کی کمر زمین کے متوازی ہوتی ہے اور اس حالت میں وُہ خُدا کی عظمت کا اقرار یہ کہہ کر کرتا ہے: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم، "یعنی پاک ہے وُہ ذات جو میرا رب ہے اور ہر چیز سے بڑا ہے۔ اس طرح ہر چیز کو، جو افقی حالت میں ہو، خُدا کے مقابلے میں حقیر گردانتا ہے۔ پھر وُہ سجدے میں جاتا ہے اور کہتا ہے "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" یعنی پاک ہے وُہ ذات جو میرا رب ہے اور سب سے بلند ہے۔ وقتِ سجدہ عبادت گزار اپنے جسم کو سکیڑ کر بہت چھوٹا کر لیتا ہے کیونکہ جسم کے عمودی

Marfat.com

یا اُفقی پھیلاؤ سے یہ اظہار ہو سکتا ہے کہ انسان خُدا کے بلند اور اعلیٰ ہونے کی نفی کر رہا ہے۔ اللہ کا وُہ نائب جو قرآن کی منزل من اللہ آیات کی تلاوت کر رہا ہوتا ہے اُس سرزمین میں نہیں ہوتا جس میں اِس کا بادشاہ رہتا ہے اگرچہ وُہ اِس سے ہم کلام ہوتا ہے۔ سجدے کی حالت میں اُسے واقعتاً ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وُہ شہنشاہوں کے شہنشاہ احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ اس حالت میں جو باتیں وُہ کرتا ہے وُہ مکمل بے تکلفی کی ہوتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ" ایک دن میں نے اللہ کے رسول کو بستر سے غائب پایا اور جب میں نے اُٹھ کر ڈھونڈنا چاہا تو میرا ہاتھ آپؐ کے تلوؤں سے لگا جو سجدے کی وجہ سے سیدھے تھے آپؐ اس وقت کہہ رہے تھے۔" اے اللہ! میں تیرے غضب سے تیرے لُطف و کرم میں پناہ ڈھونڈتا ہوں اور تیرے عذاب سے مغفرت طلب کرتا ہوں، اور میں تجھ سے تیری ہی پناہ طلب کرتا ہوں میں تیری حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔"

فرض نماز اپنے تمام ابعادِ ثلاثہ (طول، عرض اور گہرائی) کی حدود میں نہایت ہی مرتکز یاد یعنی ذکرِ الٰہی ہے جس کے لیے انتہائی مصروف آدمی بھی دن میں پانچ مرتبہ بُلایا جاتا ہے کہ وُہ بھٹکنا چھوڑ کر اپنی کامل بندگی کا اقرار کرے اور اُس حقیقتِ ماوریٰ کا اقرار کرے جو لامتناہی انداز میں اِس پر جلوہ فگن ہے مگر اس کے باوجود انتہائے رحمت سے اس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اہلِ بصیرت اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اسلام کے پانچ ستون یعنی ارکانِ دین، ذکرِ الٰہی کے لیے ہی قائم کیے گئے تھے۔

پہلے ستون 'توحید' اور دُوسرے ستون 'نماز' سے یہ بات بالکل واضح ہے۔ تیسرا ستون زکوٰۃ ہے یعنی انفاق (مال خرچ کرنے) سے ایک دُوسرے کی دستگیری، جو ایک معاشرتی فریضہ منصبی ہونے کے ساتھ ساتھ، ہمیں اس بات پر سوچنے کے لیے بھی مجبور کرتی ہے کہ دُوسرے تمام انسان بھی ہماری ہی طرح کے ہیں اور ہم سے برابری رکھتے ہیں ان کا وجود بھی ہماری ہی طرح معجزاتی ہے۔ صرف ذکرِ الٰہی ہی سے جو ہر چیز کو اس کا مقام عطا کرتا ہے، یہ اقرار محض فرضِ منصبی نہیں رہتا بلکہ ایسی حقیقت بن جاتا ہے جو تجربے میں آتی ہے۔ اسی طرح چوتھے ستون یعنی رمضان کے روزوں کا مقصد دُنیا، علائقِ ذات اور اس کی خواہشات سے

Marfat.com

کنارہ کشی ہے جو انسان کو یادِ الٰہی سے، بلکہ اس کی ذات سے، دُور کر دیتی ہیں۔ اسلام کا پانچواں ستون حج بیت اللہ ہے جو جسمانی اور روحانی طور پر ہمیں ہمارے مرکز میں واپس لے آتا ہے، یہ وُہ جگہ ہے جہاں ذکر، بمنزلہ "لقائے ربّ" اور حقیقت وصداقت بن جاتا ہے۔

یہ یادِ الٰہی، یہ مسلسل آگہی اور شعور، تقویٰ (یعنی خُدا کے حقیقت اصلیہ ہونے پر تنبیہ) سے مِل کر، بقول قرآن، خوف ورجا پیدا کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السّلام تخلیق سے لے کر اب تک (جو مٹّی سے بنائے گئے اور محترم کے حامل ٹھہرے) تضاد پر تضا ہی نظر آتا ہے، خصوصاً اس وقت جب یہ مخلوق خاکی، افلاک کو چھونے کی کوشش کرتی ہے۔ اب تو نسیم بہشت بوتلوں ہی میں بند ہے کیونکہ اب ہوائیں اس کی خوشبو زمین تک نہیں لاتیں، تاہم بہشت کی یہ خوشبو، فنونِ لطیفہ اور عملِ صناعی سے لپیٹ کر، ہمارے استعمال کی خوبصورت اشیا، ترشواتی ہے یا جیسے ان چند مردوں اور عورتوں کی زندگیاں، جو حسن کے منبع تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور جنہوں نے اپنی ہستیوں کو دُنیا اور عقبیٰ کے درمیان کھُلا دروازہ بنایا۔ یہی لوگ حقیقتاً صنّاع وفن کار ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

باب یازدہم

آرٹ، ماحول اور تصوّف

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ "اسلامی کلچر یا ثقافت" نام کی کوئی چیز نہیں۔ اگر ہم کلچر' کی اصطلاح کو اس کے جدید متعلمہ مفہوم تک محدود کر دیں تو یہ بات کسی حد تک سچ بھی ہے۔ اسلام میں لادینی اور متبذل فنون ہائے لطیفہ کا وجود نہیں۔ (نہ ہم ان کا وجود کسی اور محکم تہذیب میں پاتے ہیں) اور یہ بات براہِ راست اصولِ توحید اور لا الہ الا اللہ کا نتیجہ ہے۔

قدیم اسلامی تہذیب اور اس کے متنوّع مظاہر پر اسی اصول کی بالا دستی اور کارفرمائی نظر آتی ہے جو ہر رُخ سے صاف اور عیاں ہو جاتی ہے، جس طرح اللہ کی وحدانیت کا اللہ کے نام 'الوحید' سے اظہار ہوتا ہے (جس سے 'توحید' کا لفظ بنا۔) اگر ہم تجسس کی خاطر کسی بھی غیر مستحکم سطح کو کھرچیں یا ہٹائیں تو یہ وحدانیت ظاہر ہوتی ہے۔ خدا ہر جگہ موجود اور ہر جگہ پایا جاتا ہے اور اسی بنا پر پوری دُنیا مسلمانوں کی 'مسجد' ہے۔ وحدانیت درحقیقت ہر وجود کی اساس ہے۔

مذہب کو سمجھنے کے لیے (اور مابعد الطبیعیاتی نظریات) کو سمجھنے کے لیے بھی،

Marfat.com

جن کے بغیر مذہب میں کوئی جان نہیں رہتی) "مقدس آرٹ" کا سہارا لینا ضروری ہے۔ (بالخصوص مذہبی فنِ تعمیر اور ایسی حرفتوں کے ذریعے جو لوگوں کی روزمرّہ کی ضرورتیں پوری کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہوں) کیونکہ بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ "مقدس آرٹ" اسلام کے بنیادی پیغام کو تقریر و تحریر کے ذرائع کے مقابلے میں کہیں بہتر اور براہِ راست واضح کرتا ہے۔ اس آرٹ اور فنون کے ذریعے "ایمان" حواسِ خمسہ کے لیے زیادہ قابلِ فہم ہو جاتا ہے اور حواس جن تاثرات کو جذب کرتے ہیں ان کا اثر اور ردِّ عمل فوری ہوتا ہے جس کی ذہنی نظریات اور اخلاقی ہدایات میں کمی محسوس ہوتی ہے ـــــ جس کسی نے بھی قیروان کی مسجد جامع کو دیکھ لیا یوں سمجھیے کہ اُس نے اسلام کو دیکھ لیا[1] اور جس نے کسی مسلم صنّاعی کی مستند مصنوعات کو چھُو لیا اُس نے سمجھیے، اسلام کو چھُو لیا، اور جن لوگوں نے کچھے کو چھُوا سمجھیے کہ انھوں نے اور زیادہ گہرائی تک ایمان کی اساس تک رسائی حاصل کر لی اور عالمگیر حقیقت سے رابطہ پیدا کر لیا۔

سیّد حسین نصر کا کہنا ہے کہ "اسلامی آرٹ وحیٔ اسلامی کی رُوح کا پیکرِ ارضی ہونے کے ساتھ زمین پر آسمانی صداقتوں کا جلوہ ہے۔ ایسا جلوہ جس کے سہارے مسلمان عالمِ بالا، اور اس سے بھی ماورئی، بارگاہ رب العزت تک، یعنی اُس صداقتِ ازلی تک جو اس کے فن کی ابتدا اور انتہا ہے، سفر طے کرتا ہے[2]" اس کے ساتھ ہی یہ (آرٹ) ہمیں مسلسل اس "وسعت" یا ایسی فضا کی یاد دلاتا ہے جہاں تمام

---

[1] حال ہی میں انگلستان کے بڈیفڈز کے ایک غریب علاقے کی ایک استانی اپنے شاگردوں کی ایک جماعت کو لے کر تیونس گئی تھیں جہاں قیروان کی مسجد سے باہر نکلتے ہوئے اُس جماعت کے ایک مضبوط ترین ارادے کے مالک لڑکے نے کہا: "مس! مجھے کبھی یہ بات معلوم نہیں تھی کہ مذہب بھی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے"۔

[2] 2. Titus Burkhardt, The Art of Islam

Marfat.com

مخلوق آزادانہ سانس لے سکے ، جہاں تازہ ہوا ، آبِ شیریں اور فطرت سادہ و معصوم ہے۔ وحیٔ الٰہی کی گونج مدت تک فضا میں رہتی ہے ، جس طرح بجلی کا کوندا دیر تک فضا کو روشن رکھتا ہے ۔ یہ گونج نہ صرف نسلاً بعد نسل انسانی قلوب میں ابھرتی رہتی ہے بلکہ صدیوں تک ارضی ہیولوں میں موجود رہتی ہے ۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ برقِ تجلی کے ان ہیولوں میں مخفی رہتی ہے اور صحیح موقع ملتے ہی پھٹ پڑنے کے لیے تیار رہتی ہے خواہ مذہب کے دوسرے پہلو وقت سے گہنا ہی کیوں نہ گئے ہوں ۔

اور اس بات کا اطلاق ہر مقدس آرٹ پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اپنے آرٹ کو 'مقدس' نہیں کہتا تو یہ اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے آرٹ کا تصور نہیں کر سکتا جس کا ناتا مذہب سے نہ ہو اور اسی لیے اسے مذہبی اور ولایتی آرٹ میں امتیاز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جیسی کہ مغرب کو لاحق ہوتی ہے ۔ اس کا یہ عزم اور تہیّہ کہ وہ اپنی زندگی سے ہر اُس شے کو خارج کر دے گا جس میں لادینیت کی کوئی بُو باس ہو ، اکثر اوقات اہلِ مغرب کو چونکا دیتا ہے کیونکہ ان کا تعلق کُلّیتہً لادینیت سے ہوتا ہے ، اور وہ لادینیت کے دائرے میں بھی کافکا اور جیمز بانڈ کے ناولوں ، یا بتھوون کی موسیقی اور پاپ موسیقی (Pop Music) یا کسی ولندیزی مصوّر کے فن پارے اور اشتہاری پوسٹر میں فرق کرتا ہے۔ مسلمان کے لیے ، ایمان سے منقطع ہو کر ہر مشغلہ ایک سا ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں رہتا ۔ دلدل تو دلدل ہی ہے ، خواہ کہیں بھی ہو۔ ان حالات میں اگر وہ مغربی تہذیب اور ٹیکنالوجی کی مصنوعات میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرے تو یہ قطعاً کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اہلِ مغرب اُسے بدذوق اور غیر شائستہ قرار دیں ۔

اس کے ساتھ ہی 'اسلامی کلچر' کا تعلق (اگر اس اصطلاح کو اُس کے وسیع تر مفاہیم میں استعمال کیا جائے) کُلّیتہً اس بات سے ہے کہ ہماری دنیوی زندگیوں کے لیے یا ہماری عاقبت کے لیے کیا چیز مفید اور کارآمد ہے ؟ اس میں قطعاً

Marfat.com

کوئی بات غیر معمولی نہیں۔ یہی بات ازمنہ وسطیٰ کی عیسائی تہذیب کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے اور تاریخی نقطۂ نظر سے تو لوگوں کو ایسے مواقع بہت مختصر اور شاذونادر ہی ملے کہ وہ اپنی بہترین قوتیں فالتو کاموں پر صرف کریں یا محض "فن برائے فن" سے لطف اندوز ہو سکیں۔ روزی کمانے کے لیے بالعموم ضرورت کی بالادستی رہی ہے جبکہ دین اور ایمان کی توجہ ہر اُس بات پر مرکوز رہی جو ہمارے انجام یا نجات کے لیے سودمند ہوسکتی تھی لیکن یہاں بھی ایک امتیاز نظر آتا ہے جو اسلام کے لیے قطعی اجنبی ہے؛ کیونکہ حقیقی معنوں میں کامیاب مسلمان وہی ہے جسے دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری نصیب ہو۔

اسلام کے دو عظیم آرٹ "خطاطی" اور "فنِ تعمیر" ہیں۔ خطاطی کا تعلق وحی کی کتابت سے ہے اور فنِ تعمیر کا تعلق انسانی ماحول سے ہے۔ خطاطی کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا رشتہ کلمۂ توحید کے پہلے حصّے سے ہے جس میں اللہ کی وحدانیت کی گواہی دی جاتی ہے جس کی تفسیر خود قرآن ہے۔ کلمۂ توحید کے دوسرے حصّے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ فنِ تعمیر اس کی ذیل میں آتا ہے کہ اُس سے اسلامی ماحول کو اس طرح سنوارا جاتا ہے کہ مرد و زن اپنی زندگیاں سُنّتِ رسولؐ کے مطابق ڈھال سکیں۔

یہ بات بڑی حد تک کہی جاسکتی ہے کہ عربی رسم الخط کی تخلیق، قرآن شریف کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کی گئی۔ قبل از اسلام کے عربوں کے پاس ایک غیر ترقی یافتہ رسم الخط ضرور تھا مگر وہ اُسے استعمال کرنے میں اس لیے ہچکچاتے تھے کہ ان کی شاعری کی آزاد رُوح اس سے مقیّد ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں مُنہ سے نکلا ہُوا لفظ بھی زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا۔ اُن کی پُرشکوہ زندگی میں ضبطِ تحریر میں آیا لفظ اُنھیں یُوں نظر آتا تھا جیسے کسی پھُول کو دبا کر خشک کر دیا گیا ہو مگر اسلام کی آمد کے بعد یہ ضروری ہو گیا تھا کہ قرآن کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے تاکہ وحیِ الٰہی میں کسی قسم کی تحریف نہ ہو سکے جیسا کہ دوسرے ادیان کے صحیفوں کے

Marfat.com

ساتھ ہُوا تھا۔ اس لیے یہ بات ضروری سمجھی گئی کہ ایک ایسا رسم الخط تیار کیا جائے جو اتنا ہی صاف ستھرا اور عمدہ ہو جتنا کہ قرآن۔

کوفی رسم الخط کے بھاری بھرکم اور بڑے بڑے حروف اس ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ مارٹن لنگز لکھتے ہیں کہ یہ انتہائی معتبر تصویری تحریر (Hieroglyphs) جس میں کچھ مفرد اور کچھ ایک سے زائد حروف کے مرکب شامل تھے، ناگزیر ضرورت تھی؛ گویا یہ حروف اس حکمِ الٰہی کو بیان کرنے کے لیے وضع کیے گئے تھے جس سے وحی پھوٹی تھی یا پھر یہ حروف اس امر کا اعلان کرتے تھے کہ جس پیغام کے یہ حامل ہیں، وہ غیر مبدل اور ناقابلِ تنسیخ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان حروف کی ساخت میں کچھ ایسی گہرائی اور سنجیدگی ہے کہ یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کچھ بتانے سے زیادہ چھپا رہے ہیں، جیسے یہ خائف ہیں کہ کہیں ان کے راز ظاہر نہ ہو جائیں[1]۔

(عربی) حروف بتدریج ضبطِ تحریر میں آتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خطاط لکھتے وقت وہی درد و کرب محسوس کرتا ہے جو بچّے کی پیدائش کے وقت ہوتا ہے۔ اس میں اکثر انفرادی حروف ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوتے ہیں۔ بقول مارٹن لنگز: "گویا ہمیں خبردار کر رہے ہوں کہ اس کے مضامین بہت زیادہ عظیم ہیں جنہیں آسانی سے آشکارا نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے اکثر لوگوں کی قرآن میں الفاظ کو کھینچ کر ادا کرنے کا طریقہ ذہن میں آتا ہے[2]۔ جس میں قاری ہر آیت پر اور بسا اوقات چند لفظوں کے بعد توقف کرتا ہے، عین اسی طرح جیسے ایک پہاڑ کی بلندی پر چڑھنے والا تھوڑی دیر بعد رُک کر اپنا سانس بحال کرتا ہے یا یُوں کہیے کہ وہ قرآنی الفاظ کی آوازوں کی جلالت اور عظمت سے بے خود ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سامعین کو یہ آوازیں جذب کرنے کا وقت دیتا

---

[1] Martin Lings, The Quranic Calligraphy and Illumination, p. 16

[2] قرآن کی قرأت کے سات طریقے ہیں، جو علمِ تجوید کے واضح قواعد کے تابع ہیں۔

Marfat.com

ہے تاکہ وہ اپنے سینے میں اس کی گونج محسوس کریں۔

قرآن بہرحال اس لیے ہے کہ اُسے سمجھا جائے۔ کوئی رسم الخط کی مشکل عبارت پڑھنا ایک دشوار گزار کام ہے؛ چنانچہ کچھ ہی عرصے میں ایسے رسم الخط ایجاد ہو گئے جن کا پڑھنا بھی آسان تھا اور جو لکھنے میں بھی اس طرح رواں تھے جس طرح شہد، اور کچھ نازک نقش و نگار کی طرح تھے۔ یہ تمام رسم الخط اپنی اپنی جگہ مرصّع ہیں اور ان میں شستگی اور تزئین قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ ان میں نباتات سے مماثل علامات و اشکال بھی ہوتی ہیں جو کتاب کی "آیات" اور قدرت کی "آیات" میں گہرے ربط کو ظاہر کرتی ہیں۔

یہاں ایک اور ربط کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ اللہ نور ارض و سمٰوات ہے اور وہ نُور ہی کے ذریعے اپنا آپ ظاہر کرتا ہے قرآن کی تزئین میں سُورج کو سنہری رنگ اور آسمان کو نیلے رنگ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

یہاں مسلمان ایک مسئلے سے دوچار ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ طلاکاری، آرٹ کی ایک شکل ہے اور اشکال کسی موضوع کو ہمارے حواس اور عقل تک پہنچانے کے لیے فطرتاً اُسے "محسوس" کر لیتی ہیں، لیکن اسلام خدا کو کسی بھی صورت میں مقیّد کرنے سے ابا کرتا ہے، کیوں کہ ایسا کرنا "حقیقت" کو پابند کر دینا یا دوسرے لفظوں میں اس کا ابطال کرنا ہے۔ مارٹن لنگز کا کہنا ہے:

> "مذہبی آرٹ کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی کے اظہار کا ذریعہ بنے لیکن مسلمان فنکار یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ اس فرض سے ذاتِ الٰہی پر کمند ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ وہ تو (Capturing) اس کی پُراسرار "کلیت" کو پُرفریب حجابات کی قیود سے آزاد کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام خاص طور پر خدا کی ذات کو محدود یا محصور

Marfat.com

کر دینے کے ہر خیال کا مخالف ہے۔[1]

بھلا وہ جو بے کراں ہے، کسی کتاب کے حاشیوں میں کیسے مقید کیا جا سکتا ہے؟... مسلمان فنکاروں نے اس مسئلے کا حل ایک طرف تو کچھ اشکال اور نمونوں کے استعمال سے کیا ہے جیسے کھجور کا چھوٹا سا درخت جو اوپر کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس صفحے سے ماوریٰ کیا ہے۔ دوسری طرف وہ کچھ نمونوں کے مسلسل اعادے سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ حاشیہ نہ ہوتا تو وہ دُور دُور تک پھیل جاتے اور بے کنار بن جاتے: گویا اس طریقے سے کسی انسان کا ذہن اپنے تخیل کے زور پر ان نمونوں کی جہتوں کے متعلق سوچے جنہیں بصری طور پر پیش نہ کیا جا سکا۔

مساجد کی تزئین و آرائش میں بھی (جن میں یقیناً قرآنی خطاطی بھی کی جاتی ہے) یہی اصول کارفرما ہے یعنی لامحدود اور لامتناہی کا تصوّر، جس کا اظہار ہم آہنگ بیل بوٹوں اور جھالروں سے ہوتا ہے۔ ٹائٹس برک ہارٹ (Titus Burkhardt) کہتے ہیں:

"مسلمان فنکار کا ایک دوسرے سے پیوست، اقلیدسی اشکال کا دکھانا دراصل خدا کی وحدانیت کا براہِ راست اظہار ہے جو دنیا کی غیر مختتم انواع کی کثرت میں نظر آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ خدا کی وحدانیت بذاتِ خود اظہار سے ماوریٰ ہے کیونکہ اس کی فطرت کلّیت کی متقاضی ہے اور کسی چیز کو باہر نہیں رہنے دیتی؛ تاہم اس کا اظہار اس دنیا میں توازن اور ہم آہنگی سے ہوتا ہے اور یہ توازن اور ہم آہنگی "وحدت میں کثرت" اور "کثرت میں وحدت" کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ بیل بوٹے اور جھالریں ان دونوں رخوں کا اظہار ہے۔"[2]

---

1. Burkhardt, T., Art of Islam: Language and Meaning; p. 63

Marfat.com

کوئی مسیحی جب کسی چرچ میں داخل ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کفر اور لادینیت سے باہر نکل کر ایک مقدس حصار میں پہنچ گیا ہے لیکن مسلمان کے لیے تو پوری دنیا مسجد ہے۔ پس مسجد عبادت کے لیے مخصوص جگہ نہیں، تو محض زمین کا ایک مختصر قطعہ ہے، سہولت کے لیے جس کے گرد چار دیواری کھڑی کر دی گئی ہو تاکہ مومنین وہاں کسی مداخلت کے بغیر عبادت کر سکیں۔ عیسائی گرجے کا مرکز قربان گاہ ہے جو حضور الٰہی کا مقام سمجھا جاتا ہے اور جس پر پادری کی توجہ بھی مرکوز رہتی ہے۔ اس کا رُخ (یا "قبلہ") افق کی اُس سمت کی طرف ہوتا ہے جہاں ایسٹر کے دن کا سورج طلوع ہوتا ہے اور یُوں تمام گرجاؤں کے محور، جہاں کہیں بھی وہ ہوں، ایک دوسرے کے متوازی ہو جاتے ہیں جبکہ دوسری طرف مسجد محض ایک عبادت کی جگہ ہے اس لیے اس کا کوئی مرکزی نقطہ اس چہار دیواری میں قائم نہیں ہوتا۔ اس کا رخ کعبے کی طرف ہوتا ہے جس کے باعث دنیا بھر کی تمام مساجد کعبے کے گرد ایک وسیع دائرہ بناتی ہیں (بشرطیکہ ہم دنیا کو مسطح سمجھیں)۔

کلیسا ایک طرح سے رُوح کو متاثر کرنے والی اور اعصابی کھچاؤ پیدا کرنے والی جگہ ہے۔ اس کی "نظر" ہمیشہ اوپر اُٹھائے جانے والے حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہوتی، جن کے بارے میں اُسے شدید اُمید بندھی رہتی ہے۔ کلیسا کی خواہش حضرت عیسیٰؑ سے اتصال کی ہوتی ہے، اور جب تک یہ اتصال حاصل نہ ہو انسانی روح گویا ناآسودہ رہتی ہے۔ جبکہ مسجد ایک پُرسکون جگہ ہے۔ کیونکہ مسلمان کے لیے خدا کی وحدانیت یہاں اور اب موجود ہے اور وہ تو ہر جگہ، ہر وقت موجود ہے اور اُسے صرف شناخت کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی فنِ تعمیر ہر جگہ ایک بھرپور کمال کا حامل ہے جسے دیکھ کر یہ حدیث یاد آتی ہے: "ہر حالت میں مسلمان کے لیے خیر و برکت ہی ہے۔" یہ حدیث ہمیں یاد دلاتی ہے کہ علمِ الٰہی میں ہر چیز پوری طرح درست اور مکمل ہے۔ خواہش فطرتاً بے چین کیفیت ہے جو تسکین چاہتی ہے جبکہ وہ، جو اپنے آپ میں ہر طرح مکمل ہے، پہلے ہی آرام سے ہے۔ اس کی مثال ٹھہرے ہوئے پانی کے تالاب

Marfat.com

کی ہے جب سے سورج منعکس ہو رہا ہو۔

اسلام کی پہلی مسجد ایک کھلا صحن تھی جس میں پیغمبرِ اسلامؐ اور آپؐ کے اہلِ بیت کی اقامت گاہیں کھلتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ مسجد کے فنِ تعمیر نے نسلی اور جغرافیائی حالات کی نمائندگی کرنا شروع کی جس کی وجہ سے مغربی افریقہ کی مسجدیں صورت و شکل میں عرب کی مسجدوں سے بالکل مختلف ہیں اسی طرح وہ جنوب مشرقی ایشیا کی مسجدوں سے مختلف ہیں اور انفرادی اپج کا اظہار کرتی ہیں؛ تاہم فنِ تعمیر کے بنیادی اصول ایک ہیں، ماحول ایک ہے، مقصد ایک ہے۔ مسجدیں کچھ عرصے بعد کھلے آسمان کی جگہ گنبد نے لے لی مگر دیکھیے تو گنبد آسمان ہی کا عکس ہے۔ مینار اور زیادہ بلند ہونے لگے جو اللہ عزوجل کی وحدانیت کی شہادت دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہیں جیسے لفظ اللہ کا پہلا حرف "الف" یا جس طرح اللہ کی وحدانیت کی شہادت دیتے ہوئے کسی مسلمان کی انگشتِ شہادت اوپر اٹھتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسجد کی (جو درحقیقت سجدہ گاہ ہے) تزئین شروع کر دی گئی۔ اللہ جمیل ہے اور اسے جمال پسند ہے، اور اسے روشنیوں سے خوب منور کیا گیا کیونکہ اللہ نور ارض و سموات ہے۔

ٹائٹس برک ہارٹ (Titus Burkhardt) کہتے ہیں کہ مسلمان ماہرینِ تعمیر پتھر کو بھی موجِ نور میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اگر کسی شخص نے غرناطہ کے الحمراء کا قصرِ شاہی دیکھا ہو تو وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ کہنے سے ان کا مقصد کیا ہے اور اس قصر میں کس طرح پتھروں میں جان ڈال دی گئی ہے۔ نورِ خدا بھی تو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔

کسی شے کے نظر آنے کے معنی ہیں اس کا وجود میں ہونا۔ اسلام میں روشنی ذاتِ خداوندی کی بہت کافی (یا سب سے کم ناکافی) علامت ہے؛ تاہم روشنی خیرہ کن اور آنکھوں کو چوندھیا دینے والی ہو سکتی ہے اور انسانی نارسی اس کی مقتضی ہے کہ اسے قوسِ قزح کے رنگوں میں بکھیر دیا جائے کیونکہ اسی سے اس کے مزاج کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور اس کا اظہار بھی ہو سکتا ہے۔ مسجدوں کی تزئینی ٹائلوں اور

Marfat.com

قرآنی آیات کی طلاکاری میں رنگوں کی زبان جس طرح استعمال کی جاتی ہے اُس سے روشنی کے شکوہ کے رازہائے سربستہ واکشا ہوتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح باری تعالیٰ کے اسمائے حسنہ کا استعمال قرآن میں ہُوا ہے تاکہ اللہ کی قدرت کو ظاہر کیا جائے جس کا نور اتنا چکا چوند کرنے والا ہے کہ اُسے دیکھنے کی تاب نہیں۔

مسجدوں میں یا سُنّی مسلمانوں کے عمومی آرٹ کے مظاہر میں، انسانی اشکال کا استعمال نہیں ہوا ہے تاکہ ہماری توجہ ارضی کرداروں کی طرف منعطف نہ ہو۔ اسی طرح ان مظاہر میں جانوروں کی اشکال کا بھی استعمال نہیں ہُوا! کیونکہ قرآن کے مطابق:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَٰئِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُم (الانعام (۶): ۳۸)

"اور زمین میں جو چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں۔"

یا اگر اس آیتِ قرآنی کا اور زیادہ لفظی ترجمہ کیا جائے تو مفہوم یہ نکلتا ہے کہ "جو تمہاری تمثال ہیں"۔ جس سے پھر فکر و خیال کی ایک نئی روچل نکلے گی جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

اسلام کا انسانی اشکال بنانے سے تنافر کا اولین سبب یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کی بت پرستی ممنوع ہے اور حفظِ ماتقدم کے طور پر، کہ آئندہ اس کا امکان نہ رہے، یہ سختی برتی گئی۔ انسان بڑے دعوے کرتا ہے مگر قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا (الحج (۲۲): ۷۳)

"وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔"

اسی لیے کسی زندہ چیز کی تمثال بنانے کی کوشش مسلمانوں کے نزدیک فنکار

Marfat.com

کا ملحدانہ فعل ہے۔ اس سے پہلے کہ اس قسم کی تخلیق سے وہ خود کو ایک چھوٹا سا خدا سمجھ لے اُسے روکنا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ہر ذی حیات میں ایک راز ہوتا ہے جس کا احترام کیا جانا چاہیے کیونکہ اس راز کا دنیاوی اشکال میں اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی مخلوق جس قدر بلند ہو گی اسی قدر ہم اس کی روح کی ماہیت، اصلیت اور معنی خیزی کو ظاہر کرنے سے قاصر ہوں گے اور اس نقطۂ نظر سے اگر پیغمبر اسلامؐ کا مثیل و نظیر تراشنے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک خالی خول ہی ہو گا اور اس بنا پر نہ صرف ناروا بلکہ حقیقتاً خطرناک بھی ہو گا کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ کسی خالی گھونگھے میں کیا اثرات داخل ہو جائیں اور نہ معلوم کیسی کچھ خیالی اور تصوراتی باتیں اس میں داخل کر دی جائیں جسے "بُت" کہا جا رہا ہے! جہاں تک انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا سوال ہے تو اس کا یہ منصب اور اہلیت احاطے سے باہر ہے اور یقیناً اس کی عکاسی نہیں ہو سکتی، سوائے علامتوں اور اشاروں کے، جو مجرّد ہوں گی۔ انسانی وجود کو ارضی پیکر میں سکیڑ کر نہیں پیش کیا جا سکتا۔

ممانعتیں مطلق انداز کی نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان کا تعلق ایک عالم سے ہے، ایک حالت وجود سے ہوتا ہے جو خود اپنی جگہ مطلق نہیں، اور ہر قاعدے اور قانون کی کچھ مستثنیات بھی ہوتی ہیں۔ ایرانی میناتوروں میں انسانوں اور جانوروں کی بڑی پیاری خاکہ گری کی گئی ہے، لیکن یہ لوگ اور جانور اس دُنیا کے نہیں۔ ان کا وجود کسی مختلف بُعد سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی ہموار سطح پر کسی اور جگہ سے پرچھائیاں پڑ رہی ہوں اور انہیں مقامی رنگوں میں رنگ دیا گیا ہو۔ برک ہارٹ کہتے ہیں:

> "میناتور کو بیرونی دنیا کی عکاسی مطلوب نہیں ہوتی جیسا کہ عام طور پر ہمارے حواسِ خمسہ محسوس کرتے ہیں، جن میں ہر طرح کی بے آہنگی اور اتفاقیہ پن ہوتا ہے۔ یہ بلا واسطہ "اعیانِ ثابتہ" یا تصورات کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک صاف شفاف خواب کی طرح ہیں جو اپنے

Marfat.com

روشنی حاصل کرتے ہیں۔[1]

پس منظر کی عدم موجودگی معروضیت کے وصف میں مزید اضافہ کر دیتی ہے جو اس کے شفاف پن کا حصہ ہے کیونکہ پس منظر کا لازمہ کسی انفرادی موضوع کا موجود ہونا یا مداخل ہونا ہے، جو کسی منظر کا اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے مشاہدہ ہے۔ یہ تصویریں اپنی ہی ایک دُنیا میں وجود رکھتی ہیں اور ان کی دنیا ان تمام عیوب و نقائص سے پاک اور آزاد ہے جو ہمارے دنیاوی زاویۂ نگاہ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

مزید برآں اس میں پیش کی ہوئی انسانی صورتیں، منظر پر حاوی نہیں ہوتیں۔ آرنلڈ ہوٹنگر (Arnold Hottinger) نے اس میں اور اسلامی آرٹ کے دوسرے نمونوں میں، جن میں عرب اور ایرانی ادب میں وارد ہونے والے انسانی کردار بھی شامل ہیں، مقابلہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"ان مجرّد اور بلوری اشیاء کا خاص انداز کا کھلا پن، جو عظیم اسلامی تعمیراتی شاہکاروں کا طرۂ امتیاز ہے مینا تور کے مختلف موضوعات کے باہمی ربط سے مطابقت رکھتا ہے جیسے کہ باغ کا منظر جس میں اشعار میں پیش کردہ مسلسل واقعات کی انفرادی اور بے ساختہ تصویر کشی کی گئی ہے اور جن میں فردوسی کی روشن اور نازک اشکال کسی ایک ذریعۂ اظہار میں مقید ہونے سے انکاری ہوتی ہیں۔ یہی بات ہمیں الف لیلہ کی مسلسل کہانیوں کی روانی میں بھی نظر آتی ہے جو انسانوں، جانوروں، بھوت پریت، عوام الناس اور رعنا پیکروں کا مجموعہ ہے۔"[2]

آرٹ کے کسی انسان پسند نظریے یا عمل سے اس کی کوئی نسبت نہیں جن میں کسی نظم یا تصویر میں دکھ کا ہلکا سا اشارہ یا اذیت میں مبتلا کوئی مخلوق ہنستے مسکراتے

---

1. Burkhardt T., The Art of Islam, p. 31

2. Hottinger Arnold, The Arabs, p. 77

Marfat.com

پورے منظر پر پانی پھیر دیتی ہے، اور ہوٹنگر ہماری توجہ اس "بے نیازی" کی طرف مبذول کراتے ہیں جو اس آرٹ کا طبعی خاصہ ہے۔ دنیا تو جو ہے سو ہے اور کسی میناتور میں فن کار اپنی انسانی اشکال کو پوری تصویر سے بڑھ کر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنے دیتا جو وہ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ پوری تصویر ایک آئینے کی طرح ہوتی ہے جو اندرونی توازن ظاہر کرتی ہے، جو وجود کی عام حالت ہے، یا حالت ہونی چاہیے۔

ہوٹنگر نے انیسویں صدی کے ایک رومانی انشا پرداز ہوفمنز تھال (Hofmanns Thal) کا الف لیلہ پر ایک عجیب مگر مؤثر تبصرہ پیش کیا ہے:

"اس میں ہیں بے شمار مہمات، خواب، حکیمانہ باتیں، چٹکلے بازیاں بے ہودگیاں اور پُر اسرار باتیں ملتی ہیں۔ یہاں ہیں مضبوط ترین روحانیت اور بھرپور لذت پرستی یک جان ملتی ہیں۔ ہماری نفیس یا رذیل کوئی حس ایسی نہیں جو متاثر نہ ہوتی ہو ... ان داستانوں کی بافت شاطرانہ روحانیت کے ساتھ ہوئی ہے اور اس میں ہم پہلی نظر سے آخری مفہوم تک عجیب لذت اور وجد محسوس کرتے ہیں۔ اس میں لذت کوشی کے ساتھ خوفِ خدا بھی شامل ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس انسانی، حیوانی اور شیطانی مجول بھلیوں پر آسمان کا تابناک شامیانہ تنا ہوا ہوتا ہے یا چمکتے ہوئے پاکیزہ ستارے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی نرم، صاف اور تیز ہوا کی طرح، ابدی، سادہ اور پاکیزہ جذبات اس میں رواں رہتے ہیں ....."

جو کچھ یہاں ہے، اسلامی کائنات میں ہر جگہ موجود ہے، یعنی کھلی فضا صحرا چٹیل میدان اور بے کراں افق۔

پھر خالص "انسانی" آرٹ کہاں ملے گا؟ کوئی بھی آرٹ طبیعی اور نفسیاتی اعتبار سے ہم سے اتنا قریب نہیں جتنا کہ ملبوسات کا آرٹ۔ اگر انسانی وجود کو کسی ادغام پر اس سے نکال دیا جائے یا محض اس کے ڈیزائن کا حصہ سمجھا جائے، تو بھی اسلامی ماحول

Marfat.com

کے وسط میں یہ ہمیں پرشکوہ ملبوس میں نظر آئے گا۔ ٹائٹس برک ہارٹ کہتے ہیں:

"انسانی روح پر کسی آرٹ کا اتنا گہرا اثر نہیں ہوتا جتنا کہ لباس کے فن کا، کیونکہ انسان جبلی طور پر اُن کپڑوں کے ساتھ اپنا تشخص قائم کرتا ہے جو وہ پہنتا ہے۔"

وہ جو خیال اپنے بارے میں یا کائنات کے نظام میں اپنے کردار کے بارے میں رکھتا ہے اسی کے مناسب حال کپڑے پہنتا ہے۔ برک ہارٹ کے مطابق جدید اہلِ مغرب کا لباس "اس زندگی سے منہ موڑنے کی روش کی نمائندگی کرتا ہے جس پر غور و فکر کی اقدار حاوی ہیں اور جس کا رُخ عقبیٰ کی طرف ہے۔" اس کے مقابلے میں اسلام کے روایتی لباسوں سے خواہ وہ جا بجا اور ملک بملک کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ "انسانی جسم" اللہ کی ایک آیت" ہے اور اسے ڈھانپ لینا یا چھپا دینا، اس سے منکر ہونا نہیں ہے بلکہ اسے سونے کی طرح سنبھال کر رکھنا ہے جو اُن اشیاء میں سے ہے جسے لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔[1]

مغرب میں یہ عام بات ہے کہ چڑیا گھروں میں جانے والے بچوں کی دلچسپی کے لیے، یا ٹیلی ویژن پر بعض مصنوعات کے اشتہار کے لیے چمپانزیوں کو انسانی لباس پہنایا جاتا ہے۔ ہمارے زمانے کی مغربی لباس سازی انسانوں کے مقابلے میں بندروں پر خوب جچتی ہے۔ انسانوں کے لیے تو یہ زیادہ موزوں نہیں اور نماز کے دوران میں مسلمانوں پر تو یہ انتہائی لغو محسوس ہوتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے یہ لباس جدید تہذیب کا "تمغہ" ہے۔ اور اسے اسی حیثیت سے پہنا بھی جاتا ہے۔ کوئی سپاہی اُس وقت ہی اپنے آپ کو حقیقی طور پر فوج کا رکن سمجھتا ہے جب وہ وردی پہن لیتا ہے۔ اسی طرح راہب تبھی راہب معلوم ہوتا ہے جب وہ اپنا مخصوص چغہ پہنتا ہے۔

---

1. Burckhardt T., Art of Islam; pp. 99 - 100.

Marfat.com

مصطفےٰ کمال اتاترک اور ماؤزے تنگ دونوں نے جب مکمل طور پر اپنے ماضی سے کٹ جانا چاہا اور جب اُنھوں نے ایک نئے قسم کے ترک یا چینی کو وجود میں لانا چاہا تو اپنے لوگوں کا طرزِ لباس تبدیل کروانا شروع کر دیا اور یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ جب کسی کیتھولک پادری کا اپنے پیشے پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے تو وہ بڑی جلدی "لادینوں" کا لباس اختیار کر لیتا ہے۔

جو لوگ خود کو ہوشیار بندر سمجھتے ہیں وہ چالاک بندروں ہی کا لباس پہنتے ہیں، اور جو خود کو زمین پر اللہ کا نائب سمجھتے ہیں وہ اپنے مناسب حال و منصب لباس پہنتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم حقیقی خطرات کے مقابلے میں سطحی خطرات سے زیادہ سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ مسلمان اپنے طرزِ زندگی کو مغربی روایات سے لاحق خطروں، جیسے رقص و سرود اور لڑکے لڑکیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ اختلاط وغیرہ، سے بہت زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے چند ہی اس بات سے آگاہ ہیں کہ کسی ایسے لباس کو اپنا کر، جو اسلامی تصورات و نظریات سے متصادم نہ ہو وہ نہ صرف اپنے طرزِ زندگی بلکہ اپنے تشخص کو بھی سخت خطرے میں ڈال رہے ہیں[1]

اس سلسلے میں عام طور پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ "ظاہر" کوئی معنی نہیں رکھتا، اصل بات تو آپ کا "باطن" ہے۔ اس بات کو سادہ لوحی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ ہمارے باطن میں جو کچھ ہے اس پر ہمارے ماحول کے مسلسل اثرات پڑتے ہیں جس کے باعث اس میں تبدل واقع ہو جاتا ہے۔ ہم سے قریب تر ماحول لباس کا ہے یعنی قبا، سوٹ یا کسی اور ملبوس کا جو ہم پہنتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سے قریب تر گھر کا ماحول ہے اور اس کے بعد اس شہر کا جس میں ہم رہتے ہیں۔

لوگ جو لباس پہنتے ہیں اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے متعلق وہ کیا خیالات

---

[1] ایک حدیث کے مطابق جو "باب اللباس" میں ہے: "جو کسی غیر قوم کی نقالی کرتا ہے اُسے انہی میں شمار کیا جائے گا۔"

Marfat.com

رکھتے ہیں۔ اسی طرح جس انداز کی تعمیرات وہ کرتے ہیں اس سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ معاشرے اور زندگی کے مقاصد کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں مغربی فنِ تعمیر ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے جس میں ہم اپنے عہد کے نظریات کا مطالعہ کر سکتے ہیں ۔۔۔ روایتی اسلامی فنِ تعمیر، اپنی مختلف طرزوں کے باوجود اسلام کی ایک چھاپ ضرور رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے روایتی گھر یا روایتی شہر بدیہی طور پر انکی زندگیوں کے حسبِ حال ہوتے تھے اور وہ اپنے تمام اعمال میں پیغمبرِ اسلامؐ کی سُنّت کی پیروی کرتے تھے اور اسی لیے ان کے لیے سُنّتِ رسولؐ اللہ پر عمل کرنا آسان تھا، اسی طرح جیسے عربی لباس میں وضو اور نمازوں میں رکوع و سجود وغیرہ آسان ہے۔

آج بڑے بڑے بُلڈوزر تعمیر میں "نیاپن" لانے کے لیے مصروفِ عمل ہیں اور مسمار اور تباہ کیے ہوئے قطعاتِ اراضی پر جو شہر اور قصبے تعمیر ہو رہے ہیں، ان میں مغربی فنِ تعمیر کی تیسرے درجے کی معماری کی نقالی کی جا رہی ہے اور وہ صرف "شیاطین" کے لیے موزوں نظر آتے ہیں۔ مغرب کا جو شخص اس پر تنقید کرتا یا اس کی مذمت کرتا ہے اس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اسلامی دُنیا کو فرسودہ اور قدامت پسند رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ صرف سیاحوں کے لیے جنّت نگاہ بنی رہے اور مغرب کی بالادستی اس پر برقرار رہے۔ اگرچہ مغرب کو موردِ الزام ٹھہرانے والے اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو خود مغرب کی پستی اور تنزّل کی مذمت کرتے نہیں تھکتے، اور پھر خود ہی اسی زوال آمادہ تہذیب کے اساسی ڈھانچے کو گلے لگا لیتے ہیں۔ یہاں یہ اضافہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مغرب خوب جانتا ہے کہ کس طرح شاندار انداز میں رو بہ زوال ہُوا جاتا ہے۔

یہاں معاملہ خوش ذوقی یا افادیت پر تزئین و آرائش کو ترجیح دینے کا نہیں۔ اصل معاملہ تو رُوحانی قوانین کے پُورے ہونے کا ہے جو قوانینِ فطرت ہی کی طرح بے لچک اور اٹل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ معاملہ انسانی نفسیات کا

Marfat.com

بھی ہے ۔ ہمارے زمانے کی ہر اُس چیز کو جسے "رومانی" یا "خوشنما" کا نام دیا جائے، مشکوک سمجھنے کا اظہار کرتے ہوئے، فرتھجوف شواں کہتے ہیں:

"رومانی دنیائیں بدیہی طور پر وہ ہیں جہاں خدا کے ہونے، نہ ہونے کا یقین نہ ہو۔ جب انسان بہشت اور عالم بالا کے تصور سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے تو منطقی طور پر وہ ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں روحانی چیزیں غیر ضروری اور بے محل معلوم ہوں۔ یقین سے یہ کہنے کے لیے کہ خدا کا وجود غیر حقیقی ہے انہیں انسانوں کے گرد جھوٹی حقیقت کا حصار تعمیر کرنا پڑتا ہے اور یہ "حقیقت" لازماً غیر انسانی ہوتی ہے کیونکہ سچ تو ہے کہ غیر انسانی شے ہی خدا کو خارج کر سکتی ہے۔ اس عمل میں جو شے بروئے کار آتی ہے وہ تصور کی تکذیب ہے جو اس کی تباہی پر منتج ہوتا ہے[1]۔"

آج مسلمان اپنے گرد ایک ایسے ماحول کی تعمیر میں مصروف نظر آتے ہیں جس میں دین و ایمان بے محل، نماز بے کار اور شریعت تکلیف دہ سمجھی جاتی ہے۔

انسانی جسم اور رُوح اپنے آپ کو ناموافق حالات کے مطابق ڈھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں، بشرطیکہ ماحول کی خرابی بتدریج پیدا ہوئی ہو۔ یورپی اور امریکی لوگ اپنے جدید ماحول کے مضر اثرات سے قدرتی بچاؤ کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس سہولت نے انہیں ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل ہونے والی پیداوار کی قدر و قیمت پرکھنے کا ملکہ عطا کر رکھا ہے۔ دوسری جگہ کے لوگوں کو اپنے تحفظ کی ایسی کوئی سہولت حاصل نہیں اور زندگی کے بارے میں ان کے سابقہ تجربے نے، جو مشینی ماحول کی بجائے دستکاری کے ماحول کا ہے انہیں ذوق کی وہ قدریں اور معیار نہیں بخشے جو اس قسم کی پیداوار کو جانچنے کے لیے بروئے کار لائے جاسکیں۔ اور اس صورت حال کا نتیجہ

---

1. Schuon, F., Understanding Islam, p. 37

Marfat.com

حسبِ توقع نکلا جو لوگ، ابھی ایک نسل پہلے ان اشیاء کے درمیان رہتے تھے جو خوبصورت بھی تھیں اور اسلامی طرزِ زندگی کے مناسبِ حال بھی تھیں، وہی اب ایسی خرافات کے درمیان زندگیاں گزار رہے ہیں جنہیں وہ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ ان کا مصرف کیا ہے؟ بالعموم، کوئی یورپی ہی قدیم وجدید کا موازنہ کرتے ہوئے، مثلاً عصرِ حاضر کے ایک مصری گھر اور کسی روایتی عرب کے مکان میں (جس میں اسلامی دستکاروں کی بنائی ہوئی اشیاء رکھی گئی ہوں) امتیاز کر سکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ انہوں نے (مصریوں نے) کیا کھو دیا ہے اور ان کی دماغی صحت پر اسے شبہ ہوتا ہے۔ درحقیقت ان پر ایک ایسے ماحول کے اثرات پڑے ہیں جو اسلام کے لیے قطعی اجنبی ہے اور اس بات کا احساس وشعور نہ رکھنا اور بھی خطرناک ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ کسی 'اوزار' اور 'مشین' میں صرف درجے ہی کا فرق ہے لیکن کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ کسی روایتی دستکار اور ایک ایسے مزدور میں جو کسی فیکٹری میں مشین سے بٹن ٹانکتا ہے، بہت بنیادی فرق ہے۔ ماضی میں دنیا کے ہر خطّے میں، ایک دوسرے سے انتہائی بُعد رکھنے والے لوگوں نے بھی، بالعموم حرفت و دستکاری کے کردار کے بنیادی تقدس کا اعتراف کیا۔ بعض کے نزدیک یہ حرفتیں اور دستی صناعی انسان کو "دیوتاؤں" نے سکھائی اور بعض کے نزدیک اسے "فرشتوں" نے سکھایا، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دستکار اور صناع اپنے کام کو "درویشانہ" سمجھ کر اس کی انجام دہی کے لیے اسی انداز میں تیاری کرتے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ حرفتیں آسمان سے پیغمبروں کے ذریعے تواتر سے نازل ہوئی تھیں، اور ہمارے زمانے تک خام مال کی کوئی مفید اور خوبصورت شے بنانا عبادت تصور ہوتا تھا۔ جو اشیاء کسی پاکیزہ عمل کے تحت بنائی جاتی ہیں ان میں بڑی برکت پنہاں ہوتی ہے اور وہ اس شے کے استعمال کرنے والے کو خدا کی یاد دلاتی ہیں اور اُسے خدا کے قریب آنے میں مدد دیتی ہیں۔ شاید کوئی بھی روایتی تہذیب اس تصور کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی کہ کچھ اشیاء ایسی ہیں جو صرف ہماری مادی بھلائی کے

Marfat.com

لیے ہیں۔ اُن کے ہاں ہر عمل اور ہر شے کا تعلق مکمل انسان سے ہوتا ہے جو نفس روح، اور جسم رکھتا ہے اور اسلام، جو توحید کا مذہب ہے، اپنی جگہ "کاملیت" کا دین بھی ہے۔

مراکش کے شہر فاس پر اپنی کتاب "فاس: ایک اسلامی شہر"[1] میں ٹائٹس برک ہارٹ نے ایک بوڑھے دستکار سے اپنی ملاقات کا احوال لکھا ہے جو اس وقت بھی اپنے روایتی طریقوں سے کام کرتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں ایک کنگھیاں بنانے والے شخص کو جانتا تھا جو اپنے پیشے سے منسوب گلی میں کام کرتا تھا۔ اُس کا نام عبدالعزیز تھا۔ وہ اپنی کنگھیوں کے لیے بیلوں کے سینگ استعمال کرتا تھا جنہیں وہ قصابوں سے لیتا تھا۔ پھر انہیں کرائے کے ایک گھر میں سکھاتا تھا اور پھر لمبائی کے رُخ کاٹ کر کھولتا تھا اور آگ پر اُنہیں سیدھا کرتا تھا۔ یہ تمام عمل انتہائی حزم و احتیاط سے کیا جاتا تھا مبادا سینگ ٹوٹ جائیں۔ اس خام مال سے وہ کنگھیاں تیار کرتا تھا اور ایک دستی خراد پر سُرمے دانیاں بناتا تھا کام کے دوران میں وہ قرآنی سورتیں دھیرے دھیرے گنگنا گنگنا کر تلاوت کرتا رہتا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ آنکھوں کی ایک بیماری نے جو افریقہ میں عام ہے، اُسے تقریباً ادھ اندھا کر ڈالا تھا۔ اپنے کام کی طویل مشق نے اُسے اپنے کام کو دیکھنے کے بجائے محسوس کرنے کی صلاحیت بخش دی تھی۔ ایک دن اُس نے مجھ سے شکایت کی کہ پلاسٹک کے کنگھوں نے اس کے کاروبار کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے کہا: "افسوس کی بات ہے کہ صرف کم قیمت ہونے کی وجہ سے، لوگ فیکٹریوں

---

[1] 1. Fas: Stadt des Islam اصلی اسلام کی روح اور جوہر کے مشاہدے کے لیے اس کتاب نے کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کا ترجمہ اب انگریزی میں ہو چکا ہے۔

Marfat.com

کے بنے ہوئے معمولی کنگھوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس نے کہا: "یہ بات بھی مہمل معلوم ہوتی ہے کہ لوگ مشین کے سامنے کھڑے ہو کر، بے حسی سے ایک ہی حرکت کو بار بار دہراتے رہیں جبکہ میری طرح کی ایک پرانی حرفت ناپید ہوتی جا رہی ہے"۔ اس نے کہا: "میرا کام آپ کو سخت ان گھڑ قسم کا معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر اس میں فن کے انتہائی باریک راز پنہاں ہیں جنہیں الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے خود اس فن کو بڑے طویل عرصے میں حاصل کیا ہے اور اگر میں چاہوں بھی تو اسے اس وقت تک اپنے لڑکے کو منتقل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خود اسے حاصل کرنا نہ چاہے۔ اور میرا خیال ہے وہ کسی دوسرے ہی پیشے کو اپنائے گا"۔ اس نے کہا: "اس فن کی تاریخ استاد سے شاگرد کو منتقل ہوتے ہوتے حضرت آدمؑ کے بیٹے شیثؑ تک پہنچتی ہے۔ اس نے اسے دوسرے لوگوں کو سکھایا اور جو نبی سکھاتا ہے (اور شیثؑ نبی تھے) یقیناً بہت واضح انداز میں اس کا کوئی ظاہری اور باطنی مقصد ہوتا ہے۔ خود میری سمجھ میں یہ بات رفتہ رفتہ آئی کہ اس حرفت میں کوئی بات اتفاقی نہیں اس کا ہر عمل اور طریق کار دانش پر مبنی ہے۔ ہر ایک کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔ بہر حال اگر کوئی شخص یہ سب کچھ بھی نہیں جانتا تب بھی یہ نہایت احمقانہ اور قابلِ مذمت بات ہے کہ ڈاکہ ڈال کر لوگوں کو پیغمبروں کے ورثے سے محروم کیا جائے اور انہیں کسی مشین کے سامنے کھڑا کر دیا جائے جہاں رات دن وہ ایک بے معنی کام انجام دینے میں جتے رہیں"۔

بوڑھے کنگھی ساز نے جو کچھ کہنا چاہیے تھا کہا اور جو اسے نہیں سمجھتے وہ کبھی انسانی صورتِ حال کا ادراک نہ کر سکیں گے جس میں خدا ہم سے اپنے اعمال اور حرکات و سکنات کو پاکیزہ بنانے کا مطالبہ کرتا ہے، اور ہم اس سے اس وقت تک عہدہ برآ نہیں

Marfat.com

ہو سکتے جب تک ہمارے اعمال و حرکات واقعی قابلِ تقدیس نہ ہوں ۔ اُس بوڑھے انسان اور اس کی طرح کے دوسرے لوگوں کے گزر جانے پر افسوس، جذباتیت کی ذیل میں نہیں آتا۔ اس کا تعلق ایک خوف سے ہے، اور یہ خوف اس بات کا ہے کہ اگر ہم ایک مرتبہ بالکل بے مصرف ہو کر رہ گئے یعنی مکمل طور پر بے تقدیس اور ناقابلِ تقدیس تو پھر ہم اُس الاؤ کا ایندھن بننے کے سوا اور کسی مصرف کے نہ رہیں گے جو تباہ شدہ دُنیا کے ملبے کا انجام ہے۔

اُن اہلِ حرفت کی ریاضت، جن کے اوزار سادہ ہیں اور جنہیں عقل و دانش، صلاحیت اور ہنرمندی پر انحصار کرتے ہوئے دستکاری سے بے عیب چیزیں بنانا ہوتی ہیں، اُس صوفی کے مجاہدے اور ریاضت سے کسی طرح کم نہیں جس کا خام مال مٹی، لکڑی یا ہڈی نہیں بلکہ اس کی اپنی رُوح ہوتی ہے۔

اسلامی "تصوّف" بڑا وسیع اور پیچیدہ موضوع ہے، جس میں غافل اور جلدباز لوگوں کے لیے قدم قدم پر بہت سے دام اور پھندے بھی ہیں؛ تاہم مذہب کے کسی وسیع مطالعے میں اس سے ایسے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا جیسے عیسائیت پر کوئی لکھنے والا مسیحی تصوّف سے آنکھ پھیر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سیّد حسین نصر لکھتے ہیں:

> "ہم اسلامی روایات کے کمال اور وسیع روحانی امکانات سے، اس کے باطنی پہلو سے صرفِ نظر کر کے انصاف نہیں کر سکتے۔ پس جب ہم تصوّف پر بات کرتے ہیں تو حقیقتاً ہم اسلامی روایات کے ازحد باطنی اور عالمگیر پہلو پر بات کرتے ہیں[۱]۔"

مستشرقین میں سے کچھ ایسے ہیں جو فوراً ہی اس بات کا اعتراف کر لیتے ہیں کہ تصوّف

۱ـ 1. Islam and the Plight of Modern Man.

(اسلام اور جدید انسان کی حالتِ زار) از سیّد حسین نصر ص ۴۹

Marfat.com

کے ذریعے دینی تجربات کو ازحد گیرائی اور گہرائی میسر آئی ۔ چنانچہ آرنلڈ ہوٹنگر کہتے ہیں:

"دوسری تہذیبوں میں جو اعمال غیر متعلق لوگوں تارکینِ دنیا، راہبوں، راہباؤں اور درویشوں تک محدود رہے، انہوں نے عام جمہور اسلام میں اپنی جڑیں انتہائی گہری کر لیں اور صدیوں تک وہ مسلم معاشرے کو یکجا رکھنے کا ایک اجتماعی رابطہ بنے رہے۔"[۱]

اس کا اشارہ ملتا ہے کہ کچھ اور لوگوں نے عملاً تصوف کی حدود کو، عیسائی پوزیشن کو تقویت دینے کے لیے، کم سے کم کرنے کی کوششیں کی ہیں اس لیے کہ اُن کے خیال میں اسلام کو اگر اس سمت سے الگ کر دیا جائے تو وہ یقیناً عیسائیت سے مسابقت نہیں کر سکے گا نہ انسانیت کی جملہ روحانی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کا دعویٰ کر سکے گا۔ بہرحال، کچھ بھی ہو، بہت سی ایسی کتابیں بھی ہیں جن کا نفسِ مضمون اسلام کا ایک جامع منظر پیش کرنا ہے مگر یہ کتابیں اسلام کی انتہائی غلط اور سطحی تصویر پیش کرتی ہیں اور مغربی قاری کو اس استعجاب میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ بھلا کوئی شخص، جو اپنے دین سے روزمرّہ زندگی گزارنے کے قوانین سے کچھ زیادہ طلب کرتا ہو، کیسے مسلمان ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ وہ اپنے ارادے اور مرضی سے اسلام قبول کر لے؟ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے بہت سے لوگ خصوصاً وہ جو اسلامی ممالک میں خاصہ عرصہ رہ چکے ہیں، اس بات کو تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے کہ کس طرح ظاہری اور قانونی اسلام، جو محدود ہے، اور تصوّف کے درمیان جو وسیع ہے، روحانی رفعتوں کی طرف جرأت آزما جست لگاتا ہے، وجود کے عمیق سمندروں میں غوطہ زنی کرتا ہے، جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ خود انسان کے دل میں رہتا ہے، اور جو یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ وہ براہِ راست مصدرِ علم وحکمت سے آگہی حاصل کرتا ہے، کوئی وجہِ اشتراک بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے اس خیال کی تصدیق ان مسلمانوں نے کی ہو جو یہ کہتے ہیں کہ تصوّف "حادثہ" ہے یا یہ کہتے ہیں کہ تصوّف

---

[۱] Arnold Hottinger, The Arabs

Marfat.com

ایک طرح کی بدعت ہے ، ان لوگوں کا عیسائیت کا اپنا تجربہ بھی انہیں یہ باور کراتا ہے کہ تصوف دین کا محض "محیط" ہے ۔ ایسے لوگ اپنے اس خیال میں خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ اسلام محض خدمتِ خلق کا مذہب ہے جس کے تہہِ دامن تشدد اور مذہبی جنون کی لہریں پرورش پاتی ہیں ۔

اس سے پہلے کہ ان اعتراضات پر کوئی بات کی جائے جو کچھ مسلمان اپنے دین کی بعض متصوفانہ جہات پر وارد کرتے ہیں ، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی پُر زور وضاحت کر دی جائے کہ تصوف اپنے متبعین کے اختلافِ طبائع کی رعایت سے مختلف اشکال اختیار کر لیتا ہے ، جنہیں صوفیانہ اصطلاح میں "طرق" ("طریق" کی جمع) کہا جاتا ہے اور جس کے معنی ہیں راستے ۔ یہ "طریقے" بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف نہیں ۔ ان سب کی اصل ایک ہے ، تاہم ان کے درمیان سلوک و اعمال کا فرق ہے ، جیسے کہ راہبانی فرقوں میں ہے ۔ اس سلسلے میں کوئی واضح اور کھلی ہوئی نوعی تقسیم ممکن نہیں ؛ تاہم صوفیاء کے دو گروہوں میں ایک بیّن فرق موجود ہے ۔ ان میں ایک گروہ ہے جو راہِ "سکر" پہ ایک وہ جو "صحو" پر گامزن ہے ۔ اول الذکر وہ گروہ ہے جو عشقِ الٰہی اور شرابِ معرفت (یا دونوں) سے مدہوش ہے ۔ ان کا طرزِ عمل عام آدمیوں جیسا نہیں ہوتا ۔ ان پر اکثر جذب کا غلبہ رہتا ہے اور عام زندگی کے اصولوں اور قاعدوں کی وہ کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے ، جبکہ مؤخر الذکر ، اپنے جذب کو اپنے اندر رکھتے ہیں اور اس پر سخت ضبط رکھتے ہیں اور ہر قسم کے مکروہات سے اپنا دامن پاک رکھتے ہیں ، حتّٰی کہ جب وہ باطنی طور پر "واصل باللہ" ہوتے ہیں اس حالت میں بھی وہ نہایت محتاط اور بردبار رہتے ہیں ۔ اس صدی کے عظیم صوفی بزرگ ، احمد العلوی ، کے مطابق احسن حالت یہ ہے کہ صوفی باطنی طور پر سُکر میں ہو اور ظاہری طور پر صَحو کی کیفیت میں ہو۔[1]

---

1. Martin Lings, A Sufi Saint of the Twentieth Century.

Marfat.com

ان طریقوں میں مزید فرق اور امتیاز بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ طریقہ ہے جو انتہائی عقیدت میں ڈوبا ہوا اور عاشقانہ ہے جس میں بحرِ عشق میں ڈوب جانا ہی سب کچھ ہے اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو معرفتِ خداوندی کا جویا ہے یعنی وجودِ باری تعالیٰ کے علم اور آگہی کا طالب ہے اگرچہ یہ دونوں طریقے اکثر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں کیونکہ عشق و محبت بھی ایک قسم کی آگہی ہے؛ البتہ یہ طریقہ براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ خدا تک پہنچاتا ہے عین اُسی طرح جیسے کہ صوفیاء کے تجربے میں علم و عشق یک جا ہو جاتے ہیں یا ان میں "وصل" ہے۔ جس سے ہم عشق کرتے ہیں اُسے ہم جانتے ہیں —— اور جسے ہم جانتے ہیں اُس سے ہم عشق کے سوا کچھ نہیں کر سکتے پس یہاں معاملہ کسی ایک رُخ کو اختیار کرنے کا ہے، بنیادی اختلاف کا نہیں۔

ایک اور رُخ سے دیکھیں تو ایک طرف اُن صوفیاء میں فرق و امتیاز کر سکتے ہیں جو ارکانِ اسلام جیسے نماز، روزہ کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور شدت سے شریعت کا اتباع کرتے ہیں —— دوسری طرف وہ صوفی طریقہ ہے جس میں "ذکر" کو اصطلاحی مفہوم میں اوّلیت حاصل ہے، بدیہی طور پر وہ مسلمان جو تصوف کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں حالتِ سُکر کے صوفیوں کے مقابلے میں اُن صوفیاء کو ترجیح دیں گے جو حالتِ صحو میں ہیں، اور معرفت پر شریعت کو ترجیح دیں گے۔ اس لیے وہ اُن صوفیوں کو پسند کرتے ہیں جو شریعت کا اتباع کرتے ہیں بہ نسبت اُن کے جو ظاہری ارکان و رسوم کی پابندی محض اپنا دامن آلودہ نہ کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

تصوف خاص طور پر اپنی مابعد الطبیعیاتی جہت میں ان حدود کو توڑ دیتا ہے جو کسی عام مومن کے ایمان کا حفاظتی حصار ہیں۔ وہ ہمیں ایک ایسے آزاد منطقے میں لے جاتا ہے جہاں گمراہ ہو جانے کے حقیقی امکانات ہوں خاص طور پر اس وقت جب انسانی ذات ہدایت یافتہ نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں ظاہری مذہب کو اضافی حیثیت دیتا ہے، حالانکہ وہ اس کا منبع ہے، مگر ایک لحاظ سے ان میں بُعد

Marfat.com

پیدا ہو چکا ہے اور ان عقائد اور مآثر کی، جنہیں ایک عام مسلمان مطلق سمجھتا ہے مجازی تعبیر کرتا ہے یا انہیں ایسی نظائر کے طور پر استعمال کرتا ہے جو ماورائی ہو سکتی ہیں۔

ظاہر پرست، متبعین شریعت کے لیے یہ بات خاص طور پر پریشان کن ہوتی ہے جب صوفی اکثر اشارتاً ہی سہی، یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ انہیں براہِ راست خدا سے توسل حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ وہ "ابنائے مکتب" نہیں بلکہ "تلامذۂ رحمان" ہیں۔

صوفی جو حق رکھتا ہے جو فی نفسہ "حقیقت" پر مبنی ہے مگر یہی استحقاق ایک عام مومن بھی رکھتا ہے جس کا ایمان چند سادہ اصولوں پر ہوتا ہے جو کم وبیش اس کی نجات کے لیے مناسب اور موزوں ہوتے ہیں جنہیں وہ تعلیمات متزلزل کر سکتی ہیں جو ان اصولوں پر حرف زنی کرتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بلند مرتبہ روحانی شخصیات اور اہل اللہ اپنی ظاہری تعلیمات میں حد درجے ہوشمندی اور احتیاط سے کام لیتے ہیں اور اپنے طریقے کے لبّ لباب کو صرف ایسے با صلاحیت افراد کے لیے محفوظ رکھتے ہیں جو قرار واقعی ان کے اہل ہوں، اور یہ بھی ایک سبب ہے کہ بعض شریعت کے تابع حضرات تصوّف کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں تاکہ ایمان اور احکامات دینی کے پورے نظام کو خطرہ درپیش نہ ہو جائے۔

عیسائی سیاق وسباق میں دیکھیے تو جہاں تک کیتھولک کلیسا کا تعلق ہے، اس ضمن میں کوئی قرار واقعی مسئلہ درپیش نہیں ہُوا کیونکہ عیسائی صوفیوں کی اکثریت میں، چند قابلِ لحاظ مستثنیات کو چھوڑ کر، باقی تمام راہب اور راہبائیں سخت قوانین کے تحت سب اپنے سے اعلیٰ درجے کے راہب کے ماتحت رہتے تھے۔ اسلام میں صورتِ حال اس سے یکسر مختلف ہے گو یہ صحیح ہے کہ ہر صوفی اپنے شیخ کے زیرِ "توجہ" ہوتا ہے۔ (شیخ ایک ایسی اصطلاح ہے جس کو مرشد کہا جا سکتا ہے) لیکن اسلام میں ایسا کوئی صاحبِ اختیار ادارہ یا شخصیت نہیں جو ان مشائخ کو مقرر یا برطرف کر سکے یا انہیں اپنی راہ چلنے سے روکے۔ اس کے باعث بعض مواقع پر بدعات اور الحاد کی صورتیں پیدا ہوتی رہی ہیں جو بعض حلقوں میں منجملہ اور باتوں کے صوفیوں کی بدنامی کا باعث بنی ہیں۔

Marfat.com

صوفیا کا محاسبہ بھی کیا گیا مگر یہ محاسبہ کچھ تو اجماعِ اُمّت کے ذریعے ہُوا اور کچھ اس کشاکش اور محاذ آرائی سے جو شریعت پرستوں اور صُوفی مشائخ کے درمیان صدیوں سے جاری ہے۔ اسلامی اُمّہ کے بعض طبقات میں تصوّف کی درپردہ مخالفت، صوفیوں پر ضروری قیود اور پابندیاں عائد کرنے کا باعث ہُوا۔ مگر یہ مخالفت دبی دبی ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی راہ کی رکاوٹ نہ بن سکی جو راہِ تصوّف پر چلنے کی آرزو رکھتے تھے اور یوں دین کے ظاہری (شریعت) اور باطنی (طریقت) جہات میں ایک صحت مند توازن پیدا ہو گیا۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شریعت و طریقت کے درمیان خطِ فاصل کبھی بھی بہت نمایاں اور واضح نہیں رہا۔ بہت سے علما اور فقہا، جو اسلام کی قوّتِ نافذہ کہی جا سکتی ہے، خود بھی صوفی حلقوں سے وابستہ رہے ہیں، اور آج بھی ہیں، جبکہ روحانی طور پر محترم عظیم صوفیا اسلام کی قوّتِ نافذہ میں اہم مراتب و مناصب پر فائز رہے ہیں۔ اس کی ایک حالیہ مثال شیخ عبدالحلیم محمود مرحوم کی ہے جو ۱۹۷۸ء میں، اپنی وفات تک، جامع ازہر کے (جو سُنّی مسلمانوں کی سب سے قدیم اور اہم یونیورسٹی ہے) "شیخ" رہے۔ مرحوم شیخ ہمارے زمانے کے عالمِ اسلام کی عظیم اور محترم شخصیتوں میں سے تھے۔

دین کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کے پیچیدہ تعلّقات کی تاریخ میں تین سرچشموں کا خصوصیت سے تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے ــــ پہلے کا تعلّق ابنِ منصور الحلاج (متوفی ۹۲۲ء) کی زندگی اور تعلیمات سے ہے جو اُن تین یا چار اہم صوفیوں میں سے تھا جن کے نام اُن اہلِ مغرب کے لیے اجنبی نہیں جو تصوف میں دلچسپی رکھتے ہیں۔[1]

الحلاج کو بغداد میں اس لیے سزائے موت دی گئی تھی کہ وہ ہر کس و ناکس کے سامنے

---

[1] دیکھیے کتاب: La Passion d'al-Husayn al-Hallaj, Martyr Inystique de L'Islam, Llous Massignon.

Marfat.com

بے باکانہ انداز میں اسرارِ الٰہی حالتِ سُکر کے صوفیوں کی طرح کھولا کرتا تھا، اگرچہ اس کی سزائے موت میں کچھ سیاسی عناصر کی کارفرمائی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا نعرۂ "انا الحق" ایک طرح کا برہنہ دعویٰ تھا جو قطعی غیر مشروط اور غیر واضح تھا۔ جہاں تک مذہبی ہیئت حاکمہ (طبقہ علمائے دین) کا تعلق ہے یہ کھلا کفر تھا۔ یہ کہنا کہ "مَیں حق ہوں" عملاً یہی معنی دیتا تھا کہ "مَیں خدا ہوں"۔ یہ "انا" یعنی "مَیں"، حلاج کے واسطے کچھ بھی ہو لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق تھا، یہ بول وہ فانی انسان نہیں بلکہ خود خُدا اس کے واسطے سے بول رہا تھا۔[1] یہ "انا" انسانوں کی اکثریت کے لیے، جن میں مومن بھی شامل ہیں، انسانی ذات یا خودی ہے، اور انسان کے لیے اپنے آپ کو "مَیں خدا ہوں" کہنا، گناہِ عظیم ہے یا اس کی جڑ ہے۔ اُس کے ہم عصر، جنید بغدادیؒ نے، جو صوفیا کے طبقۂ صحو سے تعلق رکھتا تھا، حلاج کی روحانی قدر و منزلت پر کبھی اعتراض نہ کیا، لیکن جب حلاج نے اس کے حلقے میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی تو جنیدؒ نے کہا: "مَیں پاگلوں کو دوست نہیں بناتا۔ دوستی کے لیے ہوش ضروری ہے۔ ہوش مندی صحیح روحانی مقام کا علم ہے۔ سُکر بے پایاں خواہش یا عشق کی علامت ہے۔"

وہ (حلّاج) اس سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا جو وہ تھا اور اس سے مختلف کچھ نہیں کر سکتا تھا جو اُس نے کیا لیکن وہ خود نہ صرف اپنے بیانات اور دعاوی کے ابہام سے آگاہ تھا بلکہ اس خطرے سے بھی باخبر

---

[1] اس سلسلے میں مولانا جلال الدین رومیؒ کا اپنے مریدوں سے یہ فرمانا: "اس مشہور دعوائے "انا الحق" کو کہ "مَیں خدا ہوں" کچھ لوگ اسے بہت گستاخانہ کلمہ سمجھتے ہیں، لیکن یہ "انا الحق" حقیقت میں ایک بہت بڑی عاجزی کا اظہار ہے۔ جو انسان یہ کہتا ہے کہ مَیں خُدا کا بندہ ہوں وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ دو وجود ہیں: ایک وہ خود اور دوسرا خدا۔ لیکن جو یہ کہتا ہے کہ مَیں خدا ہوں اُس نے اپنے آپ کو گویا بری طرح معدوم کر کے خاک میں ملا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ مَیں خدا ہوں یعنی کہ مَیں نہیں ہوں، وہی سب کچھ ہے، خدا کے سوا مَیں کچھ نہیں ہوں اور اس میں زیادہ عاجزی ہے۔" (مواعظ رومی ترجمہ از اے جے آربری ص ۵۵)

Marfat.com

تھا کہ اس کے یہ بیانات لوگوں کو گمراہ کر دیں گے۔ اس کے باوجود وہ یہ کہنے سے باز نہ رہ سکا:

"جو شخص اللہ کے اسرار اس کی مخلوق پر کھولتا ہے وہ ناقابلِ برداشت اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

علما کے ایک گروہ سے جو اس سلسلے میں اس سے جرح کرنے کے لیے آیا تھا، اُس نے کہا تھا: "تم مجھ سے کیا سوال کرو گے؟ جبکہ مَیں اچھی طرح یہ دیکھ سکتا ہوں کہ تم کتنے درست ہو اور مَیں کتنا غلط ہُوں!" جب اُسے سزائے موت دی گئی تو اُس نے کہا: "میری موت قانون کی بالادستی قائم رکھے گی۔" اُسے خوب معلوم تھا کہ کسی سیدھے سادے مومن کے لیے خوفِ خدا سے بے نیاز ہو جانا، جیسے کہ اُس نے کیا تھا، اپنے آپ کو تباہی کے راستے پر ڈال دینا تھا۔

آخر کار جب اُسے، کچھ دیر بعد، تختۂ دار پر لایا گیا (کیونکہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی تھی)، تو اُس نے دعا کی:

"یہ تیرے بندے جو تیرے دین کو بچانے کے جوش میں مجھے یہاں قتل کرنے کے لیے جمع ہُوئے ہیں، اے ربّ! تو انہیں معاف کر دے اور ان پر رحم فرما۔ یقیناً اگر تُو نے انہیں وہ کچھ دکھایا ہوتا جو مجھے دکھایا ہے تو وہ کبھی وہ نہ کرتے جو انہوں نے اب کیا ہے اور اگر تُو نے مجھ سے وہ مخفی رکھا ہوتا جو تُو نے ان سے مخفی رکھا ہے تو مَیں اس ایذا اور ابتلا کا شکار نہ ہوتا۔ تُو جو کچھ بھی کرتا ہے مَیں اس پر تیرا شکر اور تیری حمد کرتا ہُوں۔"

اور وہ خدا کی حمد و ثنا کرتے ہُوئے مر گیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنے شعروں میں کہا تھا:

"مَیں اپنی محبت ہُوں، میری محبت "مَیں" ہُوں۔ ایک قالب میں دو روحیں ہیں۔ اگر تم مجھے دیکھو تو وہ ہے جسے تم دیکھ رہے ہو اور جب تم اُسے دیکھو گے تو تم مجھے دیکھو گے۔"

Marfat.com

عاشق اور محبوب کے اس وصل نے گویا تمام سوالوں کا جواب دے دیا ہے اور تمام ابہام دُور ہو گیا ہے۔

جہاں تک ابہام کا تعلق ہے تو وہ بڑی حد تک گیارہویں صدی عیسوی میں ابوحامد الغزالی کے ذریعے دُور ہو گئے تھے جنہیں بہت سے لوگ قرونِ وسطیٰ کی ایک عظیم شخصیت سمجھتے ہیں۔ الغزالی بہت کم عمری میں بغداد کے مشہور مدرسۂ نظامیہ میں استادِ رفقہ مقرر کر دیے گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد اُنھوں نے خود اپنے دین کی اساس و بنیاد پر شک و شبہہ شروع کر دیا، اور پھر اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے مختلف مکاتبِ فکر سے رجوع کیا۔ آخر انہیں صوفیوں کی تعلیمات میں اس تشکیک کا ازالہ نظر آیا۔ سالہا سال کی جہاں گردی اور مراقبوں کے بعد وہ اسلام کی دو متضاد جہتوں (طریقت اور شریعت) کے درمیان ایک مؤثر رابطہ بن گئے۔ کوئی شخص بھی علم اور اتباعِ شریعت میں ان کا ہمسر نہیں تھا اور نہ ہی ان کے زمانے میں صوفی عقائد کا ان سے بڑا کوئی شارح نہ تھا۔ یہ غزالی ہی تھے جنہوں نے تصوف کو جوازِ شرعی فراہم کیا۔ ان کی سب سے عظیم کتاب احیاء علوم الدین ہے جس میں طریقت و شریعت کی آمیزش ہے۔ اس میں انھوں نے کسی صاحبِ ایمان کی زندگی کا ہر پہلو شرح و بسط سے بیان کیا ہے، جس میں کھانے پینے اور زن و شوہر کے تعلقات سے لے کر مریدین کے ساتھ شیوخ کے روابط کی تفصیل بیان ہوئی ہے اور صوفیانہ راہ کے مجاہدوں اور فیوض کا احوال ہے۔

صوفی عقائد و نظریات کی ترقی و ترویج میں حلاج اور غزالی کے علاوہ ایک اندلسی صُوفی محی الدین ابن عربی (متوفی ۱۲۴۰ء) کا کچھ کم مرتبہ نہیں۔ انہیں اُن کے مداحین اور متبعین "شیخ اکبر" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو اُن کے قائل نہیں انہیں ملحد سمجھتے ہیں اور آج تک اُن کی ذات از حد مابہ النزاع بنی ہوئی ہے۔ ان کی تحریریں سعودی عرب میں ممنوع قرار دے دی گئی ہیں اور ۱۹۸۰ء میں مصری پارلیمنٹ نے ان کی تصانیف کے مجموعوں کی اشاعت قاہرہ میں روک دی تھی (اس فیصلے

Marfat.com

کو بعد میں واپس لے لیا گیا)۔ اس تمام حزم و احتیاط کے باوجود، ان کے اثرات گزشتہ سات صدیوں سے دنیا پر محیط ہیں اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ان کے پیچیدہ، اور بعض اوقات بے حد دور از کار، نظریات کو دین کے باطنی اسرار منکشف کرنے کی کنجی سمجھتی ہے۔

تصوف کے جائز مخالفین کی صف میں، یعنی وہ علما جو یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف عام مومنین کے دلوں میں قانون کی بالا دستی اور قوت کو کمزور کر دیتا ہے یا یہ کہ وہ خیال اور تجربات کے بعض ممنوع منطقوں میں گھسنے کی جسارت کرتا ہے، حال ہی میں دو اور گروہ شامل ہو گئے ہیں جن کے جائز اور درست ہونے کا دعویٰ باقی تمام گروہوں سے بہت کمزور ہے۔ ان میں پہلے گروہ کے متعلق (بغیر کسی بدنیتی کے) یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت متکبر لوگ ہیں۔ تصوف کے متعلق، یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ اس کے دام میں معاشرتی پیمانے کے دو متضاد حلقے آ چکے ہیں، یعنی ایک طرف دانشور اور دوسری طرف عوام الناس۔ درمیانے درجے کے لوگ اس سے کم ہی وابستہ ہیں اگرچہ کوئی امیر وکیل یا تاجر اپنے ملازموں کو کسی صوفی حلقے کے اجتماع میں شرکت کے لیے شام کی چھٹی تو دے دیتا ہے مگر وہ خود ایسے اجتماعات کو کسی قدر حقارت سے توہم پرستی کا نام دیتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کا رویّہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے کلیسائے انگلستان کے پادریوں سے مختلف نہیں جیسے وہ حقارت سے لوگوں کا "مذہبی جوش و خروش" کہتے تھے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جن میں جدید خیالات کے لوگ شامل ہیں، جیسے انقلابی اور وہ تمام لوگ جن کی مذہب میں دلچسپیاں صرف اس حد تک محدود ہیں کہ وہ اُسے ایک مفید سیاسی ہتھیار سمجھتے ہیں اور وہ تصوف کو "بے حسی" اور تقدیر پرستی کے مساوی خیال کرتے ہیں اور یورپی طاقتوں کی دنیا میں بالا دستی کے بعد سے اسے اسلام پر آئی ہوئی ہر مصیبت کی جڑ سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تصوف نے ایک فعال مذہب کو جو دنیا فتح کر سکتا تھا، آختہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ یہ لوگ یا تو افسوس ناک حد تک اپنی تاریخ سے ناواقف ہیں یا

Marfat.com

جان بُوجھ کر کند ذہنی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

علما کا سابقہ ریکارڈ خواہ کتنا بھی قابلِ تعریف کیوں نہ ہو (خاص طور پر صدرِ اوّل کے نمایاں علمائے دین کا) جو ظلم وستم کے خلاف صف آرا ہُوئے تاہم علمائے دین اور حکام ریاست میں ایک قدرتی تعلق ضرور پایا جاتا ہے۔ یہ صوفی ہی تھے جو اکثر بے لاگ انداز میں اپنے دلی خیالات کا اظہار کر کے اپنی گردنیں کٹوانے کا خطرہ مول لے لیا کرتے تھے۔

وقت کے ساتھ جب مغرب کی یلغار شروع ہُوئی تو مسلمان ہکّا بکّا رہ گئے۔ اس موقع پر وہ بری طرح بٹے ہُوئے اور کوئی مؤثر مزاحمت نہ کر سکے۔ پھر بھی امیر عبدالقادر نے ۱۸۳۰ء میں الجزائر میں فرانسیسیوں کا زبردست مقابلہ کیا وہ شاید قرونِ وسطیٰ سے لے کر اس وقت تک واحد مسلمان تھے جن کی ہمت، شجاعت اور عظمت کا مقابلہ سلطان صلاح الدین ایوبی سے کیا جا سکتا ہے۔ عبدالقادر ایک صوفی تھے جنہوں نے دمشق میں اپنی جبری جلاوطنی کی بقیہ تمام زندگی ابن عربیؒ کو پڑھنے اور اس کی تفسیر کرنے میں صرف کر دی۔

اسی طرح کی ایک شخصیت امام شاملؒ کی تھی جنہوں نے ۱۸۳۴ء سے ۱۸۵۹ء تک زارِ روس کی فوجوں کو، فوجی تاریخ کی انتہائی زبردست معرکہ آرائی سے، اپنے علاقے سے دور رکھا۔ وہ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک شیخ تھے جنہیں اُس وقت کا برطانوی پریس "شیرِ داغستان" کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ آج بھی قفقاز کے مسلمان انہیں محبت وعقیدت سے یاد کرتے ہیں اور آج بھی سوویت حکومت کے خلاف اُن کی خاموش مگر بے ریا مزاحمت اُس حلقۂ صوفیا کے شیوخ کر رہے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے سرگرم اہلِ سیاست کو صوفیوں پر تنقید کرنے سے پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اسلام سے اُسی طرح وفاداری، شجاعت میں اُسی طرح بے مثل اور کارگر ہونے میں، اُسی طرح مؤثر ہیں جیسے یہ صوفی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوّف پر تنقید کا جواز مشکل ہی سے ملتا ہے ـــــ اس کے مقاصد یا دینی اساس خواہ کچھ بھی ہو، تصوّف امت کے

Marfat.com

خون میں شامل ہو چکا ہے۔ اور اس کی خوشبو نہ صرف مسلم آرٹ کی ہر جہت میں مہکتی نظر آتی ہے بلکہ اس کی نکہت تو کسی مومن کی روزمرّہ زندگی میں رچی بسی محسوس ہوتی ہے۔
وہ لوگ جو تصوف کے کٹّر مخالف ہیں وہ بھی دین و ایمان پر بات کرتے ہیں تو اس کی اصطلاحات سے دامن نہیں بچا سکتے اور اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک عالمگیر مذہب اپنی اس جہت سے محروم کر دیا جائے گا۔ ترکوں کو صوفی مبلغوں، تاجروں اور سیاحوں ہی نے مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ اسی طرح آبنائے انڈونیشیا اور برصغیر ہند کے بہت سے لوگ بھی ان کی وجہ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ تاریخ سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا اور تاریخ اسلام تو صوفی سلسلوں سے بندھی ہوئی ہے، عین اُسی طرح جیسے دین کے جسد میں دین کی روح داخل ہو کر اُسے بحال کر دیتی ہے۔
صوفی شیوخ نے ہمیشہ تصوف کی تعریف کرنے میں تذبذب کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر کیریٹ (Carret) سے گفتگو کرتے ہوئے شیخ العلوی نے فرمایا تھا: "مذہب سے بالاتر عقیدہ ہے، اس پر ڈاکٹر کیریٹ نے پوچھا تھا: "عقیدہ کیا ہے؟" جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا: "یہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔" اس پر ڈاکٹر کیریٹ نے دریافت کیا: "وہ وسیلہ کیا ہے؟" اس کا جواب شیخ نے مسکرا کر دیا: "انہیں میں آپ کو کیوں بتا دوں کیونکہ آپ ان کا استعمال کرنے کو تیار نہیں۔ اگر آپ میرے پاس ایک مرید کی حیثیت سے آتے، تو میں آپ کو اس کا جواب دے سکتا تھا لیکن ایک بے کار تجسس کو دُور کرنے سے کیا فائدہ؟"[1] جو لوگ کسی منظر کو پوری طرح دیکھنا چاہتے ہیں انہیں اُس روزن تک راستہ ضرور بنانا چاہیے جہاں سے یہ منظر نظر آتا ہو۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تو پھر یہ بات تصور کی جا سکتی ہے کہ ان کا شوق اس موضوع سے محض "مشغلہ بازی" کی حد تک ہے اور یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ خدا تک پہنچنے کے ذرائع سے کھیل تماشا مناسب نہیں۔

1: Martin Lings, A Sufi Saint of the Twentieth Century. pp.26-27.

Marfat.com

لیکن بہرحال تصوّف کی تعریفیں بھی کی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے: "یہ ہر اُس چیز سے محبت نہ کرنا ہے جس سے آپ کا محبوب محبت نہ کرتا ہو۔" حضرت جنید بغدادیؒ کہتے ہیں کہ:

"یہ صرف اس قدر ہے کہ اللہ تجھے تجھ میں مار دیتا ہے اور پھر اپنے ساتھ زندہ کر لیتا ہے۔" اور اُن کے ایک مرید نے تصوّف کی یہ تصریح کی ہے کہ:

"صوفی وہ لوگ ہیں جو ہر ماسوا سے کنارہ کر لیتے ہیں۔ نہ وہ اس کے سوا کسی اور چیز کے مالک ہوتے ہیں اور نہ اس کے سوا کوئی اُن کا مالک ہوتا ہے۔"

اور حضرت بایزید بسطامی نے صُوفیوں کی یہ تعریف کی ہے: "وہ سمندر کی طرح فیاض، سورج کی طرح مفید اور زمین کی طرح عاجز ہوتے ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ تصوّف "اخلاص" کا نام ہے اور یہ مساوی ہے "احسان" کے۔ پیغمبر اسلامؐ نے دین میں تین درجے بتائے ہیں۔ اوّل: اسلام یعنی خدا کے آگے اپنے آپ کو کمال عجز و بندگی سے پیش کرنا، دوم: ایمان یعنی عقیدہ اور یقین اور سوم احسان، یعنی اسلام اور ایمان میں کمال۔۔۔ اس تعریف کے مطابق تصوّف ایک ذریعہ ہے خُدا کے آگے خود کو وقف کر دینے اور خدا پر ایمان کو اس کے منطقی نتیجے تک پہنچا دینے کا، یا زیادہ واضح طور پر یُوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ سے اُس کا اصلی مفہوم حاصل کرنے کا۔ گویا یوں کہیے کہ راستے کے انجام تک پہنچنا ہے۔ شیخ العلوی اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:

"کیا یہ عین حقیقت نہیں کہ ہمارے شہسوار اپنے گھوڑوں سے نیچے بھی اتر آتے ہیں؟"

ایک عام مومن اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے مگر جس گاڑی میں وہ بیٹھتا ہے یعنی مذہب وہ سفر کرتی رہتی ہے۔ صوفی کو ایک مسافر بھی کہا ہے، یا وہ جو مسابقت کرتا ہے یا آگے کو لپکتا ہے:

Marfat.com

أُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (الحدید (۵۷): ۲۱)

"جو اُن لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خدا پر ایمان لائے ہیں لیکن۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمائے اور خدا بڑے فضل کا مالک ہے۔"

مارٹن لنگز، صوفیوں کی قرآن سے خاص وابستگی کا ذکر کرتے ہیں جو انہیں دیگر مسلمانوں سے ممتاز بناتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"وہ عمداً دنیائے فانی کے مقابلے میں وہ راہ اختیار کرتے ہیں جو انہیں ابدیت کی طرف لے جاتی ہے اور ان کا یہ انتخاب محض ذہنی یا تصوراتی نہیں ہوتا بلکہ انتہائی مخلصانہ ہوتا ہے جو ان کے وجود کی اتھاہ گہرائیوں تک کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور انہیں اس راہ پر متحرک کر دیتا ہے۔ قرآن خود اُس انتخاب کا لب لباب اور رُوح ہے کیونکہ وہ مسلسل دُنیائے دُوں اور دنیائے اعلیٰ کے عظیم تفاوت پر زور دیتا ہے۔"

پھر لنگز پوچھتے ہیں:

"بھلا ماسوئی دوسرے مذاہب میں ان کے ہم مشربوں کے، کون ہے جو پہلی چیزوں کو پہلی اور دوسری چیزوں کو دوسری جگہ دینے میں صوفیوں کا مقابلہ کر سکے۔"[1]

بعض علما اور مجتہدین کے مطابق تصوف کو محض "ذوق" کہا جا سکتا ہے۔ "ذوق" وہی رکھتا ہے جو دانا ہو۔ اس لیے کسی صداقت کو ذہن میں رکھنا ہی کافی نہیں۔ اس کے وجود کو "چکھنا" بھی ضروری ہے۔ دانا وہی ہے جو اس کا "ذائقہ" رکھتا ہو۔ سماوی حقائق (یا محض الحق) کے ادراک کا جس سے کوئی صوفی بہرہ مند ہوتا ہے یا جن کے حصول کی امید رکھتا ہے، حواسِ خمسہ سے، بہ نسبت، بالواسطہ حاصل کیے

---

1. Martin Lings, What is Sufism, p. 30.

Marfat.com

ہُوئے علم سے زیادہ متعلق ہے اور شکوک وشبہات اور بے یقینی سے اتنا ہی پاک ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ تصوف کے اس پہلو کی، جس کا تعلق علوم آگہی سے ہے (اس کی دیگر جہتیں بھی ہیں) یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ عام لوگوں کی نظر میں جو مجرد ہے، اسے مطلق بنانے کا نام تصوف ہے یہاں تک کہ روحانی مدرکات اور احساسات ویسے ہی صریح اور بدیہی صفت کے مالک نہ ہو جائیں جیسی کہ ہم عام طور پر اپنے اردگرد طبیعی دنیا میں باصرہ، سامعہ، لامسہ اور ذائقہ کے حواس سے منسوب کرتے ہیں۔

کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس میدان میں خود فریبی کے بہت سے امکانات ہیں۔ ہر انسانی عمل میں کچھ خطرات ہوتے ہیں جو عمل جس قدر رفیع الشان ہو گا اسی قدر اس کے امکانی خطرات زیادہ ہوں گے۔ جو لوگ اپنے پیٹ کے بل رینگنے کے عادی ہیں انہیں گرنے کا ڈر نہیں ہوتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت تصوف کی کسی راہ پر اُس وقت تک قدم نہیں رکھتے جب تک کہ وہ طریقت کے کسی مستند سلسلے سے باضابطہ منسلک نہ ہو جائیں (یعنی جب تک وہ "سالکین" میں شامل نہ ہو جائیں) اس کے بعد انہیں اس سلسلے کے روحانی شیخ یا مرشد کی، جو اس راہ کا پہلے ہی سالک ہوتا ہے، ہدایت میں چلنا ہوتا ہے۔

نئے سالکین سے یہ متوقع نہیں ہوتا کہ وہ انسانی ذات کی حدود سے باہر کسی مکاشفے، تجربے یا مدرکات کی جستجو کریں۔ انہیں تو نہایت عاجزی اور اخلاص سے اپنے منتخبہ سلسلے کی مشقیں اور ریاضتیں کرنا ہوتی ہیں۔ انہیں اس میں جو کچھ پیش آنے کو ہو گا، اللہ کی مرضی سے اپنے مناسب وقت پر پیش آ جائے گا، اور کوئی شخص اس پر قید و بند عائد نہیں کر سکتا۔ فرتھجوف شوآن کہتے ہیں:

> "یہ انتہائی لغو بات ہے کہ علم و آگہی کو پابند کر دیا جائے۔ پردۂ چشم لاانتہا دُور ستاروں کی کرنوں کو گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ یہ کام بغیر کسی جذبے یا دعوے کے کرتا ہے اور کسی کو یہ حق یا اختیار نہیں کہ

Marfat.com

اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالے"[1]

اب رہا معاملہ ذوق کا (یعنی یہ خیال کہ کوئی انسان اپنے ذاتی تجربات سے حقائقِ ازلی کا عرفان حاصل کر سکتا ہے) تو یہ جدید متشکک اذہان کے لیے دلکش ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے زمانے کے بہت سے لوگ مذہب کی جانب تصوف کے وسیلے ہی سے قدم بڑھا سکتے ہیں۔ وہ اپنے باپ دادا کی طرح اُن صداقتوں پر سنی سنائی باتوں کی حیثیت سے یا اُن لوگوں کی کہی ہوئی باتوں کی حیثیت سے ایمان نہیں لا سکتے جو اُن سے بہتر آگہی رکھتے ہوں اور انہیں سند کا درجہ حاصل ہو۔ وہ ان صداقتوں کو خود چکھنا اور پرکھنا چاہتے ہیں۔ شاید شائستہ اور شریفانہ طور پر ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ "ان کا ایمان کمزور ہے" اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اُس چیز کو جس پر وہ ایمان لائے ہیں، دیکھے بغیر نہیں مانتے، حقیقتاً اپنے مقصود کے اہل نہیں ہوتے ــــ مگر اب کیا کیا جائے یہ تو ہمارے عہد کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے اور کوئی شخص مخصوص صورتِ حال کے مطابق ہی کوئی عملی قدم اٹھا سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال تنہا مغرب ہی میں نہیں ہے۔ یہ پیدائشی مسلمان، جنہیں "پاسپورٹ مسلم" بھی کہا جا سکتا ہے، اور جن کی بڑی تعداد کے ایمان کی بنیادیں جدید تعلیم نے متزلزل کر دی ہیں، اب تصوف ہی کے وسیلے سے دوبارہ اسلام کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

بہرحال، کسی شخص کی مشکلات کے حل کا یہ کوئی آسان راستہ نہیں جو لوگ کسی مذہبی صداقت کا قابلِ قبول ثبوت چاہتے ہیں وہی اوّل اوّل اپنے اطمینان کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اُن کا علم کا حصول اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے اور روحانی ترقی بھی ذاتی کامیابی ہوتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اس راہ پر اکثر نا امیدیوں کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ تصوف، کسی بھی مستند تصوف کی طرح، سب سے اوّل نفیِ ذات

---

1. Frithjof Schuon, Logic and Transcendence, p. 216

Marfat.com

کرتا ہے: "میں نہیں! میں نہیں! اے اللہ، صرف تو!" اس اعلان کا پہلا جزو خود سرفرازی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے آپ کو فنا کرنے کے لیے ہے۔ اور قرآن میں اس سلسلے میں ارشادِ باری تعالیٰ اس طرح ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۚ

"جو (مخلوق) زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے۔ اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت) جو صاحبِ جلال وعظمت ہے باقی رہے گی۔" (الرحمٰن (۵۵): ۲۶-۲۷)

حشر ونشر سے پہلے موت ہے۔ جب پودے کی پتیاں مرجھا جاتی ہیں تو وہ مر جاتا ہے اور اس کا بیج زمین میں دفن ہو جاتا ہے تا آنکہ سورج کی روشنی سے نئی نمو کروٹ لیتی ہے۔ ایک صوفی ہر شے سے کٹ کر، ہر شے سے دامن کش ہو کر اور خود کو فنا کر کے ہی خدا سے واصل ہونے کی امید رکھتا ہے اور اسی حالت کو "مقامِ بقا" کہا جاتا ہے؛ یعنی دوام۔ مارٹن لنگز کی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق یہ ابدیت کا درجہ ہے۔ وہ جو زندہ رہتا ہے اور باقی رہتا ہے وہ ہمارا وجود نہیں جو دنیا میں تھا اور جسے ہم دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

مغرب کے لوگ جب پہلی بار عظیم صوفیوں کی تحریروں سے روشناس ہوتے ہیں تو یہ توقع کرتے ہیں کہ ان میں انہیں روحانیت کے کرشمے اور انبساط کے لمحے نصیب ہوں گے۔ اس میں ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جو ان کے لیے تعجب خیز ہو گا؛ بالخصوص اپنے نفس کو مارنے، احکاماتِ الٰہی کی اطاعت، اور اپنی اصلاحِ احوال پر بہت کچھ ملے گا[۱]۔ ان کتابوں میں زیادہ تر بڑی تفصیل سے انسانی احوال کے مطابق فرائض

---

[۱] ٹائٹس برک ہارٹ بیان کرتے ہیں کہ درقاوی سلسلے کے بانی کے پوتے مولے علی (جن سے اوائل ۱۹۳۰ء اپنے دورانِ قیامِ فاس (مراکش) میں ان کی خاص شناسائی ہو گئی تھی) ہمیشہ صوفیوں کے باطنی احوال پر بات کرنے سے احتراز کرتے تھے اور ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ "یہ وہ خود رو پھل ہیں جو اطاعتِ خداوندی کے شجر پر آپ سے آپ لگتے ہیں۔ ہمیں تو اس بات پر توجہ کرنی چاہیے کہ درخت کی حفاظت اور آبیاری کس طرح کی جائے۔ ہمیں اس کے پھلوں کی ان کے پکنے سے پہلے بات نہیں کرنی چاہیے!"

Marfat.com

پر زور دیا گیا ہے ، جیسے خوفِ الٰہی ، توکل علی اللہ، ترکِ دنیا اور سب سے زیادہ فقر پر۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اس راہ کا سالک عام طور پر صوفی کی بجائے "فقیر" ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ ہمیں جو ملتا ہے یا جو ملے گا ، وہ ایک عطیہِ الٰہی ہوتا ہے جو ہماری طلب کے ظرف کے مطابق ہوتا ہے؛ تاہم یہ ہمارے استحقاق سے کہیں زیادہ ہی ہوتا ہے ۔ ہمارا بنیادی فریضہ اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ ہمیں جو کچھ ملتا ہے، صاف اور سادہ ہوتا ہے مگر اس انعامِ خداوندی کو پانے کی کوشش میں ہم اپنے آپ کو گورکھ دھندا بنا لیتے ہیں جس کی وجہ سے ہم نہ صرف اُسے پا لینے کے اہل نہیں رہتے بلکہ اُسے اپنے اندر جذب کرنے کی اہلیت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

کسی دنیا دار شخص کی خودی ـــ یادوں، خوابوں، جھوٹی اُمیدوں ، احساسِ جرم اور خود غرضی ، خواہشات اور خوفوں کا ایک ملبہ ہوتی ہے اور یہی وہ "پتھر دل" ہوتا ہے جس کا ذکر اکثر قرآن میں آتا ہے ۔ برتن خالی ہو تبھی بھرا جا سکتا ہے اور صرف وہی شخص ، جس نے اپنی شخصیت یا ذات کے ظرف کو کوڑے کچرے سے خالی کر دیا ہو، یہ امید رکھ سکتا ہے کہ خدا کے انعامات اس میں ڈالے جا سکیں گے۔ انسانی دل میں بیک وقت دو ہستیوں کے لیے جگہ نہیں ہوتی جیسا کہ اکثر صوفیا نے بارہا کہا ہے۔ کچھ اور مثالیں اس نکتے کی وضاحت کر سکتی ہیں ۔ اپنی پست زندگی میں ہماری حالت برف کی دیوار کے پیچھے مقید کسی انسان کی سی ہوتی ہے جس کے سامنے کا حصہ بند ہوتا ہے ۔ برف شفاف تر ہوتی ہے اور جو شخص بھی اپنی آنکھیں استعمال کر کے اس میں سے جھانکنا چاہے اکثر یہ دیکھ سکتا ہے کہ اس سے پرے کیا ہے ۔ صوفی برف کی اس دیوار کو پگھلانے یا بسا اوقات اسے پاش پاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ (جیسے کہ زین بدھ مت میں ہوتا ہے) اور پھر ہم قلب کے آئینے کے متعلق بھی بات کر سکتے ہیں جو سماوی حقائق منعکس کرنے کے لیے وضع ہوا ہے مگر بیشتر حالتوں میں یہ بہت دھندلا ہو جاتا ہے ۔ اگر قدیم زمانے کا دھات کا آئینہ ہے تو اس پر زنگ کی تہیں چڑھ جاتی ہیں اور انہیں صاف کرنا کارے دارد ہے ۔" اب بھلا وہ

Marfat.com

قلب کس طرح منور ہو سکتا ہے جس میں مخلوق کی شبیہیں جلوہ گر ہوں ؟ ... یا یوں کہیے کہ وہ باری تعالیٰ کے سامنے کیسے حضوری پا سکتا ہے جب تک کہ اس کے اوپر سے غفلت کے داغ دھبے نہ صاف کر دیے جائیں؟[1]

پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے :

"ہر شے کو زنگ سے پاک کر کے صیقل کیا جا سکتا ہے اور دل کا صیقل ذکرِ الٰہی ہے۔"

صوفی سلسلوں کی اساس اور بنیاد ہی ذکرِ الٰہی پر ہے یا کسی ایسے ورد اور وظیفے پر جس میں اللہ کے مبارک نام کی بالا دستی ہو جیسے "اللہ اکبر"۔ اور ہمیں اس بات کا یقین دلایا گیا ہے کہ خدا اپنے نام میں موجود ہوتا ہے، یا یُوں کہیے کہ جب ہمارے لب اس کے نام کا ورد کرنے کے لیے کھلتے ہیں (یا جب ہم اپنے دل میں اُس کا وِرد کرتے ہیں) تو وہ موجود ہوتا ہے۔ صوفیوں کے لیے مسلسل وِرد اور متواتر "ذکر" ہر قفل کی کنجی ہے۔ اور بھلا کوئی قفل ایسا ہو سکتا جو قوّت خداوندی کے سامنے نہ کُھلے؛ یہ عبادت کی روح بھی ہے اور قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے :

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (العنکبوت (۲۹) ۴۵:)

"اور خدا کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے۔"

تصوّف کے فلسفے کی بنیاد ذکر میں کمال حاصل کرنے اور اس پر مستقل عمل پر ہے تاکہ کام کاج کے دوران میں بھی قلب میں اس کی گونج باقی رہے ... اس سے غرض یہ ہے کہ حضوری میں کوئی مخل نہ ہو؛ تاہم اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم یہ سمجھ بیٹھیں کہ خدا کو کسی انسانی عمل کے ذریعے طلب کیا جا سکتا ہے ـــ وہ تو ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہے ع

"لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں"

---

1. Quoted from Kitab-al-Hikam of Ibn 'Ataullah.

Marfat.com

لیکن ہم تو بھٹکنا چاہتے ہیں اور بار بار اُسی جگہ لوٹ کر آتے ہیں جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا۔ حاضر میں، اور حضوری میں۔ بالآخر، صوفیوں کے بقول، ایک مقام ایسا آتا ہے جب دل کی کثافت اور میل ذکر سے صاف ہو جاتا ہے، اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ "وہ" اس میں جلوہ افروز ہو سکے جس کا عرش ہر شے پر محیط ہے۔ اس سلسلے میں صوفیاء ایک حدیثِ قدسی کا حوالہ دیتے ہیں:

"میرا بندہ عبادت و ریاضت سے میرے قریب آنے کی سعی چھوڑتا نہیں تا وقتیکہ میں اس سے محبت نہ کرنے لگوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ لڑتا ہے اور اس کے پیر بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔"

اگر اُس شخص سے جو اپنے دل کو ماسوا سے پاک کر لینے کی اس منزل پر آجاتا ہے اور اس حدِ کمال کو پہنچ جاتا ہے، پوچھا جائے کہ اس کی کیسے گزر رہی ہے تو وہ لا محالہ یہ ہی کہے گا:

"میں اس کی رضا میں راضی ہوں جس کے جبروتِ پُر عظمت سے زمین گردش کر رہی ہے، سیلاب امنڈ رہے ہیں اور دریا پڑے بہتے ہیں، اور ستارے اپنے راستوں پر چلتے ہیں۔ زندگی اور موت اُس کے اشاروں پر ہے اور اس کے غم و خوشی کے فرشتے دنیا کے کناروں پر اُڑتے پھر رہے ہیں۔"[1]

اب ہم ایک ایسے منطقے میں داخل ہوتے ہیں جو اقتصادی اختلاف سے ماوریٰ ہے، جہاں وہ امتیازات جن کا ہم اپنی روزمرہ کی زندگیوں میں مشاہدہ کرتے ہیں بے معنی یا بعید از فہم ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں نگاہ ہی وجود

---

1. R. A. Nicholson, The Mystics of Islam.

Marfat.com

بن جاتی ہے یعنی دل کی آنکھ روشن ہو جاتی ہے جس سے ایک مطمئن صوفی اپنے رب کا جلوہ دیکھتا ہے (اور اس کا رب اُسے دیکھتا ہے) یہ وہی آنکھ ہے جس کے بارے میں سینٹ پال (St. Paul) نے "افیسوں" (Ephesians) کو خط لکھا تھا اور اس کے حوالے سے شمالی امریکہ کے ایک ریڈ انڈین حکیم نے کہا تھا:

"مَیں بے بصر ہوں اور اس دنیا کی چیزیں نہیں دیکھتا۔ مگر جب روشنی عالمِ بالا سے آتی ہے تو یہ میرا دل منور کر دیتی ہے اور مَیں دیکھنے لگتا ہوں کیونکہ میرے دل کی آنکھ تمام چیزیں دیکھتی ہے"۔[۱]

اور یہی آنکھ ایک ایسا دروازہ بن جاتی ہے جس سے گزر کر وجود وہ ہو جاتا ہے جو حقیقت میں ہمیشہ سے تھا۔ اور اللہ کے حضور اپنی اصلی شخصیت سے واصل ہو جاتا ہے۔

انسان اس منزل پر تنہا اپنی سعی و کوشش سے نہیں پہنچ سکتا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ کوشش کے بغیر "اُسے" حاصل بھی نہیں کر سکتا حقیقت ازلی سے جو رکاوٹ انسان کو جُدا کرتی ہے وہ بہت معمولی سی ہے۔ خدا انسان سے بہت قریب ہے جبکہ انسان خدا سے بہت دُور ہے۔ یہ رکاوٹ انسان کے لیے ایک پہاڑ ہے۔ وہ ایک ایسے پہاڑ کے سامنے کھڑا ہے جسے اُسے خود اپنے ہاتھوں سے ہٹانا ہے۔ وہ مٹی کھود رہا ہے مگر بے سود۔ پہاڑ اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ انسان بہرحال خدا کے نام پر کھدائی جاری رکھتا ہے اور پہاڑ یوں غائب ہو جاتا ہے جیسے وہ کبھی وہاں تھا ہی نہیں۔

---

[۱] دیکھیے Frithjof Schuon, L' Oeil du Coeur, p.22

Marfat.com

Marfat.com

باب دوازدہم

دیگر جہتیں

یہ تنہا صوفی ہی نہیں جو مبہم اور غیر واضح کو مستحکم اور مُشخّص فی الذّات بنانے کے مسائل میں سرگرداں ہیں یعنی یوُں کہیے کہ وُہ اُس حقیقت کے شعور کا دائرہ وسیع کرنے کی سعی کرتے ہیں جن کا احساس ہر ذی شعور مرد وزن رکھتا ہے تاکہ وُہ حقیقتیں بھی شامل ہو سکیں جو ہمارے حواسِ خمسہ کی گرفت میں نہیں آتیں۔ صوفی "نامعلوم" کی دریافت میں اپنے اُن ہمکاروں اور ہم مشربوں سے جو اُن سے کم حوصلہ اور جرأت رکھتے کہیں زیادہ دُور اور گہرائی میں غوطہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابنِ عطاء اللہ کے مطابق "حقیقی سفر اُس ادراک کی طرف ہوتا ہے جس میں آپ آخرت اپنی ذات سے زیادہ نزدیک پاتے ہیں؛ تاہم ہر مومن کو اس مسئلے کا سامنا ہے"۔

اسلام اور عیسائیت دونوں ہی میں ہماری دُنیوی زندگی کو اس زندگی کے لیے تیاری کا وقفہ قرار دیا گیا ہے جسے موت کے بعد آنا ہے لیکن کوئی بھی اپنے آپ کو اُس کے لیے تیار کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جو غیر حقیقی اور تصوّراتی ہو۔ یہ بات نوجوان لوگوں کو مشکل ہی سے یاد آتی ہے کہ بالفعل اگر وُہ زندہ رہے تو آخر ایک دن ضعیف العمر

Marfat.com

لوگوں کی صف میں ہوں گے۔ انسانوں کے لیے اِس بات پر یقین کرنا اور بھی مشکل ہے کہ یومِ حساب، بہشت یا جہنم سب کچھ یقینی طور پر اسی طرح سامنے آئے گا جیسے کل طلوع ہونے والی سحر آئے گی، بلکہ یُوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سحر بھی خُدا کی مرضی کے بغیر طلوع نہیں ہوتی جب کہ جسمانی موت اور اس کے بعد جو کچھ درپیش آئے وہی ہمارا اٹل مستقبل ٹھہرے گا۔

اِس بات کا سمجھنا اِن لوگوں کے لیے، جن کی توجہ اِس دُنیائے محسوس اور ظاہری پر مرکوز رہتی ہے، سخت دشوار ہے کہ یہ ہماری دُنیا کسی بھی لمحے دھوئیں کے ایک مرغولے کی طرح غائب اور ناپید ہو جائے گی! اس صورتِ حال کے باوجود قرآن ہمیں یہ یقین دہانی کراتا ہے کہ عالمِ اخروی اس دُنیوی زندگی سے بدرجہا بہتر ٹھکانا ہے جو کبھی نہ ختم ہونے والا بھی ہے اور ہمارے مشاہدے میں آنے والی تمام حقیقتوں سے زیادہ حقیقی ہے۔ اس موڑ پر پہنچ کر بعض اصطلاحات مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں اور بسا اوقات وُہ گمراہ کُن بھی ہو سکتی ہیں، جیسے "آخرت" اور اس سے بھی بڑھ کر "حیات بعد الموت"۔ اگر ان اصطلاحات سے یہ مراد لی جائے کہ جو زمانہ پہلے گزر چکا ہے عالمِ اخروی اس کی پرچھائیوں سے زیادہ کچھ نہیں یا یہ کہ جو زندگی ہم یہاں گزار رہے ہیں عالمِ آخرت اِس کی غیر طبعی توسیع شدہ صورت ہے تو یہ خیالات یقیناً ہماری گمراہی کا موجب ہو سکتے ہیں اور ہمارے اس زمانے میں یہ اصطلاحیں بُہت سے لوگوں کو ایسی ہی باتیں سمجھا رہی ہیں۔ اب بدقسمتی یہ ہے کہ متبادل اصطلاحیں موجود نہیں جو کم از کم یہ بنیادی نکتہ ہی واضح کر سکیں کہ اس دُنیا میں ہمارے تجربات اپنی کیفیت اور ماہیئت کے اعتبار سے آخرت کے "تجربات" سے بہت کم اور بے حقیقت ہیں، نہ ہی ہمارے پاس وُہ الفاظ ہیں جو یہ ظاہر کر سکیں کہ جب روح طبعی موت کے دروازے سے گزرتی ہے تو کون سے لا انتہا امکانات اس کے سامنے ہوتے ہیں۔

تاہم اپنی موت منجملہ سے کام لے کر ہم کسی حد تک اس خلیج کو پاٹ سکتے ہیں۔ ہمیں فی الوقت اپنی اس دُنیا کی صورتِ حال کا موازنہ لوگوں کے ایک ایسے گروہ کی زندگیوں سے کرنا چاہیے جو ایک بہت وسیع مکان کے ایک کمرے میں مقید ہوں اور جنہیں اس کمرے

Marfat.com

سے باہر کوئی چیز یاد نہ ہو جب کہ اس وسیع و عریض مکان میں اور بہت سے کمرے بھی ہیں اور اس مکان سے کچھ فاصلے پر اس سرزمین میں ایک پارک بھی ہے اور پارک سے پرے پہاڑ وادیاں اور دریا بھی ہیں۔ یہ قطعۂ ارضی جہاں یہ مکان واقع ہے، کسی سیّارے کا ایک منطقہ ہے اور اس سیارے کی حیثیت پوری کائنات میں ایک انتہائی چھوٹے ذرّے کی سی ہے۔

ہم اُن لوگوں کو جو ایک کمرے میں محبوس ہوں وُہ سب کچھ کیسے سمجھائیں جو اس کمرے کی چار دیواری کے باہر واقع ہے ...؟ کیا ہم اس گھر کے دیگر کمروں کی بات کریں جو اس کمرے کے مقابلے میں بہت زیادہ شاندار ہیں یا ایسے کمروں کی بات کریں جو محض کاٹھ کباڑ بار کرنے کے گودام ہیں یا بدبودار تہہ خانے ہیں ...؟ کیا ہم اس پارک کی بات کریں جس میں ایک حسین دلفریب جھیل بھی ہے۔ کیا ہم اپنے مقید سامعین سے کہیں کہ وُہ اپنے تخیل کو اس سے بھی ماورئی لے جائیں اور اس پارک سے بھی پرے منظر کو گرفت میں لینے کی کوشش کریں؟ پھر کیا ہم اس سیّارے کے آتشیں بطن کی بات کرنے کی جرأت کرسکتے ہیں اور سب سے آخر میں، کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اِن لوگوں کے تخیل کو نامعلوم دُنیا میں مزید آگے لے جائیں اور اِن سے ستاروں اور کہکشاؤں کی بات کریں ...؟

اس گھر کے دُوسرے کمرے، پارک، کھلے میدان اور ستاروں کے جھرمٹ ان اشیائے محسوس سے جن سے کہ ہم مانوس ہیں قطعی دُوسری جہات رکھتے ہیں۔ اِن میں بعض تو ایسی صریح حقیقتیں ہیں جن کے مقابلے میں ہماری انسانی زندگیاں خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، جب کہ بعض دُوسری اشیا ایسی ہیں جنہیں ہم خود اپنی اِس جیتی جاگتی زندگی میں "خواب" ہی کہنا پسند کریں گے اور اس داستان کی کوئی انتہا نہیں۔ "آخرت" اتنی بے پایاں ہے کہ اس کا مقابلہ زندگی کے اس ڈرامے سے نہیں کیا جاسکتا جس میں ہمارے انسانی تجربات واقع ہوتے ہیں۔ دُنیا داروں کو عالمِ بالا کی حقیقتیں سمجھانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم انہیں اپنی ان صلاحیتوں کے استعمال کی دعوت دیتے ہیں جو عدم استعمال سے ناکارہ ہوچکی ہیں۔

وحیٔ الٰہی انسان کی اس معذوری کو معاف کردیتی ہے۔ اسلام اور عیسائیت دونوں ہی عالمِ اُخروی کا ایک انتہائی مصنوعی اور مختصر منظر پیش کرتے ہیں، اور اس کا ایک سادہ سا

Marfat.com

متبادل "بہشت" اور "دوزخ" کے الفاظ ہیں جو ایک عام صاحبِ ایمان کو اس کی نجات کی ضروریات کے مطابق معلومات فراہم کر دیتے ہیں۔ یہ ایک واضح سی بات ہے کہ تجربے کا کوئی اور مقام یا تو اس زندگی کے مقابلے میں جو یہاں ہم گزارتے ہیں بہتر ہو سکتا ہے یا بدتر۔ چنانچہ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ عورتوں اور مردوں کو 'بہترین' کی جستجو کرنا چاہیئے لیکن ان نظریات میں علامتیں بھی استعمال ہوتی ہیں (جنہیں اگر وُہ لوگ سمجھ لیں جن کے لیے ان کا سمجھنا ضروری ہے) جو بہشت کی مسرتوں اور بھسم کر دینے والی آگ کے شعلوں کی تمثال سے بھی پرے اُفق کو اور زیادہ وسیع کر دیتی ہیں۔ خاص طور پر جب اسے دُوسرے مذاہب کی علامتیت اور دیومالائی روایات سے مربوط کر دیا جائے اور علامتوں اور دیومالاؤں کی زبان ایک عالمگیر زبان اور ذریعۂ اظہار ہے۔

صرف اس جدید عہد میں بالخصوص انسانوں کے ایک طبقے میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ عام نمونوں سے آگے پیچیدگیوں کی یا پھیلے ہوئے آفاق کی بات کی جائے۔ سابقہ زمانوں میں بہشت کی اُمید اور دوزخ کا ڈر عیسائیوں کے لیے ایک بھرپور حقیقت تھا، گو بسا اوقات ان کے اعمال سے یہ مترشح ہوتا تھا جیسے بہشت اور دوزخ موجود ہی نہیں ہیں (بالکل اسی طرح جیسے نوجوان طبقہ اکثر یہ تاثر دیتا ہے گویا بڑھاپے سے اُنہیں کبھی سابقہ پڑے گا ہی نہیں) آج جس زمانے میں ہم رہ رہے ہیں اس کی تہذیب و تمدن اور ماحول کی صورت گری میں اُمید و خوف کے معدوم ہو جانے نے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔

دُوسری طرف مسلمان کلیتہً اس بات سے آگاہ ہیں کہ مستقبل میں کیا ہو گا۔ اگرچہ قرآن کافروں کی بنیادی تعریف یہ کرتا ہے کہ وُہ ایسے لوگ ہیں جو خُدا اور اس کے اظہارِ ذات کے مُنکر ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی وُہ ان کا تعارف یوں بھی کراتا ہے کہ وُہ ایسے لوگ ہیں جو حیات بعد الموت اور روزِ حشر پر اس کے آنے سے پہلے ایمان نہیں رکھتے۔ خُدا پر ایمان کو اس بات سے جُدا نہیں کیا جا سکتا کہ ایک دن ہم سب کو اُس کے روبرو پیش ہونا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نہایت ہی بدکار آدمی کی کہانی سُنائی جاتی ہے جس نے خُدا کے روبرو حاضر کیے جانے کے خوف سے اپنے بیٹے کو حُکم دیا تھا کہ وُہ مرنے کے بعد اس کی نعش جلا دے اور اس کی

Marfat.com

راکھ کو اتنی دُور دُور بکھیر دے کہ خُدا بھی اسے دوبارہ انسانی روپ میں مجتمع نہ کر سکے؛ تاہم جب مرنے کے بعد وُہ احکم الحاکمین کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اُسے بخش دیا کیونکہ خُدا کے روبرو پیش ہونے کے خوف ہی نے اِس کے ایمان کی تصدیق کر دی۔

ایک موقع پر پیغمبر اسلامؐ منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی؛

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿ۚ﴾ (رحمٰن (۵۵):۴۶)

"اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے ۲ دو باغ ہیں"۔

اس موقع پر ایک صحابی ابو درداؓ نے پکار کر پوچھا: "اے اللہ کے رسول! کیا یہ اس شخص کے لیے بھی ہے جو زنا اور چوری کا مرتکب ہوا ہو؟" اس پر پیغمبر اسلامؐ نے یہی آیت دوبارہ تلاوت فرمائی: "جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے گا اس کے لیے ۲ دو باغ ہیں" تو اس میں یہ اضافہ اور کر دیا کہ ابو درداؓ کے علی الرغم۔

وحدانیت پر یقین رکھنے والے تین مذاہب، (ہندویت کے برعکس) ہماری موجودہ ہستی کو "خواب" سے تشبیہ دینے سے خوش نہیں، اگرچہ یہ تشبیہ اسلام اور عیسائیت دونوں کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں تاہم اکثر اسے غلط سمجھا جاتا ہے کیونکہ لوگ فوراً ہی اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ زندگی اتنی حقیقی نہیں جتنا کہ ہم اسے سمجھتے ہیں؛ حالانکہ اس تشبیہ کا مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ ادراک کی ایسی جاندار حالتوں کا امکان بھی ہو سکتا ہے جنہیں ہم اپنے اس دُنیا کے روزمرّہ تجربات کے سیاق و سباق میں، خواب کے مقابلے میں بیداری کہہ سکتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے جس کی تشریح مشکل ہی سے کسی اور طرح سے ہو سکتی ہے۔ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ایسے شخص کو بھی جس کی زندگی اِس دُنیا میں انتہائی راحت و عیش میں گزری ہو گی روزِ حشر وقتی طور پر ایک غوطہ جہنّم میں دلایا جائے گا، پھر اُس سے پوچھا جائے گا: "اے ابنِ آدم! کیا کبھی تجھے آرام و آسائش کا تجربہ بھی ہوا؟" وُہ جواب دے گا: "اے میرے مالک، مَیں قسم کھاتا ہوں کبھی نہیں"۔ اس کے بعد اس شخص کو جس کی زندگی از حد مصائب و آرام میں گزری ہو ایک جھلک بہشت کی دکھا کر خُدا کے حضور پیش کیا جائے گا جو اس شخص سے پوچھے گا:

Marfat.com

"اے ابنِ آدم! کیا کبھی تجھے زندگی میں اذیت و کرب کا تجربہ ہوا؟" وُہ شخص کہے گا: "نہیں میرے رب! میں قسم کھاتا ہوں میری راہ میں کبھی کوئی نامرادی نہیں آئی اور میں کسی اذیّت سے آشنا نہیں ہوا۔"

اس مثال سے زیادہ واضح کوئی مثال اُس حقیقت کے درجات میں تفاوت کی مشکل سے ملے گی جو شعور کو نچلی سطح سے بلند سطح کی طرف آنے میں پیش آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ مثال ان لوگوں کو جو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ ادراک کی ایسی حقیقی اور سچّی حالتیں بھی ہو سکتی ہیں جن کا تقابل یہاں کی زندگی سے نہیں کیا جا سکتا، اس سوال کا جواب مہیّا کرتی ہے کہ آخر خدا معصوم اور بے گناہ افراد کو اس دُنیا میں مبتلائے مصائب و اذیّت کیوں کرتا ہے؟ بالفعل ایک شخص ایک بھیانک خواب سے بیدار ہو کر خود کو اپنی محبوبہ کے پہلو میں پائے جہاں اس وقت صُبح کی نرم روشنی کھڑکیوں سے اندر آ رہی ہو اور اس کے سامنے اس کا سنہرا مستقبل ہو اور اس کی تمام بھرپور خواہشات پوری ہو چکی ہوں، تو ایسا شخص کتنی دیر تک اُس بیانک خواب کی اذیّت محسوس کرتا رہے گا۔ اس کے برعکس اگر وُہ انتہائی خوش کن خواب سے جاگے مگر خود کو ایک بندی خانے میں پائے جہاں ظالموں کے ہاتھوں وُہ ایذائے بدنی کے ایک دُوسرے ملّے کا منتظر ہو تو سہانے خواب کا لُطف چند لمحوں میں کافور ہو جائے گا۔ خواب سہانے ہوں یا تلخ، حقیقت، خواب پر سبقت رکھتی ہے اور بڑے درجے کی حقیقت کم درجے کی حقیقت پر مقدم ہے۔

ہمیں دو انتہاؤں کے درمیان لطیف توازن برقرار رکھنا ہے۔ ایک طرف تو انسانی زندگی کا وُہ تصوّر ہے جو حواسِ خمسہ ظاہری کے مدرکات کو صداقتِ مطلق سمجھتا ہے اور دُوسری طرف وُہ نظریہ ہے جو اس دُنیا کو غیر حقیقی سمجھ کر دیتا ہے۔ اسلام درمیانی راہ کا مذہب ہے۔ اُس نے اِس میں بھی بڑی احتیاط سے توازن قائم رکھا ہے؛ خواہ انفرادی طور پر مسلمان افراط و تفریط کا شکار ہوتے رہیں۔ اگر ان رکاوٹوں کو جنہیں حجابات کہا جاتا ہے اور جو مختلف درجوں کی صداقتوں کو جُدا کرتے ہیں، ٹھوس اور غیر شفّاف سمجھ لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ گویا ہم نے دُنیا کو ایک اُجاڑ تنہائی میں دھکیل دیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وُہ حجابات سرے سے موجود

Marfat.com

ہی نہیں تو اس کے معنی دُنیا کو نابود کرنا ہوں گے، اور چونکہ حقیقتاً ہم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر ہم کم ادنیٰ حقیقت سے ناتا توڑ لیتے ہیں کیونکہ وُہ ہماری دُنیاوی زندگی سے متصادم ہوتی ہے۔ اسلام جو تعلیم دیتا ہے درحقیقت یہ ہے کہ یہ حجابات اللہ کی مرضی سے موجود ہیں اور اُس کے رحم وکرم کا ایک رُخ ہیں، اور چونکہ ہم وُہ کھیل وہاں کھیل نہیں سکتے جو یہاں کھیلتے رہے ہیں، اور اگر ہم اِس عظیم نور سے حجاب میں نہ ہوں اور وُہ اپنی پوری تجلّی ہمیں دکھا دے تو اس دُنیا کی ہر موجود شے جل کر بھسم ہو جائے[1]؛ حتیٰ کہ ہماری دُنیا میں فرشتوں کی پوری آب وتاب کے ساتھ تجلّیات بھی ہر شے کو فنا کر دیں گی۔ قرآن مجید کہتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ (انعام (۶): ۸)

"اور کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر فرشتہ کیوں نازل نہ ہوا (جو ان کی تصدیق کرتا) اگر ہم فرشتہ نازل کرتے تو کام ہی فیصل ہو جاتا پھر انہیں (مطلق) مہلت نہ دی جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلامؐ نے عظیم فرشتے جبرائیلؑ سے کہا کہ وُہ اپنے آپ کو اس عظیم قوّت کے روپ میں دکھائے جس میں اللہ نے اُسے پیدا کیا۔ اس پر جبرائیل نے کہا" اے اللہ کے محبوب! میری ہیئتِ اصلی انتہائی ڈرا دینے والی ہے جسے اگر دکھا دُوں تو کوئی شخص بھی اپنے حواس کھو سکتا ہے۔" پیغمبر اسلامؐ نے زور دیا کہ نہیں مجھے اپنی اصلی صورت دکھاؤ۔ آخر جبرائیلؑ دُنیاوی بصارت کے دائرے کے اندر اپنے پورے ملکوتی جلوے سے ظاہر ہونے کے لیے راضی ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں ایک انتہائی خوف ناک شور برپا ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک زبردست طوفان آ رہا ہو۔ اِس کے بعد جبرائیل کی شبیہ اپنے پورے جلال سے ظاہر ہوئی جس سے اُفق دھندلا گیا۔ نبی کریمؐ اِس نظارے سے بیہوش ہو گئے، جس پر جبرائیلؑ واپس اپنے دُنیاوی رُوپ میں آ گئے اور اُنہوں نے حضورؐ کو اپنے

---

[1] امام مسلم اور امام حنبل کی ایک روایت کے مطابق: "روشنی اُس کا پردہ ہے اگر وُہ ایک مرتبہ اُسے ہٹا دے تو اُس کے لقائے مبارک کی تجلّی تمام لوگوں کو جو اُس تک پہنچ پائیں بھسم کر دے۔"

Marfat.com

گلے سے لگایا، بوسہ دیا اور عرض کی: "ڈریے نہیں اے محبوب خدا، میں آپ کا بھائی جبرائیلؑ ہوں۔" اس کے ساتھ ہی جبرائیلؑ نے یہ بھی کہا: "اگر آپؐ کہیں اسرافیلؑ کو دیکھ لیتے جو یوم نشور کا صور پھونکیں گے تو آپ کی کیا حالت ہوتی کیونکہ اُن کے آگے تو میرا وجود بھی آپ کو بہت ہی حقیر اور بے وقعت محسوس ہوتا۔"

اگرچہ صداقت ازلی حجابوں میں ہے؛ تاہم یہ حجاب کم از کم نیم شفّاف ضرور ہیں۔ صداقتِ عظمیٰ کا جلوہ صداقتِ ادنیٰ پر ظاہر ہو ہی جاتا ہے، یعنی جس طرح فرشتے رُوپ بدل کر انسانوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ رسولِ خدا نے ایک موقع پر فرمایا تھا: "بہشت تمہارے نعلین کے تسمے سے بھی زیادہ تم سے نزدیک ہے اور یہی بات دوزخ پر بھی منطبق ہوتی ہے۔" ایک اور موقع پر لوگوں نے دیکھا کہ آپؐ جیسے کسی چیز تک پہنچنے کے لیے تیزی سے بڑھے مگر یک لخت ہی پیچھے ہٹ گئے۔ جب لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو آپؐ نے فرمایا، "میں نے اس وقت بہشت کو دیکھا اور اس کے ایک خوشۂ انگور کی طرف بڑھا۔ اگر میں اُسے نکال لیتا تو تم قیامت تک اُسے کھاتے رہتے۔ میں دوزخ کو بھی دیکھا۔ میں نے اُس سے زیادہ خوف ناک نظارہ کبھی نہیں دیکھا۔"

وجود کا رشتہ ہستی کی تمام مکانی حالتوں اور جہات کو باندھے ہوئے ہے اور اسی طرح پروردگار کی رحمت کا تار ہر شے کو مربوط کیے ہوئے ہے اور یہ بات کلمۂ توحید سے عیاں اور واضح ہے، کیونکہ خدائے واحد کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، نہ صداقت کے مختلف درجات کو علیحدہ علیحدہ ناقابلِ رسائی خانوں میں بند کیا جا سکتا ہے۔ "وجود" اور "رحمت" کی اصطلاحات کی جگہ ہم "جمال" اور "خیر" کی اصطلاحات رکھ سکتے ہیں جو منبع واحد سے چھلک کر ہستی کی انتہائی حدوں تک پہنچتی ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق، جس کا پیچھے ہم حوالہ دے آئے ہیں:

"خدا جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔" یہ وہی جمال ہے جس میں ہم اپنے مکانی بُعد اور دُوری کے باوصف، خدا کو دیکھ سکتے ہیں اور اس فاصلے سے بھی بہشت کی خوشبو سونگھ سکتے ہیں۔ ایک اور حدیث کے مطابق ہم نیکی کا جو بھی کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُس کا سو گنا اجر

Marfat.com

دیتا ہے، کیونکہ اُس نے اپنے لیے ہر چیز کا ننانوے فی صد محفوظ کر رکھا ہے اور جو سَوواں حصّہ دُنیا میں رہ گیا ہے اُس کے تحت اُس کی تمام مخلوق لُطف و محبّت سے سرشار ہے۔ اسی محبّت کے باعث گھوڑا اس ڈر سے اپنا سُم اُٹھا لیتا ہے کہ مُبادا کسی بچّے کو اُس سے گزند پہنچ جائے۔

مزید یہ کہ اگر بہشت اور دوزخ ہم سے اتنے ہی قریب ہیں، جیسا کہ پیغمبرِ اسلام نے فرمایا، تو ہم ایک لحاظ سے انہی میں رہ رہے ہیں۔ اگرچہ ہم اِس سے آگاہ نہیں ہیں اور ایک باریک پردہ ہی ہمیں ابدی مسرتوں اور دُوزخ کی آگ سے جُدا رکھتا ہے۔ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ ہم سب انسان ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں مگر یہاں اس بات کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری انسانیت کی بیرونی سطح ایک باریک جھلّی کی مانند ہے جو ہماری گہری شخصیّت کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ یہاں اِس دُنیا میں ہم روزانہ اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ سے خلا ملا کرتے ہیں۔

ہمارے اِس طبیعی ماحول میں بھی جو ہمارے گرد و پیش ہیں، ماورائے ارضی جہات کا مشاہدہ صرف وُہ لوگ کرتے ہیں جو تیز بصارت کے مالک ہیں۔ اور تنہا اسلام ہی اِس نکتے کو بیان نہیں کرتا۔ ایک عیسائی مُصنّف ولیم لا (William Law) کہتے ہیں: "اِس دُنیا میں چھوٹی سے چھوٹی شئے اور اس سے کم سے کم مقدار بھی بہشت یا جہنم کی کیفیّت رکھتی ہے جو جسمانی شکل میں پائی جاتی ہے۔"

اِس پس منظر میں، جو واضح اشارہ ہے کہ جمال ایک سُرور و راحت کی چیز نہیں ایک ذریعۂ نجات ہے اور بدصورتی ایک علامتِ عذاب و عقوبت ہے، ہم اس ماحول کی اہمیّت کا اندازہ کر سکتے ہیں، جسے لوگ زندگیاں گزارنے کے لیے اپنے گرد و پیش تعمیر کرتے ہیں۔ اور اسی احساس و بنیاد پر ہم اُس بدصورتی کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں جسے "حقیقت پسندی" یا ریئلزم (Realism) کا نام دیا جاتا ہے اور جو ہمعصر فکر اور آرٹ پر بڑی حد تک چھائے ہوئے ہیں۔ آج عام طور پر یہ تصوّر لوگوں کے ذہنوں پر مُرتسم ہے کہ بدصورتی ایک خاص نوعیت سے حُسن سے زیادہ حقیقت کے قریب ہے جس کے دُوسرے لفظوں میں معنی یہ ہیں کہ بمقابلہ بہشت، دوزخ ہم سے زیادہ قریب ہے (اور آج کے دَور میں یہ کتنا صحیح

Marfat.com

ہے ۱) جدید آرٹ اِس کی ایک بھیانک مثال پیش کرتا ہے۔ مثلاً آرٹ کا ایک ناقد جب لوسین فرائڈ (Lucien Freud) کی پینٹ کی ہوئی کسی تصویر پر یُوں تبصرہ کرتا ہے: "ایک جوان آدمی جس کے لانبے اور اُجلے بال ہیں، مکمل طور پر برہنہ حالت میں ایک دیوان پر لیٹا ہوا ہے اُس کی ٹانگیں اُٹھی ہوئی اور دُور دُور ہیں۔ وُہ بائیں ہاتھ میں ایک سیاہ چوہا پکڑے ہوئے ہے جس کی آنکھیں گول گول ہیں۔ سانپ کی طرح اس کی لمبی دُم اُس کے داہنے کولہے سے گزرتی ہوئی اُس کے عضوِ تناسل کے قریب پڑی ہوئی ہے۔ وُہ نوجوان شخص چھت کو تک رہا ہے۔ اُس کے بُشرے سے وحشت اور خوف یا انتہائی کھوکھلے پن کا تاثر ملتا ہے[1]۔" ہو سکتا ہے کہ ایسی کوئی تصویر کسی نمائش میں نظر نہ آئے جو بہشت کی عکاسی بھی اسی گہرے جذبے سے کرے جس طرح یہ تصویر دوزخ کی نمائندگی کرتی ہے۔

اب چونکہ خدا ہماری ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی اور ہر لمحے میں ہمارے ساتھ ہے، اس لیے اس کے جمال اور اُس کے قہر کے مظاہر بھی ہم سے قریب تر ہوتے ہیں مگر یہ اُس کی موجودگی ہے جو ہر ممکن پر غالب ہے۔ جو لوگ کسی حد تک اِس زندگی میں اُسے نہیں پاتے اس کی طرف اس طرح متوجّہ ہوتے ہیں گویا اُسے دیکھ نہ سکتے ہوں، ایسے لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کا کہنا ہے کہ یہ وُہ لوگ ہیں جو آخرت میں اندھے اٹھائے جائیں گے جب کہ اِن کے لیے اُس وقت دو ہی سیدھے سادے متبادل ہوں گے: اندھیرا اور روشنی، اِس کا حضور یا غیاب۔ لوگ وقت کی اضافی نوعیت بھول جاتے ہیں اور یہ حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ خالصتاً ایک مکانی اور مقامی حالت ہے۔ ہم جو کچھ اب اور یہاں ہیں وہی آئندہ ہوں گے۔

اگرچہ ہم بطور ایک مفروضے ہی کے اِس بات کو جانتے ہیں لیکن پھر بھی ہم اپنے حواسِ ظاہری سے آگے نہیں دیکھتے اور اس دُنیائے تجارت کو یُوں سمجھتے ہیں گویا یہ حرفِ آخر اور خود مکتفی نظام ہو۔ اسلامی الٰہیات اس عادتِ قبیح کی اصلاح کے اقدام کرتی ہے اور اس کے لیے وُہ

---

[1] حوالہ مضمون، دی ٹائمز ۲۱ مارچ ۱۹۷۸ء

Marfat.com

انتہائی شدید عملِ جراحی سے کام لیتی ہے۔ وُہ علّت اور معلول کی درمیانی کڑی کاٹ دیتی ہے جو ہمارے لیے قوّتِ مدرکہ کے ذریعے دُنیا کو سمجھنے کی اساس ہے۔

اسلام میں الٰہیات نے کبھی وُہ اہمیّت حاصل نہیں کی جو عیسائیت میں اُسے حاصل رہی ہے۔ اسلام میں سب سے زیادہ اہمیّت عمل کو حاصل ہے، نظریّے کو نہیں اور اسلامی الٰہیات میں ہرگز لازمی نہیں کہ ان سوالوں کے جواب دیے جائیں جنہیں ابتداءً پوچھا ہی نہیں جانا چاہیے۔ کسی مسافر کو جسے باہر نکلنے کا سیدھا راستہ دکھا دیا گیا ہو، اس بات کے جاننے کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہوتی کہ وُہ کس علاقے میں سفر کر رہا ہے۔ رسولِ خداؐ کا ارشاد ہے: اُس دُنیا میں اس طرح رہو جیسے تم کوئی اجنبی یا مسافر ہو۔" باوصف اس کے قرآن مومنوں کو حکم دیتا ہے کہ وُہ سوچیں، غور کریں اور اپنی عقل و ذہانت استعمال کریں اور اس کے نتیجے میں لوگ سوال بھی کرتے ہیں اور اُن کے جواب پانے کی توقع بھی کرتے ہیں۔ کچھ متقی اور پرہیز گار لوگوں کے دل میں یہ بات آئی کہ کسی سوال کرنے والے کو خود لیے جوابات تلاش کرنے کے لیے چھوڑ دینے کی بجائے، جو ایمان کی بیخ کنی کرنے والے ہوں، یہ زیادہ بہتر ہے کہ ایسے جوابات فراہم کیے جائیں جو ایمان کو تقویّت دینے والے ہوں۔

گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں سُنّی مسلمانوں نے الاشعری (وفات ۹۲۵ء) اور اِن کے مکتبۂ فکر کے مدوّن کردہ عقائد کو مستند اور سرکاری حیثیت دے کر تسلیم کر لیا۔ الاشعری نے اپنی عالمانہ زندگی کا آغاز ایک معتزلی یعنی ایک تعقل پسند کی حیثیت سے کیا تھا۔ انہوں نے یونانی جدلیات کو عقلیت پرستی اور ان تمام مساعی کے خلاف کامیابی سے استعمال کیا جن کے ذریعے دُنیاوی اُمور کی وضاحت دُنیا ہی کے محدود پیمانوں سے کی جاتی تھی۔

الاشعری الٰہیات خاص طور پر اپنے دو نظریات کے باعث امتیاز رکھتی ہے۔ یہ دونوں نظریات انتہائی اٹل انداز میں اسلامی پس منظر کی توحید اور خُدا کے قادرِ مطلق ہونے کے ادراک پر زور دیتے ہیں۔ اوّل الذکر میں بنیادی حیثیت "اکتساب" کو حاصل ہے جس کے مطابق تمام اعمال کا سرچشمہ خُدا ہے اور اُسی نے اُنہیں پیدا کیا ہے۔ اِن اعمال کی تحصیل پھر انسانوں کو ہوئی جو بعد میں اُس کے امین قرار دیے گئے۔ دُوسرا نظریہ "مشیت الٰہی" کا ہے جس کے مطابق

Marfat.com

دُنیا میں جو کچھ درپیش آتا ہے وُہ تازہ اور نو بہ نو ہوتا ہے۔ اور اُس کا کسی سابقہ عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، دُوسرے لفظوں میں اِن کے ارادے اور ادراک کو خارجی مظاہر سے علّت و معلول کا تعلّق نہیں بلکہ خُدا کی قدرت سے دونوں چیزیں ایک ہی موقع پر ظاہر ہوتی ہیں یعنی مسبّب الاسباب خُدا کی ذات ہے اور وُہ ہر لمحے ایک نئی دُنیا تخلیق کرتا ہے۔ یہی نظریہ صوفیوں نے "تجدید خلق بالانفاس" کے نام سے اپنایا کہ خُدا نہ صرف وقت کے آغاز میں خالق تھا بلکہ اب، اس لمحے میں، اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ وُہ ایک نئی دُنیا کی تخلیق ہر لمحے کے انتہائی چھوٹے دقیقے میں کرتا ہے۔ ایک مظہر قدرت دُوسرے مظہر قدرت کی تخلیق کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اسباب وعلل، اسباب وعلل پیدا نہیں کرتے کیونکہ اس صورت میں تو خدا کے علاوہ خُدا بن جائیں گے۔ پرچھائیاں پرچھائیوں کو جنم نہیں دیتیں۔ انسانی آنکھ یا دماغ جتنی تیزی سے کسی شے کا ادراک کر سکتے ہیں دُنیا اور جو کچھ اس میں ہے اُس سے بھی تیزی سے کالعدم ہو سکتا ہے، گویا وُہ کبھی تھا ہی نہیں اور اگر خُدا کی مرضی ہو تو اسی تیزی سے اُس کی جگہ ایک نئی دُنیا تخلیق ہو سکتی ہے۔

اس موجودہ صدی تک اس نظریے کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔ آج ایک بچّہ بھی اِس کو سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے پاس پردہ فلم پر چیزوں پر پیش کرنے کے آلات ہیں جو اُن سب کی تمثیل پیش کر دیتے ہیں جو اشاعرہ کہتے تھے۔ تماشائی فلم کے پردے پر ایک وقت میں علّت و معلول کا تسلسل دیکھتے ہیں جب کہ تصویریں منعکس کرنے والے پروجیکٹر میں چلنے والی فلمی ریل میں ایک منظر کے بعد دُوسرے منظر کے درمیان علّت و معلوم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک وقت میں فلم کا صرف ایک چوکھٹا پردے پر منعکس ہوتا ہے۔ اس کے بعد اندھیرے کا ایک وقفہ آتا ہے جس کا ادراک ہماری آنکھ نہیں کر سکتی۔ اس کے فوراً بعد فلم کا ایک اور چوکھٹا پردے پر منعکس ہوتا ہے۔ یہ فلم اڈیٹر کا کام ہے کہ وُہ اِن چوکھٹوں کو مخصوص تسلسل سے دکھائے یا ترتیب دے۔ تماشائی پردۂ فلم پر کسی کھڑکی کے شیشے پر پتّھر کی ایک ضرب لگتے دیکھتے ہیں جس کے بعد شیشہ پاش پاش ہو کر گر جاتا ہے لیکن فلم کے وہ چوکھٹے جو شیشے پر پتّھر لگتا ہُوا پیش کرتے ہیں، شیشے کے چور چور ہونے کا "سبب" نہیں دکھاتے۔ فلم اڈیٹر اِن تختوں

Marfat.com

کی ترتیب بدل سکتا ہے یا ایک چوکھٹے کو نکال کر اُس کی جگہ کوئی اور چوکھٹا لگا سکتا ہے یا پھر فلم اُلٹی بھی چلا سکتا ہے۔ فلم اڈیٹر اپنی کارگاہ میں بیٹھ کر جو چاہے کر سکتا ہے، عین اسی طرح خُدا جو چاہے کر سکتا ہے اور بحیثیت مسلمان یہ بات ناقابلِ تصوّر ہے کہ خُدا کچھ کرنے کے لیے "مجبور" ہے' اس لیے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اُسے کسی معلول کو حاصل کرنے کے لیے علّت کی ضرورت ہے[1]

اشعری عالمِ دین فضالی (Fudali) کے مطابق کسی لکڑی کو جلانے کا سبب آگ نہیں ہوتی۔ بھلا آگ جیسی عاجز شے کسی چیز کا سبب کیسے بن سکتی ہے؟ یہ خُدا ہی ہوتا ہے جو کسی شے کے شعلے کی لپیٹ میں آنے پر اُسے جلا دیتا ہے۔ فرتھجوف شوآن کہتے ہیں:

"یہاں سامی اور مغربی ذہنیتوں کا وُہ کٹر پن ہمارے سامنے آتا ہے کہ حقیقت کے کسی ایک اہم پہلو کی توثیق کے لیے دُوسرے تمام پہلوؤں سے نظریں پھیر لی جائیں خواہ وُہ کسی طور اس بنیادی اصول کو، جس کا کہ مظاہرہ دکھانا مقصود ہو، بے دفا ثابت نہ کرتے ہوں[1]" اس بات کا اعتراف، کہ آگ جلاتی ہے' اس اضافے کے ساتھ کہ وُہ اس لیے جلاتی ہے کہ خُدا نے اُسے اِسی مقصد کے لیے پیدا کیا، کسی طرح خُدا کے قادرِ مطلق ہونے کے منافی نہیں مگر فضالی کا یہ ایمان ہے کہ ایسا کہنا قدرتِ کاملہ کے خلاف ہے اور سامی النسل اور مغربی لوگوں کی نفسیات کی رُو سے اُنھیں کلیتاً غلط نہیں کہا جا سکتا۔

زُہد و تقویٰ کی ضروریات اور معروضی صداقتوں کے لوازم دینیات کی سطح پر ہمیشہ ہم آہنگ نہیں ہوتے جیسا کہ شوآن نے اشاعرہ کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے[2] اس سطح پر آکر زہد و تقویٰ کو معروضیت پر سبقت حاصل ہو جاتی ہے۔ اشاعرہ کی بنیادی توجہ اس بات پر مرکوز ہے کہ ہمیں اِس بات کی متواتر یاددہانی کرائی جائے کہ خُدا ہر شے میں موجود اور فعّال ہے۔ اگر وُہ اس فعال انداز میں ہر جگہ موجود نہ ہوتا تو دُنیا اُتھل پتھل ہو جاتی۔ الاشعری

1، Schuon F., Stations of Wisdom, p.70

2. Schuon F., Dilemmas Within Ash'arite Theology in Islam and the Perennial Philosophy.

Marfat.com

کو اس میں کامیابی ہوئی مگر اس کی ایک قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ شوآن کہتے ہیں "مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر سے یہ ایک غیر ضروری تکلّف ہے کیونکہ عقل و ذہن کے پاس اس مقدس بے ہودگی کے علاوہ دوسرے وسائل بھی ہیں" مگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے الاشعری کا نظریۂ تخلیق اپنے مقاصد حاصل کر لیتا ہے اور یہ مقاصد وہ اسلام کے روائتی انداز سے حاصل کرتا ہے۔ خدا کبھی غیر موجود اور غیر فعّال نہیں ہوتا —— ہر شے کا مصدر و منبع خدا ہی کو سمجھنا چاہیے! خواہ اس بات سے انکار ہی لازم کیوں نہ آئے کہ وہ ثانوی اسباب اور بظاہر قوانینِ قدرت کے ذریعے اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ یہ گویا اس بات کا انکار ہے جس کے بارے میں یوں کہتے ہیں: "اگر خدا سیب کا درخت پیدا کرتا ہے تو یہ درخت سیب ہی پیدا کرے گا، انجیر نہیں" جس طرح کسی مسلمان کے لیے زندہ چیزوں کی تمثال بنانا ممنوع ہے کہ کہیں وہ انہیں دیوی، دیوتا سمجھ کر پرستش نہ کرنے لگے، اسی طرح اُسے دنیوی اسباب سے نتائج اخذ کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے، مبادا وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ اسباب اپنی جگہ قادرِ مطلق سے بے نیاز ہیں۔

جدید سائنس کی بنیاد اسی نسبت اور لگاؤ (علّت و معلول) پر ہے اور وہ حقیقتاً خدا کو اسباب و نتائج کے اس سلسلے سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ یہ صرف طبیعیات ہی ہے جس میں کچھ ہم عصر سائنسدانوں نے اپنے علم کے بنیادی مُسلّمات کے دائرے سے ہٹ کر ایک قوّت کی کارفرمائی کا شائبہ دریافت کیا ہے: تاہم طبیعیات ایک ایسی دقیق اور غامض سائنس بن گئی ہے کہ جدید علم الاصنام پر اس کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہاں تک ملحدانہ سائنس کے سماوی اسباب کے انکار اور عالمِ مظاہر کو عالمِ حقیقت سے الگ کر دینے کا تعلّق ہے، شوآن کے نزدیک الاشعری نے طبیعی علیّت کو پہلے ہی مسترد کر دیا تھا۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس سے دُنیا کے سائنسی خیال میں کوئی ترمیم نہیں ہوتی بلکہ یہ تو اُن بنیادوں کو مسمار کر دینے والی بات ہے جن پر یہ خیال استوار ہے اور اس سے پوری عمارت زمیں بوس ہو جاتی ہے۔

دورِ حاضر کے مسلم اہلِ دانش، کم از کم وہ جن کی آوازیں اکثر سننے میں آتی ہیں، اس حقیقت کے لیے کہ اسلام نے کبھی دُنیا کو تباہ کرنے اور انسانوں کو وصفِ انسانیت سے محروم کرنے کے حربے استعمال نہیں کیے، قربانی کے بکرے ڈھونڈتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اِنکے احساسِ کمتری

Marfat.com

یعنی مغربی ٹیکنالوجی کے کارہائے نمایاں سے مرعوبیت نے بُری طرح معذور بنا کر رکھ دیا ہے۔ اِن میں سے کچھ حضرات علمائے کٹرپن پر الزام دھرتے ہیں، کچھ صوفیوں کو؛ اور کچھ اشاعرہ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ وُہ کہتے ہیں اسلام نے یورپ کو سائنس دی اور خود پڑ کر سو گیا۔ جب کہ یورپ نے سائنس کی گیند قابو میں کر کے شہنشاہی غلبے اور اقتدار کے گول کی طرف تیزی سے دوڑ لگانی شروع کر دی۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بقول ہاٹنگر (Hottinger) "یونانی جراثیم" کو یورپ منتقل کر دیا، اگرچہ اِن جراثیم کے حملے سے اسلام محفوظ رہا مگر عیسائیت اِس کا بُری طرح شکار ہو گئی۔ ہمارے زمانے کے مسلمان دُنیا میں وُہ واحد لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اجداد کے بیماریوں سے محفوظ و مامون رہنے کی کبھی شکایت کی ہو۔ وُہ اس بات کا اعتراف کرنے سے منکر ہیں کہ جس سائنس کے وہ والہ و شیدا ہیں اور جس ٹیکنالوجی کے وُہ پرستار ہیں وُہ حقیقی اسلامی ماحول میں کبھی پنپ سکتی تھیں۔ اوّل الذکر کا انحصار خُدا کی طرف رویّے سے ہے اور موخر الذکر کا قدرت (اور انسانی پیشوں) کی طرف ہے۔ یہ دونوں ہی رویّے مسلمانوں کے توحید پر ایمان کے اصولوں سے لگا نہیں کھاتے اور دونوں ہی دُنیا کو دُوسری جہات سے علیحدہ کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلامی سائنس (روحانیت اور عقلیت کی مہم جوئی کے عظیم الشان دور میں) ایک طرف تو نظامِ قُدرت میں "اللہ کی آیات" کی تلاش میں تھی تو دُوسری طرف وُہ ایسے قوانینِ قُدرت اور ایسی قوتوں کا مشاہدہ کر رہی تھی جن سے مطابقت اور تعاون مفید مطلب ہو سکتا تھا تاکہ انسانی خانوادہ خُدا کے عطا کردہ ماحول سے مناسب انداز میں ہم آہنگ ہو سکے۔ عصرِ حاضر میں زندگی کا وُہ پورا نقشہ درہم برہم ہونے سے پہلے مسلمانوں نے کبھی بہاؤ کے خلاف بہنے کی کوشش نہ کی جس سے دُنیا کے فطری ڈھنگ کو بدل دیا جائے یا اِس کے وسائل کا غلط استعمال کیا جائے۔ مسلمان کی دُنیا انسانی حدود کے تناسب سے ترتیب اور باضابطگی پاتی تھی۔ اِس نے کبھی کوئی ایسی چیز تعمیر یا ساخت نہیں کی جو اپنی عظمت و فخامت سے اُسے مرعوب کر دے۔ وُہ کبھی اپنے ہی آلات کا خود غلام نہیں بنا اور جب تک وُہ اس حکم خداوندی پر کاربند رہا کہ زمین پر (خود

Marfat.com

اپنے گھوڑوں، اونٹوں اور مویشیوں کے ساتھ آہستگی اور نرمی سے چلو، تب یہ بات ہرگز سوچی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ زمین کی نہیں چیرنے کے لیے بلڈوزر ایجاد کرے گا۔

اس کی "خالص" سائنس نظامِ اشیاء کے جوہر کا ادراک تھی، مظاہر کا نہیں۔ اس کے لیے یہ ستارے، یہ پتھر، پہاڑ اور زمین پر اُگی ہوئی نباتات، سمندر کی موجیں آسمانوں پر بادل اشیاء کا محض کاٹھ کباڑ قسم کا انبار نہیں تھا بلکہ کسی "کتاب" کی ایک ہی جلد کی تصویروں کا سلسلہ وار رقع تھا۔ یہ تصاویر، یہ "آیات" اس بنا پر قابلِ فہم تھیں کہ یہ آسان تھیں اور اُن پیچیدگیوں اور بگاڑ سے خالی تھیں جنہیں انسانی خواہشِ ایجاد نے فطری دُنیا کے مظاہر میں پیدا کر دیا تھا۔ جہاں جدید سائنس نے انسان کی علامات کے حوالے سے غور و فکر کی فکری صلاحیتوں کو تباہ کر دیا ہے وہیں جدید ٹیکنالوجی نے اس معنویت کو گھٹا دیا ہے جو قدرتی ماحول میں نہاں ہے، اور یوں اِن کا سمجھنا دشوار تر کر دیا ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْہَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُہَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَہْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (النور (۲۴): ۳۵)

"خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل (ایسی صاف شفّاف ہے کہ) گویا موتی کا سا چمکتا ہُوا تارا ہے۔ اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے (یعنی) زیتون کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) اس کا تیل خواہ آگ اُسے نہ بھی چھوئے جلنے کو تیار ہے (پڑی) روشنی پر روشنی (ہو رہی ہے)۔"

ٹیوب لائٹ یا نیون لائٹ وغیرہ روشنی کے ذرائع ہیں، مگر کون اس بات میں شبہ کر سکتا ہے کہ یہ چیزیں تیل کے چراغ کے مقابلے میں اپنے اندر وہ معنویت نہیں رکھتیں۔ ہماری ٹیکنالوجی کی ایجادات ہیں جو ایں یا ختہ اور مبہوت کر دینے والی ہیں جس کی وجہ سے اب

Marfat.com

عالمِ قدرت کے "شفاف پن" کا مشاہدہ کرنا، یا اِس پر ایمان لانا، بتدریج مشکل ہو رہا ہے۔ اب نہ صرف ہمارے گرد و پیش کی دُنیا معنویت سے خالی ہو گئی ہے بلکہ وُہ مسائل جو یہاں پائی جانے والی اشیاء کی شبیہوں کے ذریعے تجربات کی دُوسری جہات کو بیان کرنے کی مساعی میں پوشیدہ ہیں، بے حد لاینحل ہو گئے ہیں۔

اس کتاب کے گزشتہ صفحات میں اِس سوال کو کئی بار پیش کیا گیا کہ سماوی حقیقتوں کو انسانی ذہن تک کیسے منتقل کیا جائے۔ اب ہم پھر اسی طرف آنے پر مجبور ہیں کیوں کہ یہی وُہ میدان ہے جس پر بہت سی اہم جنگیں لڑی گئی ہیں، خاص طور پہ اِس عہد حاضر میں اب ایسے اہلِ ایمان ڈھونڈے سے نہیں ملتے جو آنکھ بند کر کے ایمان لاتے ہوں اور کوئی سوال جواب نہ کرتے ہوں۔ "لا ادری" لوگوں کے نزدیک صحائف آسمانی میں بیان کردہ جنّت و دوزخ کا احوال اور یومِ حساب کی باتیں یا تو ناممکن ہیں یا لغو ہیں جب کہ دُوسری طرف اہلِ ایمان ایک دُوسرے سے اِس بات میں اُلجھتے رہتے ہیں کہ اِن باتوں کو حقیقی مفہوم میں لینا چاہیے یا مجازی؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم ناشکرے لوگ ہیں۔ ہم قُدرتی طور پر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ موت کے بعد ہم پر کیا گزرے گی۔ خُدا ہمارے اس مطالبے کو سُننے سے عاری نہیں۔ اس نے ہمیں بہت سے استعارے، اشارے اور نشانیاں دی ہیں۔ اگر ہم اپنی عقل اور تصوّر کو استعمال کرنے کو تیار ہوں تو ہمیں ان کے ذریعے مناسب جواب مِل سکتے ہیں مگر ہم تو ان استعاروں میں تضاد، اشاروں میں ابہام اور نشانیوں میں بے ضابطگی پاتے ہیں!

مرنے کے بعد کی حالتوں کے متعلق اگر کوئی بات اس دُنیا کے تجربوں کے منافی نہ نظر آئے تو ہم اِس پر شک کر سکتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ وُہ احوال جو ہمارے احوال سے مختلف ہوں، اِس دُنیا کے طبقات کے مشابہ اور کیفیتوں کے موافق ہوں۔ وقت جن قوانین کا تابع ہے اِن کا اطلاق دُوسری مُدتوں پر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مکان جن قوانین کے تابع ہے اُنھیں دُوسری قسم کی وسعتوں میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مگر چونکہ وقت کسی میعاد اور وقفے کی ایک امکانی شکل ہے اور خلا بھی وسعتوں کی ایک امکانی شکل ہے، اس لیے دُوسری

Marfat.com

جہات میں زمان و مکان کی مثالوں کی ترتیب میں ردّ و بدل ہو سکتا ہے۔ اس دُنیا میں ہم حواس خمسہ رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی اور "دُنیا" میں ہم پانچ سو کے مالک ہوں اور ہر حس دُوسری سے اتنی ہی مختلف ہو جس طرح اس دُنیا میں، بصارت اور سماعت ایک دُوسری سے مختلف ہیں اس کے باوجود ہم مجبور ہیں کہ ان کے بارے میں اُنہیں دُنیوی حواس یعنی باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ اور ذائقہ کے حوالے سے بات کریں۔

دُوسری طرف اگر اس زندگی کے بعد کی زندگی کامل طور پر ناقابلِ تصوّر ہوتی تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ حقیقت کی مختلف سطحیں ایک دُوسرے سے الگ مہر بند کر دی گئی ہیں اور ان کا ایک دُوسرے سے کوئی ربط نہیں، اور یہ بات توحید کے نظریے اور عقلِ سلیم کے بھی منافی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً ہمارے لیے کسی دُوسرے عالم میں خود پر گزرنے والے واقعات میں دلچسپی لینے کا کوئی جواز نہ ہوتا اور وُہ عالم جیسا بھی ہوتا، اس دُنیا کے باسی ہونے کے ناتے ہمارے علم، امیدوں، ضروریات اور خواہشوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا۔

اب اس دُنیا اور کسی اور دُنیا میں ہمارے تجربات کے درمیان ایک ضروری کڑی یقیناً ہے اور خدا نے قرآن مبین میں اس کا احوال یُوں بیان ہُوا ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ (البقرہ (۲) : ۲۵)

"اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اُن کو خوشخبری سُنا دو کہ اُن کے لیے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جب اُنہیں اُن میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا اور اُن کو ایک دُوسرے کے ہم شکل میوے دیے جائیں گے۔"

بہشت کے خزانوں اور زمین کی نعمتوں میں کوئی چیز مشترک ضرور ہو گی کیوں کہ ان دونوں کا منبع ایک ہی ہے۔ اس کے باوجود

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا

Marfat.com

يَعْمَلُوْنَ ٥ (السجدہ (۳۲) : ۱۷)

"کوئی متنفس نہیں جانتا کہ اُن کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی ہے۔
یہ اُن اعمال کا صلہ ہے جو وُہ کرتے تھے۔"

مذہبی اصطلاحات میں ایک بدیہی امر یہ ہے کہ خُدا اپنے وعدے سے کبھی کم نہیں دیتا، اور وُہ اُن امیدوں پر کبھی پانی نہیں پھیرتا جنہیں اس نے خود پیدا کیا ہو؛ تاہم ہم سے اس بات کا وعدہ یقیناً کیا گیا ہے کہ وُہ اپنے کئے ہوئے وعدوں سے بھی زیادہ دے گا۔ اور یہ "زیادہ" کیا ہوگا؟ انسان اس کا انکشاف کرنے سے قاصر ہے یا یوں کہیے کہ وُہ انسانی تصوّر سے بھی زیادہ ہوگا اور آخرالامر، ہم "خوشگوار آخرت" کے جو تصوّرات رکھتے ہیں اُن پر بھی وعدہ حاوی ہو جاتا ہے، جس طرح تیز روشنی ہلکی روشنی پر چھاتی ہے۔ اور قرآن اس بات کو یوں بیان کرتا ہے:

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ٥ (قٓ (۵۰) : ۳۵)

"وہاں وُہ جو چاہیں گے اُن کے لیے حاضر ہے اور ہمارے ہاں اور بھی (بہت کچھ) ہے۔"

دُنیا کی تمام خوشیاں محدود ہیں جب کہ بہشت بیکراں ہے کیونکہ اس کا منظر لامحدود میں کھلتا ہے۔ انسانی سطح پر اس کا بیان صرف اعداد و شمار ہی سے ہو سکتا ہے، مثلاً ہمیں ہزار یا، دس ہزار یا دس لاکھ مسرتیں میسّر آئیں گی یا اسے بے حد و حساب مقدار کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے جس میں اعادہ تیز ہو۔ مثال کے طور پر شہوانی محبّت، پہلی سچّی محبّت کی طرح اپنی تمام رعنائیاں اور دلکشیاں رکھتی ہے (حوروں کی دائمی عصمت اور دوشیزگی کا جو اسلام کا مطالعہ کرنے والے مغربی طلبہ کے لیے تفریح کا باعث ہے، یہی مطلب ہے) پیاس کے وقت انسان کے لیے ہر مشروب، پہلا مشروب ہوتا ہے، اگرچہ بہشت میں کوئی پیاسا نہ ہوگا۔ اسی طرح ہر غذا انسان کو بھوک کے وقت کا پہلا لقمہ معلوم ہوتا ہے جب کہ کوئی بھی وہاں (عالمِ بالا میں) بھوکا نہیں رہے گا۔ اسی طرح ہر ملاقات کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ یہ پہلی دوستی ہے، اور بہشت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نو ساختہ نہ ہو اور

Marfat.com

جس سے انسان عنفوانِ شباب کے شوق کے ساتھ حظ نہ اٹھا سکے۔

بہرحال اِن تمام باتوں کا تصوّر خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، منطقی ہے کیونکہ تجربے کی ایسی حالت جس میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے، جامد نہیں ہو سکتی۔ بیکرانی اور لامحدودیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ خوب سے خوب تر کی طرف حرکت کو کبھی سکون نہیں ہوتا۔ اس کا قدم مسلسل آگے اور آگے ہی کی طرف بڑھتا رہتا ہے، اور اس سے حاصل ہونے والے لُطفِ حُسن اور طلب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ایک معجزے کے بعد اس سے بھی بڑا معجزہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ بہترین ہمدمی اور تعلق خاطر بڑھتے ہوئے اور زیادہ شیریں ہو جاتا ہے اور اگرچہ محبّت کی "تکمیل" پہلے ہی مرحلے پر ہو جاتی ہے، تاہم اُس کا لُطف بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اہلِ جنّت ہر لحظہ حیرت و استعجاب کا شکار ہوں گے کیونکہ ہر مرتبہ جب وُہ کسی شے کو کامل ترین سمجھ کر قبول کریں گے کہ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں، تو اُن کے سامنے اس سے بھی بہتر شے آجائے گی۔ پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے کہ جنّت میں کم ترین درجہ وُہ ہوگا جس میں اللہ بندے سے اس کی خواہش پُوچھے گا۔ اور وُہ شخص بار بار اپنی خواہشات بیان کرے گا۔ اللہ پھر اِس سے پُوچھے گا کہ وُہ اپنی خواہشات بیان کر چکا؟ جب وُہ کہے گا ہاں، تو اللہ کہے گا: لو تمھاری خواہشات کے بلکہ اِن کے برابر مزید خواہشات کے پورے ہونے کا سامان ہو گیا ہے۔

پھر بھی یہ مسئلہ اپنی جگہ جوں کا توں رہے گا۔ جب ہم نفسیاتی محبّت، غذا اور مشروبات کا ذکر کرتے ہیں تو کیا ہم اُنھیں نہایت محتاط طریق پر واوین میں رکھیں یا انہیں ایسے ہی چھوڑ دیں جیسے وُہ ہیں؟ — دراصل یہ معاملہ دقت اور ضرورت کا ہے کیونکہ دونوں طریقوں کو دُرست قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہشت کی چیزیں (اور جہنّم کی بھی) اس دُنیا جیسی ہیں کیونکہ تجربات کی تمام امکانی حالتوں کا ربطِ باہمی ہے۔ وُہ ان سے مختلف بھی ہیں کہ ان کے درمیان حقیقت کی مختلف سطحوں یا جہات کا فرق ہے۔

اب دُنیا اور بہشت کی چیزوں میں مماثلت کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آخرت میں حقیقتاً کھانے پینے کی چیزیں ہیں (جنّت میں لذیذ اور دوزخ میں قابلِ نفرت) اور اِن دونوں میں

Marfat.com

عدمِ مماثلت کے باعث ہمیں اِس کے برعکس خیال اپنانے کا بھی اختیار ہے تاہم جو برعکس خیال کو اپنائیں اُنہیں لازماً اظہار کے اِن ذریعوں کی نشاندہی کرنا چاہیئے جس کے وسیلے سے وُہ اِس خیال تک پہنچے۔ یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ ایسی تمام اشکال کو مجازی مفہوم میں لینا چاہیے مگر پھر ایک عام آدمی یہ پُوچھے گا کہ بھلا مجازی غذا اور مشروبات اس کے کس کام کے ہیں؟ نہ صرف اسلام نے بلکہ دُنیا کے تمام مذاہب نے بھی ٹھوس تصورات کو ہمیشہ ترجیح دی ہے اور یہ اہلِ ایمان کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے کہ وُہ اپنی دانش اور شعور کے مطابق جو چاہیں توجیہہ کریں۔ بہر حال ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ کچھ نیک اور سادہ لوگ اُخروی زندگی کے کچھ انگھڑ اور مبہم سے تصوّرات کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں جب کہ اِن سے کم نیک اور کم سادہ لوگ، بہشت اور دوزخ کے نظریات کو محض اِن کی تمثیل کے لیے استعمال ہونے والی خام تشبیہوں کی بنا پر رد کر دیں گے۔

اب ان تمام امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور مقدّس استعاروں کی حقیقی یا مجازی تعبیر میں سے کسی کے ساتھ خود کو وابستہ نہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا ہے کہ ایک مسلمان قرآن و حدیث کی روشنی میں یومِ حساب بہشت کی لذات اور جہنم کی عقوبتوں کے متعلق کیا عقیدہ رکھتا ہے؟

کوئی بھی محاسبے سے بچ نہ سکے گا۔ اس دُنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی قسم کے "حجاب" میں رہا ہے یا خود فریبی کا شکار رہا ہے لیکن جب یہ حجابات درمیان سے اُٹھ جائیں گے تو وُہ خود بغیر کسی وسیلے کے حقیقتِ ازلی کو اپنے روبرو پائے گا اور اللہ فرمائے گا:

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ○ (قٓ (۵۰): ۲۲)

("یہ وُہ دن ہے کہ) اس سے تو غافل ہو رہا تھا۔ اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اُٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ مزید فرماتا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

Marfat.com

شَرًّا یَّرَہٗ ﴿ (الزلزال (۹۹): ۷-۸)

"اور جس نے ذرّہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وُہ اسے دیکھے گا۔ اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وُہ اُسے دیکھے گا۔"

کیوں کہ:

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿ (یونس (۱۰): ۳۰)

"وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اُس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرلے گا اور وُہ اپنے سچے مالک کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو کچھ وُہ بہتان باندھا کرتے تھے سب اُن سے جاتا رہے گا۔"

کسی نفس نے جو کچھ اعمال کیے ہوں گے وُہ مشخص ہوکر سامنے آئیں گے اور ہر متنفس اس دن تنہا ہوگا، اور اس وقت اللہ فرمائے گا:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿ (الانعام (۶): ۹۴)

"اور جیسا ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ایسا ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے اور جو (مال و متاع) ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وُہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم خیال کرتے تھے کہ وُہ تمہارے (شفیع اور ہمارے) شریک ہیں، (آج) تمہارے آپس کے سب تعلّقات منقطع ہوگئے اور جو دعوے تم کیا کرتے تھے سب جاتے رہے۔"

ہر متنفس اس دن اپنا بوجھ خود اٹھائے گا کیونکہ کوئی مخلوق اس بوجھ کو اٹھانے میں اس کی شریک نہ ہوگی نہ اس کے کسی چھوٹے سے حصّے ہی کو اُٹھائے گی۔ اس کی وضاحت اللہ قرآن میں یوں کرتا ہے:

Marfat.com

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰیؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰی حِمْلِهَا لَا یُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰیؕ (فاطر (۳۵): ۱۸)

"اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ بٹانے کو کسی کو بلائے تو کوئی اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا اگرچہ قرابت دار ہی ہو"

فرتھجوف شواَن کے الفاظ میں: "موت کے وقت تمام یقین دہانیاں اور تمام صلاحیتیں لبادوں کی طرح اتر جاتی ہیں اور انسان کا وجود ناتواں رہ جاتا ہے، اور وہ مثل ایک گم شدہ بچّے کے ہوتا ہے۔ کچھ باقی نہیں رہتا صرف وہی شے باقی رہتی ہے جسے ہم نے اپنی ذات کے گرد خود بنا رکھا ہوتا ہے۔ وہ یا تو بھاری بوجھ کی طرح گرتا ہے یا اس کے برعکس بہشت کی طرف ایک ابھرتے ستارے کی طرح کھنچا چلا جاتا ہے"[2] اس مقام پر انسان کی ہر نشانی اور تشخص مٹ جاتا ہے ماسویٰ ان اہلِ ایمان کے جو ایمان پر قائم رہے

---

[1] اس قانون میں ایک اہم استثناء بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی نے کسی مرد یا عورت کو بغیر کسی جائز وجہ کے (مثلاً اپنی ذات کے تحفظ کے لیے یا کسی قانونی طریقے کار کو بروئے کار لاتے ہوئے) قتل کر دیا ہوگا۔ تو اس صورت میں وہ اپنے گناہوں کے بوجھ کے علاوہ مقتول شخص کے ان تمام گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے گا جو اگر مقتول زندہ رہتا تو کر سکتا تھا اور اس کے لیے اسی کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔ سورہ ۵ کی آیت ۲۹ اور دیگر آیات کے مطابق یہ یوں ہوگا کہ گویا مقتول شخص نے اپنی زندگی بھر کے گناہوں کی ذمے داری اپنے قاتل کو منتقل کر دی ہو اور ان ہی آیات کو ذرا توسیع دی جائے تو انہیں ریاست کی طرف سے دی گئی اس سزائے موت پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے جس میں سزا قوانین شریعت کے مطابق نہ دی گئی ہو یا یہ کہ جب رحم یا معافی کی گنجائش پوری نہ کی گئی ہو۔

---

2. Schuon F., Understanding Islam, p.84

Marfat.com

اور نمازیں ادا کرتے رہے، اور وُہ شخص جو ایمان نہیں رکھتا تھا، اور جس نے کبھی نماز ادا نہ کی، خود کو ایک مہیب سمندر کے اندھیرے میں پائے گا:

أَوْ كَظُلُمَٰتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَىٰهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِۦ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِۦ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَآ أَخْرَجَ يَدَهُۥ لَمْ يَكَدْ يَرَىٰهَا ۗ وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ ٱللَّهُ لَهُۥ نُورًا فَمَا لَهُۥ مِن نُّورٍ ۝ (النور ۲۴: ۴۰)

"(اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے) جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے جس پر لہر چلی آتی ہو (اور) اُس کے اُوپر اور لہر (آرہی ہو اور) اُس کے اُوپر بادل ہو؛ غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہوں۔ ایک پر ایک (چھایا ہُوا) جب اپنا ہاتھ نکالے تو کچھ نہ دیکھ سکے اور جس کو خُدا روشنی نہ دے اُس کو (کہیں بھی) روشنی نہیں (مل سکتی)۔"

یعنی اس کی اپنی کوئی روشنی نہ ہوگی اور جب وُہ اس گھپ اندھیرے سے اُس روشنی میں آئے گا تو یہ ایسی خوف ناک صورت ہو گی جس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام کے تصورِ یومِ نشور پر "کشف" کا تصوّر حاوی ہے۔ اس دن کوئی شے بھی اس مالکِ حقیقی سے پوشیدہ نہ رہ سکے گی جو بقول سنائیؒ: "اندھیرے میں کسی چٹان پر رینگتی ہوئی چیونٹی کے قدموں کی آہٹ بھی محسوس کرتا ہے۔" اِس دِن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ ہو گا نہ جائے پناہ:

فَإِذَا نُفِخَ فِي ٱلصُّورِ نَفْخَةٌ وَٰحِدَةٌ ۝ وَحُمِلَتِ ٱلْأَرْضُ وَٱلْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَٰحِدَةً ۝ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ ۝ (الحاقہ ۶۹: ۱۳-۱۴ اور ۱۸)

"تو جب صُور میں ایک (بار) پھُونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑ دونوں اُٹھا لیے جائیں گے، پھر ایک بارگی توڑ کر برابر کر دیے جائیں گے، اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھُپی نہ رہے گی۔"

اور چونکہ اُس دن تن ڈھانپنے کے لیے کچھ نہ ہوگا، سب لوگ برہنہ بدن اور برہنہ پا ہوں گے۔ جب نبی اکرمؐ نے یہ فرمایا تو حضرت عائشہؓ نے جو ایسے سوالات بھی پوچھ لیا

Marfat.com

کرتی تھیں جو دُوسرے پُوچھنے سے ہچکچاتے تھے، پُوچھا "کیا اس دن مرد اور عورت ساتھ ساتھ ہوں گے اور ایک دُوسرے کو دیکھیں گے؟" تو آپؐ نے کہا "اس دن بڑی سنگین صورتِ حال ہوگی اور کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا۔"

صرف برہنگی ہی کافی نہ ہوگی بلکہ وہاں بے شمار شاہد بھی موجود ہوں گے؛ حتیٰ کہ جانور تک گواہی دیں گے۔ ایک حدیث میں مروی ہے کہ اس دن ایک طوائف کو بھی محض اس لیے بخش دیا جائے گا کہ اُس نے کسی پیاسے جاں بلب کتّے کو دیکھ کر اپنی پاپوش اُتاری، اُسے اپنے دوپٹے سے باندھا اور اُس کنویں سے پانی نکال کر کتّے کو پلایا تھا۔

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک عورت کو اِس لیے سزا دی گئی تھی کہ اس نے کسی بلّی کو بند کر کے بھوکا مار دیا تھا۔ یہاں صیغے کا ابہام مدِّ نظر رہے: کوئی واقعہ جو حدودِ زماں سے آزاد ہو (جیسا کہ ہم وقت سے آشنا ہیں) وُہ صیغۂ ماضی میں بیان کیا جا سکتا ہے (گویا وُہ ہو چکا ہو) اگرچہ وُہ ہمارے لیے مستقبل میں ہوگا۔ اس سیاق و سباق میں وقت کی اضافیت اِن تصریحات سے ظاہر ہوتی ہے جو یوم قیامت کے لیے قرآن مجید میں جگہ جگہ آئی ہیں: "الرّاجفہ" (لرزا دینے والی) "الحشر" اُٹھائے جانے والا دن:

يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۙ (واقعہ(۷۳)؛ ۱۷)

"(وُہ دن) جو بچّوں کو بوڑھا کر دے گا۔"

اور (اس دن یہ حال ہوگا) کہ تمام دُودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچّوں کو بھول جائیں گی:

وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى (الحج (۲۲)؛ ۲)

"اور تمام حمل والیوں کے حمل گر پڑیں گے اور لوگ تجھ کو متوالے نظر آئیں گے مگر وُہ متوالے نہیں ہوں گے۔"

اور یہ حالت ایک حدیث کے مطابق پچاس ہزار سال تک رہے گی اور ایک اور حدیث کے مطابق مخلص ایمان والوں کے لیے یہ وقفہ ایک ساعت کی طرح گزر جائے گا۔ اور اس نرم اور شفیق زمین کو بھی گواہی دینے کے لیے زبان ملے گی۔

Marfat.com

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ (الزلزال (۹۹): ۴-۵)

"اس روز وُہ اپنے حالات بیان کر دے گی۔ کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا (ہوگا)۔"

اور جو کچھ زمین اور سمندر پہ ہوا ہوگا یا آسمانوں میں ہے۔

إِن تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُن فِي صَخْرَةٍ (لقمٰن (۳۱): ۱۶)

"اگر کوئی عمل (بالفرض) رائی کے دانے کے برابر بھی (چھوٹا) ہو اور ہو بھی کسی پتّھر کے اندر تو وُہ سامنے آجائے گا۔" حقیقتِ مطلقہ کے روبرو کوئی بات چُھپی نہ رہ سکے گی۔

اور بڑی نمایاں بات یہ ہوگی کہ انسان خود اپنے خلاف گواہی دے گا اور اس سے روگردانی نہیں کر سکے گا۔ یومِ حساب کو وُہ ایک "سائق" (چلانے والے) اور ایک "شہید" (گواہ) کے ساتھ آئے گا، جو اس کے ساتھ ساری زندگی رہے ہوں گے، بُہت کچھ کہیں گے؛ تاہم اس کی اپنی ذات جو بُہت سے بہانے تراش سکتی اور معذرتیں پیش کر سکتی ہے اس دن خاموش کر دی جائے گی:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (یٰسین (۳۶): ۶۵)

"آج ہم اُن کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور جو کچھ یہ کرتے رہے تھے اُن کے ہاتھ ہم سے بیان کر دیں گے اور اُن کے پاؤں (اُس کی) گواہی دیں گے۔"

اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رُوح خود اپنا منصف ہوگی کیونکہ اس دن بالآخر وُہ پوری طرح اپنے آپ سے "اُس کامل نمونے" کے حوالے سے واقف ہو جائے گی جس سے اُس نے مطابقت پیدا کی یا جس سے روگردانی کی۔ ہر روح وُہ گوشہ تلاش کرے گی جو اُس کے لیے موزوں ہوگا؛ خواہ وُہ طبقہ "علّیین" (اُوپر والے) میں ہو یا طبقہ "سجّین" (یا اسفل) میں اور خُدا ہمیں متواتر یاد دلاتا رہتا ہے کہ اللہ کبھی ناانصافی نہیں کرتا؛ وُہ ہمیں اسی طرف جانے دیتا ہے جو فطرتاً ہماری جگہ ہے۔

Marfat.com

روح کا جوہر، جو اس زندگی میں کسی قدر مائع ہوتا ہے، مرنے کے بعد جم کر گویا متحجر ہو جاتا ہے، اور وہ لاکھ کوشش کرے اپنی یہ حالت بدل نہیں سکتا:

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (۱۰:۵۴)

"اور اگر ہر ایک نافرمان شخص کے پاس روئے زمین کی تمام چیزیں ہوں تو (عذاب سے بچنے کے) بدلے میں (سب) دے ڈالے اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو پچھتائیں گے اور) ندامت کو چھپائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور (کسی طرح کا) ان پر ظلم نہیں ہوگا"

یہ دُنیا جائے رحمت ہے، جہاں مانگنے والے کو سب کچھ ملتا ہے۔ اُس دن صرف معروضیت کی حکمرانی ہوگی اور ہم جو ہیں، ہیں۔ یا یوں کہیے کہ جو کچھ ہم نے اپنے آپ کو بنا دیا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (الزمر (۳۹): ۵۳-۵۴)

"اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے اور اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آ واقع ہو، اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار ہو جاؤ پھر تم کو مدد نہیں ملے گی"

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ہمیں ایک پُل عبور کرنا ہوگا۔ (اس پُل کا بہت سی روایات اور اساطیر میں ذکر آیا ہے) یہ پُل بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگا۔ یہ پُل گہری اور اندھی خلیج کے اُوپر تنا ہوا ہے۔ ہر اس روح کو جسے جنت میں داخل ہونا ہے، اس پُرخطر راہ سے گزرنا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اس پر سے پلک جھپکنے

Marfat.com

ہیں گزر جائیں گے، کچھ ہوا کے جھونکے کی طرح اور کچھ پرندوں کی طرح اُڑ کر جائیں گے۔ کچھ کسی اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی رفتار سے اور کچھ انسان کی عام رفتار سے گزریں گے۔ پھر وُہ شخص آئے گا جو اپنے پنجوں کے بل چل رہا ہوگا، اور یہ پل اُسے ہلا کر گرا دے گا، جیسے کہ وُہ اور بہت سوں کو سر کے بل آگ میں پھینک دے گا۔ یہ بھی یومِ حساب کا ایک پہلو ہے جس سے کسی روح کو جنّت کے اہل یا نا اہل ہونے کا اندازہ ہو جائے گا۔ اُس گہری کھائی میں کہ جس میں نااہل اور بے صلاحیّت لوگ گریں گے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے، جو روایات کے مطابق ایک ہزار سال تک دہکا کر سُرخ کر دیے گئے ہوں گے اور پھر مزید ایک ہزار برس تک دہکایا جائے گا؛ یہاں تک کہ وُہ ستاروں سے تہی رات کی طرح سیاہ ہو جائیں گے اور قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب گنہگار اس طرف بڑھیں گے تو وُہ آگ:

إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ۝ وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ۝ لَّا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ۝ (الفرقان (۲۵): ۱۲-۱۴)

"جس وقت وُہ ان کو دُور سے دیکھے گی تو (غضب ناک ہو رہی ہوگی اور یہ) اُس کے جوش (غضب) اور چیخنے چلانے کو سُنیں گے، اور جب یہ دُوزخ کی کسی تنگ جگہ میں (زنجیروں میں) جکڑ کر ڈالے جائیں گے تو وہاں موت کو پکاریں گے۔ آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بہت سی موتوں کو پکارو۔"

اور وہاں وُہ سیاہ دھوئیں کے سائے میں اِس پیڑ کا پھل کھائیں گے جسے "زقوم" کہا جاتا ہے۔ کچھ نے اس کو بدی کا پھل کہا ہے جو اُنہوں نے دُنیا میں اپنی زندگی میں کمائی تھی۔

وَيُسْقَىٰ مِن مَّاءٍ صَدِيدٍ ۝ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ (۱۴: ۱۶-۱۷)

"اور اُسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ وُہ اُسے گھونٹ گھونٹ پیئے گا اور گلے سے نہیں اُتار سکے گا۔"

Marfat.com

کتبِ احادیث کے مطابق یہ گنہگار ایسے پھوڑوں کا شکار ہوں گے جو خچروں کے برابر جسامت رکھتے ہوں گے اور بڑے بڑے سانپ ان کی کھال کھوپڑیوں سے ناخنوں تک اتار دیں گے، اور جب وہ آگ کے تپتے ہوئے جوتے پہنیں گے تو ان کے مغز اس طرح اُبلیں گے جیسے تانبا کٹھالیوں میں اُبلتا ہے۔ ان کے اگلے دانت آگ کے انگاروں کی طرح روشن ہوں گے اور ان کی انتڑیاں پگھل پگھل کر بہیں گی۔ جب وہ چیخیں گے تو ان کی آوازیں گدھے کی مکروہ آواز کی طرح ہوں گی جو ابتدا میں ہانپنے جیسی ہوتی ہے۔ آخر میں ڈھینچوں ڈھینچوں جیسی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر دوزخ کی آگ کا عشرِ عشیر بھی دُنیا میں آ جائے تو ساری دُنیا کی آبادی کو جلانے کو کافی ہے اور اگر کسی دوزخی کی پوشش ہمارے اُوپر ٹانگ دی جائے تو اس کی بدبو اور تپش سے دُنیا کا آخری آدمی تک مر جائے۔

گنہگاروں اور خطاکاروں پر موت ہر طرف سے اُمنڈ پڑے گی پھر بھی قرآن کے مطابق وُہ مر نہ سکیں گے اور اِن کا عذاب طویل ہو جائے گا:

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ؕ

"جب اُن کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے تاکہ (ہمیشہ) عذاب (کا مزا) چکھتے رہیں۔" (النساء (۴) : ۵۶)

اور یہاں حواس مختل ہو جانے سے بھی عذاب سے نجات نہیں ملے گی اور مجرم اور خطاکار اپنی حالت کے کبھی عادی نہ ہوں گے۔ اور

يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِي بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝ (الحج (۲۲): ۲۰)

"اس سے اِن کے پیٹ کے اندر کی چیزیں اور کھالیں گل جائیں گی۔"

اور یہ عذاب معنی خیز اِس وقت محسوس ہوتا ہے جب ہم دلوں کے پتھر بن جانے کے متعلق وُہ سب باتیں یاد رکھیں جو قرآن نے کہی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ ایسے دِل خُدا کے پیغام اور اس کی رحمت کو جذب کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

دوزخ کے مختلف طبقات کے بارے میں مسلمانوں کی امثال، مغربی تخیّل کے لیے قطعاً اجنبی نہیں۔ اب دانتے نے "جہنم" کا تصور اسلامی سرچشموں سے لیا تھا یا اُسے اِس

Marfat.com

کا ادراک خود بخود ہُوا تھا، کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب کہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس کا تصوّر مسلمانوں کے ہاں گنہگاروں کو دیے جانے والے عذاب کے تصوّر سے خاصی مماثلت رکھتا ہے جس کے بارے میں اِن دونوں تصوّروں میں مجازی تعبیروں کی گنجائش ہے جس کے بارے میں قرآن کے ایک عظیم مفسّر فخرالدین الرّازی (وفات ۱۲۰۹ء) کی تفسیر ایک دلچسپ مثال ہے۔

الرّازی کے مطابق قرآن کی آیات میں کئی جگہ جو "زنجیروں" اور "بیڑیوں" کا ذکر آیا ہے وُہ روح کے (سابقہ) دنیوی اور مادی علائق اور جسمانی لذائذ سے چمٹے رہنے کی علامات ہیں، اور چونکہ اب یہ خواہشات پوری نہیں ہوسکتیں، اس لیے یہ زنجیریں مرکے جی اُٹھنے کے بعد "النفس" کے عالمِ ارواح میں داخل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس کے بعد انہی بندھنوں سے روحانی آگ کے شرارے نکلتے ہیں کیونکہ ناآسودہ خواہشات، شدید تپش کا احساس پیدا کردیتی ہیں۔ الرّازی کے نزدیک "الجحیم" یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کے یہی معنی ہیں۔ گنہگار روحانی دُنیا میں داخلے سے محرومی کی گلوگیر اذیت کو نگلنے اور ہر پسندیدہ شے سے جدائی کا دُکھ جھیلنے کی کوشش کرتا ہے، اسی لیے "طعام ذا غصّة" (گلا گھونٹنے والے کھانے) کا بیان بامعنی بن جاتا ہے[۱]۔ یہاں اس بات کا اعتراف کرلینا چاہیے کہ اس قسم کی تفسیروں کا اثر قرآن اور حدیث کی پیش کی ہوئی بے لاگ اور مُہیب تشبیہوں کے مقابلے میں کم ہے اور اسی لیے وُہ رُوح کو جھنجھوڑ کر حقیقت کا احساس دلانے میں غیر مؤثر رہتی ہیں۔

یہاں سب سے اہم اور مابہ النزاع سوال مسلمانوں میں تصوّر دوزخ کا ہے۔ کیا وُہ ابدی ہے؟ یہاں بھی ہم اصطلاحی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ کُمار سوامی اور دُوسروں نے اُس بنیادی فرق پر زور دیا ہے جو "ابدیت" (یعنی جو کسی وقفے یا میعاد سے ماوریٰ ہو) اور "دوام" (غیر معیّنہ میعاد) میں ہے۔ اگر ہم ان تعریفوں کو تسلیم کرلیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ صرف خُدا ہی ابدی ہے کیونکہ وہی تنہا حقیقتِ مطلق ہے اور قرآن یقیناً اس نظریے

---

[۱] دیکھئے محمّد اسد کی The Meaning of the Qur'an. خاص طور پر صفحہ ۹۰۴

Marfat.com

کی حمایت کرتا ہے "دوام" تو ہمیشہ ہمیشہ کو رہتا نظر آتا ہے لیکن اِس سے عمودی سمت میں بڑھ کر ابدیت سے ملحق ہو جانے میں جائے فرار ہے جیسے بیدار ہو کر خواب سے نجات مل جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے مردود اور مقہور لوگوں کو اپنے عذاب کا خاتمہ نظر نہ آتا ہو، لیکن خُدا کی نظر میں ہے۔ مزید برآں، یہ کہ اس کا رحم و کرم اس کے غضب پر سبقت رکھتا ہے اور یہ رائے رکھنا کہ یہ رحم و کرم دوزخ پر عائد نہیں ہو گا یہ کہنے کے مترادف ہے کہ دوزخ ایک آزاد اور خود مختار وجود رکھتی ہے جو اس کی بیکراں رحمت کی پہنچ سے باہر ہے اور یہ بات مسلمانوں کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

یہ بات قطعاً تعجب خیز نہیں معلوم ہوتی جب ہم قدیم مآخذ میں جہنم کے خاتمے کے وقت جہنم کے میدانوں میں کسی "سبز درخت" کے اگلنے کا حال پڑھتے ہیں (اور دُوسرے حوالہ جات میں پانی کی سبیل کا ذکر ملتا ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاحات میں خالص اور پاک کرنے اور پگھلانے کے بارے میں بتایا گیا ہے وُہ بھی تطہیر کا عمل ہے اور سزا برائے سزا نہیں۔ عیسائی اصطلاحات کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ تمام عمل تزکیۂ نفس یا تنقیہ کا مقام ہے نہ کہ ایسا جہنّم جہاں نجات کی ہر اُمید منقطع ہو جائے۔ خود سینٹ تھامس ایکوئناس جیسے جیّد شخص نے یہ کہا ہے کہ جہنّم میں کوئی حقیقی ابدیّت نہیں، صرف "وقت" ہے اور وقت کو بہرحال اختتام ہے۔

اِس سے مساوی یہ حقیقت بھی کچھ کم معنی خیز نہیں کہ یہاں سفارش کام آئے گی۔ ایک متفق علیہ حدیث کے مطابق (بخاری و مسلم دونوں نہایت مستند سمجھے جاتے ہیں) جو اہلِ ایمان سلامتی کے ساتھ جنّت میں داخل ہو جائیں گے، اپنے اِن بھائیوں کے لیے، جو بدقسمتی سے جہنّم میں ہوں گے، سفارش کریں گے اور پھر انہیں اس بات کی اجازت مل جائے گی کہ اپنے جاننے والوں کو دوزخ سے نکال لائیں۔ ایسے نیکوکار لوگوں کے چہروں کو آگ کے گزند سے محفوظ رکھا جائے گا اور وُہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو دوزخ سے نکال لائیں گے۔ اس کے بعد اِن کا رب ان سے کہے گا: "واپس جاؤ اور ان لوگوں کو بھی نکال لاؤ جن کے دلوں میں تمہارے دل میں ایک دینار بھر بھی اچھائی ہو۔" وُہ اس حُکم کی بھی تعمیل کریں گے۔ اس کے بعد خدا پھر اُنہیں

Marfat.com

حکم دے گا اب تیسری بار جاؤ اور اِن لوگوں کو بھی نکال لاؤ جن کے دلوں میں ایک ذرہ برابر بھی اچھائی ہے" اور وہ اس حکم کی بھی تعمیل کریں گے، اگرچہ پیغمبروں اور فرشتوں نے لاتعداد لوگوں کو اپنی سفارش سے پہلے ہی بچا لیا ہوگا۔ پھر خدا فرمائے گا" فرشتوں نے سفارش کی اور بیچ میں پڑے پیغمبروں نے سفارش کی اور بیچ میں پڑے، مومنوں نے سفارش کی اور اب تو میں الرّحم الرّاحمین ہی باقی بچا ہوں" اور پھر وہ خود جا کر مٹھی بھر لوگوں کو نکال لائے گا اور دُنیا میں کوئی ایسی شے نہیں جو اس کی مٹھی بھر سکے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ساری زندگی میں کوئی نیکی نہ کی ہوگی اور جل بھن کر کوئلہ ہو گئے ہوں گے۔ انہیں اُٹھا کر وہ "بحرِ حیات" میں پھینک دے گا اور وہ سیلاب میں بہتے ہوئے کوڑے کی بجائے آبدار موتی بن کر نکلیں گے۔ ہمیں یہ سوچنے کی آزادی ہے کہ تلخ انجام کو پہنچنے تک کتنے گنہگار دوزخ میں رہ جائیں گے۔

ہمیں ایک اور حدیث یہ بتاتی ہے کہ جب آخری آدمی لایا جائے گا اور جب اسے اس کی خواہش سے بھی زیادہ دے دیا جائے گا تو خدا سے کچھ ردّ و قدح کے بعد وہ اپنے بہشتی گھر میں اس طرح داخل ہو گا جیسے کبھی وہ اپنے ارضی گھر میں بھی داخل نہیں ہوا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ دُنیا میں پوری عُمر گزارنے کے بعد موت کی اذیّت اور آگ کے بظاہر کبھی نہ ختم ہونے والے عذاب کے بعد (جس نے اسے جلا کر کوئلہ کر دیا تھا) جہنّم سے لوٹ کر وہ ایک لمحے کی پس و پیش کے بغیر اپنے بہشتی گھر کو پہچان لے گا؛ گویا وہ کبھی اس سے باہر رہا ہی نہ تھا!

اس سے ہم ایک ہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں: انسانی روح جہاں کہیں بھی ہو اور جس قدر دُور بھٹکتی پھرے اس کا اصلی گھر بہشت ہے۔ اس کے سوا جہاں کہیں بھی ہوگی جلاوطنی کی زندگی ہی گزارے گی، اور یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ جو شے کیچڑ اور کوڑے سے برآمد کی گئی تھی اور جل کر کوئلہ ہو گئی تھی وہ ایک بیج تھا جو آبِ حیات سے پروان چڑھا تھا) ہمارے اندر کا "مرکز" جو بہشت کا طالب اور جویا رہتا ہے اور وہیں آرام اور اطمینان محسوس کرتا ہے، ہماری بیرونی شخصیّت نہیں جو علائق دُنیا میں گرفتار اور اپنے اصلی جوہر

Marfat.com

سے الگ اور کٹی رہتی ہے، اگرچہ وُہ بھی ایک ایسے سرور و حظ کی متلاشی ہوتی ہے جسے وُہ اِس دُنیا میں نہیں پا سکتی۔ درحقیقت ہر وجود کا "اندرون" یعنی روح اپنے گھر کی طرف لوٹنے کے لیے مضطرب رہتی ہے اور اس وقت تک سکون نہیں پاتی جب تک وہاں پہنچ نہیں جاتی۔ ہماری فطرت میں جو کچھ ہمارے جوہر سے لگّا نہیں کھاتا وُہ میل کچیل ہے جسے جل ہی جانا چاہیے۔ اور جو کوئی اپنی اس کثافت کو اپنی ذات یا اپنا حقیقی وجود سمجھتا ہے، اس کے ساتھ ہی جلا دیا جائے گا۔

بہشت میں داخل ہوتے ہی وقت سے نجات مل جائے گی اور ہر شے اپنا صحیح مقام پالے گی۔ اگر نعمتوں سے سرفراز لوگ سابقہ حیاتِ ارضی کی ایک بھی ناخوشگوار یاد ساتھ لے گئے تو یہ اِن کے کمالِ موعود کے منافی ہوگا؛ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بہشت کے لوگ کسی بات کو بھلا دیں گے کیونکہ بہشت ہی تو وُہ جگہ ہے جہاں ہر چیز انتہائی واضح طور پر دیکھی جا سکے گی وُہ جو اس وقت دیکھیں گے وہی تو تخلیق کا حاصل ہوگا جس میں ہر قسم کی عدم مطابقت دُور ہو جائے گی۔ وہاں کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی کیونکہ کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا کھو جانا ناروا نقص شمار ہوگا، جیسے شفّاف آئینے پر دھبّا۔ اور یہ حقیقت کہ ہم اِس دُنیا کی کسی شے سے محبّت کرتے ہیں اس بات کا شافی ثبوت ہے کہ یہ شے اس دُنیا یعنی بہشت کی کسی زیادہ حسین اور عدیم المثال شے کا پرتو ہے۔

جب ایک بار یہ حکم دے دیا جائے گا تو دُنیا کے سایوں اور ابہامات کی طرف لوٹنا ناممکن ہوگا:

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ○ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○ (الزخرف (۴۳): ۷۰-۱)

"(اُن سے کہا جائے گا) کہ تم اور تمہاری بیویاں عزّت (و احترام) کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جاؤ۔ اور وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھوں کو اچھا لگے (موجود ہوگا) اور (اے اہلِ جنّت) تم اِس میں ہمیشہ رہو گے۔"

کیونکہ یہی وُہ لوگ ہوں گے اور پھر ارشاد باری ہے:

Marfat.com

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ۝

"یہی لوگ ہیں جن کے اعمالِ نیک ہم قبول کریں گے اور اُن کے گناہوں سے درگزر فرمائیں گے (اور یہی) اہلِ جنّت میں (ہونگے) (یہ) سچّا وعدہ (ہے) جو اُن سے کیا جاتا تھا" (احقاف (۴۶):۱۶)

اور یہی وُہ اہلِ جنّت ہیں جن کے لیے ارشادِ باری ہے:

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْیَوْمَ فِیْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۚ هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ۚ لَهُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ وَّ لَهُمْ مَّا یَدَّعُوْنَ ۚ سَلٰمٌ ۣ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ ۝ (یٰسٓ (۳۶):۵۵-۵۸)

"اہلِ جنّت اِس روز عیش و نشاط کے مشغلے میں ہوں گے۔ وُہ بھی اور اُن کی بیویاں بھی سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ وہاں اُن کے لیے میوے اور جو چاہیں گے (موجود ہوگا) پروردگارِ مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائے گا)۔

ایک ذرا مختلف زاویے سے دیکھیے تو "مقربون" اور "اصحاب الیمین" میں ایک فرق اور امتیاز نظر آئے گا؛ حالانکہ یہاں جنّت میں کوئی بھی اپنی خواہشات سے کم نہیں حاصل کرے گا، سب کے سب زیادہ سے زیادہ ہی حاصل کریں گے؛ تاہم اہلِ بخشش سرور انبساط کے انجذاب کی مختلف صلاحیتیں رکھتے ہیں اور یوں بہشت میں بھی طبقات ہیں "مقربون" قریب تر لوگوں میں سے ہیں (یعنی وُہ خُدا کے قریب تر رہوں گے) اور سورۂ واقعہ میں قرآن مجید بڑے جامع انداز میں مگر ایجاز سے اُن کی حالت بیان کرتا ہے جس کی تفسیر میں مفسّرین نے جلدیں بھر دی ہیں۔ وُہ جڑاؤ تختوں پر جلوہ افروز ہوں گے، نوخیز خدمت گار جو ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہیں گے اِن کے لیے چشمۂ صافی سے مشروبات لائیں گے (ہو سکتا ہے یہ آبِ حیات ہی ہو)، وُہ ایک دُوسرے کے آمنے سامنے ٹیک لگائے کامل مجالست میں بیٹھے ہوں گے۔ ان کو پرندوں کا گوشت کھانے کو ملے گا جو ایک قسم کی ملکوتی غذا ہو گی

Marfat.com

جس میں دُنیاوی بھاری پن اور کثافت نہیں ہوگی اور ان کے ساتھ حوریں ہوں گی، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی جو "لُؤلُؤالمکنون" یا چھپے ہوئے موتیوں کی طرح پُراسرار و نازک اور خوب صورت ہوں گی، اور ان کے کان امن و سلامتی کے زمزموں سے گونجیں گے۔

"اصحاب الیمین" داہنے ہاتھ والے بھی کچھ کم خوش اور مگن نہ ہوں گے کیونکہ انہیں وُہ تمام خوشیاں اور مسرتیں حاصل ہوں گی جس کے کہ وُہ متحمل ہو سکیں گے۔" پھلدار درختوں پھولوں، چھایا اور وفور سے بہتے پانیوں اور ان پھلوں کی بہتات کے درمیان جو ہاتھ کی پہنچ سے کبھی ورے نہ ہوں گے" وُہ اپنی زندگیاں گزاریں گے۔ خُدا جو کسی کام کو کرنے کے لیے صرف یہ کہتا ہے "ہوجا" اور وُہ ہو جاتا ہے ان کے لیے ایک نئی تخلیق کریگا یہ خوبصورت دوشیزائیں ہوں گی جو ہر اعتبار سے ان کی ہم پلّہ (اَتراب) ہوں گی جو محبّت کرنے والی اچھّی رفیق ہوں گی۔ اس ارضی دُنیا میں ہماری خواہشات اور اس کا مطلوب ہماری ضروریات اور اس کی تسکین الگ الگ ہوتی ہیں اور بسا اوقات بعض ایک دُوسرے سے اتنی دُور ہوتی ہیں کہ ان کے درمیان وسیع خلیج حائل ہوتی ہے لیکن بہشت ہماری موجودہ حالت کے تجربات کے مقابلے میں توحید سے زیادہ قریبی رشتہ رکھتی ہے۔ اس لیے بہشت میں یہ تمام فاصلے مٹ جائیں گے۔

معاد یا آخرت کا علم کتاب پرستوں یا مدعیانِ علم و فضل کے رحم و کرم پر رہا ہے۔ اِن لوگوں نے علامتوں اور استعاروں کو جو اس علم کی لازمی زبان ہے، اس قدر لفظی مفہوم میں لیا ہے کہ شاید کوئی لکیر کا فقیر یا بے مغز صاحبِ ایمان بھی نہ لیتا ہو لیکن شاید مسئلہ جُزوی طور پر یہ ہے کہ یہ لوگ علم و آخرت کی علامتوں اور رموز کو غلط زاویے سے دیکھتے ہیں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کن ذرائع اور وسیلوں سے انبساط و خوشی پیدا کی جا سکتی ہے بلکہ یہ ہے کہ حظ و انبساط اپنی جگہ وجود رکھتے ہیں، یعنی وُہ اشیاء مثلاً پھل کا خالص مشروب اور پرندوں کا گوشت وغیرہ نہیں جو خواہشات کو پورا کرتی ہیں بلکہ خود خواہش اور اس کی مکمل تسکین ضروری ہے۔

ایک مرتبہ ایک ایسے شخص نے جس کے نزدیک اونٹوں کے بغیر بہشت، بہشت نہیں

Marfat.com

کہی جاسکتی تھی، پیغمبر اسلامؐ سے دریافت کیا کہ کیا اُسے جنّت میں اونٹ بھی میّسر آئیں گے۔ آپؐ نے جواب دیا: "اگر اللہ تمہیں جنّت میں لے گیا تو وہاں وُہ تمام چیزیں جو تمہاری روح اور آنکھ پسند کریں گی، موجود ہوں گی۔" اس دُنیا میں تو اعلیٰ قسم کے جانوروں کا مالک ہونا اس شخص کی دلی آرزو تھی۔ کیا جنّت میں بھی اُسے اِن کی خواہش رہے گی؟ مناسب یہ ہے کہ اس سوال کو یہیں رہنے دیا جائے۔

اب آتا ہے حوروں کا مسئلہ۔ یہ بڑی بڑی آنکھوں والی وُہ خوبصورت دوشیزائیں ہوں گی جو جنّتیوں کی رفیق و ہم جلیس بنائی جائیں گی، اور اس موضوع نے کئی صدیوں تک عیسائیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے رکھی۔ اگرچہ عالم اخروی میں "سودائے عشق" کا تصوّر اب لوگوں کو اس طرح نہیں چونکاتا جیسے کبھی پہلے کرتا تھا، پھر بھی اس دور کے مغربی لوگ آج بھی اس تصوّر سے محظوظ ہوتے ہیں اور اکثر یہ پوچھتے ہیں کہ ایسے ہی انتظامات جنّتی عورتوں کے لیے کیوں نہیں کئے گئے جو یوم جزا کے بعد اپنے بہشتی گھروں میں سکونت پذیر ہوں گی۔

بدنی لذّات کے متعلق پچھلے صفحات میں جو کچھ کہا گیا اور جو کچھ اسلامی پس منظر کے متعلق بیان کیا گیا اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ہر وُہ لذت جو اس دُنیا میں ہماری زندگیوں میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی، بہشت اس سے تہی نہیں ہوگی کیونکہ ایسا ہوا تو یہ اس آسودگی کی فضا میں ایک بہت بڑا خلا ہوگا۔ اگر کمتر لذّتیں اور راحتیں جو ہمیں اس دُنیا میں میّسر آتی ہیں، اُن بہتر اور اکمل لذّتوں کا پرتو ہیں جو کسی دُوسرے عالم میں موجود ہیں، تو یقیناً بدنی لذّتیں بھی حقیقت کے دائرے میں ضرور جگہ پائیں گی۔ عورتوں کا حُسن و جمال تو جمالِ ابدی کی یاد دلاتا ہے اور یہ بہشت میں اور زیادہ نمایاں ہوگا۔ یہ حُسن حوروں کے واسطے سے جلوہ ریز ہوتا ہے جن کے ذریعے خُدائی نعمتیں مجسّم ہو کر سامنے آئیں گی، فیاضی، مہر و محبّت اور تمام اچھّی خصلتوں کی نمائندہ ہیں اور ان کے ساتھ خُدا کی اتنی قربت میں رہ کر ہم جلیس اور ہمدمی دُنیا کے بدنی حظ و انبساط کے مقابلے میں کہیں زیادہ مسرور کُن ہوگی۔

درحقیقت یہاں ایک دہرا استعارہ ہے: پہلا اُس سُرور اور اتّصال کا دمخالف صنفین

Marfat.com

اسی اتّصال کے لیے تخلیق ہوئیں) اور بالآخر اُسے انجام تک پہنچانے کا دُوسرا؛ حُسن و جمال کا ہے جو جزوی طور پہ دُنیا میں نظر آتا ہے، بہشت میں ہر جگہ نظر آئے گا، اور حور کی ذات میں محسوس، گرم جوش اور بے تکلفانہ انداز میں زندہ ہو جائے گا؛ اور اس سے بھی ماورا ایک انتہائی گہری رمز ہے جس سے صوفیا کی نسبت ہے اور وُہ ہے حقیقت ورا الورا یعنی لُب لُباب یا روح حقیقت جو ہر قسم کے تخیّل سے ماورا ہے (کہا جاتا ہے کہ آنکھ، آنکھ کو نہیں دیکھ سکتی)۔ اسے عربی کی قواعد کے مطابق مؤنث لفظ 'ذات' سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ ہماری فہم کے مطابق رات کی طرح سیاہ ہوتی ہے اس لیے اسے مجازاً "لیلیٰ" کہا جاتا ہے جو بہت سی مسلم داستانوں اور نظموں کی ہیروئن ہے۔ کسی دوشیزہ کی معصومیت، حسن اور پُراسراریت کے وسیلے سے تمام اشیاء کی انتہائی گہرے اسرار کا جو عیاں ہیں اور پنہاں بھی؛ ادراک حاصل کیا جاتا ہے اور ان سے محبت کی جاتی ہے۔

جس طرح دوزخ جدائی اور علیحدگی کا مقام ہے (اس میں مردود و مقہور لوگ اگرچہ ایک دُوسرے سے انتہائی متنفر ہوں گے) اس طرح بہشت وصلِ کامل کی جگہ ہے اور اسلام اسے نفسانی اصطلاحات کے وسیلے سے بیان کرنے میں کوئی خرابی محسوس نہیں کرتا۔ ایک حدیثِ مبارکہ کے مطابق ہر انسان اپنا ہی چہرہ اپنی رفیقۂ زندگی کے چہرے اور بدن میں منعکس دیکھے گا؛ گویا وُہ مکمل طور پر ایک دُوسرے میں مدغم ہو گئے ہوں، اگرچہ دونوں اپنا اصل تشخص نہیں کھوئیں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر دوشیزہ کی ہڈیوں کا گودا ایک "نورانی شہد" کی طرح بہتا ہوا معلوم ہوگا؛ یعنی وہ اتنی شفاف ہوں گی، اور یہی لب لباب ہے حُسن کا جو ہم پر نمایاں کر دیا جائے گا۔ وُہ اشکال جو اس ارضی دُنیا میں ٹھوس اور غیر شفاف نظر آتی ہیں، بہشت میں نورِ خداوندی کو جس نے ان کی ہستی کو ایک مظہرِ محسوس بنایا، ڈھانپ نہیں سکیں گی۔ یہ اشکال ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اور یہ بات اس وقت تک کوئی نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وُہ فکر و خیال کی دنیاوی عادات سے خود کو آزاد نہ کرے جن کے باعث ہر شے اپنے غیر شفاف اور ٹھوس خول میں بند رہتی ہے اور ہر روح اپنے نفسی و طبعی پیکر میں متقید اور اس کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی ہے۔ پھر بھی اگر وُہ یہ یاد کر سکے کہ لفظ پر نالٹی

Marfat.com

(Personality) (یعنی شخصیت) لاطینی لفظ "پرسنا" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی اداکار کا مصنوعی چہرہ، تو اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ مصنوعی چہرے عموماً اصلی چہرے پر گوند سے نہیں چپکائے جاتے اور اس سے وہ کچھ منطقی نتائج نکال سکتا ہے۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ بخشے جانے والے ہر مرد اور عورت کو بہشت میں ستر لباس مہیا کیے جائیں گے۔ اُن میں سے ہر ایک، ایک گھنٹے میں ستر بار اپنا رنگ بدلے گا۔ اگر ہم ذہن میں رکھیں کہ اس دُنیا میں 'جسم' اور 'شخصیت' روح کے ملبوسات ہیں تو اس حدیث کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بہشت میں ایک بازار ہوگا جس میں کوئی خرید و فروخت نہیں ہو گی بلکہ صرف مردوں اور عورتوں کے پیکر ہوں گے۔ جنتی جس شکل اور پیکر میں خود کو دیکھنا پسند کریں گے اسی میں ان کی روح سما جائے گی کیونکہ وہ آزادی اظہار کے کسی کمتر ذریعے پر راضی نہ ہوں گے، اور بہشت تو راحت و آسودگی کا مقام ہے۔

اندریں حالات یہ سوال کہ حوروں کے مقابل مذکر کردار جنت میں کیوں نہ ہوں گے، ایک فالتو سا سوال معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ اوسط مسلمان کیا ان پیچیدہ علامات کے بارے میں قرار واقعی کچھ سوچتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ سمجھنے کیلئے ایسی باتوں کا گہرا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں (نہ قوّتِ متخیلہ کو کام میں لانے کی ضرورت ہے) بالخصوص اِن لوگوں کے لیے جن کے دماغ، تصوّرات اور احساسات کی صورت گری اسلام نے کی ہے؛ البتہ جب کبھی ایسے سوالات پوچھے جائیں تو الفاظ کے ذریعے کوئی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک عام مسلمان اِس قسم کے سوالات نہیں پوچھتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جنّت میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگا اور یہی اس کے لیے کافی ہے۔

مگر یہ سب کچھ کب تک برپا رہے گا؟ اگر تنہا خدا ہی ازلی و ابدی ہے تو اِن الفاظ کے لفظی مفہوم میں جب سب کچھ ہو چکے گا (جزا و سزا کا عمل) اور دوزخ کے میدان میں ایک سبز درخت اُگے گا، تو بھلا وہ بخشے جانے والوں سے یہ وعدہ کیسے کر سکتا ہے کہ انہیں کبھی جنّت چھوڑنا نہ پڑے گی؟ اوّل تو یہ کہ بہشت اور جہنّم کا کوئی موازنہ ممکن ہی نہیں (جس طرح رحمتِ خداوندی اور غضب الٰہی میں ممکن نہیں) ایک (بہشت) وسیع ہے

Marfat.com

دُوسری (دوزخ) محدود۔ ایک "مفتوح" ہے دُوسری "مسدود"۔ ہم خیر و شر کو ہمیشہ یکجا استعمال کرتے ہیں لیکن وُہ ایک ہی نوع یا ایک ہی درجۂ حقیقت سے تعلق نہیں رکھتیں اسی لیے ہم سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ نیک اعمال کا دس گنا یا سَو گنا (یا اس میں جتنا بھی اضافہ تصوّر میں آسکے) انعام ملے گا جب کہ اعمالِ بد کی سزا بدی کے مساوی دی جائے گی اور اس سے زیادہ نہیں دی جائے گی، گویا نیکی زرخیز ہے، بدی بنجر ہے۔

دوم یہ کہ بہشت ایک خاص انداز میں "مفتوح" یا کھلی ہوئی ہے۔ یہ خُدا کی طرف کھلتی ہے اور اس کے حضور جو ابدی بھی ہے اور لامتناہی بھی، کسی چیز کا کوئی انجام نہیں ہو سکتا:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۧ (التوبہ (۹):۷۲)

"خُدا نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے بہشتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں (وُہ) اِن میں ہمیشہ رہیں گے اور بہشت جاودانی میں نفس مکانات کا (وعدہ کیا ہے) اور خُدا کی رضامندی تو سب سے بڑھ کر نعمت ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔"

اس آیتِ مبارکہ میں لفظ "رضوان" آیا ہے جس کا عمومی ترجمہ "بہ طیب خاطر قبول کرنا" یا "رضامندی" کیا جاتا ہے کیونکہ اس لفظ کا مادہ "رَضِیَ" ہے جس کے لغوی معنی "مطمئن ہو جانا"، "راضی ہو جانا" یا "سراہنا" ہیں لیکن اس لفظ کا کوئی بھی ترجمہ اس کی خاص امتیازی اہمیت کو بھرپور انداز میں واضح نہیں کرتا جو بہشت سے بھی زیادہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سے پرے کیا ہے یا اس کے بغیر کیا ہوگا؟ کا تصوّر بہت مشکل ہے۔ لامحالہ ہم بے کراں وُسعت کے تصوّر ہی سے چپکے رہ سکتے ہیں جو خود انسانی فہم کے حوالے سے ہماری گرفت میں نہیں آسکتا۔

رسولِ خُدا کا ارشاد ہے کہ ایک لمحہ وُہ بھی آئے گا جب اللہ بخشش پانے والے

Marfat.com

تمام جنتیوں سے پوچھے گا کہ وہ اب مطمئن ہیں ؟ اور وہ جواب دیں گے : "اے رب ! کیوں نہ مطمئن ہوں گے جب کہ تو نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو اپنی کسی اور مخلوق کو نہیں دیا" تب اللہ تعالیٰ کہے گا :

"کیا میں تمہیں اس سے بھی نفیس کچھ اور دوں ؟" اور وہ پوچھیں گے : "اس سے نفیس اور کیا ہوگا ؟" اللہ جواب دے گا : "میں اپنی رضوان تمہیں عطا کروں گا !" اور پیغمبر اسلام نے یہ بھی فرمایا : "اس وقت جب کہ اہل بہشت اپنے کیف و انبساط میں مگن ہوں گے اوپر سے ایک روشنی ان پر تجلی ریز ہو گی۔ جب وہ اپنے سر اٹھائیں گے تو اپنے رب کو اوپر سے اپنی طرف متوجہ پائیں گے، اور اُن کا رب کہے گا : "تم پر سلامتی ہو اے اہل بہشت !" ۔ ۔ پھر وہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ ان کی طرف دیکھیں گے اور جب تک وہ اس کی طرف دیکھتے رہیں گے کسی شغل و انبساط کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے تا آنکہ وہ ان کی طرف سے پردہ کر لے گا اگرچہ کہ اس کی روشنی موجود رہے گی۔"

اور پیغمبر اسلام کا یہ بھی ارشاد ہے :

"اس خدا کی قسم ! جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے کوئی انعام و عطیہ اتنا گراں قدر نہیں جتنا کہ اس کی طرف دیکھنا !" اور جب خدا حجاب میں ہو گا تو جنتی ہوش میں آجائیں گے اور اپنے سماوی گھروں کو لوٹ آئیں گے تو ان کے ساتھی مسرت سے کہیں گے وہ اَب پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آتے ہیں۔ یوں یہ اُن لوگوں کے لیے سفر کا انجام اور منزل کو پالینا ہو گا جو اپنی دنیوی زندگی میں کہا کرتے تھے :

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝ (المؤمنون (۲۳)، ۲۹)

"اور (یہ بھی) دعا کرنا کہ اے پروردگار ہم کو مبارک جگہ اتاریو اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔"

یہاں موازنہ مکمل نظر آتا ہے۔ اگر ہم 'رضوان' کا ترجمہ خدا کی جانب سے قبولیت سمجھ لیں تو اسلام کا ترجمہ انسان کی طرف سے تسلیم و قبول ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کو تمام اختیار کے ساتھ تسلیم کرتا ہے، اور اپنی تقدیر کو بھی تسلیم کرتا ہے خواہ اس میں کتنے ہی مصائب

Marfat.com

کیوں نہ پیش آئیں، اور پھر وُہ صراطِ مستقیم پکڑ لیتا ہے جو بہشت اور اس سے بھی ماورا لقائے باری تک لے جاتا ہے، اور اسی بنا خُدا اِسے قبول کرتا ہے اور اسے روشنی پر روشنی دیتا ہے اور" نُورٌ علیٰ نُور" کر دیتا ہے۔

ایک مسلمان جب اپنے دین کے پہلے رُکن، یعنی توحید پر اپنے ایمانِ کامل کا اقرار کرتا ہے تو وُہ بنیادی چیز سے خود کو منسلک کر لیتا ہے اور ہر مظاہر ماسوا سے خود کو کاٹ لیتا ہے، اور اُس حق کا اعتراف کرتا ہے جو تمام پیغمبر لائے تھے جب وُہ اپنے دین کے دُوسرے بنیادی رُکن کے تحت نماز ادا کرتا ہے، خواہ وُہ مسجد میں ادا کی جائے یا کسی ریگزار میں، کسی مغربی شہر میں یا کسی قطبی منطقے میں ادا کی جائے اس وقت وُہ تمام ممکنہ دُنیاؤں کے مرکز میں ہوتا ہے کیونکہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں اس کا نام لیا جائے گا وُہ وہاں موجود ہو گا۔ اور جہاں وُہ موجود ہو گا لازمی طور پر وہی ہر جہت سے مرکزی جگہ ہو گی۔

جب کوئی مسلمان اپنے دین کے تیسرے بنیادی رُکن کے مطابق زکوٰۃ دیتا ہے تو گویا وُہ غریبوں کا حق ادا کرتا ہے اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ رحمدلی سے پیش آتا ہے اور دُوسری مخلوقات کے حقوق تسلیم کرتا ہے جنہیں اُسی جیسی شکل وصورت پر پیدا کیا گیا ہے اور اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ خُدا اگر اس کے قریب ہے تو دُوسروں کے بھی قریب ہے۔ جب وُہ اپنے دین کے چوتھے رُکن کے مطابق روزہ رکھتا ہے تو وُہ خود کو اس دُنیائے ارضی سے بھی کاٹ لیتا ہے جس میں وُہ عارضی طور پر مقیم ہے اور اس گھر کی تیاری کرتا ہے جہاں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

جب وُہ مکّے میں ایک حاجی کی حیثیت سے کعبہ کے سات طواف کرنے کے بعد کھڑا ہوتا ہے تو وُہ مرکز، جس کو اُس نے کعبہ سے دُور رہتے ہوئے بھی اپنی نماز میں تسلیم کیا تھا اب ایک زندہ حقیقت بن کر اس کے سامنے آ جاتی ہے جب وُہ احرام کی حالت میں کپڑے کے صرف دو سادہ اَن سلے پارچوں میں ملبوس ہوتا ہے تو گویا وُہ اپنی نسلی شہریت، معاشرتی مقام جیسے اوضاع واطوار کو پیچھے چھوڑ آیا ہے جن سے وُہ اِس

Marfat.com

دُنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ اب وُہ فلاں فلاں جگہ کا فلاں فلاں شخص نہیں، صرف حاجی ہوتا ہے۔

اس کے برہنہ پیروں کے نیچے صدف رنگ سنگِ مرمر کا وہ مطاف ہوتا ہے جو دُنیا کے عین وسط میں واقع ہے اور اگرچہ اُسے حکم دیا گیا ہے کہ کسی اور مقام پر نماز ادا کرتے ہوئے اپنی نظریں نیچی رکھے لیکن اب یہاں اسے اجازت ہے کہ وُہ اپنی نظریں اُٹھا کر کعبے کی طرف دیکھے جو زمین پر اُس محور اور قطب کا ارضی سایہ ہے جس کے گرد ستاروں سے جگمگاتے افلاک گردش کرتے ہیں۔ اگرچہ اب بھی بہشت بہت دُور محسوس ہوتی ہے مگر یہ کیا کم ہے کہ وُہ اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝

Marfat.com

اسلام اور تقدیر انسانی

الله
هي العليا

گائی ایٹن (حسن عبدالحکیم)

مترجم : فضل قدیر

Marfat.com